BROWN BOOK

بنام خداوند جان آفریں

جامیست جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجراء الناظر ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر :- ظفر الملک علوی

نمبر ۱	جولائی ۱۹۳۶ء	جلد ۴۲

فہرست مضامین

قیمت :- فی پرچہ ۵ / ۲ /

۳۷۱

dated 1975

بادۂ کہن

الناظر کی شائع شدہ ۲۰ جلدوں کا ایک مکمل سٹ بھی بغرض فروخت موجود نہیں صرف ۲۰ یا ۲۲ جلدوں سے چند سٹ ابھی بن سکتے ہیں۔ اور کچھ جلدیں زیادہ تعداد میں بچی ہیں۔ اس لیے اس ذخیرے کو ختم کرنے کیلیے ان کی قیمتوں میں

انتہائی تخفیف

کا اعلان کیا جاتا ہے۔ ہر جلد کا مختصر حال اور رعایتی قیمت درج ذیل ہے:۔

(۱) جلد چہارم (جنوری لغایت جون ۱۹۱۱ء)

خاص مضامین نثر:۔ عجائبات فلک۔ (مفتی انوار الحق ایم۔ اے) شاہان اودھ کی بے تعصبی (خواجہ عبد الرؤف عشرت) معرفت حق (مولوی سید علی اصغر بلگرامی) سکندر (شوق قدوائی) (ا۔ ست) عالم خیال پر ایک نظر (شیخ مشیر حسین قدوائی بیرسٹر ایٹ لا) ماہیت شکر (مولوی ابو الحسن الہ آبادی) جاپانی عورت (ت۔ ک) تقسیم محنت (خان بہادر مرزا سلطان احمد) حضرت فخر الدین عراقی (عبد اللہ بیگ نے مولوی معشوق حسین خاں بی۔ اے) عالم خیال کے دوسرے رخ پر ایک نگاہ (مسٹر محمد سلیمان بیرسٹر ایٹ لا) اسپین اور اسلام (مسٹر ابراہیم حسین) تسلیم و رضا (ابو العلا سید احمد ناطق) فطنت (خان بہادر مرزا سلطان احمد)

نظم:۔ عالم خیال (شوق قدوائی کی یہ نظم بہت مقبول ہوئی اور کتابی صورت میں بار بار چھپ چکی ہے) میں کیا ہوں (مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی) نیند (شوق قدوائی) ماں کی مامتا (منشی محمد حسین محوی) نوحہ خوانی (مرزا کاظم حسین محشر) مسدس نعتیہ (مولوی سید محی الدین تمنا پھلواروی) عبرت حسرت (ملا سید علی حید نظم طباطبائی) احمد یار ستیالی (ملک محی الدین قمر) سیس اینڈ ریلیجن (شوق قدوائی) باغ خزاں رسیدہ (محوی)

حجم ۳۶۰ صفحے۔ قیمت سابق عہ
رعایتی قیمت ۸ر

(۲) جلد پنجم (جولائی تا دسمبر ۱۹۱۱ء)

خاص مضامین نثر:۔ مسلمانوں کی علمی ترقیاں۔ (مولوی محمد نعمت خاں) حق معرفت (مولوی سید علی اصغر بلگرامی) مجوزہ محمڈن یونیورسٹی پر ایک فلسفیانہ نظر (مسٹر ظفر حسن خاں) استاد الملک ملا جیون (قاضی خادم حسین علوی) برجیس نمک (مفتی انوار الحق ایم۔ اے) ہندوستان کے نوشتہ ہائے اسلامی (مولانا حکیم شمس اللہ قادری) شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی (عبد اللہ) عورتوں کے حقوق (مولانا سید احمد دہلوی، مؤلف فرہنگ آصفیہ) شیخ اوحد الدین کرمانی (عبد اللہ) مسلمانان ہند کی معاشرت اور اسکی اصلاح (ڈاکٹر کے فرضی نام سے کپتان لطافت حسین خاں آئی۔ ایم۔ ایس نے یہ مضامین لکھے) ذکاوت یا اخلاق (مولوی جواد علیخاں عالی) مشتری اور اسکا انجام (مفتی انوار الحق ایم۔ اے) مولانا جلال الدین رومی (عبد اللہ)

جلال الدین اکبر کے ایک سپہ سالار کی بہادری (مسٹر قطب الدین حسین) کلیلہ و دمنہ (منشی دیانت حسین صدیقی کا تحقیقاتی مضمون) حیدر نائک (ت ۔ ک) عقل نسانی (مولوی سید احمد ناطق) جامعہ قرطبیہ (مولوی نعمت خاں) شیخ محی الدین اکبر (عبداللہ۔ اس مضمون کو دفتر رسالہ صوفی نے کتابی صورت میں شائع کیا) سیر کشمیر (مسٹر مشیر حسین قدوائی بیرسٹر ایٹ لا)

نظم :- ابر (منشی احمد علی شوق قدوائی) تتلی (منشی محمد حسین محوی) ہوا (شوق قدوائی) جنگل اور باغ (شوق قدوائی) فضا (شوق قدوائی) بندھیاچل کی چاندنی (شوق قدوائی) شخصی سلطنت میں سازش کا اثر (سید میر محمد طباطبائی خلف علامہ سید علی حیدر طباطبائی) قرض (مرزا محمد بہادر بیگ وکیل حیدرآباد)

حجم ۳۰۰ صفحے ۔ قیمت سابق ؎ ۸

رعایتی قیمت ۸

(۳) جلد بست و پنجم (جولائی تا دسمبر ۱۹۲۳ء)

(اس جلد کے بعض پرچوں میں حضرت "چلپی" کے نوٹ فیہا فیہ کے عنوان سے شائع ہوتے رہے، اور ایڈیٹر کے قلم سے سفر حجاز کی مختصر روداد کے کئی نمبر شائع ہوئے)

خاص مضامین نثر :- خواجہ بزرگ قدس سرہٗ (عبداللہ) حکومت کے وسائل آمدنی (مسٹر سی۔ آر۔ اے) ایک غیب داں (خان بہادر مرزا سلطان احمد) جنوبی ہند کی عظمت (مرزا مظفر حسین علیگ) چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی (ایڈیٹر) خطاب (ملا) مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ (عبداللہ) مثنوی مولانا روم کی ایک جدید اردو شرح (مولوی عبدالمنان بی اے) دنیا کے تمدنی مراکز (مولانا حسرت موہانی)

طاہرہ (ریویو از مولوی محمد ظفر ایم اے ایل ایل بی) انگریزوں کا پہلا قدم بہار میں (مولوی محمود شیر وکیل پٹنہ)

نظم :- سبد گل فروش (صاحبزادہ ولی احمد خاں جیبوی) صبح حرم (حضرت شاہ ابو الشرف محمد دی مہاجر) لہو کی بوند (منشی محمود حسین محمود اسرائیلی) فتح مکہ (جگر بسوانی) امید و بیم کی تصویر (قاضی غلام امیر امیر بدایونی) انس بن مالک (جگر بسوانی) مجاز سے حقیقت تک (مولوی حمید الدین سلیم پانی پتی)

حجم ۳۰۰ صفحے ۔ قیمت سابق ؎

رعایتی قیمت ۱۰

(۴) جلد بست و ششم (جنوری تا جون ۱۹۲۴ء)

(اس جلد کے بیشتر پرچوں میں "فیہا فیہ" "چلپی" صاحب کے قلم سے اور سفر حجاز کی روداد ایڈیٹر کی لکھی ہوئی درج ہے)

خاص مضامین نثر :- فلسفۂ ازدواج (پروفیسر رشید احمد صدیقی ایم اے) انسانی تہذیب کی ترقی (مولوی نجم الغنی قریشی) طاؤس چینیوں کا خدا ۔ (علامہ احسان اللہ عباسی مصنف تاریخ اسلام وغیرہ ۔) سقراط (مولوی حامد علی) روح نے بچا لیا (مولوی محمد ظفر ایم اے) پیام امن (ریویو از مسٹر ظفر حسن خاں) ذات بحت ۔ روح ۔ تقدیر (علامہ احسان اللہ عباسی) حضرت مخدوم الملک (مولوی سید محمود شیر وکیل) عربی شاعری کی خصوصیات (مسلم عظیم آبادی) خواجہ قطب الدین بختیار کاکی ("عبداللہ") کھرا ۔ پالا ۔ برف (میر طالب علی طالب الہ آبادی) انبیائے بنی اسرائیل (منشی بشیر احمد علوی ۔) شیخ بو علی سینا (پروفیسر حافظ محمد حسین ایم اے)

سری کرشن جی (مسٹر عبدالشکور بریلوی ایم اے) نظم:۔ خدائے ذوالجلال (جگر بسوانی) راز حیات (مسلم عظیم آبادی) پاس محبت (صاحبزادہ ولی محمد خاں) جذبات قناعت (مولوی قاضی غلام امیر آسیر بدایونی) رہروی منزل حق (مسلم عظیم آبادی) انقلاب سیرت (سید ضامن حسین گویا، جہان آبادی) علم و ضبط (مولوی ضیا احمد ضیا ایم۔ اے) فلسفۂ محبت (مولوی وحیدالدین سلیم) اجل (باسط بسوانی)

حجم ۳۸۰ صفحے۔ قیمت سابق عا ر

رعایتی قیمت ۱۴ ر

مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے) رامائن کی تعلیم (علامہ احسان اللہ عباسی) دائرہ (مولوی نجم الغنی قریشی) بیرن کا کمرہ (مولوی نجم الغنی قریشی) اسپین کی پہیلیاں (مولانا خلیل الرحمٰن) ملنجہ و مراکش (مولانا خلیل الرحمٰن) غوث الاعظم (مرزا محمد عسکری بی اے) افغانیہ (مولوی حامد علی) فاتح مصر (ا۔ ع)

نظم:۔ زاری عفت (عبداللہ خاں تپش خورجوی) غمزدہ کوئل (حضرت اقدس حیدرآبادی) دل (سید اظہر علی ایم اے) مسلم جوان مرد سے خطاب (جوش ملیح آبادی) دل (باسط بسوانی)

حجم ۴۰۰ صفحے۔ قیمت سابق عا ر

رعایتی قیمت ۱۴ ر

(۵) جلد بست و ہفتم (جولائی تا دسمبر ۱۹۲۴ء)

ہر ماہ "فیہ ما فیہ" اور سفر حجاز کی روداد کے کسی نمبر۔

خاص مضامین نثر:۔ پیام امن (ریویو از مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی) پارسی مذہب (ناظر دہلوی) صینیوں کی فضائی آسمانی تقسیم (سید طالب علی طالب الہ آبادی) جلاوطنی (خواجہ منظور حسین علیگ) جدید دنیائے اسلام (ریویو از مولوی محمد ظفر ایم اے) تصوف (مولوی ضیا احمد ایم اے) ماتا بدل (پروفیسر رشید احمد صدیقی ایم اے) ابن رشد (ریویو از منشی سید افتخار حسین بی اے جسٹس چیف کورٹ اودھ) افادات مہدی پر ایک نظر (مولوی سید حبیب احمد) یورپ میں فن تاریخ کی تاریخ (پروفیسر معتضد ولی الرحمٰن ایم اے) کلام میر (ا۔ ع) مختصر تاریخ جاوہ و ملحقات (مولوی عبدالسلام رفیقی از جاوہ) تاریخ مغرب ابن العذاری (ریویو از منشی امیر احمد علوی بی اے) حضرت شیخ فرید گنج شکر (عبداللہ) انتخاب از سیر المصنفین

(۶) جلد بست و ہشتم (جنوری تا جون ۱۹۲۵ء)

(بعض پرچوں میں فیہ ما فیہ بعض میں سفر حجاز کی روداد ہے)

خاص مضامین نثر:۔ دیباچہ تصوف اسلام (مولوی عبدالماجد بی۔ اے) تاریخ عرب (ریویو از پروفیسر جمیل الرحمٰن ایم اے) ملہر راؤ ہلکر (شانی خاں) اتحاد بین المسلمین و الہنود (حضرت ملا مسکون ولعلی البو صامری) گوتم بدھ (منشی امیر احمد علوی بی اے) مولانا آزاد کی تحقیق و تدقیق (مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے) ارادہ (مولوی سید رضا حیدر ناظمی) مغلیہ سلطنت کے زوال کے اسباب (حضرت ملا مسکون العلی) عباسیہ بغداد (ریویو از منشی امیر احمد علوی بی اے) دیوان غالب کی شرحوں پر ایک سرسری نظر (مولوی محمد احمد تنہا دسوانی ایم، اے) سیاسیات (ریویو از قاضی تلمذ حسین ایم۔ اے) ہند عہد اورنگ زیب میں (ریویو از مولانا عبدالماجد بی اے)

الہیا بائی اور کوکو جی ہلکر (خانی خاں) دوا فروش کی بیوی (جلیل قدوائی) عقل انسانی (پروفیسر معتضد ولی الرحمن ایم اے) جسونت راؤ ہلکر (خانی خاں) تعلیمات پیسٹلوزی (مولوی حامد علی خاں) ادب اردو کے عناصر اربعہ (یہ انعامی مضمون ہے اس کو الگ فروخت ہوتا ہے از مولوی سعید انصاری جامعی) حضرت محبوب الٰہی (عبد اللہ) نجات الرشید (مولوی ضیاء احمد ضیاء ایم اے) گل رعنا (ریویو از سید ہاشمی فرید آبادی) تلشا بائی اور ملہر راؤ دوم (خانی خاں) جگناتھ (منشی محمد ظفر ایم اے)

نظم :- نعت سرور کونین (اصغر گونڈوی) ظن جام (تپش غورجوی) بی اماں (جلیل قدوائی) لعبت ماضی (مسلم عظیم آبادی) باد صبا (مولوی وحید الدین سلیم) طرز محبت (اقدس حیدرآبادی) رباعیات (نازش بدایونی)

حجم ۴۵۰ صفحے - قیمت سابق عا

رعایتی قیمت ۸ر

---

(۷) جلد سی ام (جنوری تا مارچ ۱۹۲۶ء)

(رسالہ استبداد مسلسل)

خاص مضامین نثر :- جمہوریت افلاطون (مرزا محمد عسکری بی اے) عربی رسم الخط (مسعود علی) اردو ہندی کے بیجا اعتراضات (مولوی محمد محسن تاثیر ایم اے) مسالک النظر (پروفیسر نعیم الرحمن ایم اے کا یہ رسالہ علحدہ بھی چھپا ہے) موجودہ طریقہ تعلیم میں ترمیم کی ضرورت (مولوی سید نواب علی رضوی ایم اے) مشرقی نونی (تفیل) زبان بن رہی ہے یا بگڑ رہی ہے (ڈاکٹر سعید احمد بریلوی) شعر الہند (ریویو از پروفیسر محمد وحید مرزا ایم اے) شرابی (جلیل قدوائی) ایک برکا ٹکڑا (سید علی عباس حسینی ایم اے) انعامی مضمون (مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے ایل ایل بی - ۵۶ صفحے)

نظم :- تضمین برغزل سنائی (مولوی وارث حسین خفاش کرانی وکیل) اخلاقیات (مولوی وحید الدین سلیم)

حجم زائد از ۵۰۰ صفحے - قیمت سابق عہ

رعایتی قیمت ۱۰ا

---

(۸) جلد سی دوم (جنوری تا مارچ ۱۹۲۷ء)

خاص مضامین نثر :- اردو اور لکھنؤ (پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی) پانچ ناول نگار (سید وزیر حسین دہلوی) سلاجقہ عظمیٰ (بشیر احمد علوی بی اے) مسلم یونیورسٹی کی حالت زار (ایڈیٹر) ملوکیت و جمہوریت (مولانا حافظ اسلم جیراجپوری) یادگار انیس (ریویو از پروفیسر مسعود حسن رضوی ایم اے) اصلاح سخن (ریویو از قاضی غلام امیر آسیر بدایونی) ٹالسٹائے (مسٹر مظہر علی علوی بی اے) دو راہہ (مسٹر عزیز احمد جان) ننھی سی پوش لیڈی (مسٹر فخر الزماں) بہترین انشا پرداز (از مولوی محمد مسلم قاضی الہ آبادی)

نظم :- نظم خیالات (ابو عمر) ماتم شاد (مولوی محمد مسلم عظیم آبادی ایم اے) غزلیات :- حضرت ریاض رضا علی وحشت ۔ مولوی وحید الدین سلیم ۔ جلیل قدوائی وغیرہ

حجم ۲۳۰ صفحے - قیمت سابق عہ

رعایتی قیمت ۸

بنام خداوند جاں آفریں

نمبر ۱ جلد ۴۲ ــــــــــــــــــ جولائی ۱۹۳۶ء

پارلیمنٹی طرز حکومت

(جناب قاضی تلمذ حسین صاحب ایم۔ اے رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی)

(مضمون ذیل سڈنی لو کی کتاب "حکمرانی انگلستان" (The Governance of England) کے ایک باب کا ترجمہ ہے، انگلستان کا دستور سلطنت اپنی نوعیت میں فرد ہے، قانونی حیثیت اور عمل میں اس درجہ فرق ہے کہ کہنا چاہیے کہ قانون کو عمل سے کوئی مناسبت نہیں ہے، یا عمل کو قانون سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس امر کو سب سے پہلے سر والٹر بیجہٹ (Bagehot) نے محسوس کیا اور انھوں نے انیسویں صدی کے عشرہ ہفتم میں اس بحث پر مضامین شائع کرنا شروع کئے، یہ مضامین بعد میں کتاب کی شکل میں بنام "دستور سلطنت انگلشیہ" (The English Constitution) ۱۸۶۷ء میں اشاعت پذیر ہوئے۔ یہ کتاب اپنے طرز میں خاص تھی، اس نے علم سیاست میں ایک نئے باب کا افتتاح کر دیا۔ اسی کتاب سے پہلی مرتبہ لوگوں کو معلوم ہوا کہ قانون کیا ہے اور عمل کیا ہے۔ کتاب کے کئی اڈیشن متواتر شائع ہوئے، حسن اتفاق سے انیسویں صدی کے عشرات اواخر برطانی دستور سلطنت کیلیے بہت اہم تھے۔ تھوڑے دنوں میں کتاب میں اضافہ اور ترمیم کی ضرورت محسوس ہوئی، سر والٹر نے کتاب میں کوئی ترمیم نہیں کی بلکہ ایک مبسوط دیباچہ کتاب میں شامل کر کے جدید تغیرات کو واضح کر دیا۔ یہ کتاب اس وقت تک مستند و متداول ہے۔

انیسویں صدی کے ختم ہونے اور اس کے ساتھ ہی ملکہ وکٹوریہ کے انتقال اور شاہ اڈورڈ ہفتم کی تخت نشینی نے ظاہرًا نہیں مگر باطنًا انگریزی نظام سلطنت کے معمولات میں بہت کچھ تغیرات کر دیے۔ سڈنی لو نے اس ضرورت کو پورا کرنے کیلیے

سرولاٹر کے نقش قدم پر چلکر یہ کتاب لکھی۔ کتاب کی اشاعت اول سنہ [illegible]ء میں ہوئی اور سنہ ۱۹۲۳ء تک اسکے چودہ ایڈیشن شائع ہوئے۔ جنگ کے بعد برطانوی نظام سلطنت اور بالخصوص کابینہ کے طریق کار میں نہایت اہم تغیرات ہوے، مگر سڈنی لو نے سنہ ۱۹۲۳ء تک اصل کتاب میں کوئی ترمیم نہیں کی بلکہ دو دیباچوں کے اضافے سے تغیرات کی طرف اشارات کردیے، کتاب بدستور اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے مسلم و مروج ہے۔ امید ہے کہ یہ ترجمہ مفید ثابت ہوگا۔)

بدو و آغاز اتفاقی، اختیارات غیر معین اور زیادہ تر مفروضہ مگر با ایں ہمہ، انگریزی کابینی نظم پارلیمنٹی شکل و حکومت کے اندر ذمہ دار حکومت کا معیار و طرز قرار پاگیا ہے۔ اسی انتہائی نازک و پیچیدہ انتظام کی وجہ سے اغراض و اختیارات کا یہ لطیف توازن اور نظم فریقانہ کے آغاز کے ساتھ مجلس سلطنت کا یہ اتحاد گونہ سہولت و ہمواری کے ساتھ ایک کل کے مانند کام دے رہا ہے۔ کوئی دوسرا انتظام ایسا معلوم نہیں ہوتا جو ایسے ہی کارگر طور پر اقتدار کے مرکز کو ان لوگوں کی نگرانی میں دیدے جن کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہو کہ وہ مرضی عامہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس نظم کے لیے یہ دعوے کیے جاتے ہیں کہ یہ اس عمومی اُصول کو برقرار رکھتا ہے کہ آخری فیصلہ خود قوم کی طرف رجوع کیا جائے اور یہ نظم قوم کو اپنے قواعد اور قانون بنانے والوں کے انتخاب میں پوری آزادی دیتا ہے، یہ حکومت کے فرائض کا ایک ایسی جماعت اشخاص کے ذریعہ سے انجام پانا متیقن کردیتا ہے جن کے آرا عمومی ایوان کی کثرت کے آرا سے متفق ہوتے ہیں۔ یہ اس جماعت کو وہ تقویت اور وہ وسیع اختیار تمیزی عطا کرتا ہے جو پائدار نظم و نسق کیلیے ضروری ہیں اور اس کے ساتھ ہی اس جماعت کو ایک بڑی جوری ([illegible]) کے روبرو ذمہ دار قرار دیتا ہے جس کے ارکان خود قوم کو جواب دہ ہوتے ہیں، یہ قطعی طور پر اس طریق عمل کا تحفظ کردیتا ہے کہ معاملات عامہ کے ہر درجہ میں عام مباحثہ ہوگا، یہ اعلےٰ عہدہ داران سے متقاضی ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی عدالت کے سامنے اپنے افعال کو بجا ثابت کرنے کیلیے تیار رہیں جو بصورت عدم اطمینان یا عدم تیقن انھیں برطرفی کی سزا دے سکتی ہے۔ یہ ایک حقیقی ذی اقتدار قوت پیدا کردیتا ہے جو سلطنت کے ہر محکمے اور وضع قوانین اور نظم و نسق کے ہر مرحلے میں فائق ہوتی ہے، اور یہ اس امر کا امکان مہیا کردیتا ہے کہ دستوری طریق کی حسب معمول رفتار سے نہایت ہی وسیع النوعیت اصلاحات و تغیرات کو عمل میں لائے بشرطیکہ آنکہ انتخاب کنندگاں کی کثرت واقعی ان اصلاحات و تغیرات کی خواہاں ہو۔

اکثر پارلیمنٹی طرز حکومت کا مقابلہ وفاقی اور صدارتی طرزوں سے کیا جاتا ہے، کیونکہ صرف یہی وہ اشکال ہیں جو باغلب وجوہ ان آزاد و متمدن قوموں میں قائم رہتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جو مطلق العنان شاہی کی ہیئت سے گزر چکی ہیں۔ ڈی ٹاکول کے بعد سے یہ مقابلہ اکثر کیا جاتا رہا ہے کہ

غیر ملکی مبصرین نے جو بالطبع اپنے ہاں کے ادارات کو ترقی دینے کے خواہشمند ہوتے ہیں، گاہ بگاہ انگریزی نظم کی خوبیوں پر حد سے زائد زور دیا ہے۔ شاید انھیں ہمیشہ یہ نظر نہیں آتا کہ اس کا انحصار کس قدر زیادہ ان حالات پر ہے جنھیں مقامی یا اتفاقی کہہ سکتے ہیں۔ اس مرکب میں نہایت کثیر اجزا شامل ہیں، تجزیہ کنندگاں انھیں نہایت مختلف النوع عناصر کے علامات کہتے ہیں اور اگر کوئی عنصر حذف کر دیا جائے یا غیر معمولی تناسب میں شامل کر دیا جائے تو ماحصل کا کل مزہ بدل جائے گا۔ کوئی نقل (جن سے ناروے سے لے کر نیوزیلینڈ تک دنیا بھری ہوئی ہے)، اصل کو صحیح صحیح پیدا نہیں کر سکی ہے۔ کسی ملک میں یہ ہوا ہے کہ وزارتی مجلس کی رازداری اور مجموعی ذمہ داری مہیا کرنے میں کوتاہی ہو گئی ہے، کسی دوسرے ملک میں دولتمند و با فرصت طبقہ ایسا موجود نہیں ہے جو نظم معاشرت و سیاسیات کے درمیان کڑی کا کام دے۔ کسی اور جگہ فریقوں کی اس واضح الحدود تقسیم اور رائے عامہ کی اس صحیح التعیین ثنویت کے میلان کا فقدان ہے جس سے کابینہ کو برسر اقتدار لانے اور اسے خارج کرنے کی کل کا سامان مہیا ہوتا ہے۔ جن مستعمرات میں ہر طرح پر یہ کوشش کی گئی ہے کہ تا حد امکان انگریزی نمونے کا اطلاق کیا جائے، وہاں بھی یہ تشابہ نامکمل ہے۔ آسٹریلوی سیاسیات کا ایک باخبر مفسر یہ کہتا ہے کہ :-

"یہ امر مشکوک ہے کہ ذمہ دار حکومت اس مفہوم میں کہ وزارت کی ایسی حکومت ہو جو ایک ایسی معینہ روش نکالے جسے ملک پسند کرے اور اس کے عوض اسے پارلیمنٹ کے اندر مؤیدین کی وفاداری حاصل ہو، آیا اس قسم کی حکومت بر اعظم آسٹریلیا کی آب و ہوا میں کبھی سرسبز ہوئی ہے، البتہ متوفی سر ہنری پارکس کے زیر اثر نیو ساؤتھ ویلز ایک استثنٰی ہے۔ درحقیقت جب یہ چاہا جائے کہ ایک ایسے نازک نظم کو جسے معمولات نے متبرک بنا دیا ہو اور جو اپنی کامیابی کیلیے نمائندگی کے ایک خاص طبقہ کے انتخاب پر انحصار رکھتا ہو، اسے بیخ و بن سے اٹھا کر ایک ایسی قوم میں نصب کر دیا جائے جس پر بالضرورت ایسے لوگ حکمرانی کرتے ہوں جنھیں زندگی عامہ کا بہت کم تجربہ ہو، تو پھر اسکے سوا اور ہو کیا سکتا ہے ؟ ایسے شاذ مواقع کے سوا جب کوئی اہم مسئلہ مثلاً محاصل تجارت کا مسئلہ، سامنے آجاتا ہے آسٹریلوی پارلیمنٹ معمولی فریقانہ سمتوں پر منقسم نہیں ہوتی اور برابر نئی وزارتوں کا ہنگامہ برپا رکھ کر سامان دلچسپی مہیا کرتی رہتی ہے اور وزارتوں کے یہ انتخابات سیاسی ملحوظات کی بنا پر نہیں ہوتے بلکہ شخصی ملحوظات کی بنا پر ہوتے ہیں۔ بلا کسی خاص خیال کے نیو ساؤتھ ویلز، ساؤتھ آسٹریلیا اور وکٹوریہ تین صوبوں کو لیجیے، ان صوبوں میں چالیس برس کے اندر علے الترتیب اٹھائیس، بیالیس اور چھبیس وزارتیں رہ چکی ہیں۔ جو دشواری ہر نئے ملک کو پیش آتی ہے، آسٹریلیا کو بھی اس کا سامنا کرنا پڑا، وہ یہ کہ

جن لوگوں کو طبعاً پارلیمنٹ میں داخل ہونا چاہیے اُن کے لیے تجارت یا پیشے کے فرائض حسب ضرورت وقت دینے سے مانع ہیں اور ایسے بافرصت اشخاص کی عدم موجودگی میں حلقہائے انتخاب کو ارکان کی پسندیدگی میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ یہ کہنا بیکار ہے کہ رکنیت کا معاوضہ کامیاب تاجروں کیلیے باعث ترغیب نہیں ہے مگر جن لوگوں کے لئے یہ تنخواہ باعث ترغیب ہے ان میں مقابلہ بڑھ گیا ہے[1]۔"

یہ ثابت کرنا دشوار نہیں ہوگا کہ اطالیہ اور بلجیم کے مانند براعظم یورپ کی جن پارلیمنٹی بادشاہیوں نے گذشتہ صدی میں اپنے دساتیر سلطنت کو اس صریح مقصد کے ساتھ نئے سانچے میں ڈھالا کہ انھیں ہمارے دستور کے مماثل بنادیں، انھیں اسی طرح کے یا اس سے زیادہ وسیع اختلافات قبول کرنا پڑے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ بلجیم اور اطالیہ کی تاریخوں کی رفتار وہ نہیں رہی ہے جو برطانیہ کی تاریخ کی تھی اور نظم معاشرت کے درجات مرسومہ بہت ہی مختلف ہیں۔

لیکن پارلیمنٹی حکومت میں ایک اولین وصف مشترک ہے انگلستان، پرشیا، فرانس، بلجیم، مستعمرات برطانیہ ہر جگہ وزرا پارلیمنٹ کے ارکان ہیں۔ مجلس عاملہ انتخابی ایوان کو جواب دہ ہے، اور حلقہائے انتخاب کے نمائندے اس مجلس کے افعال کی جانچ کر سکتے، ان پر نظر ثانی کر سکتے، ان پر نکتہ چینی کر سکتے اور ان کو ناروا قرار دے سکتے ہیں۔ راست ذمہ داری یا واقعتاً ہے یا ایسا ہونا فرض کیا جاتا ہے۔ راست اختیار بھی ہے۔ وزرا بہت بڑے بڑے کام انجام دے سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تقریباً ہر ایک کام انجام دے سکتے ہیں مگر یہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ انھیں قومی تائید کا اعتماد حاصل ہو۔ جب تک وہ اس اعتماد کو قائم رکھیں وہ روے زمین پر سب سے زیادہ پرزور و پرعمل حکمراں ہیں۔ جب وقت وہ اس اعتماد کو زائل کر دیں ان کی حیثیت ذاتی شہریوں کی ہے۔ اس اقتدار سے ملبوس ہو کر ان کے سیاسی فعل کی حد وسعت تقریباً نامحدود سی ہے۔ انگلستان کا ایک وزیر اعظم جسے پارلیمنٹ میں اپنی کثرت پر تیقن ہو وہ کام کر سکتا ہے جو جرمانی شہنشاہ، امریکی صدر جمہوریہ اور موتمر ممالک متحدہ امریکہ کی مجالس ذیلی کا میر مجلس نہیں انجام دے سکتا کیونکہ وزیر اعظم انگلستان قوانین کو بدل سکتا ہے، وہ محصول عائد کر سکتا یا محصول کی تنسیخ کر سکتا ہے اور سلطنت کی قوتوں کی رہبری کر سکتا ہے، صرف ایک شرط یہ ہے کہ وہ اپنی کثرت کو قائم رکھے۔ یہ اس امر کا خارجی مادی اظہار ہے کہ قوم نے اسے جس بے قید ماموریت سے ملبس کر دیا ہے وہ اسے علیحدہ نہیں کرنا چاہتی۔

ان سب کی اصل یہ رواج ہے کہ وزرا کسی ایک نہ ایک ایوان پارلیمنٹ سے تعلق رکھنے پر مجبور ہیں مگر یہ محض رواج ہے اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس کی مخالفت تاج کی جانب سے اس درجہ نہیں ہوئی جس

[1] ایچ۔ ڈی۔ آر۔ ڈاکر "آسٹریلوی عمومیت" (Australian Democracy) صفحہ ۲۲۴۔

درجہ خود مجلس وضع قوانین کی جانب سے ہوئی، قانون اب بھی اس طریق عمل کو شک کی نگاہ کے ساتھ دیکھتا ہے اور اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی ایک وقت میں دارالعوام میں چار معتمدین سلطنت اور چار ماتحت معتمدین سے زیادہ ہوں (۲۱-۲۲- وکٹوریہ باب ۱۰۶ دفعہ ۴، ۲۷-۲۸ وکٹوریہ، باب ۳۴)[1]۔ گلیڈ اسٹن کہتا ہے کہ "اس ملک کا کوئی تحریری قانون یا قانونی رواج ایسا نہیں ہے جس کا اقتضا یہ ہو کہ تاج کے وزرا کسی ایک نہ ایک ایوان پارلیمنٹ میں نشست رکھیں، شاید یہی وجہ ہے کہ میرے بیشتر اہل ملک میری دانست میں یہ تو تسلیم کرلیں گے کہ یہ ایک موزوں و باعث سہولت رواج ہے مگر نسبۃً کم لوگ اس امر سے آگاہ ہوں گے کہ اس رواج کا ملحوظ رکھنا جان و دل سے کس قدر قریب ہے اور اسے معاشرتی قوتوں کے توازن و اتحاد سے کس قدر گہرا تعلق ہے[2]"؛ اس کے بغیر کہ "تاج کے خدام" ہمیشہ یہ محسوس کرتے رہیں کہ وہ قوم کے خدام بھی ہیں۔ وضع قوانین کا عام انتظام ان کے ہاتھوں میں نہ آسکے گا اور اس کے بغیر ہر درجہ و مرحلہ میں انھیں اپنے اعمال و افعال کی ذمہ داری دلنشین نہ ہوتی رہے گی۔

اختیارات کی وہ تفریق جو ہمارے لیے صرف نظریاتی یا متروک ہو کر رہ گئی ہو، ممالک متحدہ امریکہ میں بدستور زندہ و عمل فرما ہے۔ جماعت عاملہ مجلس وضع قوانین سے علیحدہ رکھی گئی ہے۔ کابینہ کے ارکان موتمر میں نہیں بیٹھتے، وہ صرف سر دفتران ہیں اور صدر جمہوریہ کو جواب دہ ہیں، اور صدر نظم و نسق کا سرکردہ اعلیٰ ہے؛ موتمر کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ قوانین بنائے اور متفقہ محاصل کے وصول کرنے اور تقسیم کرنے کا انتظام کرے۔ کوئی وزارت براہ راست مجلس وضع قوانین کے روبرو جواب دہ نہیں ہے الا یہ کہ وزارت سے مراد دارالنائبین کے مختلف مجالس ذیلی کے وہ میران مجلس ہوں جن کے وزارتی فرائض مختلف اختیارات سے کابینہ کے عہدہ داروں کے فرائض سے زیادہ اہم ہیں۔ یہ کابینی عہدہ دار بلند رتبہ راز دار ضرور ہیں، بس ایسے ہی جیسے ہمارے "مستقل" نائبان معتمد ہیں مگر اول الذکر میں استقلال کا عنصر نہیں ہوتا۔ صدر جمہوریہ، سفارتی مراسلات، بری و بحری انتظام اور غیر ملکی معاملات کے اغراض کیلیے وزیر اعظم ہے، لیکن تشریعی اغراض کیلیے اگر کوئی صاحب منصب وزیر اعظم ہے تو وہ دارالنائبین کا صدر ہے جو مجالس ذیلی کو نامزد کرتا ہے اور یہ خیال رکھتا ہے کہ میران مجلس حاوی فریق کے ارکان ہوں۔

---

[1] اپریل ۱۸۶۴ء میں بدیں وجہ ایک نہایت ہی معین دستوری مباحثہ ہوا تھا کہ قانون تحریری کے برخلاف پانچ ماتحت معتمدین کو دارالعوام میں نشست کرنے اور رائے دینے کی اجازت ہو گئی تھی۔ [illegible] کیلیے جو ... ہو تا کہ قانون ... منظور کیا گیا۔

[2] گلیڈ اسٹن "التفاتات" (Gleanings) جلد اول صفحہ ۲۲۰، مسٹر گلیڈ اسٹن نے اس امر کو یاد دلایا ہے کہ اتفاقی حالات کی وجہ سے وہ دسمبر ۱۸۴۵ء سے جولائی ۱۸۴۶ء تک دارالعوام میں نشست کے بغیر معتمد سلطنت کے عہدہ پر فائز رہا۔ [illegible] نمایاں واقعہ ہے"

مجالس ذیلی کی اس وزارت کے مختلف اجزا علیحدہ علیحدہ کام کرتے ہیں، ان میں اتفاق یا صحیح اتحاد نہیں ہوتا، جماعت عاملہ کا لحاظ بہت کم ہوتا ہے اور بعض اوقات کسی مشترک روش کا لحاظ کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مالیات کا انضباط ایک ایسے طریق پر ہوتا ہے جس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ خرچ ایک جماعت کے تجاویز سے ہوتا ہے اور محصول دوسری جماعت کے حکم سے لگتا ہے۔ محاصل و وسائل کی ایوانی مجلس کا صدر کبھی کبھی امریکی وزیر خزانہ کہا جاتا ہے مگر وہ ایسا وزیر خزانہ ہے جسے صرف مداخل کی فکر کرنا پڑتی ہے، مخارج پر دوسرے وزیر مال کا اقتدار ہوتا ہے اور وہ مجلس تقسیمات مصارف کا صدر ہوتا ہے، اور کابینی عہدہ دار جو واقعاً محکمہ خزانہ کا سرکردہ ہوتا ہے وہ موازنے کے کسی جانب کیلیے بھی ذمہ دار نہیں ہے۔ درحقیقت وہ ایسے ماہر گواہ سے زیادہ نہیں ہے جسے یہ اجازت دیگئی ہو کہ وہ اپنے تجاویز رد یا قبول کے لیے موتمر کے مجالس کے سامنے پیش کرے[1]۔

امریکی نظم، ذمہ داری کو منقسم کردیتا اور اس کا کسی ایک جگہ پر متعین کرنا دشوار بنا دیتا ہے۔ جو صدر ایک میعاد کے لیے منتخب ہوا ہو موتمر اس پر اس کے سوا اور کسی طرح پر اقتدار نہیں حاصل کرسکتی کہ اسے اپنے جذبات اور اپنے مدارات کے لحاظ پر توجہ دلائے۔ صدر کو کسی ایسے موتمر پر کوئی اقتدار نہیں ہوتا جس کی نسبت ایسا ہونا ممکن ہو کہ وہ اس کے مخالف فریق سے ہو، صدر کے عدم اقتدار کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ نہیں کرسکتا کہ موتمر کو منتشر کردے اور نمائندوں کے بجائے انتخاب کنندگاں کی جانب رجوع کرے اور خود ایوان نمائندگاں کو اپنے کاموں پر بہت کم اختیار ہوتا ہے کیونکہ ان کاموں کا سرانجام فی الواقع ان "دو کوڑی" چھوٹے چھوٹے مجالس وضع قوانین" کے سرگروہوں کے ہاتھوں ہوتا ہے جن کا وجود میں آنا صدر موتمر کا زیر بار احسان ہوتا ہے۔

ان مختلف اختیاروں اور ذمہ داریوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ کابینی نظم کے تحت میں ایک ہی ہاتھ میں تفویض ہیں اور ان کا نفاذ عام بحث و مباحثہ کی فضا میں ہوتا ہے۔ یہ اختیارات اور یہ ذمہ داریاں ایک حکمران مجلس کے اندر مجتمع ہیں جس کی ہستی ایک ایسے نیابتی ایوان کے باعث ہے جس کا انتخاب براہ راست انتخاب کنندگاں کی جانب سے ہوا ہے "قوم (یعنی متصف الاوصاف رسالے دہندگان) نے یہ روا رکھا ہے کہ ایک مجلس عاملہ برقرار رہے اور بظاہر اسکے اختیارات بھی وسیع ہوں مگر قوم نے عملاً اس مجالس عاملہ کا انتخاب کیا اور اسے اپنی مرضی پر اس درجہ اور اس قدر علے الدوام منحصر رکھا کہ وہ جس امر کو قوم کی مرضی سمجھتی ہے اسکے خلاف

---

[1] مثلاً فرض کہ ہمارے کابینی عہدہ دار اس وجہ سے مستعفی ہوجائیں کہ معتمد خزانہ نے اپنے "خط" میں جس قدر رقم مصارف کے لیے طلب کی تھی وہ کل کی کل منظور نہیں ہوئی، ہماری نظروں میں ایسا ہی عجیب غریب ہوگا جیسا انگریزوں کی نظر میں ہمارے تاج کے وزرا اس قسم کے حادثات کے ہوتے ہوئے اپنے عہدوں پر قائم رہیں۔ ڈاکٹر وولسن "موتمری حکومت" (Congressional Government) صفحہ ۱۶۲

کرنے کی جرأت نہیں کر سکتی[51]"۔ قوم خود اپنے گھر میں مالک ہو سکتی ہے، اس کی قوتیں عدم اتحاد کی وجہ سے منتشر ہونے کے بجائے ایک راستہ پر چلائی جا سکتی ہیں۔ جہاز سلطنت کے عہدہ دار، ملاح، مہندس متحدہ مقصد اور اتحادِ مرضی کے ساتھ ملکر کام کر سکتے ہیں۔ دارالعوام اصولاً اس وجہ سے قوی ہے کہ وہ وزارت سے اسکے ہر ایک فعل کے متعلق جواب طلب کر سکتا اور قوم سے انکار کرکے اسے مستعفی ہونے پر مجبور کر سکتا ہے۔ وزارت اس کی خادم ہے مگر اس کی غلام نہیں ہے کیونکہ وزارت یہ کر سکتی ہے کہ بادشاہ کو یہ صلاح دے کہ پارلیمنٹ کو منتشر کر دیا جائے۔ قوم سے رجوع کیا جائے اور فیصلے کی استدعا کی جائے۔

امریکہ کے ارباب قلم میں سے بعض نہایت ہی دقیقہ رس افراد کو ہمارے نظم کے اس طریق سے جو انکے نظم کے خلاف ہے، خصوصیت کے ساتھ یہ حیرت ہوئی ہے کہ وضع قوانین اور حکمرانی دونوں کے اختیارات عمومی جمعیتوں کی کامیاب سرگروہی کا نتیجہ اور انعام بنا دیے گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قومی پارلیمنٹ کو چاہیے کہ مدبروں کو عملی جہانبانی کی تعلیم دے۔ ملک کے سامنے انھیں پیش کرے تاکہ جب قابل آدمیوں کی ضرورت ہو تو وہ مہیا ہو سکیں،" جن حکومتوں میں نظم و نسق تشریعی جماعت کی عاملانہ مجلس کے ذریعہ سے انجام پاتا ہے، ان ملکوں میں نہ صرف مدبرین کی تعلیم بلکہ ان کا مظاہرہ بھی مسلسل و مکمل ہوتا رہتا ہے[52]"۔ امریکہ کی کوئی نامزد کنندہ مجلس عارضی اپنے مقصد کے لیے موزوں شخص کے واسطے "موتمر کی فہرست پر نظر نہیں ڈالتی"۔ اگر وہ ایسا کرے تو وہاں اسے اس قسم کا شخص نہ ملے گا کیونکہ وہ اصحاب نظم و نسق کے تیار کرنے کا مدرسہ نہیں ہے۔ اہل موتمر کا کام یہ ہے کہ وہ "مسودات قوانین کو منظور کریں، ان کا یہ کام نہیں ہے کہ ان مسودات کے قوانین بن جانے کے بعد انھیں چلاتے بھی رہیں"۔ مگر کابینی مدبر کو یہ دونوں فن سیکھنا پڑتے ہیں۔ "وزارت ایک تشریعی وزارت ہے اور اس کی زندگی مجلس وضع قوانین[53] سے ہے جہاں قومی ذہانت ہمیشہ عاملانہ جگہ حاصل کر لیتی ہے۔ پارلیمنٹ کے اندر ایک طولانی زندگی سے کم از کم اتنا تو ہوتا ہے کہ عملی تدبر سے طولانی واسطہ پڑتا ہے، اور بہترین صورت میں عملی مدبر کے فرائض کی طولانی تعلیم حاصل ہوتی ہے"۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ انگلستان کی سیاسی زندگی کے سرگروہ، اخلاق کے وزن، شخصی خدمت کے امتیاز اور انفرادی تجربہ کے اقتدار کے علاوہ اخبارات کے گمنام لکھنے والوں پر علو و شان کے کچھ اور اسباب بھی رکھتے ہیں۔

قوم کو پارلیمنٹی مباحث سے دلچسپی ہوتی ہے کیونکہ وہ یہ جانتی ہے کہ اسکے معنی کیا ہیں اور وہ کس

---

[51] برائس، "امریکی دولت عامہ" (American Commonwealth) جلد اول صفحہ ۲۱۸۔

[52] ووڈرو ولسن، موتمری حکومت (Congressional Government) صفحہ ۱۹۶۔

انجام تک منجر ہو سکتے ہیں۔ قوم یہ محسوس کرتی ہے کہ وہ "خود ذی اقتدار تشریعی جماعت کے مباحثہ میں موجود ہے۔ یہ مباحثہ ایسا ہوتا ہے جس میں حکمت عملی پر ایک مفروضہ مسئلہ کی ہر ایک ہیئت صاف طور پر واضح کی جائے گی اور اس جماعت کے مسلمہ سرگروہ ہر ایک اہم دلیل کو اس کی انتہائی حد رسائی تک پہونچا دیں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مباحثہ ایسا ہوگا جس پر کسی شئے کا صریح انحصار ہوگا اور وہ شئے کوئی دلچسپ یا اہم شئے ہوگی، نظم و نسق یا قانون کا کوئی باوزن مسئلہ ہوگا یا کسی فریق کی قسمت یا کسی نام و نمود کے مدبر کی کامیابی اس پر معلق ہوگی۔" وزارت کے معیار عہدہ کا نظم و ضبط پارلیمنٹ کے اندر تشریعی تجاویز کے برسرکار لانے کی قابلیت سے ہوتا ہے۔ کسی ذی حوصلہ شخص کے خود کسی دن وزیر ہو جانے کا امکان اس پر منحصر ہوتا ہے کہ اس میں پارلیمنٹ کے اندر وزارتی حکمت عملی کی حمایت کرنے، یا اس حکمت عملی پر حملہ کرنے کی قابلیت کس حد تک ہوتی ہے۔ اعلےٰ و معزز عہدہ حاصل کرنے کی توقع بلکہ اس کے امکان کا محفوظ ترین طریقہ یہی ہے کہ قوم کی بہترین ذہانت کو سیاسی زندگی میں داخل کر دیا جائے۔ ہمارے بحر اوقیانوس کے دوسری جانب کے مہربان ناقدین اس امر پر افسوس کرتے ہیں کہ موتمر میں کسی جگہ کا کوئی انعام اس سے زیادہ نہیں مل سکتا کہ کثیر التعداد مجلسوں میں سے کسی مجلس کی رکنیت حاصل ہو جائے اور ان مجلسوں میں سے کسی کو بھی نہ حکمت عملی کے معاملہ میں فوقیت حاصل ہوتی اور نہ تجویز پیش کرنے سے زیادہ اس کا کوئی مسلمہ اقتدار ہوتا۔ اسکے برخلاف انگلستان میں نادر ترین قابلیتوں کے لوگ شوق کے ساتھ پارلیمنٹ میں جگہ کے خواہاں ہوتے ہیں کیونکہ حکومت کی اعلےٰ مجلس کی رکنیت کیلیے پارلیمنٹ کی زندگی بہترین راستہ بلکہ درحقیقت واحد راستہ ہے۔ وہ سرگروہی جس کے ساتھ ایک عظیم الشان حکمران فریق پر اقتدار حاصل ہو، ایک ایسا انعام ہے جو جلیل القدر مقابلہ کنندگان کو اپنی جانب کھینچ لیتا ہے اور ایک آزاد حکومت میں یہی وہ واحد انعام ہے جو جلیل القدر مقابلہ کنندگان کی کوشش کا باعث ہو سکتا ہے۔

ان مدائح کو جب ہم واقعی حالات مروجہ پر عائد کرتے ہیں تو ان میں کچھ شرط لگانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کہنا محفوظ ہے کہ کابینی حکومت وہ سب کچھ ہو سکتی ہے جو اسکے مدح سرا ناقدین کے خوشامدانہ انداز میں مضمر ہے بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ واقعتاً ایسا ہے۔ دوسرے دوروں کی بہ نسبت، دونوں جلیل القدر قوانین اصلاح کے درمیانی ایام میں یہ نمونہ حقیقت سے زیادہ قریب تھا، کیونکہ عامۃ الناس کے ہجوم کے لیے انتخابی دروازے سیل کے کھلنے کے قبل طبقہ متوسط کی فوقیت کے زمانہ میں اور اس زمانہ میں جبکہ غیر ملکی حکمت عملی کے بہ نسبت وضع قوانین اور اندرونی معاملات کو نسبتہً زیادہ اہمیت حاصل تھی، اس وقت جماعت عاملہ مجلس وضع قوانین، اور حلقہائے انتخاب کے تعلقات فیمابین موجودہ زمانہ کی بہ نسبت ان تعلقات سے

زیادہ مشابہ تھے جن کی تصویر دستوری نظریہ میں کھینچی گئی ہے۔ انیسویں صدی کے عشرہ سابع تک میں کتب نصاب کے لکھنے والوں کا تصور واقعات سے بہت دور تھا اور ادھر حال کے برسوں میں ترمیم کن اثرات نے زیادہ قوت پکڑلی ہے۔ وزرا کی ذمہ داری کی وسعت اور حقیقی نوعیت کو، کابینہ کے ارکان کے باہدگر اور وزیر اعظم کے ساتھ ان کے تعلقات کو، فریقانہ نظم کے ارتقا کو اور ایک جانب وزارت کے بالمقابل اور دوسری جانب انتخاب کنندوں کے بالمقابل دار العوام کی تقلیل شدہ قوت و اہمیت کو، غرض اس قسم کے جملہ امور کو حساب میں لانا چاہیے۔ ہمارے حال کے سیاسی ارتقا میں آخر الذکر نہایت اہم خصوصیت ہے۔ لاؤ کہتا ہے کہ "۱۶۸۸ء کے انقلاب کے بعد سے انگریزی دستور سلطنت کے ارتقا کی وجہ سے جو خاص تغیر وقوع میں آیا وہ یہ تھا کہ سلطنت کا مرکز اور اس کی قوت عملاً تاج سے نکل کر دار العوام کی جانب منتقل ہو گئی"۔ اس پر یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۳۲ء کے بعد سے خاص تغیر یہ ہوا کہ اس مرکز و قوت کو پارلیمنٹ کے کابینہ کی جانب منتقل کرنے اور آخر الذکر (کابینہ) کو انتخاب شدہ نمائندوں کی بجائے خود جماعتہائے انتخاب کنندگان کے زیر اقتدار کے زیر اثر لانے کا میلان بڑھتا گیا۔

کلام ثاقب

(جناب مرزا ثاقب صاحب قزلباش لکھنوی)

یہ دونوں متحد شکلیں ہیں حسن عشق کامل کی
پریشانی تری زلفوں کی حیرانی مرے دل کی

شہید ناز ہو کیا بات ایسے باوفا دل کی
خوشا وہ آنکھ جس میں کھنچ گئی تصویر قاتل کی

بے مطلب سننے والوں نے نہ پروا رنگ محفل کی
جہاں بیٹھے وہیں ہم نے کہانی چھیڑ دی دل کی

طریق عشق میں چلنے کو ہمت چاہیے دل کی
یہاں ناکامیاں ہوتی ہیں خضر راہ منزل کی

ازل سے دہر کا ہر خشک و تر رہن حوادث ہے
موافق ہیں نہ دریا کی ہوائیں اور نہ ساحل کی

خدا جانے اسیر غم کی حالت کیا ہے زنداں میں
بہت چپ چپ سی ہیں کل رات سے کڑیاں سلاسل کی

کھنچا جاتا ہوں از خود کوچۂ محبوب کی جانب
کہ جذب عشق کامل رہبری کرتا ہے منزل کی

مرادوں کی ہزاروں کھیتیاں جلتے ہوئے دیکھیں
کبھی کشت تمنا سے نہ رکھ امید حاصل کی

ازل کا سوختہ ساماں تھا میں جس کو محبت نے
بنا کر شمع غم رونق بڑھائی اپنی محفل کی

سماں مقتل کا بعد قتل بھی آنکھوں میں پھرتا ہے
صفائی دید کے قابل تھی دست ناز قاتل کی

عجب لذت ہے بحر غم کی موجوں کے تلاطم میں
رہین منت ساحل نہیں کشتی مرے دل کی

اب افسردہ دلی کا رنگ ہے بیٹھی نظر ثاقب
ان آنکھوں نے بہت سرگرمیاں دیکھی ہیں محفل کی

(جناب مولوی محمد جمیل الرحمٰن صاحب ایم اے معلم تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی)

(سلسلہ الناظر ماہ جون ۳۶ء)

باوجودیکہ عباسی خلفاء نے مطلق العنان بادشاہوں کی روش اختیار کر لی تھی، اور بجائے خود اُن کی ذات کو بہت مقدس سمجھا جاتا تھا، لیکن میل جول میں اب تک سادگی باقی تھی۔ دوسرے مشرقی بادشاہوں کے برعکس، جنھیں نہایت مبالغہ آمیز الفاظ میں خطاب کیا جاتا ہے، خلیفہ محض امیر المومنین کہلاتا تھا؛ اور بات کرتے ہوئے اُسے "تو" سے مخاطب کرتے تھے۔ خلیفہ کو سلام کرنے میں بھی معمولی مسلمانوں کی طرح السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کے عام الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ اگر اجازت مل جائے تو خلیفہ کے سامنے بیٹھ بھی سکتے تھے۔ زمانۂ مابعد میں جو رسوم اور آداب دربار کے لیے مخصوص تھے، اُن کا ابتدائی دور میں پتہ نہیں چلتا۔ عرب طبعاً خوددار اور آزاد واقع ہوا ہے۔ ناممکن تھا کہ ایسے رسوم و آداب وضع کیے جائیں جو عربوں کی خودداری کو نقصان پہونچائیں۔ لیکن جب دربار میں عربوں کا اثر کم ہوا، اور ایرانی اور ترک جیسی غیر اقوام نے اُن کی جگہ لی تو وہی پرانے عجمی اوضاع واطوار دربار کا ایک جزو بن گئے۔

ابتدائی عباسی خلفاء کے زمانے کے درباری انتظامات کے متعلق ہماری معلومات بہت سطحی ہیں۔ ہارون کے باپ خلیفہ مہدی نے امراء کی ایک محافظ فوج مرتب کی تھی، جس میں انصار کے شریف ترین خاندانوں کے لوگ بھرتی کیے گئے تھے۔ یہ دستہ فوج خلیفہ کی ذات سے وابستہ تھا، اور اُس کے ہر شخص کو جاگیریں دی گئی تھیں[1]۔ ولی عہد خلافت کی کوئی محافظ فوج نہ تھی، مگر اُسے یہ تفوق حاصل تھا کہ اُس کے سامنے نیزہ برداروں کی ایک جماعت چلا کرتی تھی[2]۔ خلیفہ معتصم کے عہد میں دربار کی ایک یہ رسم ہوگئی تھی کہ خلیفہ کے سامنے کوئی بات نہ کرے۔ لیکن متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ اس قاعدہ پر بالعموم عمل نہ ہوتا تھا۔

جوں جوں عیش وعشرت کی گرم بازاری ہوتی گئی، قدیم مشرقی تکلفات بڑھتے گئے، اور

---

[1] ابن اثیر ج ۶۔ ص ۳۳۔ [2] مصر میں خمارویہ بن احمد بن طولون کی محافظ فوج کے لیے دیکھو: ابن تغری بردی ج ۲۔ ص ۶۵۔

شان و شوکت کے اظہار کے موقعوں کی تلاش ہونے لگی۔ ایسے موقعوں کی بھی کمی نہ تھی، اور ان سے پورا فائدہ اُٹھایا جاتا تھا۔ چنانچہ ایسے موقعوں پر انتہائی شان و شوکت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ خلیفہ کے محل میں دربارِ خاص و عام ہوتے تھے، جن میں بڑے بڑے جشن ترتیب دیے جاتے تھے۔ ان جشنوں میں راگ اور رنگ کو بے انتہا دخل تھا۔ لیکن صد درجے کی طمطراق کا اظہار اُس وقت ہوتا تھا جب کسی بیرونی بادشاہ کا ایلچی بارگاہ خلافت میں باریاب ہو۔ ایران کے دو قدیم قومی تیوہاروں یعنی نوروز اور مہرگان کے موقع پر بھی اسی قسم کی شان و شوکت کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ ان تیوہاروں کو خلفا نے بدستور سابق باقی رکھا تھا۔ نوروز یکم فروردین ماہ کو ہوتا تھا، جو ایرانی تقویم کے مطابق سال کا پہلا مہینہ تھا، اور اسی سے موسم بہار کا آغاز ہوتا تھا۔ یہ تیوہار چھ دن تک منایا جاتا تھا۔ لیکن اصلی جشن چھٹے دن ہوتا تھا۔ اس روز خلیفہ اپنے محل میں ایک دربار عام منعقد کرتا تھا۔ اس کے گرد سپہ سالار اور محل کے دوسرے ملازم کھڑے ہوتے۔ سب سے آگے وزیر، پھر خلافت کے افسرانِ اعلیٰ ہوتے۔ ان کے بعد ان عمائد کی باری تھی جو اُس وقت دارالخلافہ میں موجود ہوں۔ حاضرین میں سے ہر شخص خلیفہ کی خدمت میں کوئی نہ کوئی تحفہ بطور نذر پیش کرتا، اور خلیفہ اپنی طرف سے انھیں خلعت اور انعامات تقسیم کرتا تھا۔ جس طرح بغداد میں خلیفہ کا دربار ہوتا تھا اُسی طرح صوبوں کے والی اپنے اپنے مستقر پر چھوٹے چھوٹے دربار کیا کرتے تھے؛ جن میں بلا امتیاز ہر شخص کو آنے کی اجازت تھی۔ خلیفہ کی طرح والی بھی نذریں لیتے تھے، اور خلعتیں اور انعامات تقسیم کرتے تھے۔ فرق غالباً اتنا تھا کہ یہ لوگ کوشش کرتے تھے کہ زیادہ وصول کریں اور اس کے بدلے میں جہاں تک ہو سکے کم دیں۔ خلیفہ ہارون کے عہد کے ایک شاعر نے اس تیوہار کے جو حالات لکھے ہیں، ان میں وہ بیان کرتا ہے کہ نوروز کے موقع پر وہ بصرہ پہونچا، اور اُس کی رسائی والیِ شہر کے دربار میں ہوئی۔ جب وہ والی کے حضور میں پہونچا تو دیکھا کہ وہ اپنے درباریوں اور دوستوں کے مجمع میں بیٹھا ہے اور نشہ میں ایسا چور ہے کہ شراب کا پیالہ بھی، جو اُس کے ہاتھ میں ہے، منھ تک نہیں لے جا سکتا۔ شاعر کو دیکھ کر اُس نے اپنے پاس بلایا اور کہا کہ اگر اس وقت ہمیں گانا سُنا کر خوش کر دو تو اس کے صلے میں تمام دولت جو میرے سامنے ہے تمھیں دے دوں گا۔ یہ کہہ کر اُس نے نہایت بیش بہا اشیا کے انبار کی طرف اشارہ کیا جو اُس کے سامنے رکھی تھیں۔ شاعر نے فوراً ایک طرب انگیز گیت گانا شروع کیا۔ والی اس سے اتنا مسرور ہوا کہ اُس نے وہ تمام تحائف، جن کی قیمت تیس ہزار درہم آنکی گئی تھی، شاعر کے حوالے کر دیے[۱۵]۔

اگر دولتمند اور با اثر طبقہ یہ چھ دن عیش و نشاط میں گذارتا تھا تو اس کے یہ معنی نہ تھے کہ عوام اس تیوہار سے حظ نہ اُٹھاتے ہوں۔ اپنی حیثیت کے مطابق وہ بھی یہ دن خوشی اور تفریح میں گذارتے تھے۔ صبح سویرے

---

[۱۵] اغانی ج ۱۶۔ ص ۱۵۱۔

سے ہی بغداد کے بازاروں میں چہل پہل شروع ہو جاتی تھی۔ ہر طرف لوگ چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ ان کی خوشی کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی تھی۔ سڑکوں پر بھیڑ کاؤ کی وجہ سے کیچڑ ہو جاتی تھی۔ ہر راہگذر کو اس کیچڑ میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ملتا تھا۔ خصوصاً اُن لوگوں کو جو قیمتی کپڑے پہنے ہوں۔ کیونکہ ان پر یا تو پانی ڈال دیا جاتا تھا، اور یا پھٹے پُرانے کپڑوں اور چٹائیوں میں انھیں لپیٹ دیا جاتا تھا۔ یہ بھی کافی نہ تھا۔ جب تک کہ ہر شخص کوئی چھوٹی بڑی چیز خرید نہ لے اُس وقت تک اُس کی رسائی ناممکن تھی۔ مصر میں ایسے موقعوں پر ایک جلوس ترتیب دیتے تھے، جو شہر کے گلی کوچوں میں گشت لگاتا تھا۔ ایک شخص عجیب و غریب سوانگ بھر کے تیوہار کے "بادشاہ" کی حیثیت سے جلوس کے آگے آگے چلتا تھا۔ تمام گشت کے دوران میں ہنسنے ہنسانے والے لوگوں کا ایک جم غفیر بطور محافظ فوج کے اُس کے ساتھ رہتا تھا۔ اُس جلوس کی وجہ سے طرح طرح کی بدنظمیاں اور بدعنوانیاں پیدا ہوتی تھیں، اور عوام کے شور و غل اور حرکات و سکنات سے نقض امن کا اندیشہ رہتا تھا[۱]۔ تیوہار سے قبل کی رات لوگ سڑکوں اور کھلی جگہوں میں بسر کرتے، اور مختلف قسم کی تفریحوں میں وقت گذارتے تھے۔

نوروز کا تیوہار ایران سے نکلکر ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف شمالی افریقہ تک پہونچا۔ مگر اس کے منانے میں عوام الناس سے بعض ایسی حرکتیں سرزد ہونے لگیں کہ چند بادشاہوں، مثلاً مصر کے فاطمی خلیفہ معز نے نوروز کی ممانعت کر دی[۲]۔ لیکن بغداد کے دربار میں مدتوں اس کا رواج رہا[۳]۔

خلیفہ راضی کے زمانے کے ایک شاہد عینی نے نوروز کے دوسرے دن کے جشن کا حال یوں لکھا ہے۔ خلیفہ شاذ قلعہ نام ایک قبّے میں، جس کا طول و عرض ۴۰ × ۴۰ ذرعہ تھا، بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے حکم سے بغداد اور نواح شہر کے تمام گلاب کے پھول خرید لیے گئے تھے۔ جب مغنی اور مہمان آنے شروع ہوئے تو ایک پردہ ڈال دیا گیا؛ جس کے پیچھے مغنی بٹھائے گئے۔ اب دسترخوان بچھا۔ مغنیوں نے گانا شروع کیا۔ دف اور طنبورے کی آواز سے قبہ گونج اُٹھا۔ اس اثنا میں ملازم گلاب کے پھولوں کی پنکھڑیاں قبے کی چھت پر لے گئے؛ اور سونے چاندی کے سکے ان میں ملا کر مہمانوں پر ان کی بارش شروع کی۔ یہ بارش عصر سے عشا کے وقت تک برابر جاری رہی، اور مہمان پھولوں میں دب گئے[۴]۔

نوروز کا تیوہار قدیم شان و شوکت کے ساتھ اب تک طہران میں منایا جاتا ہے۔ وہاں سے یہ افغانستان

---

[۱] دمشقی (Kosmographie) ص ۲۸۰۔ نشق الازہار مصنفہ ابن ایاس۔ [۲] تاریخ ابن زولاق۔

[۳] البیرونی نے اپنی کتاب الجماہر فی الجواہر میں بیان کیا ہے کہ متوکل نے نوروز کے موقع پر نذر دینے کیلیے دربار منعقد کیا تھا۔ البیرونی کی عبارت ابن ابی اصیبعہ نے نقل کی ہے۔ [۴] کتاب السرور۔ ج ۱۔ ورق ۲۲۹۔

اور ہندوستان پہونچا۔ ان ملکوں کے بادشاہ بھی اسے مناتے رہے۔ آج کل بھی ترکستان اور کردستان کے باشندے اسے خوشی خوشی مناتے ہیں۔ نوروز موسم بہار کی آمد کی خبر دیتا ہے۔

نوروز کی طرح ایران کا دوسرا قدیم تیوہار مہرگان بھی منایا جاتا تھا۔ یہ تیوہار ہمیشہ ۲۲ر اکتوبر، یعنے قدیم ایرانی تقویم کے مطابق، "۱۶۔ مہر ماہ" کو آتا تھا۔ اس تاریخ سے موسم خزاں کا آغاز ہوتا ہے۔ مہرگان بھی چھ دن منایا جاتا تھا۔ اصلی جشن چھٹے دن ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے اس دن کو جشن مہرگان کہتے تھے۔[۱] نوروز کی طرح اس موقع پر بھی خلعت اور انعامات تقسیم کیے جاتے تھے۔ خلفاء بڑے بڑے دربار اور جشن کرتے تھے۔ بعد کے زمانے میں یہ رسم ترک کردی گئی۔ لیکن جب بنی بویہ بغداد کے مالک ہوئے تو سلطان عضدالدولہ کے عہد میں اس تیوہار کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔ پرانے طریقے کے مطابق سلطان کی خدمت میں نذریں پیش کی جاتی تھیں، اور سلطان خلعتیں تقسیم کرتا تھا، اور خطابات اور اعزازات سے اپنے ملازموں کو سرفراز کرتا تھا۔ ایک مرتبہ عضدالدولہ ایک اصطرلاب کو، جس پر ستاروں کے نشانات بنے ہوئے تھے، بغور دیکھ رہا تھا۔ ایک شاعر اُس وقت دربار میں موجود تھا۔ اُس نے چند حسب حال اشعار فی البدیہہ کہے:۔

> "میں دیکھتا ہوں کہ لوگ تیرے پاس بہت سی امیدیں لے کر آتے ہیں، اور مہرگان کے موقع پر نذرانے پیش کرتے ہیں۔ لیکن تیرے غلام ابراہیم کو معلوم ہے کہ تجھے دنیا کی تمام نعمتیں حاصل ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ دنیا تیری شان و شوکت اور قوت کے لیے ناکافی ہے اس لیے تیرے سامنے آسمان پیش کیا گیا ہے"

ان اشعار کے صلے میں عضدالدولہ نے شاعر کو مالا مال کر دیا۔[۲]

یہاں اس کا بھی ذکر کر دینا ضروری ہے کہ اس شاہی جشن نے ایشیا کے مختلف ملکوں میں نئی نئی صورتیں اختیار کر لی تھیں، اور ہر ملک کے بادشاہ کسی نہ کسی طریقے سے یہ جشن منایا کرتے تھے۔ مثلاً دہلی کے شاہان مغلیہ میں بھی دیوان عام کا قاعدہ تھا۔ شاہی محل کے بڑے دروازے سے ایک عریض راستہ جاتا تھا، اور تین وسیع صحنوں میں سے گذر کر بادشاہ کے دیوان تک پہونچتے تھے۔ ہر ایک صحن کو دوسرے صحن سے جدا کرنے کے لیے محرابدار دالان تھے۔ آخری دالان کے اوپر نوبت خانہ تھا، کیونکہ نوبت بادشاہ کا خاص حق سمجھی جاتی تھی۔ شاہی محل کی دیوار کے قریب، قلعے سے اتنا ملا ہوا کہ باہر سے نظر آسکے، اور پھاٹک کے بالمقابل نصف دائرے کی شکل کا ایک چبوترہ تھا، جس پر سفید سنگ مرمر کی پچی کاری کا فرش تھا۔ دیوار میں ایک دروازہ تھا، جو شاہی محل میں کھلتا تھا۔ اسی دروازے سے نکل کر بادشاہ چبوترے پر آتا، اور تخت شاہی پر رونق افروز ہوتا۔ یہ وہی مشہور مرصع بجواہر تخت طاؤس تھا جسے نادرشاہ دہلی سے اپنے ساتھ ایران لے گیا۔

---

[۱] دمشقی ص ۲۷۹۔ [۲] مرگیلاس (Adam Mez (Renaissance [illegible] کی کتاب (Renaissance [illegible] (Gemalde [illegible]

بغداد، ص ۹۶۔

لیکن اس تمام انتظام میں ہندی رسوم کا پتہ نہیں چلتا۔ کیونکہ یہی انتظام بعینہٖ طیسفون میں پایا جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت ایرانی رسم تھی۔ بغداد سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر، مدائن کے کھنڈروں میں، ایک وسیع و عریض قبہ نما ایوان ہے، جسے "طاق کسرےٰ" کہتے ہیں۔ اسی ایوان میں کسرےٰ دربار عام منعقد کیا کرتا تھا، اور رعایا درشن کے لیے حاضر ہوتی تھی۔ ایوان میں تخت شاہی اب تک موجود ہے۔ گو دیواروں کے نقش و نگار بالکل مٹ چکے ہیں، لیکن وہ دروازہ اپنی اصلی صورت میں اب تک باقی ہے، جس سے شہنشاہ ایوان میں داخل ہوتا تھا۔ یہ دروازہ زمین سے کم از کم دس فٹ بلند ہے۔ اس ایوان کے کھنڈر اب تک دکھائی دیتے ہیں، اور وہ راستہ بھی باقی ہے جو شاہی محل کی طرف جاتا تھا۔ ایوان کا رخ ٹھیک مغرب سے مشرق کی طرف تھا۔ چنانچہ نوروز کے موقع پر جب شہنشاہ علی الصباح اس ایوان میں اپنی رعایا کے سامنے آتا تھا تو چڑھتے سورج کی کرنیں اسکے چہرہ پر پڑتی تھیں۔

ہم بیان کر آئے ہیں کہ سلاطین بنی بویہ قدیم ایرانی طمطراق کے دلدادہ تھے۔ اسی کی نقل میں وہ بھی دربار عام منعقد کیا کرتے تھے، جس میں رعایا کے ہر فرد و بشر کو شامل ہونے کی اجازت تھی۔ اس موقع پر شاہانہ رعب و دبدبہ میں اضافہ کرنے کی غرض سے دربار میں وحشی جانور لائے جاتے تھے۔ سلطان عضد الدولہ جب دربار میں آتا تھا تو تخت کے دونوں جانب جنگلے کے باہر زنجیروں سے بندھے ہوئے شیر اور شیر ببر ایستادہ کیے جاتے تھے، اور ہاتھیوں کی قطاریں دو رویہ کھڑی کی جاتی تھیں۔ اس رسم کی یہ وجہ بیان کی جاتی ہے کہ وحشی جانوروں کی موجودگی سے عوام کے دل میں بادشاہ کے رعب و داب کا سکہ بیٹھ جاتا تھا۔[۱] ہندوستان کے راجاؤں کے ہاں بھی جشن کے موقع پر اس رسم پر عمل کیا جاتا تھا۔ طہران میں شاہ ایران کے سامنے جشن نوروز میں ہاتھی لایا جاتا تھا، جو جھک کر بادشاہ کو سلام کرتا تھا۔

ایسے موقع پر بھی جب خلیفہ دربار منعقد کرتا تھا تو شیر دربار میں لائے جاتے تھے۔ ۳۰۵ھ (۹۱۷ء) میں بازنطینی ایلچی عارضی صلح کی درخواست کرنے کے لیے خلیفہ مقتدر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے ساتھ قیصر قسطنطنیہ کے بھیجے ہوئے بیش بہا تحفے تھے۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ ان ایلچیوں کا استقبال نہایت شان و شوکت سے کیا جائے۔ محل کے صحن اور محراب دار دالانوں میں باقاعدہ فوج کی قطاریں کھڑی کی گئیں، اور عمارتوں کی دیواروں پر قیمتی قالین لٹکائے گئے۔ جس وقت یہ ایلچی خلیفہ کے حضور میں باریاب ہوئے ہیں، خلیفہ تخت پر بیٹھا تھا۔ اس کے ایک طرف وزیر اور دوسری طرف مونس خادم کھڑے تھے۔ بغداد کے باب الشامیہ سے لے کر محل کے دروازے تک ایک لاکھ ساٹھ ہزار سپاہی دو رویہ

۱۔ الفخری، ... ماخوذ از کتاب تاریخ صقلیہ اسلامی ج ۲ ص ۲۶۳۔ افریقیہ کے بنو زیری کے سامنے زرافہ اور ہاتھی لائے جاتے تھے۔

ایستادہ تھے۔ ان کے بعد غلاموں اور سات سو حاجبوں کی صفیں تھیں۔ محل کے اندر سو شیر بھی زنجیروں میں جکڑے دکھائی دیتے تھے، اور دالانوں کی دیواروں پر طلائی جوشن، اور دوسری قیمتی چیزیں آویزاں تھیں۔ سب سے پہلے ایلچی اُس ایوان میں لائے گئے جہاں طلائی درخت تھا۔ ایوان کے بیچوں بیچ سنگ مرمر کا حوض تھا؛ اس حوض میں اٹھارہ شاخوں والا ایک طلائی درخت تھا، جس کی شاخوں پر سونے کے بنے ہوئے مرصع بجواہر پرندے بیٹھے تھے۔ اس ایوان سے گذر کر ایلچی اُس کمرے میں پہونچے جو "فردوس" کہلاتا تھا۔ اس میں زرق برق قالینوں کا فرش تھا۔[1]

ان سرکاری اور نیم سرکاری موقعوں کے علاوہ، مشرقی ممالک کے دستور کے مطابق، شادی اور ختنہ کی دعوتیں دی جاتی تھیں۔ ان دعوتوں میں شان و شوکت کا بے انتہا اظہار ہوتا تھا، اور بے حد اسراف سے کام لیا جاتا تھا۔ اس قسم کی دو دعوتوں کے حالات ہم تک پہونچے ہیں، جن میں غیر معمولی تزک و احتشام سے انتظام کیا گیا تھا، اور جو خطیر رقم ان میں خرچ ہوئی تھی اُس کا یقینی اندازہ مشکل ہے۔ پہلا موقع وہ تھا جب خلیفہ مامون نے اپنے وزیر حسن بن سہل کی بیٹی بوران سے شادی کی تھی۔ دوسرا موقع تاریخ میں "جشن برکوارا[2]" کہلاتا ہے، کیونکہ خلیفہ متوکل نے یہاں اپنے بیٹے کے ختنے کی دعوت دی تھی۔ بوران کی شادی کے وقت حسن بن سہل میزبان تھا۔ اُس نے مامون کے علاوہ شاہی محل کے تمام لوگوں کو اپنے محل میں جو فم الصلح کے قریب تھا، دعوت دی تھی۔ یہ دعوتیں [illegible] دن تک جاری رہیں۔ بغداد سے مہمانوں کو لانے کے لیے جو کشتیاں مقرر کی گئی تھیں صرف اُن ہی [illegible] کام کرنے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہونچتی تھی۔ رات کو جب دلہن رخصت ہوئی تو [illegible] زربفت کا فرش کیا گیا تھا، اور جو عورتیں اُس وقت موجود تھیں اُن پر بڑے بڑے موتی نچھاور کیے گئے تھے۔ کمرہ میں عنبر کی شمعیں اس کثرت سے روشن کی گئی تھیں کہ دن کا دھوکا ہوتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ عام دعوت کے موقع پر، جس میں تمام اراکین خلافت اور افسران فوج شامل تھے، مہمانوں میں مشک کی گولیاں تقسیم کی گئی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک گولی میں کاغذ کا ایک پرزہ تھا، جس پر کسی نہ کسی جاگیر کا نام درج تھا، جس شخص کو جو پرچہ مل گیا وہی اُس جاگیر کا مالک قرار پایا۔[3] اس کے علاوہ کاغذ والی گولیوں کے اوپر سے بھی بانٹے گئے تھے۔ ان پر کسی غلام یا گھوڑے وغیرہ کا نام تھا۔ تمام اخراجات حسن بن سہل نے برداشت کیے تھے، اور خلیفہ نے ان کی تلافی اس طرح کی تھی کہ فارس اور اہواز کے ایک سال کے محاصل اُسے عطا کر دیے تھے۔[4]

---

[1] ابن تغری بردی، ج ۲ ص ۲۰۲۔ طلائی درخت اور دوسرے عجائبات کے حالات یاقوت نے تفصیل سے لکھے ہیں۔ ج ۲ ص [illegible]۔ [2] برکوارا سامرا کے قریب ایک شہر تھا۔ یعقوبی (ص ۴۰) نے اس کا نام بلکوارا اور یاقوت نے برکوان لکھا ہے۔ [3] ثعالبی ص ۱۴۔ [4] مسعودی، ج ۷ ص ۶۶۔

خلیفہ متوکل نے اپنے بیٹے کے ختنے کے موقع پر بڑکوارا میں ایک جشن ترتیب دیا تھا۔ اس وقت دعوت کے بعد ایوان میں ایک طلائی اور جواہر سے مرصع قالین کا فرش کیا گیا، جس پر عنبر، الوے اور مشک سے مختلف تصویریں بنائی گئی تھیں۔ مہمان جب ایوان میں داخل ہوئے تو اُن کے سامنے مرصع طلائی رکابیاں رکھی گئیں۔ اب نوکر اندر آئے۔ انھوں نے بڑے بڑے ٹوکروں سے سونے اور چاندی کے سکے نکال نکال کر رکابیاں بھرنی شروع کیں۔ اس کے بعد شراب کا دور چلا، اور حکم دیا گیا کہ مہمان شراب کے ہر گھونٹ کے ساتھ سکوں کی تین مٹھیاں اُٹھاتے جائیں۔ جوں ہی کوئی رکابی خالی ہو جاتی تھی نوکر اُسے دوبارہ بھر دیتے تھے۔ آخر جب دعوت ختم ہوئی تو اعلان کیا گیا کہ امیرالمومنین کی خواہش ہے کہ ہر مہمان جتنا اُٹھا سکے اپنے ساتھ لے جائے۔ اکثر مہمانوں نے اپنی جیبیں بھر لیں، اور یہ دولت اپنے ملازموں کو حوالہ کرنے کے بعد پھر واپس آئے اور دوبارہ جیبیں پُر کر کے چلے گئے۔ سب سے آخر میں خلعتیں تقسیم ہوئیں۔ اس جشن میں خلیفہ نے ایک ہزار غلام بھی آزاد کیے[1]۔

دربار بغداد کے حالات مکمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان خاص مصروفیتوں کا بھی ذکر کیا جائے جو آئے دن وہاں پیش آتی رہتی تھیں۔ ہم خلیفہ امین کے زمانے سے یہ حالات شروع کریں گے، کیونکہ اس خلیفہ میں ابتدائی عباسیوں کے معائب، ومحاسن بدرجۂ اتم موجود تھے۔ امین زبیدہ کے بطن سے ہارون الرشید کا بیٹا تھا۔ زبیدہ، خلیفہ منصور کی پوتی تھی۔ اس طرح امین ماں اور باپ دونوں کی طرف سے منصور کی اولاد تھا۔ خاندان کے عیب اور اُس کی خوبیاں پورے طور پر اُس نے ورثہ میں پائی تھیں۔ اپنے باپ ہارون کی طرح وہ بھی حسن وعشق کا دلدادہ اور فضول خرچ واقع ہوا تھا؛ اور اُسی کی طرح امین کو حکومت کے کام سے نفرت تھی۔ ایک ہمعصر شاعر کا بیان ہے کہ اُس وقت جب دشمن کی فوجیں دارالخلافہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھیں، خلیفہ امین نے اُسے محل میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ جب وہ وہاں پہونچا تو خلیفہ صندل کے بنے ہوئے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا جو اُسے بہت پسند تھا، اور وہاں وہ اکثر وقت گذارا کرتا تھا۔ یہ صرف دس ذرعہ مربع تھا اور [illegible] سبز طلاکار قالین کا فرش تھا۔ امین شراب پینے میں مصروف تھا، اُس کے سامنے ایک قیمتی بلور کا جام رکھا تھا جس میں دس رطل شراب تھی۔ ایک دوسرے ندیم نے جو اسی محاصرہ کے دوران میں خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، بیان کیا ہے کہ جب وہ امین کے سامنے پہونچا ہے تو وہ ایک کھڑکی سے باہر [illegible] دجلہ کو جو محل کے نیچے ہی بہتا تھا، بغور دیکھ رہا تھا۔ انہماک کا یہ عالم تھا کہ اُسے ندیم کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی اور ندیم کو سلام کا جواب بھی نہ دیا۔ آخر خلیفہ نے آنکھ اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا اور کہا کہ "آگے

---

[1] ثعالبی، ص ۵۵۔ [2] ابو نواس نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ دیوان ابو نواس مطبوعہ قاہرہ۔ ص ۹ اور ۱۱۔

آ کر دیکھو۔ میری سنہری بالیوں والی مچھلی دجلہ میں چلی گئی ہے۔" اس کی تفصیل یہ ہے کہ شاہی محل میں ایک حوض تھا جسے دریا کی ایک نہر سے پُر کیا جاتا تھا۔ اس میں مچھلیاں پلی ہوئی تھیں۔ اس حوض کا دہانہ لوہے کی جالی سے بند ہوتا تھا۔ اسی جالی سے نکل کر خلیفہ کی پیاری مچھلی دریا میں چلی گئی تھی، جس کی وجہ سے خلیفہ اتنا آزردہ تھا۔

یہ نوعمر خلیفہ جس سے اس کی ماں کو صد درجہ محبت تھی، بے انتہا بگڑا ہوا، اور ہر قسم کی بداعتدالیوں کا شکار تھا۔ خصوصاً وہ نوخیز لڑکوں کی صحبت میں رہتا تھا، اور انھیں میں سے ایک غلام، جس کا نام کوثر تھا، خلیفہ کے دل و دماغ پر پورے طور سے حاوی تھا۔ زبیدہ چاہتی تھی کہ کسی طرح امین کو اس صحبت بد سے نجات دلائے۔ آخر اُس نے یہ ترکیب کی کہ اپنی خوبصورت کنیزوں کو لڑکوں کا لباس پہنا کر خلیفہ کے سامنے پیش کیا۔ زبیدہ سمجھتی تھی کہ وہ ان لڑکیوں کو اس ہیئت میں دیکھ کر اپنے ہم صحبتوں سے متنفر ہو جائے گا، اور یہ خیال درست نکلا۔ امین کو یہ ترکیب اتنی پسند آئی کہ دربار کا یہ معمول ہو گیا کہ کنیزیں لڑکوں کا لباس پہنیں۔ اس کے بعد دوسرے دولتمندوں نے اپنے گھروں میں یہی طریقہ اختیار کر لیا۔[1]

امین اور اس کے بھائی مامون میں جو خانہ جنگی ہوئی اس میں مامون کامیاب ہوا، اور امین قتل ہوا۔ مامون خصائص کے لحاظ سے اپنے بھائی جیسا نہ تھا۔ اُس کی ماں ایرانی لونڈی تھی، اور اسی کا اثر تھا کہ مامون دوسرے عباسی خلفاء سے بالکل الگ نظر آتا ہے۔ مامون کی ماں نے اُس کی تربیت پر خاص توجہ کی تھی، کہ کسی طرح اُس پر خاندانی روایات اور عادات کا اثر نہ پڑے۔ مامون صحیح معنوں میں ایک حکمراں کی طرح صاحب فکر و تدبر اور ساتھ ہی نرم مزاج واقع ہوا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ ملاطفت و مدارات سے اپنے ہمنشینوں کے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ ایک مورخ نے نہایت عجیب و غریب قصہ بیان کیا ہے۔ مامون کا معمول تھا کہ ہر منگل کو سارا دن فقیہوں اور عالموں کی صحبت میں گذارتا تھا، اور مختلف بحثوں میں حصہ لیتا تھا۔ دستور یہ تھا کہ علماء پہلے محل کے ایک ایوان میں جمع ہوتے تھے، جس میں قیمتی قالینوں کا فرش تھا۔ یہاں انھیں کھانا کھلایا جاتا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد ملازم مجمر لاتے، اور مختلف خوشبودار مسالوں سے علماء کو بخور دیا جاتا۔ اس تیاری کے بعد وہ خلیفہ کے حضور میں پیش ہوتے، اور مختلف مسائل پر بحث شروع ہوتی۔ علماء کو اجازت تھی کہ ہر مسئلے کے متعلق آزادانہ رائے دیں اور اُسے حل کرنے کی کوشش کریں۔ یہ مباحثے شام تک جاری رہتے۔ پھر علماء کو کھانا کھلا کر رخصت کر دیا جاتا۔ اس قسم کی ایک مجلس کے دوران میں ایک خادم ایوان میں داخل ہوا، اور اطلاع دی کہ ایک شخص سفید موٹا اونی لباس پہنے ہوئے حاضر ہے، اور اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے۔ مامون نے سمجھا کہ یہ اجنبی صوفیوں کے زمرے سے ہے جو اسی زمانے میں اپنا اثر پیدا کر رہے تھے، اور اسی قسم کا لباس استعمال کرتے تھے۔ خلیفہ نے اُسے اندر بلا لیا۔

---

[1] مسعودی ج ۶۔ ص ۴۲۷۔　　[2] مسعودی۔ ج ۸۔ ص ۲۹۹۔

ایک اجنبی، جس کے چہرے سے وقار ٹپکتا تھا، موٹے بے دُھلے اون کی ایک عبا پہنے ہوئے، داخل ہوا۔ جوتے اُس کے ہاتھ میں تھے؛ ننگے پیر کمرے میں آکر قالین کے سرے پر کھڑے ہو کر اُس نے بآواز بلند خلیفہ کو سلام کیا۔ خلیفہ نے سلام کا جواب دیا، اور اُس سے بیٹھنے کو کہا۔ اجنبی نے بات کرنے کی اجازت چاہی، اور اجازت ملنے پر کہا کہ:۔ میں تجھ سے ایک سوال کا جواب سننے آیا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ تو نے خلافت اجماع امت سے حاصل کی ہے یا بزور قوت و غلبہ؟ مامون نے جواب دیا کہ: مجھے خلافت نہ اجماع امت سے حاصل ہوئی اور نہ قوت و غلبہ سے۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھ سے قبل ایک شخص مسلمانوں کے امور کا متولی تھا، جسے مسلمانوں نے منتخب کیا تھا، اور مجھے علم نہیں کہ یہ انتخاب جبری تھا یا رضامندی سے۔ اُس نے مجھے اور میرے ساتھ ایک اور شخص کو مسلمانوں کی موجودگی میں اپنا ولی عہد بنایا، اور حج کے وقت خانہ کعبہ میں جو مسلمان موجود تھے اُن سے ہم دونوں کے لیے بیعت لی۔ معلوم نہیں یہ بیعت جبراً لی گئی تھی یا رضامندی سے۔ لیکن میرے علاوہ جس شخص کے ہاتھ پر بیعت کی گئی تھی وہ اب دنیا سے رخصت ہو چکا ہے، اور خلافت میرے ہاتھ میں منتقل ہوئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مجھے اجماع امت اور ان کی رضامندی حاصل نہیں۔ لیکن مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ اگر میں حکومت سے دست بردار ہو جاؤں تو مسلمانوں کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ ان کی بہبودی میں ہرج مرج واقع ہوگا۔ فتنہ و فساد اور خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ خدائے عز و جل کے احکام معطل ہو جائیں گے۔ نہ لوگ بیت اللہ کا حج کر سکیں گے، اور نہ جہاد و قتال کی طرف راغب ہوں گے۔ کوئی مرکز باقی نہ رہے گا۔ اور نہ کوئی مظلوموں کی فریاد سننے والا رہ جائے گا۔ یہی سب سوچ کر میں نے حکومت کا کام اپنے ہاتھ میں لیا؛ تاکہ مسلمانوں کی کما حقہ حفاظت کر سکوں، دشمنوں کے خلاف جہاد کروں، عامۃ المسلمین کی جان و مال۔۔۔۔ محفوظ رکھوں اور ان کی دست گیری کروں۔ میں اُس وقت تک یہ فرائض انجام دوں گا جب تک مسلمان کسی دوسرے شخص کو متفقہ طور پر منتخب نہ کر لیں۔ اس کے بعد میں حکومت اُس کے سپرد کر کے عام مسلمانوں میں شریک ہو جاؤں گا۔ اے اجنبی! میرا یہ پیغام عوام تک پہونچا دے کہ جب کبھی وہ کسی دوسرے کو منتخب کر لیں گے، مجھے خلافت سے دست بردار ہونے میں تامل نہ ہوگا۔

اجنبی نے یہ گفتگو خاموشی سے سنی، اور جب خلیفہ تقریر ختم کر چکا تو حسب قاعدہ اُس نے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ"، کہا اور باہر چلا گیا۔ مامون نے علی بن صالح حاجب کو حکم دیا کہ کسی شخص کو بھیجو اور دیکھو کہ یہ اجنبی کہاں جاتا ہے۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد حاجب نے آکر اطلاع دی کہ جو خادم اس کے پیچھے بھیجا گیا تھا وہ بیان کرتا ہے کہ اجنبی محل سے نکل کر سیدھا دار الخلافے کے ایک دور افتادہ محلے کی مسجد میں گیا، جہاں اُسی ہیئت کے پندرہ آدمی اور موجود تھے۔ اُنھوں نے اُس سے سوال کیا کہ وہ کیا خبر لایا ہے

اجنبی نے جو کچھ گذر را تھا بیان کیا اور کہا کہ خلیفہ تک اس کی رسائی ہوئی۔ خلیفہ کا خیال ہے کہ اُس نے عنانِ حکومت محض مسلمانوں کی بہبودی کے لیے اپنے ہاتھ میں لی ہے، تاکہ عامۃ الناس کے جان و مال کی حفاظت ہو سکے اور جب مسلمان اُس کی جگہ کسی دوسرے کا انتخاب کر لیں گے تو خلافت سے دست بردار ہو جانے میں اُسے تامل نہ ہوگا۔ یہ سن کر اُن سب نے کہا کہ ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں۔ اسکے بعد سب نے اپنا اپنا راستہ لیا۔

مورخ لکھتا ہے کہ مامون کو یہ سن کر اس لیے خوشی ہوئی کہ اُس نے اتنے بڑے مخالف کو بلا دقت زیر کر لیا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ متذکرہ بالا حکایت کو کہاں تک تاریخی وقعت حاصل ہے؛ مگر جس مورخ نے اسے بیان کیا ہے اُسے مستند بھی مانا جاتا ہے اور یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ اُس نے اپنی تاریخ لکھنے میں بعض ایسے ماخذوں سے مدد لی ہے جو اب مفقود ہو چکے ہیں۔ اس لیے ہم بھی اس حکایت کو صحیح سمجھ لیتے ہیں، اور مامون کے متعلق جو کچھ اس میں بیان ہوا ہے اُس سے اس خلیفہ کے خصائل کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سیرت کے لحاظ سے اپنے پیشرو خلفا سے بالکل جدا تھا، اور عہد خلافت کے آغاز سے ہی اُس میں یہ تبدیلی پائی جاتی ہے۔

مامون کے بعد اُس کے بھائی معتصم نے دار الخلافہ بغداد سے سامرا کو منتقل کیا، جہاں اُس کے آٹھ جانشینوں نے اپنی زندگی گذاری۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ دار الخلافہ بدلنے سے بغداد کی رونق یا اہمیت کم ہو گئی تھی؛ گو یہ ضرور ہے کہ سامرا شان و شوکت کے لحاظ سے پرانے دار الخلافہ پر سبقت لے گیا تھا[1]۔ ایک پرانا مصنف جس نے سامرا کو انتہائی رونق کے زمانے میں دیکھا تھا، بیان کرتا ہے کہ حکومت کو اس شہر کی عمارات عامہ، مثلاً دکانوں وغیرہ سے ایک کروڑ دینار سالانہ وصول ہوتے تھے[2]۔ خلیفہ معتمد اپنی خلافت کے آخری زمانے میں دوبارہ بغداد کو منتقل ہوا۔ اس کے بعد خلافت عباسیہ کے خاتمے تک یہی شہر برابر دار الخلافہ رہا۔ مگر اب بغداد کے رونق کے دن ختم ہو چکے تھے۔ خلفاء کے سیاسی انحطاط کے ساتھ ساتھ ان کا دار الخلافہ بھی رفتہ رفتہ اپنی شان و شوکت کھو کر برباد ہوتا چلا گیا۔ امین اور مامون کی خانہ جنگی میں تقریباً ایک سال تک طاہر بن حسین نے شہر کا محاصرہ کیا تھا۔ اس محاصرے کے دوران میں ایرانی فوج نے شہر کے ایک حصہ کو آگ کی نذر کر دیا۔ اسی آگ سے سرکاری دفاتر بھی تلف ہوئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آگ دار الخلافہ کے مرکز تک پہونچی تھی۔ بغداد کی یہ پہلی بربادی تھی۔

---

[1] ایک ہم عصر شاعر نے بغداد اور سامرا کا مقابلہ یوں کیا ہے کہ بغداد کی حالت ایک بوڑھی عورت کی سی تھی جس کے شباب کا زمانہ گذر گیا ہے، لیکن اُس کے خد و خال اب تک خوبصورتی کا پتہ دے رہے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے اس کی عزت و توقیر میں کمی نہیں آئی، مگر اب ایک نوجوان اور خوبصورت سوکن نے اُس کی جگہ لے لی ہے۔ ابو تمام۔ ص ۲۰۲۔ [2] یعقوبی۔ ص ۳۸۔

اس کے بعد متعدد مرتبہ شہر برباد ہوا، اور ہر دفعہ تباہی میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ اس سے پنپ نہ سکا۔
بہر کیف وہاں کے رہنے والے یہ کبھی نہ بھولے کہ بغداد کسی زمانے میں پرشکوہ شہر اور دنیا کا مرکز تھا۔
کبھی کبھی معلوم ہوتا تھا کہ پرانی چہل پہل پھر عود کر آئی ہے۔ خصوصاً کسی فاتح سپہ سالار کی واپسی کے موقع پر کافی شان و شوکت کا اظہار ہوتا تھا۔ اور عوام الناس کو تفریح کا سامان مل جاتا تھا۔ اسی قسم کے واقعات تھے جو باشندگانِ شہر کے دلوں سے بغداد کی تباہ حالی کا خیال تھوڑی دیر کے لیے محو کر دیتے تھے۔ ان موقعوں پر قبے کھڑے کیے جاتے تھے۔ بازاروں کی دیواروں پر قالین لٹکائے جاتے تھے[1]۔ فاتح فوج کے سامنے مال غنیمت جلوس کی صورت میں آگے آگے چلتا تھا، اور مقید بادشاہ یا باغی اونٹوں یا ہاتھیوں یا گدھوں پر سوار شہر میں سے گذرتے تھے[2]۔ جلوس کے بعد غالیوں کو پھانسی دی جاتی تھی، اور ان کی لاشیں وہیں دریائے دجلہ کے کنارے ایک سال تک لٹکی رہتی تھیں۔
لیکن دبدبے اور صولت کے یہ مظاہرے ایسے نہ تھے جن سے خاندان خلافت کے زوال و انحطاط کی نشانیوں کو چھپایا جا سکے؛ کیونکہ انحطاط بین طور پر شروع ہو چکا تھا۔ خلفاء کے محل میں اب مختلف افکار و حوادث نے جشنوں اور دعوتوں کی جگہ لے لی تھی، اور خونریزی کے واقعات روزمرہ پیش آتے تھے۔ خلیفہ معتضد (۸۹۲-۹۰۲ء) کے پیشرو کی زندگی کا خاتمہ زہر سے کیا گیا اور معتضد خلیفہ ہوا۔ یہ خلیفہ اعصابی کمزوری میں مبتلا تھا، اور اکثر اوقات اُس پر سوداویت کا اثر ظاہر ہوتا تھا۔ ہر لحظہ اُسے بھوت پریت کا خیال لگا رہتا تھا۔ یہ بھوت کبھی سفید داڑھی والے راہب کی شکل میں ظاہر ہوتا، اور کبھی خوبصورت نوجوان تاجر کے بھیس میں۔ لیکن خلیفہ کو سب سے زیادہ پریشانی اُس وقت ہوتی جب بھوت ننگی تلوار ہاتھ میں لیے ہوئے سامنے آتا۔ چنانچہ مشہور تھا کہ اُس نے محل کے چند خادموں کو قتل بھی کیا تھا۔ اس کی خبر شہر میں بھی پہونچی، اور لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ بعض کا خیال تھا کہ یہ درحقیقت قہر خدا ہے، جو خلیفہ پر اُس کی سفاکی کے سبب نازل ہوا ہے؛ اور بعض لوگ سمجھتے تھے کہ یہ کچھ بھی نہیں۔ ایک خادم کسی کنیز پر عاشق ہے، اور اپنی معشوقہ سے ملنے کے لیے طرح طرح کے بھیس بدلتا رہتا ہے لیکن معتضد کو بذات خود ان تاویلوں سے تشفی نہیں ہوتی تھی۔ اسی سے اُس کی اصلی کیفیت کا پتہ چلتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا دماغ صحیح نہ تھا۔ اس واقعہ کی وجہ سے وہ دن بدن زیادہ بےچین اور غضبناک ہوتا گیا، اور اُس کے غیظ و غضب میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ محل کے بہت سے ملازم اور غلام اُس کے غصہ کے شکار ہوئے۔ ان میں سے چند کو قتل اور چند کو دریا میں غرق کر دیا گیا[3]۔
معتضد کی موت زہر سے واقع ہوئی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی موت کے حالات مختصراً بیان کر دیے جائیں۔ کیونکہ اس موقع پر بعض ایسی باتیں پیش آئیں جن سے خلافت کے آخری زمانے کے متعلق

---

[1] [illegible] ۱۹۳۔ [2] مسعودی، ج ۸، ص ۲۰۰، ۲۰۱۔ [3] مسعودی، ج ۸، ص ۱۸۱۔

کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

معتضد بستر مرگ پر پڑا تھا۔ نزع کی حالت شروع ہو چکی تھی، اور بظاہر اُس پر غشی طاری تھی۔ طبیب نے جھک کر نبض پر ہاتھ رکھا۔ مگر مریض نے، جس کی قوت گویائی جواب دے چکی تھی، اپنی تمام قوت مجتمع کر کے ایسے زور سے طبیب کے ایک لات رسید کی کہ وہ بیچارہ دور جا پڑا۔ زندگی کے آخری لمحوں میں خلیفہ نے شور و غل کی آواز سُنی۔ اُس نے آنکھیں کھولیں، اور اشارہ سے مونس خادم سے اس کا سبب دریافت کیا۔ مونس نے کہا: حضور۔ یہ محافظ فوج کے سپاہی ہیں، جنھوں نے وزیر کو گھیر رکھا ہے، اور ان کا غصّہ ٹھنڈا کرنے کے لیے انھیں انعامات تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ یہ سُن کر خلیفہ کو سخت غصہ آیا اور نزع کی تکلیف کے باوجود اُس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا ہے اس غیظ و غضب کے عالم سے لوگ اس قدر ڈرے کہ کمرے سے نکل بھاگے[1]۔

گو معتضد کے عہد میں خلیفہ کی سفاکی اور خونریزی کی وجہ سے عوام دہشت زدہ رہتے تھے، لیکن اُس کے تیسرے جانشین القاہر کے زمانے میں یہ حالت انتہا کو پہونچ گئی تھی۔ القاہر بے رحم اور مغلوب الغضب آدمی تھا۔ اُس کے نیزے سے، جو وہ بحالت غضب موقع بے موقع استعمال کیا کرتا تھا، کوئی شخص محفوظ نہ تھا۔ شروع میں اُس نے لوگوں کے دلوں میں ایسی دہشت بٹھائی کہ کسی کو اُس کی مخالفت کی مجال نہ ہوئی لیکن آخر وہ محل کی ایک سازش کا شکار رہوا۔ گو اُس کی جان بچ گئی، لیکن اس خیال سے کہ وہ آئندہ فساد برپا نہ کر سکے اُسے اندھا کر دیا گیا۔ باوجود تمام بے رحمی کے اس سفاک شخص کے دل میں رقت کا جذبہ موجود تھا، جس کا اظہار عجیب و غریب طریقے سے ہوا۔ محل کے اندرونی صحن میں القاہر نے ایک چھوٹا سا تفریحی باغ تیار کرایا تھا۔ اس باغ میں بہت سے نادر درخت تھے، جنھیں بصرہ کے راستے ہندوستان سے لایا گیا تھا۔ مختلف قسم کے درختوں کے گھنے پتّوں میں سرخ اور زرد پھل نظر آتے تھے۔ اور ان کے قریب ہی خوبصورت خوشبودار پھولوں کی کیاریاں تھیں، جن کی خوشبو سے ہوا معطر رہتی تھی۔ انواع و اقسام کی چڑیوں اور طوطوں کے چہچہانے سے باغ میں عجیب سماں بندھ جاتا تھا۔ یہ مختصر سا باغ اُسے بہت پسند تھا، اور وہ اکثر اپنے ندیموں کے ساتھ یہیں اپنا وقت گذارا کرتا تھا۔ القاہر کے قتل کے بعد جب راضی خلیفہ ہوا تو اُسے بھی یہ باغ بہت پسند آیا، اور اب چونکہ نابینائی کے سبب القاہر بالکل بے ضرر ہو گیا تھا اس لیے راضی اُس سے بحسن سلوک پیش آتا، اور بعض مرتبہ مہمات سلطنت میں اُس سے مشورہ بھی کرتا۔ ایک مرتبہ اتفاقاً راضی کو کچھ رقم کی ضرورت پیش آئی۔ اُس نے قاہر سے مدد چاہی، کیونکہ مشہور تھا کہ قاہر کے پاس اب بھی کافی رقم

---

[1] مسعودی۔ ج ۸۔ ص ۲۱۲۔

موجود ہے۔ اس مدد کے بدلے میں راضی نے یہ امید دلائی کہ وہ حکومت کے کاموں کا کچھ حصہ اُس کے سپرد کر دے گا قاہر نے راضی کے وعدہ وعید کی مزید توثیق کے بغیر مدد دینے کا وعدہ کیا، اور کہا کہ میں نے اس باغ میں اپنی تمام دولت دفن کر دی تھی۔ مگر اندھا ہوں اس لیے صحیح جگہ نہیں بتا سکتا۔ بہتر ہے کہ تمام باغ کھدوا کر یہ دولت جہاں کہیں ملے نکلوالی جائے"۔ راضی نے اسے منظور کر لیا۔ چنانچہ درخت جڑ سے کھود ڈالے گئے، اور چھوٹے چھوٹے پودے اُکھاڑ پھینکے گئے۔ چند ہی روز میں یہ ہرا بھرا باغ تباہ ہو گیا، لیکن کوئی دولت ہاتھ نہ آئی۔ راضی نے قاہر سے اس تمام کارروائی کا مطلب دریافت کیا، تو اُس نے کہا کہ "مجھے یہ دیکھ کر روحانی تکلیف ہوتی تھی کہ وہ شخص جو میری تمام تکلیفوں کا باعث ہے اُس باغ کا لطف اُٹھائے، جو مجھے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ عزیز تھا"[1]

خلافت عباسیہ کے آخری دور میں بدامنی کا ہر وقت کھٹکا لگا رہتا تھا، بار بار انقلابات بپا ہوتے تھے، اور حکومتیں جلد جلد تبدیل ہوتی رہتی تھیں۔ شاذ و نادر ہی کوئی چست و چالاک خلیفہ ایسا دکھائی دیتا ہے جو طویل زمانے تک امن و امان برقرار رکھ سکا ہو۔ دارالخلافے میں روزمرہ سپاہیوں کے غدر اور بغاوت کے واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ ان موقعوں پر سپاہی ہمیشہ شہر کے کسی نہ کسی حصہ کو آگ کی نذر کر دیتے تھے۔ مختلف محاصروں اور تباہ کن جنگوں کی وجہ سے مضافات شہر بالکل غیر آباد ہو گئے تھے۔ خوش حالی کا خاتمہ ہو چکا تھا، اور خاص شہر کی آبادی بھی کم ہو گئی تھی۔ ان بربادیوں کا خاتمہ اس وقت ہوا جب تاتاریوں نے بغداد کو فتح کر کے اُسے تہ و بالا کر ڈالا۔ اس وقت شہر کا بڑا حصہ غیر آباد ہو گیا، اور جو کچھ باقی بچا وہ بھی محض کھنڈر تھا۔ یہاں تک کہ خلیفہ کا محل بھی، جس کے وسیع و عریض ایوان اور عظیم الشان باغ جو کسی وقت نادرات زمانہ سمجھے جاتے تھے، اور جس کے میدانوں میں وحشی جانور پلے ہوئے تھے، بے نشان ہو گیا۔ اُس کی چار دیواری اور بُرج ایسے غائب ہوئے کہ ان کے کھنڈر بھی نہ رہے اور ایک مدرسہ اور زبیدہ کے مقبرے کے سوا اس زمانے کی کوئی قابل ذکر یادگار باقی نہ رہی۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بغداد کی تعمیر میں پتھر استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ مکانات زیادہ تر کچی اینٹوں اور لکڑی کے تھے۔ اسی وجہ سے شہر میں اکثر تباہی خیز آتش زدگی کے حادثات پیش آتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اسی طرح کی آتش زدگی سے بیس ہزار جانیں تلف ہوئی تھیں۔ عضدالدولہ بویہ جب بغداد کا مالک بنا تو اُس نے شہر کے بعض اُجڑے ہوئے حصوں کو دوبارہ تعمیر کرایا، جو نہریں بند ہو گئی تھیں، انھیں دوبارہ جاری کرایا؛ نئی نہریں کھدوائیں؛ اور مالکان مکان کو قرض دے کر نئے سرے سے تعمیر مکانات پر آمادہ کیا۔ غرض یہ ہے کہ اس نے ہر طرح شہر کی خوشحالی میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ بنی بویہ اور ان کے بعد سلاجقہ کے سلاطین کے محلات شہر کے اُس حصے میں تھے جسے محرم کہتے تھے۔

---

[1] مسعودی۔ ج ۸۔ ص ۳۲۶۔

لکھنوی اور دہلوی شاعری ایک تحقیقی و تنقیدی نظر

(جناب مولوی اسمٰعیل احمد مینائی صاحب تسنیم بی۔اے، ایل۔ایل۔بی، وکیل)

(بسلسلۂ ماہ مارچ و اپریل ۱۹۳۶ء)

(۳)

اب تک میں نے شاعری کی تعریفات و توضیحات کی قطع و برید، اور شرح و بسط میں وقت صرف کیا، بہ ظاہر یہ کوشش موضوع مضمون سے ہٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ "سعی انقطاع و تشریح" بھی نفس مضمون اور مقصد اصلی کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے یعنی اس بنیادی سوال کے قابل قبول اور سادہ ترین جواب تک پہونچنے کی خاطر کہ شاعری کیا ہے اور کس صنف ادب کا نام ہے؟ دراصل موجودہ تحقیق کے سلسلے میں میری حیثیت ایسے متلاشئ علم کی ہے جو اپنی خوش بختی یا بدبختی سے اس قسم کے ایک جامعہ میں پہونچ گیا ہے جہاں کا ہر ہر استاد اور معلم باوجود انفرادی استعداد، قابلیت، اور علم کے نفس شاعری کے مسئلے پر کسی دوسرے کا ہم خیال نہیں، بہ الفاظ دیگر جتنے اساتذہ ہیں اتنی ہی آرا ہیں اور چونکہ اپنی اپنی جگہ ہر ایک کی رائے مساوی وقعت اور اہمیت رکھتی ہے اس لیے ایسا ممکن نہیں کہ باقی ماندہ کو نظر انداز کر کے کسی ایک کی رائے کو "کنعان شاعری" کے واسطے "یوسف گم گشتہ" تصور کیا جا سکے، بنا بر آں منزل مقصود تک پہونچنے کے لیے ان جملہ استادوں کے ملفوظات سے بہرہ اندوز ہونا ضروری ہے۔ میں یہ دعوے تو نہیں کر سکتا کہ اس "کوشش انفصال" میں میں نے دنیا بھر کے تمام صائب الرائے محققین کی آرا کو یکجا کر لیا ہے کیونکہ یہ کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں، تاہم میں نے حتے الوسع ایسے بیشتر نظریوں کو جمع کرنے کی سعی کی ہے جو "نمائندگانہ خصوصیات" کے حامل ہونے کے علاوہ انھیں لوگوں سے منسوب بھی کیے جاتے ہیں جن کا "تحقیق شاعری" کی دنیا میں ڈنکا بجا ہوا ہے۔

شاعری کو عموماً حیات انسانی کا ایک نمایاں واقعہ تصور کیا جاتا ہے بنا بر آں اُس کی نوعیت اور اُس کے فلسفے کے مجمل تجزیہ سے ہمارا نقصان نہیں صریح فائدہ ہی ہے کہ کچھ نہ سہی تو خود اپنے متعلق ہی وقوف کچھ زیادہ ہو جائے گا۔ ممکن ہے اس مقام پر یہ اعتراض کیا جائے کہ تجزیہ سے تو علم اور واقفیت میں کچھ بیشی ہوتی نہیں پھر نوعیت و فلسفۂ شاعری کے تجزیہ کی کیا ضرورت ہے۔ تجزیے سے وقوف میں ازدیاد نہ ہو سکنا مجھے تسلیم ہے لیکن کیا اُس سے غلط فہمیاں بھی رفع نہیں ہوتیں اور یہی میرا مقصد ہے کیونکہ غلط فہمیاں دور ہونے کے بعد ہی "حظ شعر" حاصل ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ میں شاعری کی بابت پھیلی ہوئی اُن عام خام خیالیوں کو

دور کرنا چاہتا ہوں جن کی بنا پر ایک ہٹ دھرم اور ضدی نام نہاد نقاد لکھنؤ پر دہلی یا دہلی پر لکھنؤ کے سرمایۂ شاعری کو مرجح سمجھتا اور اپنی اس ترجیح کی ترویج کرتا ہے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ شاعری کے رموز اور اس کی باریکیوں کو زیادہ دیدہ ریزی سے ٹٹولنے میں زیانِ کار کا اندیشہ ہے گویا شاعری ایک گھڑی کے مانند ہوگئی جس کی مشین اور کل پرزوں کو ایک بار کھول دینے کے بعد ہر کس و ناکس اُن کو دوبارہ اصلی حالت پر نہیں لا سکتا یا اگر کسی نہ کسی طرح لے بھی آئے تو اس میں پہلی سی کیفیت صحیح وقت بتلانے کی نہیں رہے گی۔ یہ نظریہ سراسر بے بنیاد اور قطعاً بے سروپا ہے کیونکہ عموماً اشیا کے متعلق جس قدر ہمارا علم بڑھتا ہے اُسی قدر ہم اُن سے زیادہ لطف اندوز ہوتے ہیں۔ دقتِ نظر سے اس مسئلے پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ازل سے انسان کا مطمحِ نظر یہی رہا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو جتنی ترقیاں تہذیب و تمدن، علم و معاشرت، وغیرہ میں ہوئیں وہ نہ ہوتیں، یہی حال شاعری کا ہے کہ ارسطو اور افلاطون کے وقت سے لے کر آج تک نفسِ شاعری کی باریکیوں کے متعلق تدقیق جاری ہے۔ بایں ہمہ میدان کی وسعت اور دماغِ انسانی کی انفرادیت کے سبب اب تک نقشے کی تکمیل نہیں ہو سکی ہے میں اس کا مدعی نہیں کہ تمام خالی جگہوں میں رنگ بھر دوں گا تاہم جب تک رنگ آمیزی کے لیے خلائیں باقی ہیں کوشش کرنے والوں کے لیے بھی "سعی عمل" کا دروازہ باز ہے۔

ایک مغربی عالم کا قول ہے کہ "نفسِ شاعری کی بھول بھلیوں کی اگر پوری طرح چھان بین مقصود ہو تو علمِ انسانی اور حیاتِ بشری کے جملہ شعبوں کی تحقیق اور تشریح کرنا پڑے گی، بالفاظِ دیگر اس قسم کی کوئی کوشش اُس بلند تر از جنت، اور عمیق تر از جہنم، بادیہ پیمائی کے مماثل ہوگی جس کا ذکر مشہور سخن گو ورڈس ورتھ نے دماغِ انسانی کے رازوں کی معلومات کے سلسلے میں کیا ہے۔ بنابرآں اس موضوع پر ہاتھ ڈالنے سے قبل اس کی حد بندی کر دینا بہت ضروری ہے"۔ اس میں تو شبہ ہی نہیں کہ شاعری اپنی ماہیت کے لحاظ سے اتنی وسیع ہے کہ غیر ذمہ دارانہ طور سے اُس پر مفصل تبصرہ کرنے میں حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں کی جانچ پڑتال کرنا پڑ جائے گی، چنانچہ اس مغربی عالم کے نظریے کے مطابق اس جانب قدم اٹھانے سے پیشتر اس کی ضرورت لابدی ہے کہ اپنے دائرۂ تحقیق و تلاش کے حدود معین کر دیے جائیں۔ لیکن اس کے معانی یہ بھی نہیں کہ اُسے اسقدر محدود کر دیا جائے کہ اُس کے وجود ہی میں شک پڑ جائے یا اس کی ہیئت اس درجہ بدل جائے کہ اُس کو شاعری کے لفظ سے تعبیر کرنا بھی ظلم ہو۔

جس طرح بساطِ معاشرت میں مداخلت بے جا کے قانون کے کئی خانے ہیں اسی طرح حیاتِ انسانی کے دیگر شعبوں میں بھی اس قسم کے قیود کا وجود پایا جاتا ہے، بنابرآں اگر ہم اُن شعبوں میں سے کسی ایک کے متعلق بحث و تمحیص کرتے کرتے دیگر شعبوں کے مقبوضات میں دخل اندازی کے مرتکب ہوں تو اُسی طرح

قصوروار اور مجرم ہیں جس طرح غیر شخص کی زمین پر بلا اجازت کنواں کھودنے کی حالت میں ہوتے۔ شاعری ایک
خاص صنف ادب ہے، ادب کے اور بھی شعبے ہیں اس لیے سب سے پہلا خطرہ تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ اس صنف پر
بحث کرتے کرتے کہیں ہم دیگر اصناف کے رقبے میں نہ چلے جائیں مگر یہ اندیشہ کچھ ایسا خوفناک نہیں کیونکہ
شاعری کی صنف دیگر اصناف ادب سے کچھ اس طرح متعلق ہے کہ اس کے سلسلے میں دیگر شعبہ جات کا ذکر آجانا ناگزیر
ہے لیکن جس واقعہ کے خلاف ہم کو خاص طور پر حفاظتی تدابیر اختیار کرنا ہیں وہ ہے دیگر کلیۃً جدا علوم میں دست
اندازی۔ نفسیات کا علم ایک بڑے زمیندار کے مانند ہے اور ہم کو اس کا کوئی استحقاق نہیں کہ مزرعہ شاعری
کی سیر کرتے کرتے اس ہمسایہ زمیندار کی زمین پر چلے جائیں جہاں ممکن ہے کہ اس کے کاشتکار ہم سے باز پرس
کریں اور اپنی خفت اٹھانی پڑ جائے۔ یہی حال علم مابعد الطبیعیات کا ہے جس کی ریاست کی سرحد مزرعہ شاعری
کی مقابل کی حد سے متصل ہے بلکہ یہاں تو اور زیادہ احتیاط درکار ہے ورنہ کانٹوں سے پاؤں زخمی ہونے،
اور کاشتکاروں کی جانب سے باز پرس کیے جانے کے علاوہ نالش ٹھک جانے کا اندیشہ بھی ہے یعنی نقصان
مایہ بھی اور شماتت ہمسایہ بھی۔ ایک علم ایسا اور ہے جس کے حدود اربعہ میں مداخلت نہ کرنے کے متعلق ہم کو
خاص طور سے ملحوظ رکھنا چاہیے یہ علم ہے، علم فنون لطیفہ (Aesthetics) یہاں دوستی کے پردے میں
دشمنی کا احتمال زیادہ ہے۔ ان علوم کے سوا بھی چند ایسے علوم ہیں جن میں دخل اندازی کا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے
لیکن وہ اتنے اہم نہیں بنابر آں صرف انھیں تین کے متعلق احتیاط کرنا کافی ہوگا۔

اگر میں مناظر فطرت کا نظارہ کرکے انبساط اور مسرت کا احساس کروں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ میرا دماغ اس
وقت شاعرانہ کیفیت سے متاثر ہے یہاں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ بہجت اور مسرت جس کا بھی احساس مجھ کو ہے
صرف مجھی کو ہے یعنے ان کیفیات کا احساس کلیۃً میرا ہے۔ برخلاف اس کے اگر بجائے فنون لطیفہ میں کسی ایک کے
کسی نمونے کا نظارہ یا مطالعہ کروں مثلاً کسی سنگتراش کے بت کا یا کسی شاعر کی نظموں کا۔ اور اس صورت میں
بھی مجھے انبساط کا احساس ہو تو یہ احساس کلیۃً اور قطعاً صرف میرا ہی نہیں ہوگا۔ اس میں ایک دوسری ذات
ایک اور ہستی کا احساس اور ادراک بھی شامل ہے یعنی شاعر کا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ منظر فطرت کا نظارہ
کرنے کی صورت میں میرے اور میرے احساس انبساط و مسرت کے سرچشمہ کے مابین کوئی ذریعہ یا واسطہ نہیں،
میں جس چیز کو دیکھ رہا ہوں اس سے بلا استمداد غیر محظوظ ہو رہا ہوں اور اس لطف اور حظ کی نوعیت اور شدت
انحصار شروع سے لے کر آخر تک محض میرے اوپر ہے۔ برخلاف فنون لطیفہ کی کسی ایک کے نمونے کا مطالعہ
کرنے کی حالت میں میرے اور میرے ادراک بہجت کے درمیان ایک تیسری ہستی اس استاد فن کی بھی ہے
جس نے اپنے تخیلات و جذبات کو اس فن کی مدد سے میرے سامنے پیش کیا ہے۔ فرض کیجیے میں حافظ کی ایک

غزل پڑھ کر حد درجہ مسرور ہوتا ہوں تو کیا اس سرور کی کیفیت میں حافظ کا کوئی حصہ نہیں کیا اس کیفیت انبساط اور پہلی قسم کے احساس مسرت میں کسی طرح کا فرق نہیں، ان احساسات کی نوعیت ہی سے یہ ظاہر ہے کہ فرق بڑا عظیم ہے نیز اسی فرق پر شاعری کی امتیازی خصوصیات کا دارومدار ہے اور اسی بنا پر شاعری منجملہ فنون لطیفہ متصور ہوتی ہے لہذا شاعری کے تجزیہ کے موقع پر ہم کو نہ صرف خصوصیات جذبات اور صفات احساسات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے بلکہ اس کیساتھ خصوصیت داسے اور مساوی صفت فن کا بھی جس کی اعانت اور واسطے سے شاعر نے اُن جذبات اور تاثرات کو ہم تک اس طرح پہونچانے کی کوشش کی ہے گویا اُن کو ہمارا بنا دیا ہے۔ قسم اول کے احساسات انبساط و مسرت کا ہم عمیق سے عمیق مطالعہ ہی کیوں نہ کریں لیکن اس سے ہم کو کبھی احساسات کی قسم دوم کے متعلق کوئی وقوف نہیں ہو سکتا یعنی شاعری کی امتیازی خصوصیت — [الفاظ کے ایک خاص استعمال کے ذریعہ مختلف قسم کے تاثرات و حالات ذہنی کا منتقل اور محتمل کرنا] — پر کوئی روشنی کسی طرح نہیں پڑ سکتی۔ بہ الفاظ دگر ہم اس پر مجبور ہیں کہ "شاعری کا مطالعہ کریں تو بحیثیت ایک ارادی مترتبہ فعلیت کے جو ایک قیام یافتہ منزل مقصود کی جانب ہماری رہنمائی کر رہی ہے"

شاعری کی بابت ایک عام تخیل یہ ہے کہ وہ صرف ذریعہ انبساط خاطر ہے، میری رائے میں یہ صحیح نہیں جیسا کہ میں اس سے قبل لکھ چکا ہوں اگر شاعری کا مقصد صرف اتنا ہی ہوتا تو نہ اُس کو فنون لطیفہ کی صف میں وہ جگہ حاصل ہوتی جو آج اُسے حاصل ہے نہ حیات انسانی کے کاروبار میں اُس کو اتنی اہمیت کا درجہ عطا کیا جاتا جس کی وہ عام طور سے مستحق سمجھی جاتی ہے۔ شیلی نے اپنے نظریہ شاعری کے دوران میں اشارۃً یہ بھی لکھا ہے کہ "شاعری ہم کو اس مادی اور سفلی دنیا سے نکال کر ایک جدید دنیا میں پہونچا دیتی ہے جو زیادہ روحانی اور علوی ہوتی ہے" میرے خیال میں شیلی کا یہ تخیل بڑی حد تک درست ہے۔ شاعری کم و بیش ہماری آنکھوں کے سامنے ایک ایسے عالم کا منظر لاتی ہے جس میں دماغ کے ہمہ اقسام کی تشنگی بجھ سکتی ہے۔ یہ عالم گو نظری تخیلات اور خیالی تصورات کا ایک گہوارہ ہوتا ہے تاہم اُسکے اجزائے مکانی سے اصلیت ہمہ تن مفقود نہیں ہوتی بہ الفاظ دیگر شاعری اس وقت تک شاعری ہی نہیں جب تک اُس میں کسی احساس مکمل کے مجذب کر لینے اور اُسے محفوظ رکھنے کی استعداد کی صفت موجود نہ ہو۔

اقبال کی ایک مشہور عالم نظم ہے "پرندے کی فریاد" جس کے ابتدائی چند اشعار یہ ہیں:-

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ — وہ باغ کی بہاریں وہ سب کا چہچہانا
آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی — اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا
لگتی ہے چوٹ دل پر آتا ہے یاد جس دم — شبنم کے آنسوؤں پر کلیوں کا مسکرانا
وہ پیاری پیاری صورت، وہ کامنی سی مورت — آباد جس کے دم سے تھا میرا آشیانا

آتی نہیں صدائیں اُس کی مرے قفس میں
ہوتی مری رہائی اے کاش میرے بس میں

اس سے تو شاید کسی کو اختلاف نہ ہو کہ ایک اسیر پرندے کی فریاد کی حیثیت سے یہ سب اشعار حقیقت اور صداقت کا ایک بے بہا نمونہ ہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ ان خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر شاعر نے کیا کیا، اُس نے پرندوں کی اسیری کو اُس "تخئیلی دنیا" کے ایک اہم واقعہ کی حیثیت عطا کر دی جس کا ذکر سٹلی نے کیا ہے، کوئی شخص صرف ان اشعار کو دہرائے اور اُس کا دماغ فی الفور ایک ایسی دنیا میں جا پہونچے گا جہاں پرندوں کی اسیری ایک مجسّم حقیقت ہوتی ہے۔ ہم آپ، اس روزمرہ کی زندگی میں اس کا صحیح احساس نہیں کر سکتے، نہ ہم ہر وقت کسی پرند کو قید کر کے اُس کی آہ و زاری اور نالہ و فریاد سن سکتے ہیں لیکن تخئیل میں اُس کو اسیر کر کے دیکھیے اُس کی کیفیت کا اُس کی حالت کا اُس کے جذبات کا آپ کو اسی طرح ادراک ہوگا جس طرح اپنے سر کے درد کا یا آنکھ میں تنکا پڑ جانے کی تکلیف کا، مجھے تسلیم ہے کہ اس تخئیلی دنیا میں آپ یا میں پرندوں کو سچ مچ قیدی نہیں بنا سکتے، نہ آپ اُن کے دل کی چوٹ کو عملاً آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں نہ اُنکی مصیبت کا دکھڑا کانوں سے سُن سکتے ہیں، با ایں ہمہ شاعر نے جو نقشہ اُن کی اسیری کے مصائب کا کھینچا ہے وہ مصنوعی نہیں ہے کیونکہ اُس نے نہ اُن کی فطرت کو بدلا ہے نہ آپ کی فطرت کو بدلنے کی کوشش کی ہے، آپ اب بھی اُن کو قید کر سکتے ہیں، اب بھی اپنے تخئیل میں اُن کو مقفس کر سکتے ہیں اور گو اس عمل اسیری کو واقعیت نہیں حاصل ہوگی تاہم آپ اُن کی اسیری کے نوحے سے اسی طرح متاثر ہوں گے گویا آپ نے اُن کو واقعی قیدی بنایا ہے اور اُن کی فریاد سُن رہے ہیں، اور شاید یہی سبب ہے کہ شاعر کی یہ صادق مصوری آپ کی نگاہوں کے سامنے اصلیت سے بھی زیادہ اصل تصویر پیش کرنے میں کامیاب ہوتی ہے، شاعر نے پرندوں کو اس نظری دنیا کا جزو بنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ پرندوں کی فریاد اسیری کو، اور وہ محض اُن کے تصورات کے تخئیل کو کامیاب اور مستقل بنانے سے۔

بغور دیکھا جائے تو اس عمل سے شاعر نے ایک ایسے عالم کی آفرینش کی جو دستبرد اغیار سے محفوظ ہے جو کلیۃً اُس کا اور اُسی کا ہے، اُس نے اُسے اپنے لیے اور اپنے تاثرات اور خواہشات کے لیے تیار کیا ہے یعنی وہی خود اس کا مالک اور آقا ہے، اور اس عالم خود ساختہ کے ادراک کے واسطے اُسے صرف اپنے ان اشعار کے دہرانے کی دیر لگتی ہے اور وہ اُس میں پہونچ جاتا ہے۔ مگر ہماری ضرورت کے لحاظ سے یہاں یہ چیز اہم نہیں کہ اُس نے یہ دنیا کس طرح بنائی ہے اور کس کے لیے بنائی ہے بلکہ یہ امر کہ ہر کس و ناکس، زید، عمر، بکر، سب محض اس نظم کے مطالعے اور اس کے اشعار کی تکرار سے شاعر کی اس خیالی خود ساختہ دنیا میں

پہونچ سکتے ہیں۔ شاعری کو کسی رُخ سے دیکھئے کسی پہلو سے جانچئے، ہمیشہ یہی خصوصیت آپ کو اُس کی تہ میں ملے گی اور اسی چیز کو ایک مغربی محقق "احساس کی معراج" یا "ادراک کی تکمیل" سے موسوم کرتا ہے۔

انسان ازل سے دنیا پر قابض ہونے، اور اُس کے افعال اور اعمال کو اپنا تابع بنانے کی کوشش میں سرگرداں ہے لیکن دنیا اس امر پر راضی نہیں ہوتی وہ اپنی جگہ پر اس فکر میں ہے کہ خود انسان کو اپنا بندۂ بے درم بنائے وہ اپنی راہ چلی جاتی ہے اور انسان کی تکالیف و مصائب کا کوئی لحاظ نہیں کرتی، اول اول وہ انسان کو بہلا پھسلا کر اپنی مرضی پر چلانا چاہتی ہے مگر جب یوں کام نہیں نکلتا تو وہ اُس کو دق کرنا شروع کر دیتی ہے گویا اُس کو انسان کی محتاجی نہیں ہے کہ وہ اُس پر ظلم و ستم توڑتی ہے، مصائب و آلام کے پہاڑ ڈھاتی ہے، القصہ بالکل اس طرح عمل کرتی ہے گویا اُس کے نزدیک انسان کی کوئی ہستی ہی نہیں، ہم اُس کی دستبرد سے پناہ نہیں پا سکتے، ہم اُس کی روش اور اُس کے طرز عمل عملاً بدل نہیں سکتے مگر ہم یہ ضرور کر سکتے ہیں کہ شاعری کی اس تخئیلی دنیا میں ان سب نقائص کی ترمیم تصحیح کرلیں کیونکہ اُس دنیا پر ہمارا اقتدار بلا شرکت غیرے ہوتا ہے وہاں ہمیں ہم ہوتے ہیں۔ ہمیں راعی، ہمیں رعیت، ہمیں حاکم ہمیں محکوم، ہمیں قافلہ ہمیں منزل، ہمیں دریا ہمیں ساحل، غرض ع

ہمیں ہم ہیں تری محفل میں محفل دیکھنے والے

لیکن یہ ترمیم و تصحیح قبح کے کالعدم کرنے سے ممکن نہیں کیونکہ اُس صورت میں ہماری تخئیلی دنیا میں غیر واقعیت کا نقص پیدا ہو جائے گا۔ ہم کو اس تکلیف رساں دنیا کی نوعیت بدلنے کی ضرورت نہیں، اگر ہماری شاعری دنیا کے نیک و بد میں سے بد کو نظر انداز کر کے محض نیک کی بنیاد پر اپنی تخئیلی دنیا کی تعمیر کرے تو اُس تعمیر کردہ دنیا کا مرتبہ ایک دل خوش کن افسانے سے زیادہ نہ ہوگا جس کے لیے طلسم ہوشربا کے دفاتر فسانۂ آزاد کی جلدیں، اور [illegible] کے نظریہ حیات شاعری کو چھوڑ کر کہیں اور جانے کی ضرورت کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کسی پہلوئے حیات کو نظر انداز نہیں کرتی، نہ حسن کو نہ قبح کو نہ نیک کو نہ بد کو، وہ قبیح اشیا کو بھی اس طرح اپنا معمول بناتی ہے کہ اُس کی تیار کردہ دنیا میں اُس کے لئے بھی ایک معنی خیز جگہ نکل آئے کیونکہ بدی کو بھی بہرحال اپنے آقا — دانش یا تخئیل — کے احکام کی پابندی کرنا پڑتی ہے، نیز رباب عالم کے پردہ ہائے زشت کا ایک پردہ تکوین نغمات و تناسب موسیقی کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا پردۂ حسن، اور یہی چیز تفہیم شاعری کی معراج ہے کہ وہ ہماری چشم بینا کے لیے ایک عالم کا خاکہ مہیا کرے جہاں ہماری مملکت اسی طرح بلا شرکت غیرے ہو کہ اُس کے قبیح پہلو بھی ہمارے واسطے کسی اہمیت اور کسی معانی کے حامل ہوں یعنی ہمارا ہر احساس اور ہر ادراک ہمارے لیے بہر طور معنی خیز ہو

اور با مطلب تاکہ کوئی چیز ہم کو غیر واقعی اور مصنوعی نہ معلوم ہونے پائے۔

شاعری کے اس مطمح نظر تک پہونچنے کے واسطے شاعر کے لیے دو راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ یا تو وہ شاعری کی جملہ ظاہری علامتیں ۔ قافیہ، ردیف، بحر، صنائع و بدائع، تشبیہ و استعارات، خصوصیات و ترنم الفاظ اصطلاحات وغیرہ ۔ کو ایک جگہ جمع کرے اور پھر نتیجے پر غور کرے کہ آیا وہ اپنی منزل مقصود تک پہونچا یا نہیں، اس طریقہ کار پر سب سے پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ شاعر کبھی بھی اس امر کی ضمانت نہیں کر سکتا کہ اس نے جملہ علامات ظاہری کو یکجا کر لیا ہے، علاوہ بریں جب شاعر اپنی تمام تر توجہ ظاہری علامات کو یکجا کرنے کی جانب منعطف کر دے گا تو اس امر کا امکان زیادہ قوی ہے کہ وہ نفس شاعری کو یکسر نظر انداز کر دے، حقیقت یہ ہے کہ یہ ظاہری علامتیں صرف اُسی وقت شاعری کی خارجی نشانیاں تصور ہو سکتی ہیں جب اُن کے ذریعہ کسی خاص تخیلی مقصد کا اظہار ہوتا ہو یعنے جب نفس شعری موجود ہو، تاہم یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ ان خارجی نشانیوں کے جامے میں ملبوس ہوئے بغیر اس نفس شعری کو بھی کسی اور طرح شعر کی صورت نہیں عطا کیجا سکتی بنا بر آں شاعر کے لیے دوسرا طریقہ کار یہ ہوا کہ وہ کسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر اُسے شعر کی چند یا سب ظاہری علامتوں سے مزین کرنے کی کوشش کرے، بالفاظ دیگر نفس شاعری کی حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے ہم کو اپنی سعی تلاش کا آغاز قلب شعر سے کرنا چاہیے اور یہ قیاس چنداں بعید الفہم بھی نہیں کیونکہ میرا خیال ہے کہ اس موضوع کے جملہ مباحث میں، عوام کا پسندیدہ تر ین مفروضہ غالباً یہ ہوتا ہے کہ اعلےٰ ترین شاعری وہ ہے جو الہامی ہو، یعنے شاعری خواہ وہ غزل کی صورت میں ہو یا نظم کے پیرایے میں، بلینک ورس ہو یا قافیہ و ردیف کی پابند، اس کے حسن و قبیح، سود و زیاں کا انحصار اُس کے نفس مضمون کے الہامی ہونے پر ہے ۔ یہ وہی چیز ہے جس کو مشرق کے محققین اور شعرا مدتوں سے آمد اور آورد کے مسئلے سے تعبیر کرتے چلے آئے ہیں ۔ آمد کی حالت میں مضامین شاعر کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں، الفاظ و محاورات، کنایات و اشارات، غرض جملہ ضروریات شعری، اس کوشش میں ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں کہ اُس کے مضامین کی لباس آرائی کر سکیں، برخلاف اس کے آورد کی صورت میں شاعر مار مار کر مضامین کو دماغ سے باہر آنے پر مجبور کرتا ہے، ٹھونس ٹھونس کر مصرعوں میں الفاظ بٹھاتا ہے لیکن با ایں ہمہ شعر میں جان نہیں پیدا ہوتی، شعر کو اگر انسان سے تشبیہ دی جائے تو آمد کا شعر مثل زندہ انسان کے مانند ہوتا ہے، جسم بھی آراستہ و پیراستہ، خوبصورت و حسین، نرم و نازک، روح بھی بیدار و شاداں ۔ آورد کا شعر مثل مردے کے ہوتا ہے، روح مفقود، جسم سرد، سخت، کرخت، بھیانک، نہ خود اس میں حرکت کا وجود ہے نہ دوسروں میں تحرک پیدا کرنے کی قابلیت ۔ آورد اور آمد کا یہ جھگڑا ہمارے ذہن کو فی الفور تخئیل اور فن کے

مخصوص کی جانب متوجہ کر دیتا ہے۔ فن کے متعلق اصطلاحات، قافیہ ردیف، خصوصیات محاورات، ترنم الفاظ، غرض مختلف عنوانوں سے بحث کی جا سکتی ہے، لیکن اس کے متعلق اجمالی حیثیت سے جو کچھ ابتدائی دو ایک صفحات میں لکھا جا چکا وہ موضوع زیر بحث کی ضروریات کے لیے کافی ہے کیونکہ اس طویل تفحیص و مباحثہ سے گو میرا اصل مقصد شاعری کی صحیح تعریف اور واقعی تشریح کرنا ہے جس کے واسطے میرے نزدیک فن اور نفس شعر دونوں قریب قریب یکساں اہمیت رکھتے ہیں تاہم لکھنوی اور دہلوی مدارس کا امتیاز جس کے لیے یہ سب پاپڑ بیلے جا رہے ہیں بیشتر مغز شعر پر منحصر ہے، بنابرآں اب ہم کو الہام کی حقیقت سے بحث کرنا ہے۔

الہام ایک ذو تصوراتی لفظ ہے، مذہب کی اصطلاح میں اس سے وہ کیفیت مراد ہے جس سے محض انبیائے کرام، اولیائے عظام، اور اصحاب کشف مستفید ہو سکتے ہیں، لیکن اس فوق الفطری تصور زائی کے سوا اس کے متعلق ایک دوسرا تخیل بھی ہے۔ غیر معمولی قدرت یا طاقت کے حصول کا، جو انسان کے دل و دماغ کو نہ صرف دوسروں کے قلب و دماغ ہی سے قوی تر اور حساس تر بنا دیتی ہے بلکہ اس کو خود اسی شخص کی عام دماغی قوتوں سے بالاتر کر دیتی ہے یہ الہام جو عموماً ناقابل توجیہ، نامعلوم، غیر طلبیدہ، اور غیر اختیاری ہوتا ہے صرف شعرا یا ادبا ہی تک محدود نہیں، نہ ارباب فنون لطیفہ کی محدود میراث ہے، اہل سائنس و ریاضی، ماہرین جنگ و تجارت، غرض تمام وہ اشخاص جن کا تعلق تخئیلی شعبہ ہائے حیات سے ہے اس سے یکساں مفید ہو سکتے ہیں۔

اس قسم الہام کی بابت ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک نامعلوم کیفیت اضطراری ہوتی ہے جو صرف چند خوش قسمت اشخاص کے حصے میں آتی ہے اس میں ارادے اور قصد کو ذرا دخل نہیں ہوتا۔ لیکن یہ ہے بہت بجا درکیفیت، خصوصاً ان صورتوں میں جب حسب ضرورت حاصل ہو جایا کرتی ہو، اور اسی کو ہم ———— (genius) سے تعبیر کرتے ہیں، اس کے نمونے ہر شعبۂ علم و عمل میں مل سکتے ہیں علیٰ ہذا شاعری میں بھی ملتے ہیں مثلاً بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو غالب کے اس مطلع پر سر نہ دھننے لگیں ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

"فیند" "دماغ" "راتیں" اور دنیا و دگی زلفیں، جو بعد میں آتی ہیں ان کو ابھی رہنے دیجئے تعجب اس پر ہوتا ہے کہ تمام دنیا کے پھولوں میں سے غالب نے لالے ہی کو کس طرح اس جگہ تمثیل کے لیے منتخب کیا، لالہ جو صرف ایک ایسا پھول ہے جس کی داغ پوش حرماں نصیبی اس طرح اس شعر میں کھپ جاتی ہے گویا اسی کے واسطے بنی تھی، طرابلس کے شہیدان اسلام کی تعظیم و تکریم کے بارے میں اقبال کی ایک نظم ہے بعنوان "حضور رسالت مآب میں" اس کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ پوری نظم کا تخیل شاعر کے مبالغے پر مبنی ہے لیکن شاعر جس طرح اسے بیان کرتا ہے اس کے دیکھنے سے ایسا احساس ہوتا ہے گویا واقعی طرابلس کے شہیدوں کا

لہو حضور دو عالم کے واسطے جنت کی جملہ موجودات سے برتر و اعلیٰ ہے۔ ایسی صورت میں یہ انداز بیان الہام نہیں تو اور کیا ہوا۔ لیکن اس نوع کا الہام گو وہبی شعرا کے کلام میں اکثر نظر آتا ہے تاہم الہام کے اُن نمونوں کے مقابل بالکل ماند پڑ جاتا ہے جن میں اصلیت سے بھی زیادہ اصل تخیل پیش کیا گیا ہو جن میں ہمارے روزمرہ کے مشاہدات سے گریز کرنے کے باوجود ایک خاص واقعیت، قبولیت، اور ندرت پائی جاتی ہو۔ شیکسپیر کے ڈرامے دانتے کی نظم جنت، فردوسی کا شاہ نامہ، غالب اور اقبال کے افکار، اس قسم کے الہامات کا گنجینہ ہیں۔ ذرا فردوسی کی ایک بیت ؎

نسب نامۂ دولت کیقباد　　ورق بر ورق ہر سوے برد باد

پر غور کیجیے، یا اقبال کے ایک شعر ؎

کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی　　بربط قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

پر، سمجھ میں نہیں آتا ان شعرا کو یہ حسن بیان کہاں سے عطا ہوا۔ یا غالب کے ان دو اشعار کا تصور کیجیے۔

(۱) دریاے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک　　میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

(۲) قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم　　گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

قلب ان تخیلات کے سرچشمے کے تصور سے وجد میں آجاتا ہے۔

لیکن یہ الہام بھی شاعری سے متعلق نہیں، اگر کسی شاعر کے کسی مخصوص حصہ کلام میں اس کی جھلک کہیں کہیں دکھائی دے جائے تو اُس کو محض اُس کی خوش بختی کی دلیل سمجھنا چاہیے؛ ورنہ شاعری اس کی محتاج نہیں، کیونکہ الہامی شاعر خواہ وہ ہومر ہو یا دانتے، ورجل ہو یا گیٹے، شکسپیر ہو یا ملٹن، خیام ہو یا سعدی، غالب ہو یا اقبال، ہمیشہ اور حسب ضرورت اس قسم کے الہام پر قدرت نہیں رکھ سکتا نیز ہم اس کی ماہیت اور حقیقت سے آشنا نہیں۔ لفظ الہام کا ایک اور تصور ہے اور اسی تصور کی شکل میں وہ شعرا کا رہنما ہوا کرتا ہے۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں چیز نے یا فلاں واقعے نے یا فلاں شخص نے فلاں شاعر کے لیے فلاں شعر یا غزل یا نظم کی حد تک الہام کا کام کیا تو ہمارا مطلب کیا ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ زوال سلطنت عباسیہ سعدی کے مشہور مرثیے "آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں" کا ملہم ہوا یا عارف کی بے وقت جواں مرگی۔ غالب کی شہرۂ آفاق مرثیہ نما غزل "کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور" کی وجہ الہام بنی، یا یورپ سے واپسی کے وقت جزیرۂ سسلی کے بعید سواحل کا نظارہ اقبال کی پر درد نظم "صقلیہ" کا سبب الہام ہوا، ان بیانات سے ہمارا کیا مقصد ہے۔ یہاں ہم کسی تخیلی یا ما فوق حقیقت سے بحث نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک معین اور مستقل اصلیت سے، شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو یہ کہے کہ مثنوی مولانا روم الہام کے زیر اثر لکھی گئی لیکن شاید اس سے کسی کو بھی انکار

نہ ہو کہ حضرت شمس تبریزیؒ کی صحبت نے مولانا روم کے واسطے مثنوی کی حد تک الہام کا کام کیا۔ الہام کے اس تصور کی صورت میں ہم کو ہر نظم، غزل، اور شعر کے لیے اُسے فرض کر لینا لازمی ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ہر نمونہ شعری کا ایک اپنا علیحدہ سبب، تحریک یا داعیہ ہوتا ہے جو خود کو اس نمونہ شعری کی عام صورت، اسلوب، اور تفاصیل میں ظاہر کر دیتا ہے۔ الہام کی اس تشریح سے واضح ہے کہ وہ کسی طرح فن کے مغائر نہیں، بلکہ اس کا مصدر و معادن ہی ہے کیونکہ جتنا بڑھا ہوا شاعر کا الہام ہوگا اتنا ہی اُسے بڑھے ہوئے اظہار ذرائع کی حاجت ہوگی۔ اس موقع پر ایک چیز کا اور خیال رکھنا چاہیے کہ شاعر کا یہ الہام نہ تو اس کی شاعری کا صرف مادہ ہے نہ صرف ماہیت، بلکہ ہر دو متحد، اور اس طرح متحد کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر پھر ایک دفعہ اقبال کی نظم صقلیہ کا تصور کیجیے۔ میں اگر صرف یہ کہوں کہ سواحلِ سسلی کے نظارے نے شاعر کے واسطے الہام کا کام کیا تو یہ صحیح نہ ہوگا، صرف نظارہ سواحل سے کبھی بھی شاعر کے ذہن میں طوفانِ جذبات برپا نہیں ہو سکتا تھا اگر یہ نظارہ اُس کے قلب کے لیے کسی مخصوص پیغام کا حامل نہ ہوتا۔ وہ پیغام کیا تھا اس کا پتہ ہم کو نظم کی ماہیت سے چلتا ہے، یعنی مسلمانوں کے عروجِ گذشتہ کی یاد جس نے روح بنکر جسمِ نظم میں جان ڈال دی اور دونوں کے اتحاد سے شاعری کا یہ بے بہا نمونہ عالمِ وجود میں آیا۔ الہام کے یہ دو ناقابلِ تجزیہ اجزا اصل میں اُس کے دو رُخ ہوتے ہیں ایک واقعہ شاعر کے دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے، یہ فعلِ اثر اندازی الہام کا مادہ ہے، اس اثر اندازی سے وہ اُس کے دماغ میں ہیجان پیدا کر کے بعض خوابیدہ قوتوں کے بیدار کرنے اور چند غیر موجود کے وجود میں لانے میں کامیاب ہوتا ہے یعنی کیفیات، تعبیرات، تصورات، امتزاجات، وغیرہ۔ یہ الہام کی ماہیت ہیں، اور یہ دونوں مل کر جب الفاظ کا جامہ پہن لیتے ہیں تو نظم کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اسی لیے کوئی دو شاعر ایک ہی نظم نہیں لکھ سکتے کیونکہ گو مادہ الہام دونوں کے باب میں وہی ہو، تاہم ماہیت اس وجہ سے وہی نہیں ہو سکتی کہ کوئی دو دماغ کبھی یکساں نہیں ہوتے۔

الہام شاعرانہ کی اس توضیح سے ظاہر ہے کہ نفسِ شاعری کی بابت قطعیت سے کوئی عام ادعا نہیں کیا جا سکتا مثلاً بعض لوگ اس خام خیالی کی بنا پر کہ شعرا مناظرِ قدرت کے حسن سے بہت متاثر ہوتے ہیں یہ تصور دل میں رکھتے ہیں کہ شاعری نظارۂ حسن پر منحصر ہے، داغ اور جرأت کی شاعری کی حد تک تو ممکن ہے یہ نظریہ صحیح ہو لیکن شاعری کا عام تخیل اگر ذہن میں رکھا جائے تو اس نظریہ کا مغالطہ طشت از بام ہو جاتا ہے۔ کیا دارا اور سکندر کی جنگ کا حال نظامی نے یا سہراب اور رستم کی لڑائی کا واقعہ، یا رستم کی موت کا ذکر فردوسی نے نظارۂ حسن سے متاثر ہو کر لکھا تھا، شہر آشوب لکھنے کے لیے سودا کو اور مرثیہ دہلی لکھنے پر داغ کو، کیا مطالعۂ حسن نے رغبت دلائی تھی، یا فلسفۂ غم اور مرثیۂ غالب کی تدوین کا باعث اقبال اور حالی کے لیے نظارۂ حسن ہوا تھا۔

اسی طرح ایک عام غلط فہمی یہ بھی ہے کہ شاعری صرف انسان کے جذبات کا اظہار کر دیتی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ شاعری کو جذبات میں خصوصیت حاصل ہے لیکن وہ اور بہت سی چیزیں بھی منتقل کر سکتی ہے اور کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعری میں جذبات کا ہونا لازمی ہے کیونکہ جذبات خود زندگی ہی کا لازمہ ہیں، بنا برآں اگر شاعری میں ان کا وجود ملتا ہے تو محض اسی لیے کہ شاعری ایک بہت جامع طریقہ ہے نشر و نقل خیالات کا، ورنہ جذبہ تو رونے اور چلانے سے بھی ظاہر و منتقل ہوتا ہے، البتہ رونے سے جو اظہار جذبات ہوتا ہے وہ ہوتا ہے ناکمل اس لیے ہم فوراً رونے کی وجہ دریافت کرتے ہیں برخلاف اسکے شاعری ہم کو یوں تشنہ نہیں چھوڑتی، اسی طرح ایک مدرسہ تخیل کے پیروؤں کا اعتقاد یہ ہے کہ شاعری صرف نمونہ عبرت ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ جہاں ہزاروں اور کام شاعری کرتی ہے وہاں یہ کام بھی اُس سے عمل میں آتا ہو لیکن اس کو معیار شاعری بنانا ظلم ہے۔ میتھیو آرنلڈ کا قول تھا کہ شاعری تبصرۂ حیات ہوتی ہے۔ اقبال کی نظم ہے "ماہ نو" اُس کا پہلا بند ہے۔

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل
طشت گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خون ناب نشتر قدرت نے یا کھولی ہے فصد آفتاب

چرخ نے بالی چرا لی یا عروس شام کی
نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیم خام کی

اس کو شاعری کہنے میں تو کسی کو باک نہ ہوگا لیکن کیا یہ تبصرۂ حیات ہے۔ اس قسم کی شاعری تو محض تعمیر کرتی ہے تبصرہ نہیں، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ شاعری میں بڑی حد تک تبصرۂ حیات کا حسن موجود ہوتا ہے کیونکہ وہ کائنات کی بے ترتیب اور اُلٹ پُلٹ اشیا اور مشاہدات کی ترمیم کر کے اُن کو ایک مرتب اور معین شکل کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کرتی ہے، باوجود اس کے اگر ہم یہ کہیں کہ تبصرۂ حیات کی خواہش، شاعری کا ذریعہ الہام ہوتی ہے تو یہ قطعاً مہمل ہوگا، بجز اس کے کہ وہ شاعری محض اسی مخصوص غرض کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہو۔

ان سب تردیدات کے بعد اب یہ کہنے کی گنجائش تو نہیں رہتی کہ شاعر کی قوت ابداع کسی خاص قسم کے موضوعات تک محدود رہتی ہے کیونکہ "شاعرانہ موضوع" کی اصل میں کوئی حقیقت ہی نہیں ہے، ہر موضوع شاعرانہ ہو سکتا ہے لیکن اُس کی شعریت اس میں نہیں موجود ہوتی ہے بلکہ اُس طریقے میں جس سے شاعر اُسکی تزئین و آرائش کر کے اُس کو ہم آپ تک پہونچاتا ہے یہ ممکن ہے کہ شاعر کے موضوع شاعرانہ کو ہم آپ پسند نہ کریں لیکن اُس کی قابلیت شاعری کی قدر و وقعت پر تو ہم آپ دونوں مجبور ہیں، شاعرانہ موضوع کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا انحصار ذاتی رجحانات اور انفرادی افتاد طبیعت پر ہوتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ داغ کا کلام نفسانی خواہشات کو بھڑکانے کا ذریعہ ہے تو اس کی تردید کوئی بھی نہیں کر سکتا

لیکن اگر اس بنا پر کوئی یہ ادعا کرے کہ وہ داغ کے کلام کی خصوصیات، معاملہ بندی، روانی اور آتش بیانی کا بھی منکر ہے تو ہر شخص کا فریضہ ہوگا کہ اُس کے لاطائل دعوے کی تردید کرے۔ ایک مشہور مصنف نے اپنی ایک کتاب میں غالب کی شاعری کی جملہ خوبیوں سے انکار کیا ہے کیونکہ اُنھیں اُس کی شاعری کے موضوعات پسند نہیں، ظاہر ہے کہ اُن کو اپنی پسند و ناپسند کے اظہار کرنے کا ہر طرح حق حاصل ہے اور بات یہیں تک رہتی تو خیر تھی، لیکن جب وہ بڑھ کر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ غالب میں شاعرانہ کمالات کا بھی فقدان تھا تو اس سے اُن کی قابلیت اور دماغی توازن کا اندازہ ہو جاتا ہے، کیونکہ کسی نظم یا غزل یا شعر کا مضمون ایک چیز ہے اور اس مضمون کو شاعرانہ انداز میں فن کے ذریعہ ادا کرنے کی قابلیت رکھنا ایک بالکل جداگانہ چیز، ایک کو دوسرے سے ذرا سا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا کسی شاعر کی قابلیت اور وقعت کا اندازہ کرتے وقت دیکھنا یہ نہیں چاہیے کہ اُس کے شاعرانہ مضامین کی نوعیت کیا ہے بلکہ یہ کہ اُس کی شاعرانہ صلاحیت کس مرتبہ کی ہے۔ اور اس کی ایک آسان ترکیب یہ ہے کہ شاعر کے کسی ثمرۂ تخیل کے اصل بیان کو اپنے لفظوں میں لکھنے کی کوشش کر کے اس کا اندازہ کرنا چاہیے کہ شاعر کے شعر سے بہتر اس کو ادا کرنے کا اور کوئی طریقہ ہے یا نہیں۔

(۴)

میں نے اس سے قبل کہیں لکھا ہے کہ شاعری کی صحیح تعریف کرنے کے لیے ضرورت نہ صرف شاعری کے مختلف اجزا کا تجزیہ کرنے کی ہے بلکہ اس امر پر غور کرنے کی بھی کہ ابتدائے آفرینش سے شاعری کے متعلق دماغ انسانی میں کیا تخیل قائم ہوا؟ اُس تخیل نے رفتہ رفتہ کس طرح اور کیا ترقی کی اور اب اُس کی حقیقت کیا ہے؟ اسی سبب سے میں نے ابتدائیہ ادعا بھی کیا تھا کہ اب تک مشرقی محققین و اساتذہ نے جب کبھی بھی حقیقت و ماہیت شعر کی وضاحت کی کوشش کی ہے تو پیش نظر یہ رکھا ہے کہ شاعری کو کیا ہونا چاہیے درآنحالیکہ اصل میں سوال یہ ہونا تھا کہ شاعری کیا ہے؟ میں ہاکی کے کھیل کی نوعیت پر ایک مقالہ قلمبند کرتے کرتے کہنا یہ شروع کر دوں کہ ہاکی کے کھیل میں بجائے کارک کی سخت از سنگ گیند کے ربڑ یا کپڑے کی گیند استعمال کرنی چاہیے کیونکہ اول الذکر میں ضرب شدید پہونچنے کا احتمال ہی نہیں مشاہدہ بھی ہوا ہے یا گول کا محافظ بجائے ایک آدمی کے دو آدمی ہونا چاہیے یا گول کے بعد ہر ٹلی بجائے میدان کے وسط میں ہونے کے گیلری کے وسط میں ہوا کرے وغیرہ وغیرہ تو ظاہر ہے کہ میرا مقالہ بجائے اس کے کہ ہاکی کے کھیل کی حقیقت کو واضح کرے صرف ایک قیاسی اور نصب العینی کھیل کی ماہیت کے متعلق رہ جائے گا۔ ملک ہند کی بابت لکھ دیتے دیتے میں اگر یہ کہنے لگوں کہ ہندوستان کو گرین لینڈ کے بازو واقع ہونا چاہیے تھا

یا کوہ ہمالہ کو بمبئی کے محاذ ہونا چاہیے تھا تو میرا یہ اظہار خواہشات ملک ہندوستان کی تشریح کے تحت نہیں لایا جا سکے گا، علیٰ ہذا اگر میں افلاک کی حقیقت سے بحث کرتے کرتے یہ کہوں کہ آسمانوں کو کوہ دندصیا جل سے زیادہ اونچا نہ ہونا چاہیے تھا تاکہ ہم نہ صرف جملہ اجرام فلکی کی حقیقت سے بہرہ اندوز ہو لیتے بلکہ ہفت افلاک کے تمام رازوں سے بھی واقف ہو جاتے تو یہ افلاک کی حقیقت کی وضاحت نہیں ہوئی۔ بنا بر آں کسی مسئلے کی بابت بحث و تحیص کے دوران میں بحث و تحیص کرنے والے کا مقصد صرف یہ ہونا چاہیے کہ وہ مسئلہ اصل میں ہے کیا؛ یعنے اُس کے آغاز، اُس کے ارتقا، اور اُس کے انجام کی داستان کیا ہے۔ ممکن ہے میرے اس ادعا سے کسی شخص کے ذہن میں یہ غلط فہمی پیدا ہو کہ میں اس امر کی ترویج کرنا چاہتا ہوں کہ کسی مسئلے کے متعلق گفتگو کرتے وقت صرف مسئلے کی وقتی اور موجود صورت سے واسطہ رکھنا صحیح ہوتا ہے یعنی اگر مرور زمانہ سے کسی چیز میں کوئی خرابیاں یا کچھ عیوب پیدا ہو گئے ہوں تو ہم کو اسی مسخ شدہ، اور عیب زدہ صورت حال کو بے لوث اور خالص تصور کر کے اصل کے بجائے اس سے سروکار رکھنا چاہیے۔ اس اصول کی خامی خود اُس کی توضیح سے ظاہر ہے اور نہ در اصل میرا یہ مطلب ہے۔ آج جس دین پر دنیا کے بیشتر مسلمان عامل ہیں وہ اس مذہب سے کتنا جدا ہے جس کو خدا کے آخری نبی نے ہم کو دیا تھا، جس کی ابوبکرؓ عمرؓ عثمانؓ اور علیؓ نے پیروی کی تھی، جس کی اشاعت کے لیے مثنیٰ، ابو عبیدہ، عبدالرحمٰن، اور ـــ نے جانیں دیں، جس کی تلقین و تبلیغ کی خاطر، خواجۂ اجمیریؒ اور ـــ نے گھر بار، عزیز و اقارب، دوست احباب، ملک و مال کو خیرباد کہا، لیکن کیا اسلام کی ماہیت، اسلام کی صحیح حقیقت کی تشریح کرنے کے معنی یہ ہوں گے کہ اس موجودہ اسلام کی وضاحت کی جائے جس میں بہتر فرقے ہیں، خارجی اور شیعی ہیں، نام نہاد علما کی تاویلیں ہیں مغرب زدہ محققین کی تحقیقیں ہیں۔ میرے نظریے کی رو سے اسلام کی اصلیت سے بحث کرنے کے واسطے درست یہ ہوگا کہ بحث اس سوال سے رکھی جائے کہ اسلام کیا ہے؛ نہ یہ کہ اسلام کو کیا ہونا چاہیے! تو اسلام کیا ہے؟ سے کوئی اگر یہ سمجھے کہ میرا مقصد اسلام کی موجودہ صورت کی توضیح کرانا ہے تو وہ غلطی پر ہوگا میرا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلام کے آغاز، اُس کے ارتقا، اُس کے عروج اور اسی کے ساتھ ساتھ اُس کی موجودہ خامیوں سے بحث کی جائے، موخرالذکر سے اس لیے کہ اُن کی برائی کو طشت از بام کر کے لوگوں کو اُن کی صحت کی جانب مائل کیا جا سکے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس بحث کے دوران میں یہ کہے کہ اسلام میں مرد کو چار شادیوں کی اجازت نہ ہونی چاہیے تھی تو کیا یہ اسلام کی تعلیم کی وضاحت ہوئی؟ اگر وضاحت کنندہ اس خواہش کا اظہار کرے کہ کاش اسلام میں محجوب بالارث کا مسئلہ نہ ہوتا تو کیا یہ اسلامی اصولوں کی تشریح کرنا ہوا؟ اگر شارح اس امر پر زور دے کہ اسلامی کتب فقہ میں سزائیں اتنی سخت نہ ہوتیں تو کیا اس کو آپ اسلامی تعلیم کی تفسیر سمجھیں گے؟

اس نوع کے تمام اظہارات خواہش تو محض خود ساختہ آرا اور شخصی قیاسات پر مبنی ہوتے ہیں اُن سے اصل مسئلے پر کوئی روشنی نہیں پڑتی نہ اُن میں بحث کو واضح کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال ہمارے بیشتر محققین ادب کا ہے کہ بحث کرنے سے پہلے اس سے کہ شاعری کیا ہے اور کہا یہ کہ اُردو شاعری میں معشوق کا حلیہ بہت مضحکہ خیز ہوتا ہے، اور قصائد سے تملق اور خوشامد کی بو آتی ہے، اُردو غزل سے قوم و ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا، اردو شاعری کا انداز بیان امرد پرستانہ ہونے کی وجہ سے نوجوانانِ ملک کے اخلاق کی تخریب کرتا ہے، اردو اشعار کا مرکزی تخیل شعرا کی زندگی کا صادق آئینہ نہیں ہوتا، اردو شاعری کی تشبیہیں اور استعارے بعید از قیاس اور دور از عقل ہوتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے ان تمام اعتراضات کو شاعری کی نوعیت کی بحث سے کیا تعلق، یا ان آرزوؤں کے اعلان کو شاعری کی حقیقت کے مسئلے سے کیا نسبت کہ شعر میں قومی جذبات کی زیادتی ہونی چاہیے، شعر میں گل و بلبل کے مضامین سے احتراز کرنا چاہیے، شعر میں معشوق کا ذکر نہ آنا چاہیے، شعر میں قافیہ ردیف کی قید نہ رکھنا چاہیے، شاعری میں ایطا و شتر گربہ کے عیوب کو اہمیت نہ دینا چاہیے، شاعری میں تخیل کو پیچیدہ نہ ہونا چاہیے۔ انھیں فروگذاشتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر سطحوں پر اردو شاعری کے صحیح معیار کی تشریح آج تک نہ ہو سکی نہ اس کا منصفانہ فیصلہ ہوا کہ اُردو شاعری کا کتنا اور کون سا حصہ صحیح نفس شعری کا حامل ہے یا اردو شعرا میں سے کن کن کے افکار کو دوسروں کے افکار پر ترجیح ہونی چاہیے یا شاعری کے کون کون سے اصناف حقیقتاً قابل اعتراض ہیں اور کون کون سے محض شخصی تاثرات کے تحت مردود ٹھہرائے گئے ہیں۔

پس اس غلطی سے بچنے کے لیے ہمارا مطمح نظر یہ ہونا چاہیے کہ تمام نمائندگانہ زبانوں کے سرمایہ ادب کے حصہ نظم کا مجملاً مطالعہ کر کے یہ اندازہ کریں کہ انسان نے اول دن سے، اُس نظریے کو مختلف اور واضح الفاظ میں ظاہر کرنے کے جھمیلوں میں پڑے بغیر، خود اپنے ذہن میں شاعری کی نوعیت کے متعلق کون سا نظریہ قائم کیا جس کی تعیین صرف اُس کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے ہو سکتی ہے، اور پھر اس نظریے میں امتداد زمانہ کے ہمراہ کیا کیا تغیر و تبدل ہوتے آئے اور اب اس کی ارتقا یافتہ شکل کیا ہے؟ اس منزل تک پہونچنے کی اور بھی صورتیں ممکن ہیں اور ان میں سے ایک آدھ یقیناً اس شکل سے بہتر بھی ہے لیکن وہ سب کی سب اتنی طویل ہوں گی کہ نہ صرف موجودہ بحث میں اُن کے لیے گنجایش نکالنا ناممکن سا ہے بلکہ ان کو اطمینان بخش طور پر انجام دینا کسی ایک شخص کے بس کا بھی نہیں۔

یوں کہنے کو تو یہ بھی مشہور ہے کہ جس طرح دنیا کی ابتدا حضرت آدم سے ہوئی اُسی طرح شاعری کا آغاز بھی آپ ہی سے ہوا۔ چنانچہ فارسی کے دو تذکروں کے دو اشعار بھی اس امر کے ثبوت میں پیش کیے

جاتے ہیں ایک امیر خسرو دہلوی کا ؎

ما ہمہ در اصل شاعر زادہ ایم　　دل بہ ایں محنت نہ از خود دادہ ایم

دوسرا مرزا صائب کا ؎

آنکہ اول شعر گفت آدم صفی اللہ بود　　طبع موزوں حجت فرزندیٔ آدم بود

واقعہ یہ ہے کہ جب قابیل کے ہاتھ سے ہابیل مقتول ہوا تو حضرت آدم پر اس واقعے کا بہت اثر پڑا، بعض راویوں کا قول ہے کہ حضرت آدم نے اس پر ایک مرثیہ سُریانی نظم میں لکھا جس کے اشعار کا بعد میں عربی میں ترجمہ کر لیا گیا، لیکن میری رائے میں یہ قول صحیح نہیں سب سے پہلی چیز جو اس کی مخالفت پر ہم کو مجبور کرتی ہے وہ یہ مذہبی اعتقاد ہے کہ انبیا شعر گوئی سے پاک ہوتے ہیں، علاوہ بریں اکثر کتابوں مثلاً ابن عباس کی تفسیر معالم التنزیل میں یہ روایت یوں ہے کہ حضرت آدم نے مرثیہ تو ضرور لکھا لیکن نثر کی صورت میں اور صدیوں بعد یعرب بن قحطان نے اس کا عربی نظم میں ترجمہ کیا جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

تغیرت البلاد و من علیہا　　و وجہ الارض مغبر قبیح

تغیر کل ذی طعم و لون　　و قل بشاشۃ الوجہ الملیح

فوا اسفا علی ہابیل ابنی　　قتیلا قلہ تفضلۃ الضریح

یہی روایت زیادہ قرین قیاس بھی ہے اور قرین اعتقاد بھی۔ بنا برآں شاعری کے آغاز کو حضرت آدم کی جانب منسوب کرنا غلط ٹھہرتا ہے۔ علاوہ بریں اگر انفرادی حیثیت سے شعرا کے کلام سے بحث کرنے کو مطمح نظر بنایا گیا تو اُس بحث کا تمام ہونا معلوم، ہمارا مقصد تو مختلف زبانوں کے ادب کے حصۂ نظم کا اجمالی مطالعہ کر کے شاعری کی ماہیت کے متعلق ایک رائے قائم کرنا ہے اور یہ چیز شاعری کی ابتدا کے مسئلے کی دقتوں میں پڑنے سے نہیں حاصل ہو سکتی۔

متاعِ عزیز

(جناب میاں عبد العزیز صاحب فطرت راولپنڈی)

اب سینہ ہے چاک چاک میرا ساقی
ہر زخم ہے تابناک میرا ساقی
دے بادۂ غم رُبا کہ حاصل ہو سکوں
ہو قصۂ زیست پاک میرا ساقی

حضرت سفیر کاکوروی

(جناب مولوی تحسین الدین علوی صاحب بی۔اے)

بسا اوقات سعی اور جد و جہد کی رو میں بڑی بڑی قابل قدر ہستیاں خواب و خیال ہو جاتی ہیں انھیں بھولی ہوئی ہستیوں میں ایک ذات مولوی فخر الدین احمد علوی المتخلص بہ سفیر کاکوروی کی ہے، مرحوم درحقیقت محسنان ادب میں شمار کیے جا سکتے ہیں مگر افسوس ہے کہ ابھی تک کسی صاحب ذوق نے آپ کے کلام کی طرف توجہ نہ کی، آپ کے کلام پر قدرے روشنی ڈالنے سے میرا مقصد اول تو صاحبان نظر کی توجہ اس طرف منعطف کرانا ہے اور ساتھ ہی یہ خیال بھی دامنگیر ہے کہ اگر اس ترقی ادب و شاعری کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں ایسے ایسے چند نادر اور بیش قیمت جواہر پارے ایک جگہ محفوظ کر لیے جائیں تو ادب اُردو پر عین احسان ہوگا۔

مرحوم کا کلام یوں تو تقریباً ہندوستان کے ہر اعلیٰ رسالہ میں شائع ہو چکا ہے مگر اس ضمن میں 'زمانہ' اور 'الناظر' خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیونکہ اُنھوں نے بمصداق ع

جو حسین چمکا مری آنکھوں کا تارا ہو گیا

ہمیشہ اپنے ملک کے باکمال شاعر یا ادیب کا نہایت ہی پرخلوص خیر مقدم کیا ہے انھیں لطافت اور رنگینی کے مجموعوں میں ہمیں ایک پھول اور نظر آتا ہے جو ہر اہل نظر سے اک نگاہ کا آرزومند معلوم ہوتا ہے۔

حضرت سفیر قصبہ کاکوری کے ایک نہایت ہی نامور اور شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے آپ کے والد مولوی ذکی الدین علوی ایک عرصہ تک ریاست حیدرآباد میں بعہدۂ اول تعلقداری سرفراز رہے۔ حضرت سفیر کی ولادت سنہ ۱۲۷۳ھ میں ہوئی اور ایک عرصہ تک آپ اپنے والد بزرگوار کے ہمراہ حیدرآباد میں مقیم رہے۔

حضرت سفیر کو اول تو قدرت کی طرف سے ذہانت، طباعی اور جوہر قابل کا معتد بہ حصہ عطا ہوا تھا دوسرے یہ کہ آپ کی خوش قسمتی سے آپ کو اپنے والد و نیز دیگر افراد خاندانی کی صحبت میں رہنے کا کافی موقع ملا۔ یہ وہ ہستیاں تھیں جن پر تہذیب اور پرہیزگاری جس قدر ناز کرے کم ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرحوم اوائل عمر ہی سے اوصاف حمیدہ کے مالک نظر آتے

ہیں۔ آپ کی نگاہیں لطیف خیالات اور جذبات کی آئینہ داری کرتی ہیں اور آپ کے بشرے سے ذہانت وذکاوت مترشح معلوم ہوتی ہے۔

مرحوم کی تعلیم موجودہ زمانہ کے قواعد وضوابط کے موافق نہ ہوسکی۔ انگریزی میں فقط انٹرنس تک پڑھا البتہ فارسی اور عربی کی تعلیم اچھی خاصی تھی، آپ کو تاریخ وفلسفہ میں خاص شغف تھا اور آپ کے کلام سے یہ امر نمایاں ہوتا ہے کہ آپ کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ شاعری کا ذوق آپ میں بچپن ہی سے پیدا ہوگیا تھا اور غالبًا یہی مرحوم کا سب سے زیادہ مرغوب شغلہ تھا۔

مرحوم آخر میں زیادہ تر خاموش رہنے لگے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "وہ فنا فی الشعر" ہوچکے ہیں۔ آپ میں ایک قسم کی استغنا اور بے نیازی کی شان پیدا ہوگئی تھی اور اس طرح وہ "نغمات شعری" جو کبھی حروف اور الفاظ کی گرفت میں آکر صفحۂ قرطاس پر رونما ہوتے تھے صرف آپ کے دماغ کے پردوں میں گونجنے اور آپ کی روح کو بے چین کرنے کے لیے رہ گئے تھے، بالآخر اسی عالم میں مرحوم نے سنہ ۱۳۵۱ھ میں رحلت کی اور اس طرح وہ رباب جس سے کبھی کبھی دو ایک دردانگیز نغمے فضا میں بلند ہوتے ہوئے سنائی دیتے تھے، ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔

کلام پر تبصرہ حضرت سفیر کو اس وقت نظم گو کی حیثیت سے پیش کرنا ہے کیونکہ مرحوم نے غزل سے زیادہ نظم سے اظہار انسیت کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ امر خاص طور سے لحاظ کے لائق ہے کہ آپ کی طویل نظموں میں تغزل کا رنگ کم وبیش ضرور پایا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت سفیر کی ذات اُن مبارک ہستیوں میں سے ہے جس نے اردو ادب کو انگریزی ادب سے روشناس کرایا ہے اور جس نے انگریزی نیز مغربی خیالات کو اُردو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے اور اُس میں اُسے ایک حد تک بڑی کامیابی ہوئی ہے۔ مرحوم نے اُردو شاعری میں انگریزی خیالات اور انداز بیان کو اس خوبی سے شیر وشکر کردیا ہے کہ وہ اپنے ہی ملک کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ کی نگاہیں انگریزی علم ادب سے ایسی خیرہ بھی نہیں ہوگئی ہیں کہ آپ کو اپنے اردو شاعری کے محاسن ہی بالکل نظر نہ آئیں۔ آپ نے جہاں کنگھی، چوٹی، شانہ اور زلف پیچاں وغیرہ کے تذکروں میں اُلجھنے کی کم کوشش کی ہے وہاں مغربی ادب کے ایسے دیوانے بھی نہیں ہوگئے ہیں کہ آپ اُردو ادب کی روح اور اس کی چھوٹی باتوں کو سراسر فراموش کر بیٹھیں۔ ذیل کی نظم "کنول" کے عنوان سے ہے جو مسز سروجنی نائیڈو کی نظم کا ترجمہ ہے۔ بلاشبہ کسی غیر زبان کی نظم یا عبارت کا دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا کہ اس کے طرز ادا اور اسلوب بیان اور اُس کے مجموعی اثر کو ذرا بھی ٹھیس نہ لگے کافی دشوار ہے۔

سَغیر کی ترجمہ کی ہوئی نظموں کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ خود آپ کی ذاتی نظمیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس نظم میں الفاظ کا برمحل استعمال اُن کی نشست و ترکیب اور اُن کی ہم آہنگی شاعر کے صحیح وجدان اور قوت ممیزہ پر دلالت کرتی ہیں۔ نظم ملاحظہ ہو:۔

کنول

ذرہ ذرے سے ہے یارب تیری قدرت آشکار — شاہد صنعت ہیں گلزار جہاں کے برگ و بار
شام کا وقت اور سواد دشت و سیر آبجو — جس جگہ پر سانپ لہراتے ہیں زیر کوکنار
مچکے چپکے جس جگہ چلتا ہے چیتا رات کو — جھاڑیوں میں جسکی آنکھوں سے نکلتے ہیں شرار
آہوان دشت رہتے ہیں جہاں نازک خرام — جو بھڑک اُٹھتے ہیں جگنو کی چمک سے بار بار
دھوپ کچھ کچھ ہے پرندوں کے پروں پر وقت شام — آسماں پر اُڑ رہے ہیں جو قطار اندر قطار
زیب سیمائے فلک ہے قرص زریں کی نمود — سبزہ رنگوں کی جبیں پر جیسے ٹیکا آشکار
وقت خلوت جنکا جنگل کی سہانی شام ہے — ہیں پرستش گاہ جس کے سب یہ دشت و کوہسار
ایسے دلکش وقت میں اک خواب شیریں کی طرح — جھومتا ہے آبجو پر نیلوفر مستانہ وار

اسی طرح ایک دوسری نظم بعنوان "املتاس کا پھول" خاص طور سے قابل ذکر ہے، یہ نظم بھی مسز سروجنی نائیڈو کی انگریزی نظم سے ماخوذ ہے، نظم بالا کی طرح اس میں بھی نزاکت خیال، طرز ادا اور بالخصوص قوت مشاہدہ کی کارفرمائی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، دوسرے یہ کہ اس کی فارسی تراکیب، اور انداز بیان پر غالب کی غزلوں کا دھوکا ہوتا ہے، خصوصاً یہ نظم اُن لطیف تشبیہات اور استعارات سے آراستہ ہے جو اُردو شاعری کے لیے بجا طور سے سرمایۂ ناز ہو سکتے ہیں۔

املتاس کا پھول

اے املتاس تجھے کیوں گل صحرا کہیے — صورت سبزہ ہے پامال مگر کیا کہیے
کوئی ٹوٹا ہوا تارہ ہے تو افتادۂ خاک — یا تجھے طالع بیدار ہمارا کہیے
جام زرین مے ہوش ربا ہے کوئی — یا تجھے شمع تہ دامن صحرا کہیے
ساق سیمین پری میں ہے سنہری پازیب — موسم گل کا تجھے نقش کف پا کہیے
سر بزانو ہے دلہن محو خیال طفلی — ڈبڈبائے ہوئے اشک ستم آرا کہیے
شام غربت میں کوئی خواب پریشاں ہے تو — یا تجھے غول فریبندۂ صحرا کہیے
رونمائے پر طاؤس ہے تیرا جلوہ — دیدۂ آہوئے رم دیدہ کا نقشہ کہیے

بعض وقت انسان پر ایک ناقابل بیان جذبۂ عبودیت طاری ہو جاتا ہے، اُس کے محسوسات میں ایک تموج پیدا ہو جاتا ہے اور اُس کی روح کارزارِ حیات کی دار وگیر سے آزاد ہو کر خالق حقیقی میں جذب ہو جانا چاہتی ہے۔ بس اسی نکتہ کو حضرت سفیر کی اُس نظم کی شان نزول سمجھنا چاہیے جو 'راگنی' سے موسوم ہے۔ بحیثیت شاعر کے دل میں عشق و محبت کے خیالات موجزن ہوتے ہیں۔ اور اُن کے ہجوم میں اُس کی قوت متخیلہ نظروں کے سامنے ایک دلکش اور محبوب صورت پیش کر دیتی ہے جس کے سامنے اُس کا سر نیاز خم ہو جاتا ہے۔ یہ نظم کافی طویل ہے اس لیے اس کے ابتدائی چار اشعار کی نقل پر اکتفا کی جاتی ہے بقیہ نظم میں سے چند شعر اور بھی درج کیے جاتے ہیں اُن میں شاعر اپنی خیالی مطربہ کے حسن اور دلفریبی سے ایسے مسحور ہو کر اُس کی تعریف میں رطب اللساں ہوتا ہے۔

نوا پرداز عیش و کامرانی — ہے قانون نجوم آسمانی
ہر اک تار شعاع نجم روشن — سکوت شب میں ہے آواز ارگن
غم دنیا و دیں سے کیا سروکار — کہ نظروں میں کھلا ہے ایک گلزار
دم فکر سخن یہ ذہن عالی — بنا ہے ایک فانوس خیالی

اب وہ مطربہ تصور میں آجاتی ہے۔

فروغ رُخ پہ زُلفوں کا وہ انبار — پس شب صبح کا گویا ہے آغاز
زباں پر وہ ثنائے خالق کل — جواب نغمۂ شیرین بلبل
صدائے ساز ہے لیلائے محمل — اثر انداز مثل سحر بابل
صدا میں بھر دیا گویا کہ جادو — ادب آموز چشم شوخ آہو
ہے مثل تیغ قاتل نغمۂ چنگ — بنایا دل کو جس نے آج چورنگ
رواں تاروں پہ یوں نغمات دلکش — رگ گل پر ہو جیسے رقص شبنم
یہ حسن صوت صورت میں ہے مضمر — نہاں قالب میں جیسے جان مضطر

مرحوم نے ایک نظم 'عالم خواب' کی سُرخی سے لکھی ہے یہ نظم در اصل راوی ورما کی تصویر 'تنا ڈلی' کو دیکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس میں آپ نے اپنی قوت متخیلہ، ژرف نگاہی اور محاکات کی مدد سے اصلی تصویر میں جان ڈال دی ہے۔ عموماً نظم کے ہمراہ کسی منظر یا تصویر کا ہونا لازمی قرار دیا جاتا ہے تاکہ پڑھنے والا نظم کا مفہوم بآسانی سمجھ جائے۔ مگر اصلی مرقع نگاری وہی ہے جس میں شاعر نے معرکۂ جنگ یا اور کسی واقعہ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہو کہ وہ خود ہی نظروں کے سامنے آجائے۔ یہی

خاص خوبی اس نظم کی دلکشی کا باعث ہے۔ اس کے علاوہ اپنے جذبات اور تخیلات کی بھی مصوری کی گئی جس نے اُس کے اثر میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔

یہ زمین زر فشاں یہ منظر آب رواں — اور لب ساحل پہ چڑیوں کی سبک پروازیاں
یہ ہوائے روح پرور یہ فضائے آسماں — رشک جنت ہے سواد دلکش ہندوستاں
کیا سہانا وقت ہے اور کیسی ٹھنڈی ہے ہوا
سامنے بحر رواں اور سیر ساحل پُر فضا

لطف نظارہ تماشا ہے کنار آب کا — پوچھنا کیا ہے مرے حال دل بیتاب کا
نشہ ہے چھایا ہوا گویا شراب ناب کا — دیکھتا ہوں آنکھ سے میں یا ہے عالم خواب کا
جلوہ فرما ہے لب ساحل جو اک رشک پری
وہ شباب فتنہ ساماں وہ نظر جادو بھری

ساعد سیمیں بت کی وہ صفا مانند عاج — صندلی قشقے میں وہ آب گہر کا امتزاج
عنبریں زلف رسا مشک ختن سے لیکے باج — تا لب ساحل یہ خوشبوئے سمن لاتی ہے آج
وہ ادائے ساختہ اور وضع میں ہے سادگی
بے خودی کیف ہے اک صورت افتادگی

ریگ ساحل پر جو ہے لیٹی ہوئی وہ سرو ناز — بے تکلف دوش پر بکھری ہوئی زلف دراز
بحر کی جانب نہیں لیکن وہ چشم پاکباز — کیا خبر اُس کو کہ آتا ہے اُسی سمت اک جہاز
آ رہا ہے سوئے ساحل وہ جہاز با شکوہ
دور سے بہتا نظر آتا ہے گویا ایک کوہ

دھیان کس کا ہے اسے اتنا جو استغراق ہے — کس کی فرقت کا ہے غم کس کی جدائی شاق ہے
اپنے شوہر سے گر ملنے کی یہ مشتاق ہے — جو پئے سیر و سفر آوارۂ آفاق ہے
کیا تعجب ہے جو پیش آئے یہ حسن اتفاق
کھینچ لائے اُس کے شوہر کو وطن کا اشتیاق

انداز بیان، ترنم، روانی اور طرب انگیزی اس نظم کی نمایاں خصوصیات میں سے ہیں۔ پھر اس میں واردات قلبیہ کی سچی تصویریں موجود ہیں۔ اہل بصیرت کے لیے "بے تکلف دوش پر بکھری ہوئی زلف دراز" کا مصرع ہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اُس عورت کے دلی جذبا

...ادگی اور اُس کی دلکش ادائے استغراق وغیرہ عکس فگن نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ بیاختہ اور ...خودی کیف خود ہی ایسی ترکیبیں ہیں جنھیں نقش ونگار سے اگر تعبیر کیا جائے تو غالباً غیر مناسب نہوگا۔

مرقع نگاری کے علاوہ حضرت سفیر کی نظموں کی دوسری امتیازی خصوصیت تسلسل اور واقعہ ...اری ہے اور بعض نظموں میں تو یہ خوبی اس حد تک پائی جاتی ہے کہ پڑھنے والے کو اُس پر منظوم ...سانوں کا دھوکا ہونے لگتا ہے، نظم کے ابتدائی، درمیانی اور آخری اجزا اس سلیقہ سے ...ربوط کر دیے جاتے ہیں کہ اصل واقعہ کی تہ تک پہونچنے کے لیے ہم میں شروع ہی سے ایک ...تابی پیدا ہو جاتی ہے، اُس پر جزئیات کا استقصا اور واقعات کی گوناگونیت اور دلکشی کا باعث ...وتی ہے۔ ان خوبیوں کی حامل خصوصاً وہ نظمیں ہیں جو 'راگنی' 'عالم خواب' اور 'خیال خواب' کے ...یر عنوان لکھی گئی ہیں۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے آخر الذکر نظم بجنسہ درج کی جاتی ہے۔

خیال خواب

آسایش و آرام کا ہر طرح مکاں ہے — گویا کہ زمیں پر یہ کوئی قصر جناں ہے
تزئین کی ہر شے ہے گراں قیمت و نایاب — سامان تکلف ہے، دل آویز سماں ہے

چھوٹا سا ہے اک باغ کھلا صحن مکاں ہیں — آتی ہے چمن سے جو ہوا راحت جاں ہے
برسات کی رُت ہے، شب مہتاب کا عالم — تسکین دہِ قلب و جگر بادِ وزاں ہے

سر تھامے ہوئے کوچ پہ بیٹھی ہے کوئی حور — انداز و ادا برق بلا آفت جاں ہے
بکھری ہوئی زلفوں میں ہے خوشبوے گل تر — مخمور ہیں آنکھیں اثرِ خواب گراں ہے

کیوں نیند اچاٹ ایسی ہے کیوں قلب ہے مضطر — کیوں روے نگار آئینۂ سوز نہاں ہے
اک آگ سی سینے میں لگا دی ہے یہ کس نے — کیوں اس قدر اُٹھتا جگر و دل سے دھواں ہے

ہے کونسا وہ ناوک دلدوز دل افگار — بسمل کی طرح جس سے دل زار تپاں ہے
دیکھا ہے کچھ ایسا ہی مگر خواب پریشاں — جو باعث تکلیف سبب کاہش جاں ہے

دیکھا کہ قیامت کا سماں پیش نظر ہے — میدان بلا خیز میں اک حشر جہاں ہے
نالاں نظر آنے لگے ہر طرح کے انساں — دیکھا جسے وہ مائل فریاد و فغاں ہے

کچھ لوگ تو واں چاک گریباں نظر آئے — بعضوں کو میسر فقط اک پارۂ ناں ہے
بچوں کو جو فاقہ ہے تو جورو بھی ہے رنجور — کچھ پاس زر و مال نہ رہنے کو مکاں ہے
اندوہ غریبی میں پڑا ہے کوئی بیمار — جس کا کوئی پرساں ہے نہ کوئی نگراں ہے

مشتاق اجل قبر میں جانے کو ہے تیار درویش و تونگر میں مساوات جہاں ہے
یاد آتا ہے اس وقت جو یہ خواب فراموش ہر لحظہ وہی دھیان ہے اب نیند کہاں ہے
جذر و مد ہستی کا جو نقشہ ہے جہاں میں دریا جسے کہیے وہ جہان گذراں ہے
مانند حباب اپنی جو ہستی ہے کوئی دم پھر کیوں یہ سفیر آرزوے نام و نشاں ہے

نظم بالا و نیز مرحوم کی دیگر نظموں پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اس کا اندازہ بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ آپ کا مطمح نظر فلسفیانہ ہے اور آپ عالم اور اُس کی کائنات۔ اُس کی بقا اور فنا کی طرف زیادہ متوجہ رہے ہیں۔ گو آپ کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہیں پہونچ سکے ہیں کیونکہ حقائق اشیا تک پہونچنا دراصل انسان کے دائرۂ امکان سے باہر ہے، تاہم آپ نے اس طلسم کدۂ رنگ و بو کی نیرنگیوں اور بے ثباتیوں کے نقشے نہایت پر اثر انداز میں کھینچے ہیں اور ان میں اس امر کو زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کا ہر ذرہ "ہر لحظہ و ہر ساعت دنیاے دگر دارد"۔ ان باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آپ کی نظمیں جوش بیان، و شگفتگی سے ایک حد تک معرا ہیں، لیکن اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ نقدان جوش و انبساط کی ذمہ داری بڑی حد تک اول تو خود شاعر کی افتاد طبع کے سر ہوتی ہے دوسرے کچھ اس زمانہ کے عام مذاق شاعری کے سر یہ قاعدہ ہے کہ دکھے دل کی داستانیں بھی دُکھ بھری ہوتی ہیں، حضرت سفیر کا لب و لہجہ اگر یاس انگیز ہے تو اس کا سبب اُن کے زمانہ کی نیرنگیاں، انحطاط و تنزلی قوم، مذہبی تعصبات، اور حیات اور اُس کی وہ عام کشاکش ہیں جن کے مرقع اُس وقت اُن کے پیش نظر تھے اور پھر اُن سے اگر اُن کا کلام بھی متاثر ہوا اور اُنھیں ویسا ہی اسلوب بیان اختیار کرنا پڑا تو اس میں قابل گرفت کون بات ہو سکتی ہے۔

اس سے یہ سمجھ لینا کہ حضرت سفیر کی شاعری دنیا کے تاریک ہی پہلو سے وابستہ ہے سخت غلطی ہے بلکہ اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ آپ ایک ہمہ گیر طبیعت لے کر آئے تھے، اور قدرت کی شگوفہ کاریوں کے تذکروں سے بھی آپ کا کلام لبریز ہے۔ ذرہ و خورشید، صبح و شام، روز و شب گل و بلبل، وغیرہ وغیرہ غرضیکہ کائنات کی تقریباً ہر شے آپ کے تصورات اور محسوسات کو مشتعل کر سکتی تھی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ جب آپ مناظر قدرت کی مصوری کرتے ہیں اور اُن کی رنگا رنگ دلفریبیوں کے نقشے کھینچتے ہیں تب بھی دنیا کے سیاہی جلووں کو آپ نظر انداز نہیں کر سکتے اور اُن سے لطف اندوز ہونا تو کجا آپ کے دل میں اُس وقت بھی ایک خلش سی موجود رہتی ہے۔ ذیل کی دستمری، آپ کی مرصع اور شگفتہ نظم کہی جاسکتی ہے لیکن اس میں بھی جابجا "بے ثباتی" مع اپنی تمام یاس انگیزیوں کے

رونما ہوتی رہتی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو۔

کبک و قمری (مسلسل)

حسن عروس بوستاں رشک بتان آذری　　لیلیٰ شب فروز ہے ماہ سپہر اخضری

جلوۂ ماہ آسماں طرفہ بہار دلستاں　　باغ صبا ہے باغ میں، مائل طرز دلبری

سرو سمن کنار جو مست وادائے بے خودی　　چادر ماہتاب ہے آئینۂ فسوں گری

عالم خواب ہر طرف لطف سکوت ہر گھڑی　　کبک دری کو قیس کی شب کو ملی ہے ہمسری

الغرض ماہ آسماں آفت جان ناتواں　　خرمن برق ہوش پر برق ادا ستمگری

خندۂ گل بگوش ہوش بانگ درائے کارواں　　رنگ چمن ہے بے ثبات صورت سحر سامری

گرد قمر تمام شب نالہ کناں ہے زار زار　　نوک زباں پہ پے بہ پے شکوۂ ستمگری

آب بقا مگر کہاں چشمۂ کائنات میں　　دور فلک دکھا رہا ہے یہ عجیب داوری

صبح بہار بن گئی پردہ کشائے باغ دہر　　رنگ شفق ہے خوشنما تازہ بتازہ سبزی

عالم نور ہر طرف بزم سرور سر بسر　　وقت سحر ہے آشکار آمد شاہ خاوری

باد سحر کی شوخیاں غنچہ و گل سے چھیڑ چھاڑ　　جام بکف ہے باغ میں شاخ چمن ہری بھری

سبزہ کنار آب جو دام طلسم روبرو　　سنبل بوستان میں ہے نکہت گیسوئے پری

صبح دمیدہ شب گذشت ماہ شبیہ خانہ رفت　　مرغ سحر ہے بام پر ورد زباں ثنا گری

لاکھوں طیور خوشنما پاکے ہوائے جاں فزا　　بحر فضائے نور میں کرنے لگے شناوری

رنگ بہار بوستاں روکش روضۂ جناں　　قمری نغمہ ریز ہے محو قد صنوبری

صحن چمن میں کو بکو تازہ ہیں نخل آرزو　　وجد میں سرو ہے بار بار ہے خمار میں پری

قمری باغ نغمہ زن گرم نظارۂ چمن　　پہلوئے سرو میں مگن دل میں امنگ ہے بھری

سرو کنار جو سے ہے صبح کو شرح آرزو　　تازہ بتازہ نو بنو مشغلۂ سخنوری

شب کو مگر وہ اور ہی کبک دری کا طور تھا　　عرض نیاز عاشقی درد بھری نواگری

ہائے وہ شکوہ سنجیاں ماہ کی لن ترانیاں　　سوز دروں سے زاریاں اور وہ ادائے کافری

گردش کبک رات بھر صورت ہالۂ قمر　　نالۂ جاں گداز میں رنگ کلام انوری

شعر و سخن سے واسطہ تم کو ہے کیا مگر سفیر　　حسن بیاں کو کہتے ہیں معجزۂ پیمبری

سطور بالا تک حضرت سفیر کے شاعرانہ کمال پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن یہ داستان اس وقت تک

مکمل نہیں کہی جا سکتی جب وقت تک آپ کی شاعری کا ہر نقطۂ نظر سے مطالعہ نہ کیا جائے کیونکہ مرحوم اگر ایک طرف 'شاعر' کے لقب کے مستحق ہیں تو دوسری طرف آپ 'مصلح قوم' کے خطاب سے یاد کیے جا سکتے ہیں۔ آپ کی نظموں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے کہ آپ کو ذوق شاعری کے ہمراہ ہمدردی، حب الوطنی، اخوت اور رواداری وغیرہ وغیرہ کا بھی کافی حصہ عطا ہوا تھا جس کا اظہار آپ کی اکثر نظموں سے ہوتا ہے۔ آپ کے عہد میں اُردو شاعری میں اخلاقی عنصر بھی شامل کیا جا رہا تھا۔ اُس کے منبر سے حکیم حالی۔ اکبر۔ اقبال ایسے ایسے جاں نثاران قوم وطن اور اُس کی محبت کا وعظ دے رہے تھے۔ بانگ درا، مسدس حالی، نیا شوالہ وغیرہ ایسی نظمیں تھیں جو اکبر مرحوم کے ظریفانہ کلام کے ساتھ زمانہ میں گونج رہی تھیں۔ اور یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ شاعری کو فقط بزم کی رونق فزائیوں اور دلبستگیوں ہی کے لیے نہ ہونا چاہیے بلکہ اُس میں اُن مضامین کو بھی جگہ دینا چاہیے جو رزمگاہ حیات میں پست ہمتی اور بزدلی کے موقعوں پر دل میں جوش و جرأت کی ایک نئی روح دوڑا دیں اور گم کردگان راہ حقیقت کے لیے مستقل شمع ہدایت بن جائیں۔ ان خیالات نے حضرت سفیر کے لیے مضراب کا کام دیا اور اُن کے بھی ساز قلب سے وہی نغمے بلند ہونا شروع ہو گئے۔ اس کی شہادت میں بالفعل آپ کی دو نظمیں 'ترانہ قومی' اور 'انقلاب روزگار' پیش کی جا سکتی ہیں۔ آخر الذکر نظم کو درحقیقت قومی نظم سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب نہ ہوگا کیونکہ اُس میں جیسا کہ اس کے خود عنوان سے ظاہر ہے لیل و نہار کے تغیرات کا نقشہ کھینچا گیا ہے لیکن اُس کے ساتھ ہی شاعر انقلاب روزگار کا رونا روتے روتے اپنے ملک اور ابنائے وطن کی بے حسی اور جمود پر بھی آنسو بہانا شروع کر دیتا ہے۔ پھر سفینۂ قوم کی تباہی کا چند موثر الفاظ میں ذکر کرتا ہے اور بالآخر نظم کو دعائیہ فقروں پر ختم کر دیتا ہے۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے اُسے بجنسہ نقل کیا جاتا ہے اور اُس کی صوری اور معنوی خوبیاں ارباب نظر کے ذوق اور فیصلہ کے سپرد کی جاتی ہیں۔

انقلاب روزگار

نکلا افق پر صبحدم وہ تاجدار خاوری　　جس کی شعاعوں میں ہم برپا ہی جنگ نیلگری
رنگ شفق ہی جلوہ گر یا شعلہ رُخ ہی اک پری　　پرخوں ہی یا وقت سحر مینائے چرخ اخضری

نظروں سے غائب ہوگئے روشن ستارے رات کے
دم بھر میں آخر کیا ہوئے ساماں سارے رات کے

گلزار ہے اُجڑا ہوا بزم طرب برہم ہوئی　　شمع سحر ہر تا بپا تصویر رنج و غم ہوئی
گلشن سے سوئے آسماں گرم سفر شبنم ہوئی　　سنبل لب آب رواں گویا صف ماتم ہوئی

نکہت چمن میں چار سو کیسی پریشاں ہو گئی
ہر عندلیب خوشنوا گلشن میں نالاں ہو گئی

رخصت ہوا شب کو قمر نکلا ستمگر آفتاب　　　روشن گر دیوار و در ہے شعلہ پیکر آفتاب
بستر سے اُٹھے دھوپ سے آیا ہے سر پر آفتاب　　　منزل یونہی طے کرتا ہے دنیا میں دن بھر آفتاب
دن رات ہیں شمس و قمر پامال جور آسماں
گردش میں ہیں شام و سحر پابند دور آسماں

مغرب کی جانب ہے رواں کشتیٔ مہر آتشیں　　　ساقی نے پھینکا ہے کہاں اپنا یہ چھوٹا سا نگیں
فصل خزاں میں زرد ہے یا ایک برگ یاسمیں　　　مدفن ہے جس کے واسطے دم بھر میں مغرب کی زمیں
خورشید تاباں کوئی دم میں سرنگوں ہونے کو ہے
اقصائے مغرب میں پہونچ کر اُس کا خوں ہونے کو ہے

خورشید عالمتاب پر آیا ہے کیا وقت زوال　　　دھندلی سی آتی ہے نظر گردوں پہ تصویر ہلال
صید اجل ایک شیر نر صحرا میں ہے آشفتہ حال　　　گرد اُسکے لپٹے ہیں مگر گرگ و سگ زرد و شغال
آنکھوں سے جاری اشک خوں دل سے اُٹھتا ہے دھواں
آنے لگی کانوں میں آواز درائے کارواں

نیرنگی باغ جہاں ہر دم ہے تازہ انقلاب　　　بچپن کا عالم اب کہاں گذرا وہ ہنگام شباب
عہد جوانی ہو چکا پیری میں ہے رنگ خضاب　　　غفلت کی نیندیں تا کجا ہشیار ہو اے مست خواب
ٹوٹا ہوا ہے بادباں باد مخالف تیز ہے
کشتیٔ ملت نیمجاں اور بحر طوفاں خیز ہے

یارب جہاں میں آسماں جب تک ہے گردش پذیر　　　خورشید تاباں تا رہے باقی سر چرخ اثیر
روشن زمانہ میں رہیں تا طلعت ماہ منیر　　　آنکھوں میں اپنی قوم کا تارا ہو ہر برنا و پیر
چمکے ہمیشہ اوج پر اقبال ہندی کا نشاں
روشن رہے علم و ہنر کے نور سے ہندوستاں

اسی طرح 'ترانۂ قومی' کی سُرخی سے آپ کی ایک نظم مشہور ہے، یہ بھی سرتاپا اخوت، ہمدردی، مساوات اور مذہبی رواداری وغیرہ کے جذبات سے لبریز ہے، اس میں بھی آپ اہل ہند کے گذشتہ وقار اور عروج کا تذکرہ کرتے ہیں، اور آخری بند میں آپ اپنے ملک سے

یوں مخاطب ہوتے ہیں۔

اختلافِ دین و مذہب کے یہ جھگڑے ہوں تمام
جو مصیبت بن گئے ہیں آج ہر خاص و عام

ہے مبارک جو تجھے حاصل ہے امن و انتظام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

خاکساری میں تو اب تک شہرۂ آفاق ہے
مخزنِ فضل و ہنر ہے معدنِ اخلاق ہے

آخر میں راقم الحروف اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہے کہ حضرت سَغیر کے کلام کا ایک سرسری نظر سے مطالعہ کیا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ مختصر مضمون کسی طرح ایک جامع اور مکمل تبصرہ نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اسے نقش اول تصور کرنا چاہیے اور یہ امید رکھنا چاہیے کہ کوئی صاحب ذوق بمصداق

نقاشِ نقش ثانی بہتر کشد ز اول

حضرت سَغیر کے کلام پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالیں گے جو حقیقی معنوں میں اردو ادب کی بیش قیمت خدمت ہوگی۔

کلامِ تسنیم

(جناب مولوی اسمٰعیل احمد مینائی صاحب تسنیم بی اے ایل ایل بی وکیل)

جب ولولے دلوں کے کوئی جگہ نہ پائیں
کیوں سرخ سرخ ڈورے آنکھوں میں بن نہ جائیں

اب بھی تڑپ رہا ہے سننے کو گوش فطرت
خاموشی ازل میں گونجی ہوئی صدائیں

افتادگی کی لذت تو نے نہیں اٹھائی
ورنہ کبھی نہ کرتا منزل کی التجائیں

ہر چند شوقِ گل ہو لیکن کبھی نہ مانگیں
گلچیں کا رخ اگر ہم اپنے خلاف پائیں

چل، عندلیبِ نالاں صحنِ چمن میں چل کر
ہم رنگِ عارضِ گل اک آشیاں بنائیں

دو چار دن تو رہ لیں اس کنجِ عافیت میں
(ق) پھر خواہ برق لوٹے یا جلوے مسکرائیں

الفت میں کامیابی تسنیم معصیت ہے
اس کا خیال رکھنا وہ مجھ کو مل نہ جائیں

سرودِ زندگی

(جناب منشی سید اظہر علی صاحب آزاد کاکوروی)

سرودِ زندگی یعنی جناب اصغر حسین صاحب اصغر۔ ایڈیٹر رسالہ ہندستانی۔ ہندستانی اکیڈمی الٰہ آباد کے تازہ افکار۔ چھوٹی تقطیع۔ جلد دیدہ زیب۔ لکھائی چھپائی صاف خوشخط۔ کاغذ عمدہ سفید۔ ۱۰۲ صفحات۔ قیمت دو روپیہ۔ مصنف سے مل سکتی ہے۔

پہلے فہرست مضامین۔ پھر مصنف صاحب کی صاف تصویر ہے۔ اس کے بعد دو صفحہ کا دیباچہ مصنف صاحب کا ہے۔ مقدمہ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو صاحب ایم۔اے، ایل۔ایل۔ڈی نے تحریر فرمایا ہے جو دسویں صفحہ پر ختم ہوتا ہے۔ زاں بعد مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی تقریظ ہے جو صفحہ ۲۰ تک چلی گئی ہے۔

محاسن کی داد دونوں بزرگوں نے دل کھول کر دی ہے۔ اور درحقیقت جناب مصنف اس کے مستحق ہیں۔ اچھے اشعار۔ بلند اور پاکیزہ خیالات کی داد بلاشبہ فقیر بھی دے سکتا ہے۔ الحمدللہ کہ اس کتاب میں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس کلام میں وقت صرف کرنے سے بہتر یہی ہوگا کہ قارئین کرام سے مقدمہ اور تقریظ مذکورہ پڑھنے کی سفارش کر دینا ہی کافی سمجھا جائے۔

مصنف صاحب ایک نامور شاعر ہیں۔ کلام میں رعنائی۔ شگفتگی۔ ندرت۔ نازک خیالی۔ وقار۔ بلند نظری کے نمونے جابجا موجود ہیں۔ محاسن بہت ہیں۔ آپ شاہراہ ترقی پر گامزن ہیں۔ اور بہت کچھ ترقی کر سکتے ہیں۔ نقاد کا کام ہے کہ اگر عروسِ نظم کے حسین چہرے پر اُسے کہیں کہیں کچھ بدنما داغ نظر آتے ہوں تو اُن پر پردہ ڈالنے کی سعی لاحاصل نہ کرے۔ بلکہ آئینہ کی طرح اُنھیں صاف پیش نظر کر دے تاکہ یہ داغ دور کر دیے جائیں۔ حسن اپنی دلفریب رعنائیوں کے ساتھ چودھویں رات کا چاند بنکر آسمان ادب پر جلوہ افروز ہو جائے اور گرد و پیش کی دنیا اُس کی نورانی شعاعوں سے دیدہ و دل منور کر سکے۔

یہ عرض کر دینا بھی بیجا نہیں سمجھتا کہ حضرت مصنف سے مجھے کوئی خلش۔ کوئی پرخاش نہیں ہے۔ مجھے اب تک اُن سے صورت آشنا ہونے کا فخر بھی حاصل نہیں تھا۔ سرودِ زندگی میں پہلی مرتبہ اُن کی شبیہ مبارک نظر سے گذری ہے۔

سرودِ زندگی کے بعض اشعار کے متعلق مجھے شبہات ہیں۔ اور اظہار خیال کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ آئندہ سطور میں اس قبیل کے بعض اشعار پیش کروں گا۔ اگر اہل نظر نے کافی دلچسپی لی تو ممکن ہے کہ یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک جاری رہ سکے۔

صفحہ (۲۴) کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیر عشق کی　　　جب خاک کر دیا اُسے عرفاں بنا دیا
فقیر کو شبہ ہے کہ آگ دینا بے محاورہ ہے۔ پہلا مصرعہ کہتا ہے کہ ہوس میں "کچھ" یعنے بقدار قلیل آگ کا اضافہ کارکنان قضا و قدر نے کر دیا اور اس طرح عشق کی تعمیر عمل میں آئی۔ دوسرا مصرعہ بتاتا ہے کہ کچھ آگ لگا دی جانے کے بعد جب ہوس جلکر خاک ہو گئی تو عرفاں بن گئی۔ اب یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ ہوس ایسی شے نہیں جس کا جلکر خاک کی صورت میں تبدیل ہو جانا ممکن ہو۔ جسم خاکی۔ دل یا جگر میں اگر آگ لگی ہوتی تو البتہ وہ جل کر خاک بن سکتا تھا۔ پھر ہوس اور عشق میں بعد المشرقین ہے۔ ایک نار ہے تو دوسری چیز نور ہے۔ ہوس میں اگر آگ کا اضافہ کیا بھی جائے تو حاصل کیا ہوگا؟ ہوس ترقی کر کے نار جہنم کا ایک شعلہ بن جائے گی۔ اور جب نوبت اس حد تک پہونچ جائے گی تو وہاں عشق کا نام لینا ہی بیکار معلوم ہوتا ہے کیا ہوس بازی کے طوفان بے تمیزی کا دوسرا نام عشق ہے؟

صفحہ (۲۴) اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن　　　آج اُس کو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا
اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے محو خواب۔ فرمائیے اگر پسند ہو۔ موجزن تو اُس وقت ہوئی جب حسن و عشق کا سامان بنی۔

صفحہ (۲۷) زخم آپ لیتا ہوں۔ لذتیں اُٹھاتا ہوں　　　تجھ کو یاد کرتا ہوں درد کے بہلانے سے
زخم لینا شاید خلاف محاورہ ہو۔ زخم کھانا غالباً صحیح محاورہ ہے۔

صفحہ (۲۹) جز دل حیرت آشنا اور کو یہ خبر نہیں　　　ایک مقام ہے جہاں شام نہیں۔ سحر نہیں
اگر "یہ" کے بجائے "کچھ" ارشاد فرمایا ہوتا تو غالباً بہتر ہوتا۔

صفحہ (۳۲) خاموش یہ حیرتکدۂ دہر ہے اصغر　　　جو کچھ نظر آتا ہے وہ سب طرز نظر ہے
"طرز" کی جگہ اگر "وہم" ہوتا؟

صفحہ (۳۴) چاہیے داغ معصیت اُسکے حریم ناز میں　　　بھول یہ ایک بھی نہیں دامن پاکباز میں
سرمد فرما چکے ہیں ؎

مے خور مے خور اگر خضنفری خواہی　　　نا کردہ گناہ پیش قاضی نہ برند

شاعر صاحب یہ فرمانا چاہتے تھے بقول لسان الغیب حافظ شیرازیؒ
"کہ مستحق کرامت گناہگارانند"

لیکن مصرعہ اولی میں جو الفاظ ہیں شاید وہ اس معانی کے حامل ہوتے نظر نہیں آتے۔ اس مصرعہ کی نثر کیا ہوئی؟ اُس کی حریم ناز میں داغ معصیت چاہیے۔ معنی بظاہر بہت صاف ہیں۔

صفحہ(۳۴) گم ہے حقیقت آشنا۔ بندۂ دہر بے خبر ہوش کسی کو بھی نہیں میکدۂ مجاز میں
حقیقت آشنا یعنے اہل اللہ تو اس معنے میں گم کہے جا سکتے تھے کہ سوا ذات باری تعالےٰ کے دنیا وما فیہا سے اُنھیں کوئی مطلب نہ تھا۔ اس جہان فانی کی عارضی لذات یہاں کے فانی اور غیر حقیقی رنج والام اور مسرتوں سے وہ کوئی غرض کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے۔ اور نہ ایک لمحہ کے لیے ادھر متوجہ ہونا پسند کر سکتے تھے۔ اب رہے دنیادار جنھیں شاعر صاحب "بندۂ دہر" فرما رہے ہیں وہ کیونکر بے خبر ٹھہرے؟ اگر اس وجہ سے بے خبر فرمائے گئے ہیں کہ وہ "حقیقت آشنا" نہیں ہیں۔ تو "ہوش کسی کو بھی نہیں" قابل غور ہے۔ اگر وہ بیہوش ہیں تو اس کے ساتھ "بندۂ دہر" بھی تو ہیں۔ بیہوش ہوتے تو دنیا کے کاروبار بحیثیت "بندۂ دہر" ہوتے کے وہ کیونکر انجام دے سکتے تھے؟

صفحہ(۳۵) موج نسیم صبح میں بوئے صنم کدہ بھی ہے اور بھی جان پڑ گئی کیفیت نماز میں
"نسیم صبح" کی جگہ اگر "نسیم کعبہ" ہوتا؟

صفحہ(۳۶) حسن ہزار طرز کا ایک جہاں اسیر ہے ملحد باخبر بھی گم جلوۂ لاالٰہ میں
اس شعر میں تجلیات صفات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اسم ذات ایک ہی ہے جسے اسم اعظم بھی کہتے ہیں۔ بعضوں کے نزدیک اللہ اسم ذات ہے۔ بقیہ اسمائے گرامی مثلاً ستار۔ غفار۔ رحمٰن۔ خالق۔ کریم۔ ذوالجلال والاکرام اسمائے صفات ہیں جن کی تجلیات کو شاعر نے "حسن ہزار طرز" فرمایا ہے۔ لیکن "حسن ہزار طرز" فارسی ترکیب ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اساتذہ عجم کے نزدیک اس موقعہ پر کون سا لفظ برمحل سمجھا جا سکے گا۔ خالص اصفہانی فرماتے ہیں ؎
غبار راہ گشتم۔ سرمہ گشتم۔ طوطیا گشتم بچندیں رنگ گشتم تا بچشمش آشنا گشتم
اب اگر "حسن ہزار طرز" کی جگہ "حسن ہزار رنگ" ہوتا؟
ملحد بظاہر باخبر کہے جانے کے قابل تو نظر نہیں آتا۔ وہ تو شاید بے خبر ہی رہے گا۔ اگر باخبر ہوتا تو ایک لمحہ بھی ملحد رہنا غالباً گوارا نہ کرتا۔ سعدیؒ نے خوب فرمایا ہے ؎
ایں مدعیاں در طلبش بے خبرانند واں راکہ خبر شد خبرش باز نیامد

قند پارسی از حضرت امیر مینائی مرحوم

جوش دل است مژدہ رسان لقائے تو
اشکے کہ می چکد دہد آواز پائے تو

شعر فہمی عالم بالا

(جناب منشی محمد اظہار الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل)

چند سال ہوئے "نگار" میں ایک مضمون شائع ہوا تھا "تاج بدترین عمارت ہے"۔ صاحب مضمون کوئی مغربی نقاد تھے۔ ہر طرف سے تاج کی تعریفیں سنتے سنتے کلیجہ پک گیا۔ ایک مضمون لکھ مارا۔ دل کے پھپھولے پھوڑ لیے۔ حسد بُری بلا ہے اہل کمال اکثر ناقدری عالم کا شکار رہے ہیں۔ "امام الغزل" میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی (عظیم آبادی؟) "علیہ السلام" نے دیکھا کہ ہر طرف غالب کا طوطی بول رہا ہے اور انھیں کوئی پوچھتا بھی نہیں لوگوں کی توجہ منعطف کرانے کے لیے غالب کی پگڑی اُچھالنی شروع کر دی۔

بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا

شروع میں خواجہ آتش کی تعریف کی آڑ لی۔ نیت پر پردہ ڈالنا تھا۔ اصل مقصود کو چھپانا تھا سمجھے تھے غالب کو بُرا کہنے سے جہاں عام سخن فہم اصحاب کو تکلیف ہوگی وہاں ممکن ہے آتش کی تعریف سے معتقدین آتش خوش ہوجائیں۔ لیکن غالب آج بھی غالب ہیں اور آتش کے کمال کو تحسین ناشناس کی ضرورت نہ تھی۔ یہ ترکیب کارگر نہ ہوئی۔ خود بینی میں اور اضافہ ہوا۔ مرزا واجد حسین یاس سے یگانہ ہوگئے۔ آتش کو چھوڑا اور خود اپنے کلام کا چراغ غالب کے سورج کو دکھانے لگے۔ کلام یاس کی خوبی سے انکار نہیں۔ شب کو محفل میں شمع سے روشنی ہوتی ہے اور اس کی تابانی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے لیکن دن میں آفتاب عالمتاب کے روبرو؟ جوش انانیت میں ان سے یہ نکتہ فراموش ہوگیا۔ اپنی فطرت ستیزہ کار کی نمائش کے لیے چنگیز سے نسبت کا فخریہ اعلان کیا اور چنگیز کا نام لیوا بیک جنبش قلم "علیہ السلام" ہوگیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اسی پر اکتفا کیا ورنہ اگر "صلعم" لکھنے لگتے تو کوئی ان کا کیا بگاڑ لیتا۔

مرزا یگانہ نے کہیں اپنی رباعیات "ترانہ" کا ایک نسخہ سید مسعود حسن صاحب رضوی کے پاس بھیجا تھا۔ آخر کی چند رباعیات میں غالب پر بے جا تمسخر کر کے سوقیت اور پھکڑ پن کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ مسعود صاحب نے فراد کی رسید کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ یہ چند رباعیات اگر شائع نہ کی جاتیں تو بہتر تھا۔ بس پھر کیا تھا مرزا صاحب آپے سے باہر ہوگئے اور "مکتوب" "غالب شکن" لکھ مارا بلکہ شائع بھی کر دیا۔ خرافات کی اس پوٹ کو "دیوتائے جلال و عتاب"، "حق شناس و باطل شکن"، "حضرت چنگیز خاں اعظم قہر اللہ" کے بدنام نام سے معنون کیا گیا ہے۔ "دیوتائے جلال و عتاب" کے حسن ترکیب پر اردو مدتوں سر پیٹتی رہے گی اسلام اور مسلمانوں کے مشہور دشمن کو

حق شناس و باطل شکن قرار دینا ایک "علیہ السلام" ہی کی غیرت وہمت کا اقتضا تھا۔ ہاں اس انتخاب اور تلاش کی داد نہ دینا ظلم ہے "تحفۂ غالب شکن" کو چنگیز خاں ہی سے منسوب ہونا چاہیے تھا۔

"غالب شکن" میں کیا ہے؟ غالب، مداحین و متبعین غالب کو کھلی کھلی گالیاں اور کلام غالب پر جا و بیجا اعتراضات بزعم خود غالب کی "چوریاں اور نقالیاں" طشت از بام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انداز بیان اس قدر تہذیب شکن ہے کہ جی متلانے لگتا ہے علمی اور ادبی بحث میں وہ زبان استعمال کی گئی ہے جسے ثقات تفوسی اور ظریفانہ گفتگو میں بھی استعمال کرنا عار سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کی شکایت نہیں۔ میرزا یگانہ سے اور توقع ہی کیا ہو سکتی تھی۔ مایوسی اور ناکامی، حسد اور عناد انسان کو ایسی ہی پستیوں میں پہونچا دیتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ ایک اچھا خاصا شاعر جب بگڑتا ہے تو اس کا کیا عالم ہو جاتا ہے۔ کاش یگانہ فن کو فن کی حیثیت سے اختیار کرتے اور محض اپنے ذوق ادب کی تسکین کے لیے شعر کہتے۔ کمال تو بقول ان کے "وہ ہے کہ مار گھونسوں کے داد وصول کر لیتا ہے"۔ بزرگوں کی پگڑی نہ اُچھالتے تب بھی وہ مشہور ہو جاتے ہاں بدنام نہ ہوتے۔ اپنی دماغی صلاحیتوں کا جتنا غلط مصرف اُنھوں نے کیا ہے وہ قابل افسوس ہی نہیں قابل عبرت بھی ہے مگر اب وہ ان حدود سے آگے نکل چکے ہیں ان کی تنقیدی شاہکاروں کو پڑھ کر ایک صحیح الدماغ شخص ان کی ذہنی کیفیتوں کے متعلق ہرگز کوئی عمدہ رسلے نہیں قائم کر سکتا۔

میرزا یگانہ کے خوشگو شاعر ہونے میں تو کوئی کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ میں انھیں سخن فہم بھی سمجھتا تھا۔ افسوس ہے کہ "غالب شکن" نے یہ حسن ظن زائل کر دیا۔ اگر آنکھیں ہوتے ہوئے نہ دیکھنا مقصود ہے تو بات دوسری ہے ورنہ یہ کہنا پڑے گا کہ یگانہ غالب کو سمجھتے ہی نہیں۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے مشورہ کے مطابق "غالب شکن" کے مصنف کا جواب خاموشی ہونا چاہیے۔ اس کی تردید میں خامہ فرسائی بیکار سی بات ہے۔ اردو داں پبلک مذاق سلیم سے اتنی عاری نہیں ہے کہ یگانہ کی ہمنوا ہو سکے۔ البتہ "غالب شکن" سے وہ مقامات ضرور دکھانا چاہتا ہوں جہاں اُنھوں نے ذوق شعر فہمی کے عجیب و غریب کرشمے دکھائے ہیں۔ غالب ؎

پڑھتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز　　لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

فرماتے ہیں "یہ مکتب غم کہنا کافی تھا۔ لفظ دل فضول بھرتی کے لیے وزن پورا کرنے کے لیے لایا گیا"۔ کیا خوب! غم دل نہ کہا جاتا تو عشق کا مفہوم کیونکر ادا ہوتا مجرد غم میں تو اس کی صلاحیت نہیں جب تک سیاق و سباق میں کوئی اشارہ اس طرف نہ ہو۔ پھر ارشاد ہوتا ہے "غالب نے اپنے نزدیک تو لفظ 'رفت و بود' سے ایک طرح کی جدت پیدا کرنی چاہی مگر دہقانیت کی کھر اندر آنے لگی"۔ معلوم نہیں یگانہ کو دہقانیت میں اتنی مہارت کہاں سے حاصل ہوئی۔ رفت گیا بود تھا عام طور پر چھوٹے بچے سبق اسی انداز سے یاد کیا کرتے

ہیں۔ غالب سے ان الفاظ میں مکتب کی صحیح تصویر کھینچی ہے۔ آپ کو دہقانیت کی کھراند آنے لگی۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ غالب ؎

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

فرماتے ہیں "یہ شعر بندیوں کا سا ہے مضمون بھی نیا نہیں دیکھیے خواجہ حافظؒ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ

یگانہ کے نزدیک یہ دونوں شعر متحد المعنے ہیں۔ اب تو آپ قائل ہوئے ان کی سخن فہمی کے! غالب کے دوسرے مصرعہ کی برجستگی اور "زود پشیماں" کا سا لطیف طنز خواجہ حافظؒ کے شعر میں کہاں۔ خواجہ حافظ تو عاشق کی نماز جنازہ میں معشوق کی شرکت کی وجہ حصول ثواب کی غرض بتا کر اس کو نرم دل قرار دیتے ہیں مرگ عاشق پر تاسف اپنی جفاؤں پر پشیمانی ترک جفا سے در پردہ عاشق کی محبت کا اعتراف "ان جملہ مطالب سے خواجہ کے شعر کو کوئی تعلق نہیں اور یہی وہ مضامین ہیں جنھوں نے غالب کے شعر کو لطیف تر اور بلند تر بنا دیا ہے۔ یہ شعر بندیوں کا سا ہے؟ اگر کوئی شخص دو چار ہی ایسے شعر کہہ دے تو اُس کے شاعر ہونے میں شک نہیں ہو سکتا۔

غم عشق جاں گسل ہے یہ کہاں بچیں کہ دل ہے غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ "عرفی کے اس شعر

غم نشئے ست خوردنی اما ز خوان عشق نے اہل روزگار غم روزگار چیست

سے رنگ اُڑا کر کہنا چاہا مگر اس کی بلندی کو نہ پہونچ سکے" کاش یگانہ صاحب یہ سمجھ سکتے کہ غالب غم کو لازمی اور عرفی اس کو اختیاری سمجھتے ہیں اور دونوں کے خیالات میں یہی مرکزی اختلاف ہے۔ غالب ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم اُلٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

کا مقابلہ عرفی کے اس شعر سے کیا گیا ہے ؎

وقت عرفی خوش کہ کشود ندچوں بر روئے مش بر در نکشود ہ ساکن شد در دیگر نہ زد

غالب بندگی میں بھی شان خودداری و استغنا کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہتا۔ وہ حصول مقصد کے لیے ذلت گوارا نہیں کر سکتا اس کے برعکس عرفی نہ صرف ناخواندہ مہمان بننا گوارا کر لیتا ہے بلکہ یگانہ کے الفاظ میں بند دروازے کے پاس دھونی دیدیتا ہے۔ حصول مقصد کے لیے کوشش کرنا کوئی بُری چیز نہیں لیکن عزت نفس کو قربان کر دینا مذموم ہے۔ اس شعر کے ساتھ غالب کی زندگی کا وہ واقعہ بھی ذہن میں رکھیے جب وہ دلی کالج کی پروفیسری کے لیے گئے تھے لیکن شایانِ شان استقبال نہ ہونے کی وجہ سے واپس چلے آئے تھے۔ غالب سطح عام سے بہت بلند تھے۔ پھر بھی یگانہ کے نزدیک غالب کا شعر پست ہے۔ غالب ؎

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں　　گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

ارشاد ہوتا ہے "یہ کوئی شعر نہیں کلام موزوں ہے اگلے لوگ بھی کہہ گئے ہیں۔ حزیں سے

چہ شد ار توبہ زمے کردہ ام اے سرو سہی　　پیش ابر کرم پیرمغاں این ہمہ نیست

لالہ خاتون

من اگر توبہ زمے کردہ ام اے سرو سہی　　تو خود ایں توبہ نہ کردی کہ مرا مے نہ دہی

لالہ خاتون کی نقل اُتارنے کو اُتاری مگر کوئی خوبی پیدا نہ ہوئی"

غالب کا شعر تو شعر نہیں کلام موزوں ہے۔ حزیں اور لالہ خاتون کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے اور اور ہاں ان دونوں میں سے چور کس کو قرار دیا جائے گا؟ حزیں اور لالہ خاتون دونوں باوجود توبہ کر لینے کے ساقی سے شراب مانگتے ہیں۔ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ غالب توبہ کا اتنا پاس تو کرتے ہیں کہ بزم مے سے تشنہ کام چلے آتے ہیں اور دل ہی دل میں افسوس و استعجاب کرتے ہیں کہ ساقی کو کیا ہوا تھا۔ شعر کے تیور بتا رہے ہیں کہ اگر ساقی شراب دیتا بھی تو شاید وہ اوپری دل سے توبہ کا عذر کرتے ساقی کو زبردستی پلا دینی چاہیے تھی۔ غالب کا انداز بیان نہایت بلیغ ہے۔ میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں۔ پینے مجھے شراب کا اسقدر شوق ہے اور ساقی بھی میرے اس شوق سے بخوبی واقف تھا۔ حزیں اور لالہ خاتون کے اشعار میں یہ پہلو نہیں۔ افسوس ہے کہ "ساقی کو کیا ہوا تھا" اس ٹکڑے کی خوبی سے بیگانہ بیگانہ ہی رہے۔ غالب

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا　　آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

فرماتے ہیں "واہ بھئی واہ یہ کیسی شاعری ہے تاخیر ہوئی تو سبب تاخیر بھی ہوگا ہاں ضرور ہوگا کسی نے لگام پکڑ لی ہوگی مگر اس میں کیا شاعرانہ خوبی ہے بات تو سچی ہے مگر ہر سچ اور موزوں کلام پر شعر کا اطلاق نہیں ہوتا"
سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا ست۔

معشوق نے آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن کسی وجہ سے دیر ہوگئی جب آیا تو معذرت کی کہ مجھے دیر ہوگئی۔ شاعر جواب میں کہتا ہے جی ہاں میں جانتا ہوں دیر ہوگئی تو آخر اس کی کوئی وجہ بھی تو ہوگی۔ کوئی صاحب (رقیب) آ گئے ہونگے۔ آپ آنا چاہتے تھے مگر انھوں نے روک لیا۔ اُن کے پاس خاطر سے آپ نہ آسکے یہاں تک کہ وعدہ کا وقت بھی ٹل گیا۔ رقیب آپ کو عزیز ہیں میرا کوئی پاس نہیں حتےٰ کہ وعدہ کا بھی خیال نہیں اس لطیف خیال کا مضحکہ نگار نہ یوں کرتے ہیں کہ اس کا مقابلہ

ایک دو تین چار　　پانچ چھ سات آٹھ

سے کرتے ہیں۔ کیا سخن فہمی ہے سبحان اللہ! غالب سے

وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو — جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا

اعتراض ہے "کہتے ہیں کہ جس شخص کو غالب کا سا روزِ سیاہ نصیب ہو تو وہ رات کو دن نہ کہے تو کیونکر بنے مگر یہ اُلٹی گنگا بہائی ہے جسے روزِ بد روزِ سیاہ کا سامنا ہو اُس کی آنکھوں میں تو روزِ روشن بھی اندھیرا ہو جاتا ہے دن کو رات سمجھنے لگتا ہے نہ یہ کہ رات کو دن کہنے لگے اندھیرے کو اُجالا سمجھنے لگے بعض اوقات شاعر کہنا چاہتا ہے کچھ اور کہہ جاتا ہے کچھ اور اپنی دھن میں کچھ نہیں سوجھتا غالب تو اس بات میں خاص طور پر بدنام ہیں" سبحان اللہ۔ واہ مرزا یگانہ آپ نے تو کمال کر دیا! یہ سخن فہمی نہیں اعجاز ہے اعجاز!! جناب والا غالب یہ کہتے ہیں کہ مجھے ایسے روزِ بد کا سامنا ہے جس کی سیاہی کے سامنے رات کی تاریکی بھی کوئی چیز نہیں۔ میرے روزِ سیاہ کے مقابلہ میں کالی رات بھی دن کا حکم رکھتی ہے وہی اردو شاعری کا محبوب مبالغہ ہے اگر آپ نہ سمجھیں تو کیا علاج!

دیگر اعتراضات سے قطع نظر یہ چند باتیں وہ تھیں جن سے میرزا یگانہ کی سخن فہمی نمایاں ہوتی ہے نا ارباب نظر سمجھ لیں گے کہ مرزا کی رائے کس وقعت کی مستحق ہے۔

ہم سیہ کاروں کو یارب تو مسلماں کر دے

(جناب مولوی سید سراج الحسن صاحب ترمذی وکیل ہائیکورٹ)

ہم سیہ کاروں کو یارب تو مسلماں کر دے — نورِ توحید سے سینوں کو فروزاں کر دے

تو اگر چاہے تو لے ذرہ نوازی کو نین — مور کے گھر میں سلیمان کو مہماں کر دے

نورِ اقبال سے روشن تھا ہمارا ماضی — حال کو بھی تو اُسی طرح درخشاں کر دے

چھائی ہیں غم کی گھٹائیں اُنھیں کر دے کافور — مشکلیں آکے پڑی ہیں اُنھیں آساں کر دے

پھونک دے روحِ بلالِ حبشی کی ہم میں — عشقِ احمد میں ان آنکھوں کو درافشاں کر دے

سوزشِ غم کا جہاں میں نہیں درماں کوئی — مرہمِ زخم کا تو غیب سے ساماں کر دے

جمع ہیں کفر کے بیڑے جو سمندر میں اُنھیں — قہر کی تند ہواؤں سے پریشاں کر دے

مثلِ آئینہ بنا کر دلِ ہر مسلم کو — جوہرِ ملتِ بیضا کو نمایاں کر دے

سوزشِ غم سے ہر اک دل میں حرارت پہونچا — نورِ ایماں سے ہر اک سینہ کو تاباں کر دے

دیکھے پھر نشو و نما ابرِ کرم سے اپنے — کشتِ ملت کو ہرا رحمتِ یزداں کر دے

باغِ اسلام کے تاراج کو جو اُٹھے ہیں — کر کے ناکام اُنھیں سر بگریباں کر دے

نظرے خوش گذرے

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس گذشتہ اپریل میں بمقام بمبئی منعقد کرکے مسٹر جناح نے خود ہی ایک تجویز یہ
منظور کرائی کہ آئندہ صوبجاتی انتخابات لڑنے کے لیے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ بنایا جائے اور اس بورڈ
کے اراکین کی نامزدگی کے تمام اختیارات اپنے ہی ذمے کرکے جناح صاحب مسلم لیگ ہی کے نہیں بلکہ بزعم
خود مسلمانان ہند کے ڈکٹیٹر (قائد اعظم) بن گئے۔ یہاں تک بھی مضائقہ نہ تھا مگر جناح صاحب نے اپنی شان
قیادت، قائم رکھنے کے لیے جو بورڈ بنایا ہے وہ عجیب معجون مرکب ہے۔

پہلی جدت تو یہ ہے کہ اس بورڈ میں مسلم لیگ کے علاوہ دوسری سیاسی مجالس کے نمائندے بھی شریک
ہیں حالانکہ سیاسی نصب العین اور اپنے طریق کار کے لحاظ سے یہ سب مجالس ہم رنگ نہیں ۔۔۔ پہلے جو کسی
زمانہ میں ایک یونٹی بورڈ قائم ہوا تھا وہ بھی اسی تماش کا تھا۔ اب گویا وہ گلزار نسیم کے تاج الملوک کی طرح
حوض میں غوطہ لگا کے دفعۃً نیا چولہ بدل کر نمودار ہوا ہے۔

دوسری ندرت یہ ہے کہ بورڈ کے اراکین خود اپنی اپنی جماعتوں کی طرف سے منتخب نہیں ہوئے ہیں
بلکہ قائد اعظم نے جس کے سر پر رکنیت کی ٹوپی رکھ دی وہ رکن منتخب ہو گیا اس لیے بورڈ میں کسی قسم کا
تناسب و توازن نہیں پایا جاتا۔ ایک طرف جمعیۃ العلما اور مجلس احرار کے قانون شکن نمائندے مسٹر جناح کے
جھنڈے تلے جمع ہیں تو دوسری طرف نامی گرامی زمیندار اور تعلقدار اُن کے تحت قیادت کے قریب
تشریف فرما ہیں۔

مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو انتخابات میں کس حد تک کامیابی ہو گی اس کا اندازہ سر دست مشکل ہے۔
دیگر تمام صوبجات ہند کے تفصیلی حالات کا علم نہیں البتہ اتنا ضرور معلوم ہے کہ صوبہ متحدہ، پنجاب اور
مدراس میں اس بورڈ کا خیر مقدم سرگرمی سے نہیں کیا گیا بلکہ تینوں صوبوں میں ممتاز افراد کی قوی جماعتیں
اس کی مخالفت کر رہی ہیں۔ حتے کہ وہ بہت سے لوگ جو مسلم لیگ میں ابتدا سے یا عرصہ سے شریک
ہیں یا وقتاً فوقتاً اُس کے ذمہ دار عہدہ دار رہے ہیں وہ بھی مسٹر جناح کی قیادت قبول کرنے کے بجائے
اُس کے بورڈ کی مخالفت کر رہے ہیں اور آل انڈیا مسلم لیگ کے جدید سکریٹری نواب زادہ لیاقت علی خاں
صاحب تک میں بھی بورڈ کے ساتھ چنداں وابستگی نہیں نظر آتی بلکہ اُن کا رجحان بھی دوسری طرف ہے۔
اس کا باعث کیا ہے؟ یہی کہ مسٹر جناح کے سامنے کوئی محکم سیاسی اصول نہیں ہے۔ اُنھوں نے

ایسے تمام لوگوں کو اس بورڈ میں شریک کرنا چاہا ہے جو اپنے اپنے صوبوں میں کچھ اثر رکھتے اور مسٹر جناح کی قیادت قبول کرنے پر آمادہ ہیں ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسٹر جناح کانگریسی رجحان رکھتے ہیں اور وہ صوبجاتی کونسلوں میں ایسے لوگوں کو منتخب کرانا چاہتے ہیں جو کانگریس کے نمائندوں کے ساتھ اشتراک عمل کرکے جدید آئین کو ناکامیاب بنائیں۔ یہ خیال غلط ہے ۔ اگر ایسا ہوتا تو مسٹر جناح ایسے اصحاب کو بورڈ میں شامل نہ کرتے جیسے کہ نواب چھتاری، نواب یوسف، راجہ سلیم پور اور راجہ محمود آباد وغیرہ صوبجات متحدہ میں ہیں ۔گو ہر دو نوابین بورڈ سے مستعفی ہوگئے اور ساری قوت اپنی جماعت زمینداران کی تنظیم پر صرف کر رہے ہیں اور غالباً جناح بورڈ کی مخالفت میں اپنے نمائندے بھی کھڑے کریں گے ۔مگر ہر دو راجگان ابھی تک جناح بورڈ میں شامل ہیں۔ اگرچہ یہ دونوں اصحاب اس تنظیم میں بھی شریک ہیں جو کانگریس اور جناح بورڈ کے مقابلہ میں صف آرا ہونے والی ہے ۔ اور ان کے ذاتی حالات اور آئینی حیثیت پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ دونوں نوابوں سے زیادہ یہ راجگان حکومت اور عمال حکومت کی رضاجوئی پر مجبور ہیں ۔ ایسے مجبور و بے بس لوگوں سے اس کی توقع کرنا کہ وہ عمال حکومت کے منشا کے خلاف علی الاعلان کانگریسی اور آزاد خیال لوگوں کا ساتھ دیں گے خود اپنے فہم و تدبر کی تحقیر کرنا ہے ۔

ان میں سے ایک صاحب وہ ہیں جو کچھ عرصہ سے زعمائے قوم میں شمار ہوتے ہیں اور مسلم کانفرنس کے وجود میں آنے سے قبل مسلم لیگ میں شریک تھے لیکن سوائے عہدوں کی طلب اور ذاتی اثر و اقتدار میں اضافہ کی خواہش کے ان کا کوئی کارنامہ پیش نہیں کیا جا سکتا ۔ڈسٹرکٹ بورڈ کی صدارت سے لے کر وزارت اور ہوم ممبری تک کس خالی اسامی پر امیدواری کے لئے کھڑے نہیں ہوئے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہر دو نوابین کی طرح قسمت نے یاوری نہیں کی اور ہر دفعہ کامیابی سے محروم رہے ۔پھر بھی وائسرائے اور گورنر کی چوکھٹ نہیں چھوٹتی اور ہر گورے چمڑے والے افسر کے لیے ہمہ وقت فرش راہ بننے کو تیار ہیں ۔بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است ۔

رہے دوسرے صاحب وہ ماشاء اللہ ابھی حال ہی میں مسند نشین ہوئے ہیں ۔ اور ان تمام خطابات و اعزازات کی بجا طور پر تمنا رکھتے ہیں جو اُن کے نامور جد امجد اور نامور تر والد ماجد کو حاصل تھے ۔ یہ ضرور ہے کہ مسٹر جناح اُن کے مربی رہ چکے ہیں اور یار دیرینہ بخیر ہمارے دوست چودھری خلیق الزماں صاحب اُن کی ریاست کے نمک خوار قدیم ہیں اور اگر یہی دونوں حضرات اُن کے جاہ و مرتبہ کے بڑھانے میں سعی فرمائیں گے تو کیا آسمان پر سے فرشتے نازل ہو کر اس خدمت کو انجام دیں گے ۔لیکن جس طرح سونے کی مورتیوں اور

جواہرات کے مجسموں میں جان نہیں ڈالی جا سکتی اسی طرح ناز پروردہ تعلقدار حکومت کے مقابلہ میں میدان داری کے قابل نہیں بنائے جا سکتے۔

اسلامی سیاسیات کو ابتدا سے انھیں مرغان زریں بال و پر کی وجہ سے شدید نقصان پہونچا ہے اور ایسی صورت میں کہ خود مسٹر جناح عالمگیر شہرت والے آغا خان تک سے مایوس ہیں ان جیسے لوگوں سے مسلمان کیا توقع کر سکتے ہیں۔

ہمیں زیادہ قلق اور افسوس اس کا ہے کہ ہمارے محترم مخاطبین جمعیۃ العلماء ہند (قدیم) نے کیوں اس بورڈ میں شرکت گوارا کی جمعیۃ العلما کا نصب العین کامل آزادی ہے اور گذشتہ سنین میں وہ برابر کانگریس کے دوش بدوش قانون شکنی کراتی رہی ہے اور ترک موالات کے دور میں تو اُس کی تنظیم ہی ہوئی تھی۔ جہاں تک ہمیں علم ہے اُس نے ابھی تک مجلس خلافت کی طرح ترک موالات کو منسوخ نہیں کیا ہے پھر آج کیا ہے کہ وہ بھی مسٹر جناح کے زیر سایہ پناہ گزیں ہوگئی جو آزادی کامل، ترک موالات اور قانون شکنی جیسی خطرناک باتوں کو سُن کر کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں۔

اگر کانگریسی بورڈ میں شرکت کسی بنا پر خلاف مصلحت تھی تو جمعیۃ العلما کو اپنا بورڈ الگ بنانا چاہیے تھا یا پھر وہ اُن دو اسلامی جماعتوں کو ملا کر ایک بورڈ قائم کرتی جو اُسی کی طرح آزادی کامل کا نصب العین رکھتی ہیں یعنے مجلس اتحاد ملت اور مجلس احرار۔ اس بارہ میں سب سے خوددارانہ طرز عمل مجلس اتحاد ملت کا ہے جس نے پنجاب میں ایک زبردست یونینسٹ پارٹی بن جانے کے باوجود جناح بورڈ کی شرکت سے محض اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ اپنے کامل آزادی کے اعلےٰ تر نصب العین کو ڈومینین اسٹیٹس کے فروتر نصب العین میں مدغم نہیں کر سکتی۔ نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد۔

اور ایسی صورت میں کہ جمعیۃ العلما خود اپنے ارکین کو انتخاب میں شریک نہیں کرنا چاہتی اُسے اس قصہ میں پڑنے ہی کی کیا ضرورت ہے۔ جو کانگریسی یا آزاد خیال مسلمان تائید کے مستحق ہوتے اُن کی تائید انفرادی حیثیت سے حضرات علمائے کرام کر سکتے تھے۔ کرایہ کے سپاہی بننے کی کوئی حاجت، نہ تھی کہ کونسلوں میں جائیں تو راجہ سلیم پور اور چودھری خلیق الزماں اور ووٹروں کو ہموار کرنے کے لیے اعلانات شائع کرتے اور وعظ دیتے پھریں جمعیۃ العلماے ہند کے مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید یا جانشین شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد مدنی۔

لیکن اگر مسلمانوں میں صرف بے اصولی ہی کا سکہ رائج ہو سکتا ہے اور وقتی مصالح اور عارضی فوائد پر تمام مجالسی آئین اور سیاسی اصول قربان کر دیے جا سکتے ہیں تو حضرات علمائے کرام کو اختیار ہے کہ جس

سنہری چڑیا کو چاہیں اپنے دامن تقدس میں پناہ دیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ "ہر چمکتی چیز تو سونا نہیں" مسلم کانفرنس کی شرکت کے بعد یہ دوسری غلطی ہے جو جمعیۃ العلماء نے کی ہے اور انشاء اللہ اُس کے نتائج بھی جلد سامنے آجائیں گے۔

مسلمان سیاسیین کی بے اصولی اور شخصیت پرستی ہی کا یہ ثمرہ ہے کہ تیس سال کی پرانی لیگ اور اُس سے نصف عمر کی مجلس خلافت اور جمعیۃ العلماء ہند (قدیم) اور دوسری نسبتاً کم عمر اسلامی جماعتوں کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانانِ ہند کی سیاست گیند دھڑ کا بنی ہوئی ہے۔ اور سیاست ہی پر کیا منحصر ہے مسلمانوں کی ساری جماعتی زندگی تباہ و برباد ہو رہی ہے۔

مصر و عراق، شام و فلسطین ہندوستان کے مقابلہ میں بہت چھوٹے چھوٹے رقبے ہیں اور آٹھ کروڑ مسلمانانِ ہند کے مقابلہ میں اُن کی مجموعی آبادی بھی کسی شمار کے لائق نہیں مگر اس کے باوجود اپنی عزت آبرو۔ اپنی آزادی و خودداری کے لیے جو قربانیاں اُنھوں نے کی ہیں ہم اُس کا عشر عشیر بھی نہیں کر سکے مہاتما گاندھی کا بھلا ہو کہ اُن کے طفیل میں قید و بند کا خوف ہم میں سے بعض کے دلوں سے نکل گیا ہے لیکن انفرادی تفوق اور ذاتی اقتدار کا جن اتنا زبردست ہے کہ کسی طرح ہمارے سروں سے نہیں اُترتا اور اس لیے مسلمانوں کی جماعتی تنظیم اور سیاسی سربلندی سب خواب و خیال ہو رہی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الالباب

"بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت" کے عنوان سے مولوی عبدالحق صاحب نے رسالہ اُردو بابتہ اپریل میں ایک مضمون تحریر فرمایا ہے جس کے نسخے علیحدہ رسالہ کی صورت میں چھپوا کر تقسیم کیے گئے ہیں اور بعض پرچوں میں یہ نقل بھی کیا جا چکا ہے۔ اس مضمون سے معلوم ہوا کہ وہ بھارتیہ ساہتیہ پرشد (ہندوستان بھر کے ادبیات کی انجمن) کے اجلاس اول منعقدہ ناگپور میں تشریف لے گئے تھے اور اُس کی کارروائیوں سے سخت بددل و مایوس ہو کر واپس آئے۔

یہ اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا اور کانگریس کے صدر سابق و حال بابو راجندر پرشاد اور پنڈت جواہر لال نہرو بھی اس میں شریک تھے۔ جلسہ نے اس نئی مجلس کے مقصد کو واضح کرنے کے لیے یہ قرارداد منظور کی:۔

"اس پرشد (انجمن) کا ادیش (مقصد) ہوگا کہ

(الف) ہندوستان کے سب پرانتوں (صوبوں) کی بھاشاؤں (زبانوں) کے ساہتیوں (ادبوں) اور ساہتکاروں (ادیبوں) میں آپس میں میل جول کرنا اور اس نام سے بھارتیہ ساہتیوں (سرزمین ہند کے

ادیبوں) کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا۔

(ب) اس سبھا کا کام "ہندی یعنی ہندوستانی" میں ہوگا "۔

مولوی صاحب نے مہاتما جی سے کانگریس کے صدر سابق و حال کی موجودگی میں کہا کہ

" آپ نیشنل کانگریس کے فیصلہ کے ساتھ ساتھ کیوں نہیں چلتے جس نے یہ قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہوگی "۔

مگر بقول مولوی صاحب کے "کوئی ٹس سے مس نہ ہوا"۔

مولوی صاحب کو توقع تھی کہ چونکہ یہ سارے ہندوستان کے ادبیات کی انجمن ہے اور کانگریس اپنے کانپور کے اجلاس میں یہ طے کر چکی ہے کہ ملک کی اور کانگریس کی زبان ہندوستانی ہوگی اور مہاتما گاندھی جیسے اردو کے سرپرست اس اجلاس کے صدر ہیں اور کانگریس کے دو صدر اس میں شریک ہیں اس لیے قرارداد کے دوسرے حصہ میں "ہندی یعنی ہندوستانی" کے بجائے "ہندوستانی" کا لفظ رکھا جائے گا تاکہ اردو ادب کے ادیبوں کے لیے بھی اس مجلس میں گنجائش نکل سکے۔ اور اس توقع کے پورا نہ ہونے سے اُن کو شکایت پیدا ہوئی ہے۔ مگر یہ شکایت کچھ زیادہ باموقع نہیں معلوم ہوتی۔ جیسا کہ مولوی صاحب کے اس مضمون کے دوسرے حصوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے

سب سے پہلے اس نئی انجمن کی پیدائش کا حال مسٹر کاکا کالیکر صدر مجلس استقبالیہ کی زبان سے سنیے:

" ۱۹۱۹ء میں مہاراشٹر ساہتیا سمیلن منعقدہ بڑودہ میں سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا۔ اس کے بعد کولھاپور کے اجلاس میں مہاراجہ بڑودہ نے بھارتیہ ساہتیا پرشد کا خاکہ بہت موثر طریقے پر پیش کیا۔ پھر کراچی میں کانگریس کے موقع پر مسٹر کنھیا لال منشی سے جو میری بات چیت ہوئی تو اس میں بھی ہم نے ایک ایسی سوسائٹی کی ضرورت کو محسوس کیا۔ پچھلے سال جب اندور میں ہندی ساہتیا سمیلن کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا اور ہم ایک جا جمع ہوئے تو ایک مفصل تجویز اس کے متعلق منظور کی گئی جسے عمل میں لانے کے لیے مسٹر کنھیا لال منشی، ہری ہر شرما اور گردھا شرما کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ ہندی ساہتیا سمیلن کے چند مہینے کے بعد مہاراشٹر ساہتیا سمیلن کا اجلاس بھی اندور میں ہوا۔ اس نے بھی کولھاپور کے تخیل کو عمل میں لانے کے لیے ہندی ساہتیا سمیلن سے تبادلۂ خیالات کیا۔ ہندی ساہتیا سمیلن نے کاکا کالیکر، ہری بھاؤ اپادھیائے اور بابا راگھوداس کو اندور بھیجا۔ اندور مہاراشٹر ساہتیا سمیلن نے اپنی ساہتیا پرشد کو اطلاع دی کہ بھارتیہ ساہتیہ پرشد کے لیے ایک مہاراشٹر کمیٹی قائم کی جائے جو ہندی ساہتیہ سمیلن کو بھارتیہ ساہتیہ سمیلن قائم کرنے میں مدد دے۔ اسی طرح کرناٹک اور گجرات کی ساہتیا سمیلنوں نے بھی اس تجویز کو سراہا "۔

اقتباس بالا اگر اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس انجمن کی بنیاد حامیان ہندی نے رکھی ہے تو چند مزید اقتباسات اس حقیقت کو عالم آشکارا کرنے کے لیے ملاحظہ فرمائیے۔

رسالہ ہنس (جو ہندی کے پرچار کے لیے حال ہی میں جاری ہوا ہے اور جس کے ایک ایڈیٹر اردو کے مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند ہیں) نے یہ اعلان کیا ہے کہ

"اب ہندی ملکی زبان کی صورت اختیار کرکے خاص و عام کی زبان ہو چکی ہے۔ مہاتما گاندھی جیسے ملک کے سدھارنے والے اسے زندہ ملکی زبان بنانے کا عہد کر چکے ہیں۔"

اور بابو راجندر پرشاد نے ہندی ساہتیہ سمیلن کے خطبہ صدارت میں ارشاد فرمایا کہ

"خوشی کی بات ہے کہ اس کمیٹی کی کوشش سے بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے اور اس کا پہلا اجلاس اس ناگپور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہو رہا ہے۔ اس کے ذریعے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ہندی کے پرچار کے متعلق لوگوں میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے وہ بھی دور ہو جائے گی اور ہمیں امید ہے کہ اس سے ہندی پرچار میں مدد ملے گی۔"

اس کے بعد کاکا کالیلکر صاحب نے اپنے خطبۂ صدارت میں صاف طور پر اعلان کر دیا کہ

"جن لوگوں نے اس تحریک (بھارتیہ ساہتیہ پرشد) کی ابتدا کی ہے انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ بھارت کا راشٹر بھاشا (قومی زبان) ہندی ہندوستانی میں چلایا جائے گا۔ ہماری کوشش ہو کہ تمام ہندوستان کی بھاشاؤں کی ایک ہی ہو اور سب میں ناگری لپی (رسم خط) جاری ہو جائے تاکہ وہ اپنے اپنے صوبے کی زبان کا کام ناگری میں کریں۔"

مولوی صاحب کے اصرار سے مہاتما گاندھی نے قرار دادیں "ہندی ہندوستانی" کے بجائے "ہندی یعنی ہندوستانی" بنا دیا۔ مطلب دونوں کا ایک ہے اور یہ ارتقائی منزل ہے اس جدوجہد کی جو آل انڈیا کامن لینگویج کانفرنس کی صورت میں اب سے بیس سال قبل شروع ہوئی تھی۔

آخر میں مولوی صاحب نے اپنی توقعات کی شکست پر بگڑ کر لکھا ہے کہ

"مہاتما جی اپنی تقریر میں ہندی اردو، ہندوستانی کی بحث میں بار بار ہندو اور مسلمان کے لفظ استعمال کرتے تھے ...... اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گاندھی جی کا دماغ اور خیال کس طرف رجوع ہو رہا ہے۔"

اور اپنے مضمون کو ختم یوں کیا ہے:-

"جب تک مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا کو یہ توقع تھی کہ مسلمانوں سے کوئی سیاسی سمجھوتا ہو جائے گا اس وقت تک وہ ہندوستانی ہندوستانی پکارتے رہے۔ جو تھا پیٹ کر بلانے کے لیے ڈھونگ رچا رہی تھی۔"

لیکن جب انھیں اس کی توقع نہ رہی یا انھوں نے ایسے سمجھوتے کی ضرورت نہ سمجھی تو ریا کی چادر اُتار پھینکی اور اصلی رنگ میں نظر آنے لگے ۔ وہ شوق سے ہندی کا پرچار کریں ۔ وہ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم بھی اردو نہیں چھوڑ سکتے اُن کو اگر اپنے وسیع ذرائع اور وسائل پر گھمنڈ ہے تو ہم بھی کچھ ایسے ہیٹے نہیں ۔

ایسی صورت میں ہمارے لیے اس کے سوا اب کوئی چارہ باقی نہیں کہ ہم اپنی زبان کے بچانے اور اس کی اشاعت و ترقی کے لیے کمربستہ ہو جائیں ۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے ؟ اس کے متعلق ہم ایک مفصل تجویز عنقریب پیش کرنے والے ہیں ۔

ہم اس بحث پر اپنے خیالات مولوی صاحب کی موعودہ مفصل تجویز کے شائع ہونے پر انشاءاللہ پیش کریں گے ۔ البتہ یہ عرض کرنے میں تامل نہیں کہ سالہا سال کی بے توجہی کے بعد مولوی صاحب کا اپنی زبان کے بچانے کے لیے اب بھی کمربستہ ہو جانا قابل مبارکباد ہے ۔

خدا شرے برانگیزد کہ در وے نفع ما باشد

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے منتظمین نے طے کیا ہے کہ اب کی دسمبر میں کانفرنس کی جوبلی علی گڈھ میں منائی جائے جس کے لیے انتظامات شروع کر دیے گئے ہیں ۔ اسی سلسلہ میں ایک تجویز یہ ہے کہ "مسلمانان ہند کی تعلیم و ترقی کے متعلق انعامی مضامین" لکھوائے جائیں ۔ چنانچہ اس غرض کیلیے جو اعلان کانفرنس کی جانب سے شائع کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا انعام پانچسو روپیہ کا ، دوسرا تین سو روپیہ کا اور تیسرا دو سو روپیہ کا دیا جائے گا ۔

"انعامی مضمون" کے لیے جو سوالات مرتب کیے گئے ہیں وہ تمام اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں ۔ علوم جدیدہ، علوم قدیمہ، مسلمانوں کے مخصوص مدارس، صنعتی اور حرفتی تعلیم، افلاس مانع تعلیم کے خاص عنوانات پر سوالات قائم کیے گئے ہیں نیز چند عام سوالات میں جنکے ذیل میں زبان اُردو کا تحفظ اور اس کو ہندوستان کی عام اور مشترکہ زبان بنانے کا مسئلہ بھی ہے ۔

اگر کسی صاحب کی نظر سے یہ اعلان نہ گذرا ہو اور وہ تفصیلات جاننے کے خواہشمند ہوں تو کانفرنس کے دفتر سے منگالیں ۔

کانفرنس کے ارباب حل وعقد کو شاید یاد ہو کہ ۱۹۰۲ء میں دربار تاجپوشی کے موقع پر دہلی میں جب کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا تو کانفرنس نے چند شعبہ جات قائم کیے تھے جنمیں سے انجمن ترقی اُردو کے نام کا شعبہ اب تک موجود ہے

اور مولوی عبدالحق صاحب کے انتظام میں سال بسال اچھی اچھی کتابیں شائع کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح ایک شعبۂ اصلاح تمدن تھا جسکے معتمد مرحوم خواجہ غلام الثقلین تھے۔ چند سال تک تو شعبۂ اصلاح تمدن کا کام پوری سرگرمی سے ہوتا رہا اسکے بعد معتمد شعبہ اور مشقلین صدر دفتر کانفرنس کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے اور یہ شعبہ حالت تعطل میں پڑگیا۔ دسمبر ۱۹۱۲ء میں جب کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تو اسی ماہ کے الناظر میں اس صورت حال پر خاص طور سے ارباب کانفرنس کو توجہ دلائی گئی اور آخر میں التجا کی گئی تھی کہ

"اگر خدانخواستہ اختلافات اس قسم کے ہیں کہ اُن کا رفع ہونا ناممکن ہے اور کوئی کارآمد سلسلہ ارتباط نہیں قائم ہوسکتا تو کم سے کم ارکین کانفرنس کا یہ فرض تو ضرور ہونا چاہیے کہ وہ کسی دوسرے شخص کو اس بارگراں کا متحمل قرار دیں"

چوبیس سال گذر گئے اور آج تک کانفرنس کے اس اہم شعبہ کی تجدید نہوئی۔ بلکہ شاید اب بہت سے اصحاب کو یہ بھی یاد نہو کہ کبھی کانفرنس کا کوئی شعبہ اصلاح تمدن کے نام سے بھی تھا۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو آج مسلمانوں میں جتنی خرابیاں اور ابتریاں نظر آتی ہیں اُن سب کی تہ میں اُنکا غیر اسلامی تمدن ہی پایا جائیگا۔

اُس وقت کے مقابلہ میں کانفرنس کی حالت بہت بہتر ہے اور اُسکے وسائل اور کارکنوں کی تعداد میں اتنا اضافہ ہوگیا ہے کہ اگر اُسکے ارباب حل وعقد کو اس ضرورت کا احساس ہوجائے تو شعبۂ اصلاح تمدن کی تجدید غالبًا چنداں مشکل نہ ہوگی۔

کانفرنس کی جوبلی کے موقع پر ہم ایک بار پھر توجہ دلانے کی جرأت کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ کانفرنس کے آنریری سکریٹری عالیجناب نواب صدر یار جنگ بہادر جو علاوہ دوسری خصوصیات کے روشن خیال عالم دین بھی ہیں شعبۂ اصلاح تمدن کو از سر نو قائم فرما کر قوم کی ایک بہت بڑی ضرورت کو رفع کرنے کا انتظام فرمائیں گے۔

رسالہ عصمت کا راشد الخیری نمبر یکم جولائی کو خاص اہتمام سے شائع ہوا ہے۔ حجم ۲۰۲ صفحے۔ مرحوم کے مختلف زمانوں کے ۴ فوٹو اور عکس تحریر مستزاد۔ نثر و نظم کے اس مجموعہ کے مطالعہ سے نہ صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کو کس قدر ہر دلعزیزی حاصل تھی بلکہ اُس سے اُن کی اعلےٰ سیرۃ اور خدمات قومی وادبی کے تفصیلات معلوم کرکے بہت کچھ سبق حاصل کیا جاسکتا ہے۔ امید ہے کہ طبقۂ نسواں جس کی خدمت میں مرحوم نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا اس یادگاری پرچہ کی پوری قدر کرے گا۔ قیمت عہ فی پرچہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سرگذشت ایام غدر

میں نے قبل اس کے کبھی ارادہ لکھنے سرگذشت ایام غدر اپنے کا نہیں کیا اور نہ اُن ناچیز خدمات کو ضبط تحریر میں لایا جو اُس ہولناک زمانہ میں اس ادنیٰ ملازم برٹش گورنمنٹ سے بتائید ایزدی کامیابی کے ساتھ انجام پائیں لیکن چونکہ اب اُس وقت کے لوگ بہت کم رہ گئے ہیں اور میں بھی چراغ سحری ہوں لہذا میں صرف اُن واقعات کو جو مجھ پر گذرے یا مجھ سے سرزد ہوئے اس غرض سے مختصراً قلمبند کیا چاہتا ہوں کہ میری اولاد اس کی تقلید کرے اور نیکنامی خاندان قائم رہے۔ و نیز اُن نوجوانان کوتاہ اندیش کو عبرت و نصیحت ہو جو بعض اقطاع ملک میں براہ شرارت و نادانی خلق اللہ کو نقصان عظیم پہنچا کر اپنے اور اپنی قوم کو "سواد الوجہ فی الدارین" کر رہے ہیں۔

میں نہیں چاہتا کہ اپنے خاندانی اعزاز اور تفصیلی حالات اُس کے سے سامع خراشی ناظرین کی کروں یا اپنے ذاتی واقعات ایام غدر کو اُس کی وجہ سے طوالت دوں۔ تاہم بغرض آغاز سلسلہ حالات اپنے کے اظہار ان امور کا بھی ضرور ہے کہ بزرگاں میرے ہندوستان زا نہ تھے اور نہ مجھ میں ہندوستانی خون شامل ہے۔ میرے دادا سردار غلام محی الدین خاں از قوم بارک زئی پٹھان باشندۂ کابل اور میرے نانا سردار غلام علی خاں از قوم غلزئی پٹھان باشندۂ غزنی تھے۔ سو سوا سو برس گذرے ہونگے کہ وہ دونوں بوجہ نااتفاقی و عداوت باہمی شاہ اور وزیر کے اپنے اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر مع خاندان اور نقد و جنس اپنے کے (جو لا سکے) بمقام لدھیانہ علاقہ پنجاب میں آکر بعد قیام چندے اول الذکر نے ہندوستان میں بمقام کلکتہ عام تجارت اور آخر الذکر نے بمقام سلہٹ خاص تجارت ہاتھیوں سے بہت کچھ نفع اُٹھایا۔ افسوس کہ غلام محی الدین خاں بعالم جوانی شیر کے شکار میں ہلاک ہوئے اور اُن کے مرتے ہی کارخانہ تجارت کا بوجہ کم سنی سردار یحییٰ خاں عرف سردار خاں والد میرے کے درہم برہم ہو گیا البتہ نقد و جنس لاکھوں روپیہ کا ہاتھ آیا۔ میری

[illegible] نے بصلاح احباب مرحوم کے اعلیٰ ترین مدرسہ میں (جو اُس وقت بمقام کلکتہ تھا) میرے والد کو بھرتی کرایا اور وہ چودہ برس تک برابر مدرسہ مذکورہ میں پڑھا کیے۔ جب اعلیٰ درجہ کی تعلیم تمامی علوم انگریزی فارسی و عربی وغیرہ میں ختم ہو چکی تو وہ بموجب قانون ہفتم ۱۸۲۲ء کے کہ اُسی زمانہ میں اجرا اُس کا ہوا تھا ڈپٹی کلکٹر مقرر ہو کر ضلع الہ آباد ممالک مغربی شمالی میں تعینات ہوئے۔ تب سے الہ آباد میں ابتدا بود و باش کل خاندان کی ہوئی اور اب وہ مثل وطن کے ہو گیا ہے۔ میں مہینہ مئی سنہ [illegible] میں بمقام الہ آباد پیدا ہوا۔ سنہ ۱۸۵۰ء میں جبکہ میں سولہ برس کا ایک طفل مکتب تھا بوجہ اعزاز خاندانی اور رعایت حکام کے ضلع باندہ میں نائب تحصیلدار حضور تحصیل کا مقرر ہوا اور پھر ستمبر ۱۸۵۴ء میں بعد دینے ایک امتحان معقول عہدۂ تحصیلداری کے قائم مقام تحصیلدار جیت پور ضلع ہمیرپور مقرر ہو کر اسی سال میں بہ ترقی تنخواہ مستقل تحصیلدار مہوبہ ضلع مذکور مقرر ہوا۔ وہاں کام بندوبست کا جاری تھا اور مسٹر جارج ہملٹن فریلنگ صاحب بہادر مہتمم بندوبست تھے۔ اُن کو میری دیانت و لیاقت و جفاکشی پر بہت بھروسہ و تجربہ تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ ۱۸۵۶ء یا اخیر ۱۸۵۵ء میں وہاں کا کام ختم کر کے ضلع جالون میں ڈپٹی کمشنر مقرر ہوئے تو فوراً مجھ کو بلا کر خاص جالون میں جہاں کا کام نہایت سخت و دشوار طلب تھا بعطائے اختیارات دیوانی و فوجداری و مینوسپلٹی وغیرہ کے تحصیلداری درجہ اول پر مقرر فرمایا۔ یہ مقام پہلے بہت آباد و پُر رونق تھا اور بزمانۂ عملداری مرہٹوں کے وہ دارالریاست اُن کا تھا۔ گرد و پیش کی ریاستیں ماتحت اس کی تھیں۔ انگریزی میں وہاں کے راجہ کو صرف پانچ چھ ہزار روپیہ ماہوار بطور وظیفہ کے ملا کرتا تھا۔ میرے وقت میں تائی بائی صاحبہ وہاں کی رئیسہ تھیں اور وہ مع خاندان اپنے کے قدیم محلات بیرون قلعہ (اس قلعہ کا مفصل حال آئندہ لکھا جاوے گا) میں رہا کرتی تھیں۔ اور میں مع زوجہ و دیگر مرد و زن ملازمان وغیرہ اپنے کے محلات اندرون قلعہ میں جو شیش محل و راجہ منزل وغیرہ کے نام سے موسوم تھے رہا کرتا تھا۔ اور کل عدالتیں اور کچہریاں مع دفتر و خزانہ وغیرہ کے وہاں نہایت وسیع اور عمدہ مکانات میں واقع تھیں۔ اور جملہ چپراسیان تحصیل اور مذکوریان دیوانی و برقندازان تھانہ وغیرہ مع تھانہ دار و بعض دیگر عمال ہر صیغہ کے وہیں علیحدہ علیحدہ مکانات میں بفراغت تمامی باتحتی میری رہا کرتے تھے۔ اور گو یہ مقام جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے اگلی رونق پر نہ تھا تاہم تمام ضلع میں بہ نسبت دیگر مقامات کے نہایت آباد و پُر رونق تھا۔ متمول مہاجنان و آسودہ حال بقالان سے یہ جگہ بہت آباد تھی دیوانی میں بھی کثرت مقدمات کی اعلیٰ درجہ سے رہا کرتی تھی۔ مگر باوجود ان سب باتوں کے صدر مقام اورئی میں تھا۔

جو وہاں سے تخمیناً دس میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ شاید وجہ اس کی یہ ہو کہ مقام اورئی وسط ضلع میں لب سڑک جھانسی و کانپور کے واقع ہے اور گو وہ مثل ایک گانوں کے ہے جس میں بجز چند گھر غریب بنیوں کے کوئی متمول نہ تھا البتہ بوجہ قیام و بود و باش وکلا و دیگر عمال و کسی قدر فوج (دو کمپنیاں ۵۳ رجمنٹ) کے اُس کو بہ نسبت اور جگہ کے خصوصیت و امتیاز حاصل تھا۔ تاہم یہ ضلع بہ لحاظ اگلی عظمت و شان مقام جالون کے اُسی کے نام سے مشہور اور موسوم رہا اور غالباً اب بھی ہے۔ گورنمنٹ کے پاس کچھ فوج نہ تھی مگر واسطے قائم رکھنے شان ریاست کے پندرہ بیس سوار جن میں ایک چہارم مرد اور باقی نہایت خوشرو اور جوان عورتیں تھیں سواری کے وقت ان کی اردلی میں بطور جلو کے نہایت عمدہ اور چست لباس میں رہا کرتی تھیں۔ اور اُن کے شوہر بھی نہایت ہی بے تکلفی کے ساتھ اُن کے گھوڑے کے ذرا پیچھے رہا کرتے تھے۔ تائی بائی صاحبہ کی عمر تخمیناً ۲۸ برس کی ہوگی۔ وہ نہایت خلیق و چست و چالاک و گھوڑے کی شہسوار و مہذب تھیں۔ اور بارہا مجھ کو بھی بوجہ خلق اور اصرار اُن کے و اُن کے شوہر کے اتفاق گھوڑا دوڑانے کا اُن کے ساتھ بطور گھوڑ دوڑ کے دو ایک میل تک رہا کیا۔ اور کبھی کبھی اُنھوں نے بعض تقریبات میں اپنے گھر پر بلا کر اپنی خاص رسوئی سے عمدہ و لذیذ کھانے کھلا کر دعوت میری کی۔

مجھ کو بہت دن وہاں نہ گذرے تھے کہ بدقسمتی سے فرلنگ صاحب بوجہ وفات میم صاحبہ اپنی کے ولایت تشریف لے گئے اور چارج دیتے وقت کپتان برون صاحب جانشین اپنے کو میرے حالات و اعزاز سے اچھی طرح آگاہ کرتے گئے کہ وہ بھی میرا وقار و اعتبار مثل اُنکے کرتے رہے۔ قریب زمانہ غدر میں اول تو تقسیم روٹیوں پر جس کی تعمیل ایک عجیب و غریب طور پر بذریعہ چوکیداران کے دیہہ بدیہہ آناً فاناً تمام ملک میں بلا مزاحمت پھیل گئی اور پھر پتہ اسکا نہ لگا کہ کہاں سے ابتدا اس کی ہوئی۔ لوگوں کو سخت حیرت و ہیبت ہوئی۔ دوسرے ایک فقیر بزرگ صورت کی اس ہولناک صدا پر کہ دربدر گشت کناں پکارتا پھرتا تھا اور کسی سے باوجود اصرار کچھ نہ لیتا تھا۔ کہ "اے بابا لوگو چڑیاں اُڑ گئیں انڈے گندے ہو گئے بھول کے جھول" لوگ نہایت خائف تھے کہ گویا وہ کسی تباہی آئندہ کی پیشینگوئی سے متنبہ کر رہا ہے۔ لیکن یہ نہ معلوم تھا اور نہ اس کا وہم و خیال تھا کہ تھوڑے ہی دن بعد ایسا حشر برپا ہوگا جیسا کہ غدر میں ہوا۔ لوگ اسی سوچ میں تھے کہ یہ روٹیوں کا ماجرا کیا ہے کونسی قوت ایسی غالب و سریع الاثر ہے کہ طرفۃ العین میں اس کی تعمیل قریب قریب تمام جگہ ہفتہ میں ہو گئی اور کوئی پرسان حال یا مزاحم اس کا نہ ہوا۔ اور اس فقیر کو

کیا ہوگیا تھا کہ بغیر کسی طمع کے ایسی بے تکی ہانک لگاتا پھرتا تھا کہ اس کے تھوڑے ہی دن بعد (غالباً وسط مئی ۱۸۵۷ء میں) یکایک یہ افواہ پھیلی کہ میرٹھ وغیرہ میں جدید کارتوس کاٹنے کے جھگڑے میں جو گائے و سؤر کی چربی سے بنے تھے غدر ہوگیا ہے۔ اور کل ہندو مسلمان سپاہیان فوج انگریزی نے متفق ہو کر اپنے افسران کو مار کر بنگلے جلا دیے ہیں۔ اور شہر والوں نے بھی اس مذہبی تکرار میں ساتھ اُن کا دیکر ہنگامہ عظیم مچا رکھا ہے۔ میں نے ہر شخص کو یہ کہہ کر کہ ایسا ہونا ہرگز ممکن نہیں ہے بدمعاشوں نے براہ شرارت یہ تمام جھوٹی غپیں اُڑا دی ہیں برائے چندے مطمئن کیا۔ مگر بخیال اس کے کہ تمام علاقہ میں اکثر زمینداری قوم ٹھاکران شورہ پشت کی ہے اور وہی زیادہ تر آباد ہیں مبادا کوئی فساد برپا نہ ہو علاوہ اس کے خزانہ تحصیل بھی بوجہ زمانہ ادخال اقساط فصل ربیع کے حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا اور انھیں سپاہیان جنگی کے پہرہ میں تھا جن کی طرف سے کھٹکا عظیم تھا فوراً کل زر موجودات کو جو چالیس پچاس ہزار روپیہ سے کم نہ تھا بمقام اوری خزانہ صدر میں بحفاظت تمام نہایت استقلال کے ساتھ روانہ کر دیا اور کوئی غیر معمولی بات ایسی نہیں ہونے پائی کہ کسی کو کچھ شبہ اس پر ہوا اور پھر تھوڑی دیر بعد بحیلہ شرکت مینوسپل کمیٹی کے جو وقتاً فوقتاً بمقام مذکور ہوا کرتی تھی اپنے گھوڑے پر کہ نہایت عمدہ اور بھروسہ کا تھا سوار ہو کر خود بھی اُس طرف روانہ ہوا اور راستہ میں نگرانی ارسال خزانہ کی کرتا ہوا اوری پہونچ کر صاحب ڈپٹی کمشنر کے بنگلے پر گیا۔ صاحب اُس وقت برآمدہ میں ٹہل رہے تھے مجھ کو دیکھ کر علیحدہ کمرہ میں لے گئے۔ ہنوز میں کل باتیں اپنی ختم بھی نہیں کرنے پایا تھا کہ صاحب نے کل واقعہ میرٹھ کو جیسی کہ افواہ تھی بیان کر کے نہایت پریشانی کے ساتھ فرمایا کہ کچھ عجب نہیں کہ یہ آگ کل ملک میں پھیل کر موجب بربادی ہم سب کی ہو۔ جلد انتظام مناسب اسکا ہونا چاہیے ورنہ عجب کا نپور تک (جو ۳۰ میل یہاں سے ہے) شورش اس کی پہونچے گی تو اس ضلع میں بھی حشر برپا ہو جاوے گا اور لوگ قابو سے باہر ہو جاویں گے۔ میں نے بزعم طبیعت اپنی کے کہ ہمیشہ دل قوی رہا عرض کیا کہ حضور خاطر جمع رکھیے یہاں مجال نہیں ہے کہ کوئی سر اُٹھاوے۔ مگر صاحب کی تشفی نہ ہوئی اور ان کا زیادہ تر پریشان ہونا اس وجہ سے بھی تھا کہ بال بچوں کا ساتھ تھا۔ میں نے صلاح دی کہ ان سب کو ریاست کدورہ میں جو یہاں سے نزدیک ہے بھیج دیجیے۔ نواب صاحب ریاست مذکورہ سے میری ملاقات ہے میں ہمراہ جا کر ہر طرح پر انتظام کر آؤں گا نیز کوئی مخفی مقام و تباہ خانہ ایسا تجویز کر آؤں گا کہ جو ضرورت کے وقت ان کو پوشیدہ رکھنے میں کام آوے اور کسی کو اُن کی

بود و باش کا پتہ نہ لگے۔ مگر صاحب نے اس تجویز کو پسند نہ فرمایا اور کہا کہ وہ ریاست گو خود مختار ہے مگر نہایت چھوٹی ہے۔ یا تو فوج باغیاں سے مغلوب ہو کر بخیال حفاظت اپنے اور اپنی ریاست کے میم صاحبہ وغیرہ کو حوالہ ان کے کر دیویں گے یا خود باغیان پتہ اُن کا لگا کر پکڑے جاویں گے۔ میں نے بھی کچھ اصرار اپنے اس مشورہ پر نہیں کیا کہ مبادا کیا حالت آئندہ ان ریاستوں کی ہو۔ بہرحال صاحب نے بعد غور و خوض کے میم صاحبہ وغیرہ کو بمقام جھانسی اس اطمینان پر بھیج دیا کہ وہاں ایک مضبوط قلعہ کل سامان حرب و رسد وغیرہ سے مرتب ہے اور بہت سے صاحبان جلیل القدر اور افسران فوج جن میں اکثر دوست و اقارب صاحب کے تھے موجود ہیں اور نیز یہ کہ اگر کل باغیان نے محاصرہ بھی اُس کا کیا تو فتح کو ایک مدت چاہیے جس میں ہر طرح کی مدد گوروں کی پہونچ سکتی ہے۔ اور واسطے انتظام ضلع کے ایک خط بنام کیشوراؤ راجہ گورسرائے لکھ کر بدست سوار بہ طلب دو سو سپاہیان بندوقچی و دو ضرب توپ روانہ کیا۔ مجھے کچھ واقفیت ریاست مذکور سے نہیں تھی اور نہ جھانسی کا حال معلوم تھا جو کچھ صاحب نے فرمایا بپاس ادب درست و بجا کہہ کر چلا آیا۔ ہنوز نہ کچھ امدادی سپاہیان وغیرہ ریاست مذکورہ سے نہیں پہونچے تھے اور نہ میں بانتظار آنے اُن کے اپنے مقام تحصیل (جالون) واپس گیا تھا کہ دفعتاً ایک سوار جو شاید صاحب کی اردلی کا میم صاحبہ وغیرہ کے ساتھ گیا تھا گھوڑا بھگاتا ہوا جھانسی کی طرف سے بدحواس آیا اور بیان کیا کہ جس وقت ہم لوگ مع بچوں و میم صاحبہ کے جھانسی پہونچے وہاں قتل عام ہو رہا تھا نوبت قلعہ میں داخل ہونے کی نہیں پہونچی تھی کہ باغیوں نے راستہ ہی میں میم صاحبہ وغیرہ کو پکڑ کر قریب ایک باغ کے دیگر صاحبوں کے ساتھ تہ تیغ کیا۔ اس خبر ہوشربا سے دیر تک صاحب پر ایک عالم سکتہ کا طاری رہا اور پھر جب ہوش میں آئے تو دیوانہ وار سر پٹکنے لگے۔ مجھ سے بھی اس دردناک سین پر ضبط نہ ہو سکا زار زار رونے لگا اور صاحب کو اپنے زبردست ہاتھوں سے دیر تک مضبوط پکڑے رہا اور اُس وقت تک دن رات مسلح اُن کے پاس رہا جب تک کہ میں نے اُن کو مع کل موجودات خزانہ صدر کے جس میں تمام ضلع کی آمدنی لکھوکھا روپیہ کی مع خزانہ لائے ہوئے میرے کے جمع تھی بہمراہی دو کمپنیاں ریاست گوالیار کے جن کو میں نے خود صاحب کی طرف سے خط بنام صوبہ ریاست مذکور متعینہ علاقہ سرحدی کے لکھ کر بلوایا تھا بحفاظت تمام پاس صوبہ مذکور کے روانہ کیا۔ روح اللہ خاں چپراسی اردلی میرے نے جس کو میں نے صاحب کے ساتھ روانہ کر دیا تھا دوسرے روز واپس آ کر اطلاع دی کہ صاحب مع کل خزانہ کے بخیریت و بحفاظت تمام پاس صوبہ ریاست مذکور کے پہونچ گئے۔ خدا کا شکر ہے کہ پھر وہاں سے صا

مذکور جا بجا ٹھہرتے ہوئے مع کپتان الگزنڈر صاحب کے جو پیچھے سے آکر شامل اُنکے ہوگئے تھے
بہ آرام تمام آگرہ پہونچ گئے اور کل خزانہ بھی بہ تعداد کثیر دستبرد باغیان سے بچ گیا - یہاں
تانتیا صاحب پسر راجہ گورسرائے مع دو سو سپاہیاں و دو ضرب توپ کے حسب الطلب صاحب
موصوف کے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے روح اللہ خاں کی واپسی سے ذرا پہلے بمقام اورئی آگیا تھا
اُس وقت بیناک راؤ بھی (جو مدت سے پیشہ مختاری کا عدالتہاے جالون میں قبل آنے میرے
کیا کرتا تھا اور جو اپنی عادات وصفات میں نہایت چالاک و مفتری تھا) میرے پاس کھڑا تھا اُس
آگے بڑھکر تانتیا پسر راجہ گورسرائے کو نہایت تپاک سے سلام کیا - اور پھر میرے پاس آکر
مجھ سے کہنے لگا کہ یہ راجہ صاحب پیشوا معزول نانا صاحب مقام بٹھور کے رشتہ دار ہیں اور انکے
کے بزرگوں کی دی ہوئی یہ ریاست (گورسرائے) ہے - اور یہ بھی ہم قوم و ہم مذہب اُن کا
ہوں اس وقت میرا موجود ہونا بھی آپکے لیے از حد مفید ہوگا - میں یہ سُن کر از حد متردد و متنفر ہوا
بجاے تقویت و مدد پہونچنے کے میرے دل میں صدہا خطرات تانتیا پسر راجہ گورسرائے کی طرف
پیدا ہوگئے - کاش اگر مجھ کو پہلے یہ معلوم ہوتا تو صاحب ڈپٹی کمشنر کے خط مذکورہ بہ طلب اُس
شرکت ضلع کے لکھنے پر خاموش نہ رہتا مگر اب اُن سے علیحدگی کا بجز اس کے کیا حیلہ ہوسکتا تھا
جو میں نے اُن سے کیا یعنے یہ کہ آپ یہاں مقام اورئی میں چندے ٹھہر کر ناکوں پر اپنے سپاہ
تعینات کر دیجیے تاکہ باہر سے کوئی غول بدمعاشوں کا نہ آئے اور قصبہ میں ہر طرح کا امن رہے
یہ کہکر میں فوراً جالون چلا گیا جہاں کے قلعہ کا بہت کچھ انتظام بغیبت تانتیا پسر راجہ مذکور کرنا
ضرور تھا - قبل اسکے یہ لکھنا ضرور ہے کہ جھانسی کے واقعہ اور صاحب ڈپٹی کمشنر کے عیال و اطفال
کے قتل ہو جانے کا خراب اثر اُن دو کمپنیوں پر جو ۵۳ رجمنٹ کے زیر کمان الگزنڈر صاحب کے
اورئی میں تعینات تھی کسی قدر پڑا اور مجھ پر وہ زیادہ تر اس وجہ سے خار کھاتے تھے کہ میں نے
اُن پر اعتبار نہ کر کے کل خزانہ صاحب ڈپٹی کمشنر کے سپاہیان ریاست گوالیار کی حفاظت میں
بانده یا الٹیجیج دیا - علاوہ اس کے مجھ کو سپاہیان راجہ گورسرائے پر بھی جیسا کہ اوپر لکھا گیا اطمینان
نہ تھا بلکہ میں اُن کو نہایت خوف کی نگاہ سے دیکھتا تھا - گویا کہ یہ سب بطور ایک پیش خیمہ نانا راؤ
مقام کانپور کے تھے - بہر حال جالون پہونچ کر اول میں قلعہ کے انتظام میں مصروف ہوا - گو کہ
توپ میرے پاس نہ تھی اور نہ تائی بائی صاحبہ رئیسہ جالون کے پاس تھی مگر میں نے گولے بارود
اور کھانے پینے کا سامان اس قدر جمع کر لیا تھا کہ ڈھائی تین سو بندوقچیوں کے لیے تین چار

نہ تک کافی ہو۔ علاوہ ڈیڑھ سو چپراسیان تحصیل و برقندازان تھانہ و مذکوریان ملازم عدالت
نی کے جو میرے ماتحت اور سچے خیر اندیش تھے اور جن کی ہمت میں نے اپنی تقریروں سے
بھی بلند کر دی تھی میں نے احتیاطاً مواضعات روڑہ۔ سرسہ و سرسہ روڑہ وغیرہ کے سو
سو ٹھاکران سرغنہ کو بھی جن کا دباؤ علاقہ میں تھا اور جوان مرہٹوں کے جانی دشمن تھے اور مجھکو اُنکے
ی قرار اور ہمت مردانہ پر پورا پورا بھروسہ تھا بُلا کر اپنی جمعیت اندرون قلعہ میں شامل کر لیا تھا۔
ان کو اس طرح قابو میں رکھنے سے مطلب میرا یہ بھی تھا کہ تمام علاقہ کے ٹھاکران جو کثرت سے آباد
اور جن سے اندیشہ لوٹ مار کا تھا فتنہ پردازی اور ہنگامہ آوری سے باز رہیں۔ اور کچھ مخبر بھی اپنے
کر باہر کی خبر معلوم کرنے کی کوشش ہر وقت بلیغ رہا کرتی تھی۔ تانتیا صاحب پسر کیشو راؤ راجہ
ہمراہ صرف دو روز اور یہیں رہ کر اور کچھ سپاہی اپنے ناکہ بندی وغیرہ کے لیے چھوڑ کر مع بقیہ سر
یان اور سامان حرب کے جالون چلے آئے تھے اور یہاں بناک راؤ مختار جس کا ذکر اوپر لکھا گیا ہے
بالطبع اُن کا تھا اور وہ میرے پاس بھی اکثر آکر خوشامد کی باتیں (جس سے حد درجہ کی فرمانبرداری راجہ کی
ع تھی کیا کرتا تھا اور راجہ بھی کبھی کبھی آکر اطاعت و خیر خواہی اپنی کا بظاہر بمقابلہ برٹش گورنمنٹ
ہر تا تھا۔ بطور مشورہ کے وہ اس بات پر زور دیتا تھا کہ ٹھاکروں کو قلعہ سے نکال کر بجائے
کے سپاہیان راجہ مع دو ضرب توپوں کے جو اُن کے ہمراہ تھیں فصیلہائے قلعہ و مکان خزانہ پر
کر دی جاویں جس میں دس بارہ ہزار روپیہ ہوگا جو بعد روانگی زر موجودات بہ تعداد کثیر کے جس کا
وپر آچکا ہے داخل خزانہ ہوا تھا۔ بناک راؤ بھی خیر خواہانہ تائید اس کی جو در اصل مغویانہ تھی کیا
ا تھا۔ مگر میں اپنے ارادہ پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہا اور اپنے دل میں ٹھان لیا تھا کہ آئندہ جو
ہمت میں ہو مگر دخل راجہ کا قلعہ و خزانہ میں نہ ہونے دوں گا۔ لاچار وہ قلعہ کو گھیرے ہوئے
اپنے سپاہیان اور دو توپوں کے جو ہندوستانی طرح کی تھیں خاموش پڑے رہے۔ مجھ کو کچھ
ف راجہ کی مخالفت کا نہ تھا اور واقعی اُن کا کچھ قابو بھی مجھ پر نہیں چل سکتا تھا۔ قلعہ کی چار دیواری
م تھی مگر نہایت بلند اور عریض و ڈھلواں تھی۔ بمناسبت اس کے خندق بھی گہری تھی۔
ں کے چاروں طرف پختہ منڈیروں پر (جو تخمیناً ایک فٹ چوڑی اور تین فٹ اونچی ہونگی)
ے ترچھے رندہائے مضبوط بنے ہوئے تھے۔ اور پھاٹک بھی نہایت مضبوط دبیز تختوں کا
ور لوہے کی موٹی موٹی میخوں اور نعلوں سے جکڑا ہوا تھا۔ میں نے فصیلوں اور برجوں پر
ں کے قریب ایک ایک بندوقچی مع گولی بارود کے بٹھا دیا تھا اور اس سے بڑھ کر

انتظام پھاٹک کا کر دیا تھا تاکہ بخوف بارش گولیوں کے کسی کو ادھر سے جرأت حملہ کی نہ ہو۔ اور ہر ایک
سپاہی کو سمجھا دیا تھا کہ جب تک سپاہیاں راجہ کی طرف سے بندوق نہ چلے وہ بھی خاموش بیٹھے رہیں
یہ وہ وقت (غالباً شروع ہفتہ دویم ماہ جون) تھا کہ کانپور میں نانا کا تسلط قرار واقعی ہو گیا تھا
راجہ سے مراسلت تامہ جاری تھی۔ اور وہ اُس کے حکم کا منتظر تھا۔ دو کمپنیاں ۵۳ رجمنٹ کی جو
بکمان افسری الگزنڈر صاحب بہادر کے اوریٔ میں تعینات تھیں وہ بالکل منحرف ہو کر باغی ہو گئی تھیں۔
لیکن چونکہ اوریٔ میں سوائے اُن کے کوئی انگریز نہ تھا اور خزانہ سے وہ مقام پہلے ہی خالی ہو چکا
تھا اور باشندگان میں بجز چند گھر غریب بنیوں کے کوئی مالدار نہ تھا اور ناکوں پر راجہ کے سپاہی
تعینات تھے جو اپنے تئیں منجانب نانا حکمراں مشہور کیے ہوئے تھے۔ کمپنیاں مذکور نے بجز
جلانے چند بنگلوں اور دفتر ہائے سرکاری کے اور کوئی ہنگامہ غارتگری وغیرہ کا نہیں کیا بلکہ ان میں
سے بہت سپاہی بمقام جالون آ کر راجہ کے سپاہیان محاصرین قلعہ میں شریک ہو گئے تھے اور باقی
اپنے کمان افسر کپتان الگزنڈر صاحب کو بعد لوٹ لینے کُل مال و اسباب اُن کے کے قید کر کے
اس ارادہ سے بجانب کانپور روانہ ہوئے تھے کہ آگے بڑھ کر رسوخ اپنا دربار نانا میں بذریعہ
حوالگی صاحب موصوف کے حاصل کریں۔ اثنائے راہ میں بمقام شہر کالپی وہاں کے قلعہ کہنہ کے
مکانات شکستہ میں جو عین دریائے جمن کے ایک بلند کگارے پر واقع ہیں ٹھہرے۔ یہاں وہ
کھانے پینے سے فارغ ہو کر لوٹ مار کے لیے شہر کو گئے تھے کہ موقع پا کر (جیسا کہ مجھ کو بعدہٗ بعض
ملازمان شاگرد پیشہ سے معلوم ہوا) صاحب موصوف نے مع میم صاحبہ و مسی بابا کے اُن کی حراست
سے بھاگ کر بعد تبدیل رنگت و لباس ہر ایک کے (جو مثل دیہاتی گنواران اس ملک کے تھا) لب دریا
کے ناہموار راستوں کو (جس کو بیہڑ کہتے ہیں) اندھیرے میں طے کرتے ہوئے جالون میں جو تخمیناً
آٹھ یا نو کوس وہاں سے ہو گا آ کر دم لیا۔ پھر تعاقب اُن کا بوجہ نشیب و فراز راستہ کے رات کے
وقت اندھیرے میں کوئی سپاہی نہ کر سکا۔ یہاں جالون میں قریب صبح کے چار بجے غالباً پہونچے ہوں گے
مگر معلوم نہیں کہ اس بھیس میں وہ کہاں و کیونکر چھپے رہے۔ یہ مقام اُن کے لیے واقعی نہایت
خطرناک تھا انھیں کے رجمنٹ کے سپاہیوں کا ایک بڑا حصہ (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) بشرکت
سپاہیان راجہ کہ وہ بھی دشمن جانی اُن کا تھا قلعہ کو محاصرہ کیے ہوئے منتظر حکم نانا راؤ مقام کانپور کا
تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ خوش قسمتی سے وہ خطروں سے بچ کر آٹھ بجے رات کو قلعہ کی چور کھڑکی
تک جو میرے عمل دخل میں تھا بسلامت پہونچ گئے۔ ملنگ خاں نامی ایک چپراسی متعینہ کھڑکی مذکور نے

امیر مینائی مرحوم

- امیر اللغات (نامکمل) عہ
- صنم خانۂ عشق عمر
- مرأۃ الغیب عہ
- محامد خاتم النبیین ۶ر
- مکاتیب امیر مینائی عمر

جلال لکھنوی مرحوم

- سرمایۂ زبان اردو عمر
- رسالہ تذکیر و تانیث ۶ر
- قواعد المنتخب ۴ر

مرزا محمد عباس ہوش

- افسانۂ نادر جہاں عمر
- پیاری سہیلی ۱۲ر

مرزا رسوا مرحوم

- اختری بیگم ۶ر
- خونی شہزادہ ۷ر
- شریف زادہ عہ

ریاض خیر آبادی

- حرم سرا ے
- نا شاد ۸ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد کامل عہ
- خدائی فوجدار عمر
- جام سرشار عمر
- الف لیلیٰ بطرز ناول للعہ

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین ۴ر
- حاجی بغلول ۴ر
- پیاری دنیا ۴ر
- کایا پلٹ ۴ر
- میٹھی چھری ۴ر
- طرحدار لونڈی ۸ر
- طلسمی فانوس عمر

منشی جوالا پرشاد برق

- مرنالنی ۸ر
- مار آستین ۸ر
- بنگالی دلہن ۱۲ر
- پرتاب ۱۰ر

سید عاشق حسین عاشق

- تارا عمر
- شادی و غم ۱۲ر

مولانا عبدالحلیم شرر

- ثانی اثنین ۶ر
- ذی النورین ۱۰ر
- ابو الحسنین ۸ر
- خواجہ معین الدین چشتی ۶ر
- حسن بن صباح ۴ر
- عصر قدیم عمر
- تاریخ یہود عمر
- مسیح اور مسیحیت عمر
- عرب قبل از اسلام عہ
- صقلیہ میں اسلام ۱۲ر
- حسن کا ڈاکو عمر
- دربار حرام پور ۱۰ر
- [illegible] ۶ر
- مفتوح فاتح عمر
- فلپانا عمر
- زوال بغداد عمر
- لعبت چین عہ
- نیکی کا پھل عہ
- بابک خرمی عمر
- طاہرہ ۱۲ر
- مینا بازار عہ
- فردوس بریں ۸ر
- فلورا فلورنڈا عمر

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق ۶ر
- قاسم و زہرہ ۸ر
- عالم خیال ۸ر
- دیوان شوق عمر

منشی محمد احسن وحشی

- نغمۂ محرم ۱۲ر
- اشک حسرت عہ
- معشوقۂ عرب عہ
- محبوب کنشت عہ

خواجہ عبدالرؤف عشرت

- تذکرہ آب بقا عمر
- زبان دانی ۶ر
- اصلاح زبان اردو ۶ر
- قواعد میر ۴ر
- اصول اردو ۴ر
- جان اردو ۴ر
- شاعری کی چار کتابیں عمر
- لغات اردو ے
- ہندو شعرا عمر
- مضمون نویسی ۸ر
- ہجولی ۴ر

مولانا اسلم جیراجپوری

- سیرۃ الرسول عمر
- خلافت راشدہ عمر
- خلافت بنو امیہ عمر
- خلافت بنی عباس عمر
- عباسیہ مصر عمر
- عباسیہ بغداد عمر
- خلافت آل عثمان عہ

قاضی سلیمان منصورپوری

- رحمۃ للعالمین ۲ جلد للعہ
- سفرنامۂ حجاز عمر

مولانا حکیم عبدالغنی امیٹھوی

- بحر الفصاحت عہ
- تاریخ اودھ ۵ جلد عہ
- تاریخ حیدر آباد دکن عہ
- تاریخ راجگان ہند ے
- تعلیم الایمان عمر
- مذاہب اسلام للعہ

مولانا حکیم عبدالحی مرحوم

- تاریخ گجرات عمر
- گل رعنا عہ

منشی احمد علی بی اے
- تاریخ تمدن ۲ جلد
- شباب لکھنؤ

مولانا حسرت موہانی
- شرح دیوان غالب
- کلیات دیوان حسرت
- نکات سخن ۲ حصے

سید سجاد حیدر بی اے
- خیالستان
- حکایات و احتسابات
- پرانا خواب مع دو افسانے
- ثالث بالخیر
- زہرا
- جلال الدین خوارزم شاہ
- جنگ و جدال

مسٹر ظفر عمر بی اے
- مستقبل اسلام
- چوروں کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- ناول لکھنؤ

مرزا محمد عسکری ایم اے
- ادبی خطوط غالب
- تاریخ ادب اردو
- نوادر

منشی امیر احمد علوی بی اے
- تاریخ اندور
- روزنامچہ حج
- شاہان مالوہ
- طرز امیر
- گوتم بدھ
- بہادر شاہ ظفر
- مثنویات
- تاریخ زوال

مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے
- تاریخ امریکہ
- سیر المصنفین ۲ جلد
- تاریخ مغربی یورپ
- خیالات

سید مسعود حسن رضوی ایم اے
- ہماری شاعری
- امتحان وفا

مولوی سلیمان ندوی
- ارض القرآن
- خطبات مدارس
- سیرت عائشہؓ
- حیات امام مالکؒ
- خیام

مولوی عبد السلام ندوی
- اسوۂ صحابہ ۲ جلد
- سیرت عمر بن عبد العزیز
- انقلاب الامم
- شعر الہند ۲ جلد

مولوی سعید انصاری
- سیر الانصار ۲ جلد
- سیر الصحابیات

حاجی معین الدین ندوی
- خلفائے راشدین
- مہاجرین حصہ اول

شاہ معین الدین ندوی
- مہاجرین حصہ دوم
- سیر الصحابہ جلد ششم
- سیر الصحابہ جلد ہفتم

خواجہ حسن نظامی دہلوی
- میلاد نامہ
- ذکر غوث پاک
- کرشن جیون
- سیپارۂ دل
- چٹکیاں و گدگدیاں
- اتالیق خطوط نویسی
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- اولاد کی شادی
- جگ بیتی کہانیاں
- بچوں کی کہانیاں
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے ۲ جلد

سید ظہور احمد وحشی
- اسلامی زندگی
- تصویر معاشرت
- درس عبرت
- زندگی کی صبح و شام
- طوفان زندگی
- عروج زندگی
- ماں کی پریشانیوں کا علاج
- وسائل معاش

مولانا راشد الخیری
- امت کی مائیں
- آمنہ کا لال
- سیدہ کا لال
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی ۲ جلد
- نوحہ زندگی
- درشہوار
- منازل السائرہ ۲ جلد
- جوہر قدامت
- عروس کربلا
- یاسمین شام
- تیغ کمال
- محبوبۂ خداوند
- نانی عشو
- وداع ظفر

نیاز فتحپوری
- جذبات بھاشا
- گیتان جلی
- شہاب کی سرگزشت
- نگارستان
- جمالستان

الناظر بک ایجنسی ۔ لکھنؤ

بنام خداوند جان آفریں

جامیست جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجرائے الناظر) ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر:- ظفر الملک علوی

نمبر ۲	اگست سنہ ۱۹۳۶ء	جلد ۴۲

فہرست مضامین

قیمت:- فی پرچہ ۵ ؍ سالانہ ۲ ؍

بنام خداوند جان آفرین

نمبر ۲ جلد ۴۲ ---------- اگست ۱۹۳۶ء

اردو ـ ہندی اور ہندستانی

(جناب پنڈت کشن پرشاد کول صاحب بی اے رکن انجمن خادمان ہند)

ہمارے دیرینہ مکرم پنڈت کشن پرشاد کول صاحب رکن انجمن خادمان ہند و سابق ایڈیٹر اخبار ہندوستانی لکھنؤ کا ایک مضمون عنوان بالا سے ہندستانی اکیڈمی کے سہ ماہی پرچے "ہندستانی" کے اپریل نمبر میں شائع ہوا تھا۔ یہ رسالہ ہماری نگاہ سے نہیں گذرتا مگر پنڈت جی نے مہربانی سے اپنے مضمون کا ایک نسخہ بغرض اظہار رائے عنایت فرمایا ہے۔

اس بحث پر متعدد رسائل میں مختلف اصحاب نے وقتاً فوقتاً مضامین لکھے جن میں سے بعض ہماری نظر سے گذرے ہیں اور بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ جتنے منہ اتنی باتیں جتنے مضمون اتنی رائیں۔ ع

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا۔

پنڈت جی نے بیس سال ہوئے عین عالم شباب میں اپنی زندگی ملک کی خدمت کے لیے وقف کی تھی اور اس وقت سے اب تک برابر مختلف حیثیتوں سے اسی میں لگے رہتے ہیں۔ اخبار نویسی بھی اسی ضرورت کی ادا اب کتابیں بھی اسی غرض کے لیے تالیف کرتے ہیں۔ اور اپنے وقت کا بیشتر حصہ مطالعہ کتب اور معاملات ملکی پر غور و خوض میں صرف کرتے ہیں اس سبب سے وہ جو کچھ لکھتے ہیں توجہ سے پڑھنے کے لائق ہوتا ہے۔ اور اسی سبب سے ہم اُنکے مضمون کو تمام و کمال یہاں نقل کرتے ہیں۔ (ناظر)

اُردو اور ہندی کا جھگڑا پُرانا ہے۔ اس جھگڑے کی بنا سیاسی بلکہ قومی ہے۔ یہ ادبی قضیہ نہیں۔ یہاں اس واردات کی سرگذشت کے سرسری بیان کا بھی موقع نہیں تاہم احباب کو یہ یاد دلانا بے محل نہ ہوگا کہ اس قضیہ کا شور پہلے پہل اس کے بعد سُننے میں آیا کہ جب سر سید مرحوم نے کانگرس کی مخالفت اس صوبہ میں شروع کی تھی اس جھگڑے کا تانتا بعد میں مسلم لیگ اور ہندو سبھا کی شکل میں جاری رہا اور اب بھی جاری ہے۔ غرض کہنے کی یہ ہے کہ اس جھگڑے کی بنا قومی تعصب یا سیاسی اختلاف سے پڑی گو اب ہر ایک فریق اس کا دعویدار ہے کہ "ہندوستانی قومیت" کے خیال کو پختہ کرنے اور عملی جامہ پہنانے کے لیے لازمی ہے کہ اُردو یا ہندی سارے ملک کی زبان قرار پائے۔ اس قضیہ کو ختم کرنے کی غرض سے چند صلح پسند اور نیک نیت لوگوں نے اب "ہندوستانی زبان" کا مسئلہ چھیڑ کر یا یوں کہیے کہ تصفیہ پیش کر کے اور اُلجھن پیدا کر دی ہے۔ یہ تصفیہ زیادہ تر سیاسی اغراض کی ہی بنا پر پیش کیا جاتا ہے۔ گو "ہندوستانی زبان" کے مدعیوں میں ایسے لوگوں کی بھی کافی جماعت شامل ہے کہ جو محض ادبی زبان کی اصلاح چاہتے ہیں۔ اس تمہید سے غرض یہ ہے کہ سیاسی، قومی اور ادبی پہلوؤں کے خلط ملط ہو جانے سے ایسی کنجلک پیدا ہو گئی ہے اور قومی جوش کی کشمکش نے اس میں ایسی گتھیاں ڈال دی ہیں کہ معمولی آدمی کے لیے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرنا اور کسی صحیح نتیجہ پر پہونچنا اگر غیر ممکن نہیں تو دشوار تو ضرور ہو گیا ہے۔ اس قضیے کا فیصلہ کرنا تو کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں نہ راقم حروف کو اس کا دعویٰ ہے۔ البتہ اس بات کی کوشش اس مضمون میں ضرور کی جائے گی کہ مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر اطمینان سے غور کیا جا سکے اور اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کے خلط ملط ہو جانے سے جو کنجلک پیدا ہو گئی ہے وہ دور کی جا سکے اور بس۔

اس مسئلہ کے دو پہلو ہیں ایک محض سیاسی اور دوسرا ادبی۔ دونوں کو ایک دوسرے سے سروکار نہیں یہاں پہلے سیاسی پہلو سے بحث کی جائے گی اور بعد میں ادبی پہلو سے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ہندوستانی قومیت کے معیار کو خواب و خیال کی باتوں سے قطع نظر کر کے اصلیت اور حقیقت میں تبدیل کرنا منظور ہے تو لابدی ہے کہ سارے ملک کی ایک زبان ہو۔ اردو کے حامی اردو کو سارے ملک کی زبان قرار دینا چاہتے ہیں اور ہندی کے دعویدار ہندی کو۔ ایک اور جماعت بنظر انصاف و صلح "ہندوستانی زبان" کو سارے ملک میں رائج کیا چاہتی ہے۔ اگر چھوٹا منہ اور بڑی بات نہ خیال کی جائے تو میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ "ہندوستانی قومیت" یا Nationalism کی حمایت میں سارے ملک کی ایک زبان قرار دینے کا خیال ہی خواہ مخواہ کی زبردستی ہے۔ "قومیت" کے لیے زبان کا عنصر لازم نہیں۔ "قومیت" کے لیے مذہب کا عنصر بھی لازم نہیں۔ وہ زمانہ پارینہ کی داستانیں ہیں کہ جب ایسا تھا۔ موجودہ تہذیب و تمدن کے دور میں

"قومیت" کی بنا سیاسی اغراض کی یکجہتی پر ڈالی جاتی ہے اور اس کا خمیر اقتصادی اغراض کی یکسانیت سے گوندھا
جاتا ہے تمام مہذب دنیا میں ایسا ہی ہوا ہے اور ہو رہا ہے اور ہندوستان میں بھی یہی ہوگا اس کے آثار آج
بھی نمایاں ہیں۔ برطانیہ اور امریکہ ایک ہی نسل اور ایک ہی قوم سے ہیں۔ ایک ہی مذہب، ایک ہی زبان، ایک
ہی طرح کا رہن سہن لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض کے اختلاف نے ان کو دو جدا قومیں بنا دیا۔ بعینہ یہی
صورت کناڈا، آسٹریلیا اور نیوزیلینڈ کی ہے۔ ایک ہی مذہب، ایک ہی زبان، ایک ہی نسل، ایک ہی
طرح کا رہن سہن، ایک ہی حکومت اور سلطنت کے تابع۔ لیکن آثار ظاہر ہو رہے ہیں کہ سیاسی اور اقتصادی اختلافات
کی بنا پر وہ زمانہ دور نہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ الگ بنائے گا۔ سوئٹزرلینڈ
کی مثال لیجئے۔ ایک ملک میں تین قومیں بستی ہیں۔ قومیت اور نسل علحدہ علحدہ، زبانیں جداگانہ لیکن سیاسی اور
اقتصادی اغراض کی یکسانیت نے ایک شیرازے میں باندھ رکھا ہے اور ایک قوم کہلاتے ہیں۔ یورپ کے مختلف
ملکوں اور سلطنتوں کو لیجیے۔ ایک ہی مذہب اور ایک ہی لباس، تقریباً ایک ہی طرح کا رہن سہن ایک زبان
نہیں تاہم "ہندوستانی" کی طرح فرانسیسی کم سے کم تقریباً تمام یورپ میں سمجھی اور بولی تو ضرور جاتی ہے لیکن
سیاسی اور اقتصادی اغراض نے جدا جدا قومیں بنا رکھی ہیں جو ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی ہیں۔ مجھے
اس سے انکار نہیں کہ جذبہ قومیت کے استحکام میں زبان لباس خورد و نوش وغیرہ کی یکسانیت سے مدد ملتی ہے
اور جہاں یہ باتیں میسر ہوں بہت اچھا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ باتیں موجودہ زمانہ میں
"قومیت" کا لازمی جزو یا لابدی عنصر نہیں۔ قومیت کا شیرازہ بغیر ان باتوں کی یکسانیت کے بھی محض سیاسی و
اقتصادی یکجہتی کی بنا پر نہایت مستحکم بندھ سکتا ہے۔ اگر پچھلی چند صدیوں میں ہندو اور مسلمانوں کا چولی دامن کا ساتھ
نہ رہا ہوتا، اگر اسلامی اور ہندو تہذیب کے غلط ملط ہونے سے موجودہ ہندوستانی تہذیب نے ایک نئی شکل نہ اختیار
کر لی ہوتی تو ممکن تھا کہ پراچین آریہ ورت کی طرح آج بھی ہماری رتیوں اور رسموں، رہن سہن اور زبان میں
کچھ یکسانیت کی کیفیت دیکھنے میں آتی لیکن مقدر کے ہاتھوں ہندوستان کی تاریخ کسی دوسرے ہی عنوان سے
لکھی گئی۔ ان تاریخ کے صفحوں کو حرف غلط کی طرح مٹا دینا نہ آپ کے بس کی بات ہے نہ میرے بس کی بات ہے
اور اگر سچ پوچھیے تو مجھے اس کا افسوس بھی نہیں۔ میری عاجز رائے میں تو ہندو اور اسلامی تہذیب، ادب اور
فلسفہ کے غلط ملط ہونے سے موجودہ ہندوستانی تہذیب و تمدن کا خزانہ مالا مال ہو گیا یہ صرف میری ہی
انوکھی رائے نہیں بلکہ تاریخ چپہ چپہ پر اس کا ثبوت دیتی ہے۔ اگر جو کچھ گذر چکا اس کا افسوس نہیں تو آنیوالے
مقدر سے بھی خوف نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ آج ملک کی ہوا بگڑی ہوئی ہے۔ ہر طرف تعصب اور نفاق کی
آندھیاں چل رہی ہیں بھائی بھائی سے روٹھا ہوا ہے۔ ہمارے مدرسے اور یونیورسٹیاں الگ الگ کونسلوں

اور بورڈوں میں جداگانہ نیابت کے ابتری اور پریشانی، ہندی اور اُردو کے جھگڑے، آرتی اور نماز کے قصے، دنگے اور فساد کے ہنگامے حوصلہ مند سے حوصلہ مند محب وطن کی ہمتوں کو پست کر رہے ہیں۔ ظاہرا ہمارے اچھے دن نہیں لیکن میرا عقیدہ اور ایمان ہے کہ ہماری خود مختاری اور آزادی یا "ہندوستانی قومیت" کا بیج جو آج سے پچاس برس ہوئے بویا گیا تھا وہ ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر کے رہے گا۔ یہ مذہبی اور قومی جھگڑے، موجودہ تعصب اور اختلافات رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ منزل مقصود تک پہونچنے میں ان کی وجہ سے دیر ضرور لگے گی لیکن ہمارا مقدر پورا ہو کر رہے گا۔ اگر آپ اپنی نظر کو روز مرّہ کی مکروہات سے بلند اور وسیع کر کے دیکھیں تو آج بھی اچھے آثار نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں میں بھی جو نسل آج تعلیم پا رہی ہے وہ اُس سے جو آج ٹرکی، مصر اور ایران میں ہو رہا ہے بے خبر اور غیر متاثر نہیں۔ اسی ملک میں انقلاب انگیز تحریک کے پچھلے دو ہنگاموں میں سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں مسلمانوں نے ہندوؤں کے پہلو بہ پہلو جیل کی مصیبتیں جھیلیں۔ لاٹھیوں، سنگینوں اور گولیوں کے سامنے سینہ سپر کیا۔ جنھوں نے اس طرح سے (غلط یا صحیح اس سے بحث نہیں) "ہندوستانی قومیت" اور "آزادی" کی عمارت کی بنیادوں کو پختہ کیا ہے اُن کے لیے اب قدم پیچھے ہٹانا ممکن نہیں۔ کسانوں یا مزدوروں کے طبقوں کو لیجیے، جو اصلی معنوں میں جمہور کہے جا سکتے ہیں۔ آج آرتی اور نماز اور گاؤکشی کے قصے اُن کو ایک دوسرے سے ظاہرا جدا کر رہے ہیں لیکن جو قوتیں دنیا میں کام کر رہی ہیں اور جن کے اثر سے ہندوستان بھی زیادہ عرصہ تک بچ نہیں سکتا وہ کل انھیں مجبور کریں گی کہ پیٹ پالنے اور روٹی کے لیے یہ متحد ہو کر اُن لوگوں کا مقابلہ کریں جو دولت و ثروت کے مالک ہیں۔ ہندو اور مسلمان کا فرق آن واحد میں مٹ جائے گا۔ زمینداروں اور تعلقداروں کا طبقہ ان کی آنکھوں کے سامنے آج بلا تفریق ہندو، و مسلمان متحد ہو رہا ہے۔ کل کسان بھی اسی طرح ایکا کریں گے۔ یہ قوتیں ہیں اور یہ اثرات ہیں جو قومیت کا شیرازہ باندھیں گے۔ مختصر یہ کہ "ہندوستانی قومیت" کے جذبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سیاسی اور اقتصادی اغراض کی یکجہتی کا احساس کارآمد ہوگا نہ کہ ایک مذہب اور ایک زبان کی شرط۔

یہ تو اصولی بحث ہوئی۔ اب عملی ضرورت کے پہلو سے غور کیجیے۔ اتنا بڑا ملک، مختلف نسلوں اور مذہبوں کے مختلف زبانیں بولنے والے لوگ، مختلف صوبوں میں بستے ہیں، اگر سارے ملک کی کوئی زبان نہ ہو، تو تجارت اور کاروبار، عدالتوں کا کام، کاونسلوں، کانفرنسوں اور جلسوں کی کارروائیاں اور تبادلۂ خیالات آخر کس طرح ہو۔ یا دوسرے ملکوں سے ربط و ضبط کس طرح بڑھے۔ کام کاج کس طرح چلے۔ اسکے لیے سارے ملک کی ایک زبان ہونا لازمی ہے۔ سو اس کا بھی فیصلہ سو برس ہوئے ہیں کہ غیروں کے قلم سے

ہو گیا اور فیصلہ بھی ایسا کہ جو بمنزلۂ مقدر ہے کہ آپ مٹا نہیں سکتے۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان انگریزی قرار پا گئی اور ہم میں سے ہر ایک با دل خواستہ یا ناخواستہ اُسے سارے ملک کی زبان تسلیم کرتا ہے۔ ہماری تمام سیاسی اور سوشل زندگی کا دارومدار اس پر ہے۔ یہ ہماری تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہے اور جب تک ہندوستان میں انگریزی زبان کے کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہیں اور میرے خیال میں خودمختاری اور آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی یہ قائم رہیں گے اُس وقت تک انگریزی زبان ہی سارے ملک کی زبان رہے گی۔ اُردو یا ہندی اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔ محض اس وجہ سے کہ جن ضرورتوں کو جس خوبی اور آسانی کے ساتھ انگریزی زبان پورا کرتی ہے اُس کی اہلیت نہ ہندی میں ہے نہ اُردو میں۔ اگر اردو اور ہندی انگریزی کی جگہ نہیں لے سکتیں تو کیا ممکن ہے کہ یہ دونوں یا ان میں سے ایک بنگالی، گجراتی، مرہٹی، تامل یا تیلیگو کی جگہ لے سکے۔ ظاہر تو سمجھ میں نہیں آتا۔ بنگالی زبان اور لٹریچر کا مرتبہ تو آج اُردو اور ہندی دونوں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ گجراتی بھی ان دونوں میں سے کسی سے کم نہیں۔ مرہٹی تامل اور ٹیلیگو بھی اس مرتبہ پر پہنچ گئی ہیں کہ ان کو ہندی اور اُردو سے کوئی خاص فیض نہیں پہونچ سکتا اور جبکہ ان کی تمام سیاسی، سوشل اور کاروباری زندگی کی ضروریات ملکی، انگریزی کے ذریعہ سے پوری ہو رہی ہیں تو بنگال بمبئی اور مدراس کے لوگ اپنی اپنی زبانیں چھوڑ کر ہندی اور اُردو کیوں سیکھنے لگے۔ آپ کو کونسی ضرورت ان زبانوں کے قبول کرنے پر مجبور کرے گی؟ مجھے معلوم ہے کہ مدراس میں آج اس بات کی کوشش بلیغ کی جا رہی ہے کہ ہندی کا پرچار ہو۔ اور کئی سال سے وہاں ہندی کے فروغ دیے جانے کا چرچا سننے میں آ رہا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس میں کامیابی ہو رہی ہے۔ اسی طرح بنگال اور حیدرآباد میں اُردو کی تعلیم کی سعی بلیغ ہو رہی ہے۔ بنگالی مسلمانوں کی اُردو دانی کی کیفیت تو ان احباب سے جنھیں ان سے سابقہ پڑا ہے پوشیدہ نہیں۔ حیدرآباد کے مسلمانوں کی اُردو دانی کے بارے میں گذشتہ نومبر کے رسالۂ "الناظر" سے ذیل کا اقتباس بے محل نہ ہوگا۔ مولوی ظفر الملک صاحب ایڈیٹر "الناظر" حال میں حیدرآباد تشریف لے گئے تھے۔ آپ ذاتی واقفیت کی بنا پر تحریر فرماتے ہیں "حیدرآباد کے لیے یقیناً یہ امتیاز کچھ کم نہیں کہ اُس نے ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیتے میں کل ملک کی رہنمائی کی لیکن اگر عثمانیہ یونیورسٹی اس بات کا بھی انتظام کر سکے کہ یونیورسٹی سے جو طلبہ سند پا کر نکلیں، اس زبان میں جو ذریعہ تعلیم بنائی گئی ہے صحت و روانی کے ساتھ اپنے خیالات قلمبند کر سکیں تو علمی حیثیت سے ان طلبہ کے لیے نیز اہل ملک کے واسطے زیادہ مفید ہوگا۔ انگریزی ہمارے نوجوانوں کے لیے بالکل غیر زبان ہے اور ظاہر ہے کہ بمقابلہ اُردو کے اُس کی تحصیل میں کس قدر دشواری ہوتی ہے لیکن برطانوی ہند کی یونیورسٹیوں سے سند فراغ لے کر

جو اصحاب مختلف محکموں میں جاتے ہیں وہ اگر سیدھی سادی مگر صحیح انگریزی لکھنا نہ جانیں تو کیسے نکو بنائے جاتے ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ بھی جب یونیورسٹی سے باہر نکلیں گے تو اسی معیار پر جانچے جائیں گے ...... اُس وقت اگر ان کی تحریریں معمولی سیدھی سادی مگر صحیح اُردو میں نہ ہوں گی تو لوگ کس درجہ اُن کی اور خود اُن کی یونیورسٹی کی ہنسی اُڑائیں گے"۔ مدراس میں ہندی کو فروغ دینے کا خیال اور کوشش یقیناً مذہبی اور قومی جوش کی تازگی کی اچھی مثال ہے۔ چشم بد دور! ایک زمانہ میں "نیشنل ایجوکیشن" اور "نیشنل یونیورسٹی" کا بھی اسی طرح چرچا ہوا تھا لیکن بے ادبی معاف ہو تو عرض کروں کہ اب تو "گاندھی کیپ" بھی مشکل سے نظر آتی ہے۔ مختصر یہ کہ جو بحث یہاں پیش کی گئی ہے اگر ایک لخت رد کر دینے کے قابل نہیں تو اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سارے ملک کو نہ اُردو کی ضرورت ہے نہ ہندی کی۔ نہ صرف یہی بلکہ اُردو اور ہندی کے لئے سارے ملک میں کوئی گنجائش نہیں۔ ان کو سارے ملک کی زبان بنانے کی کوشش خواہ مخواہ کی زبردستی ہے اور کچھ زمانہ بعد یہ کوشش ٹھٹھر کے رہ جائے گی۔ اردو اور ہندی کا مسئلہ صرف شمالی ہند تک محدود ہے اور محدود رہنا چاہیے۔ ان کی عملداری صوبہ سرحدی سے لیکر صوبہ بہار تک ہے۔ بہتر ہوتا کہ شمالی ہند میں بھی بجائے دو زبانوں کے ایک ہی زبان ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں ہونا تھا نہیں ہوا۔ پچھلے سو برس میں اُردو اور ہندی کا جس طرح علیحدہ علیحدہ نشو و نما ہوا ہے اس کو حرف غلط کی طرح مٹایا نہیں جا سکتا۔ ایک زبان قرار دینے کی کوشش نہ صرف دونوں زبانوں کو اپنی اپنی جگہ زیادہ مستحکم اور ایک دوسرے سے علیحدہ کرتی جاتی ہے بلکہ قومی تعصب کے برافروختہ ہونے سے ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد میں بھی فرق پڑ جاتا ہے چنانچہ ایک صریحی نتیجہ اس کا یہ نکلا ہے کہ پہلے جو ہندو بہ تعداد کثیر اُردو کی جانب مائل تھے وہ اب ہندی پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ سوال یہ ہے کہ اگر شمالی ہند میں اردو اور ہندی دونوں برابر سے فروغ پاتی رہیں تو حرج کیا ہے اور محض ایک ہی زبان رائج کرنے کی غرض کیا ہے؟ اگر ایک زبان رائج کرنے کی غرض صرف یہ ہے کہ ہندو اور مسلمانوں میں ربط و یگانگت بڑھے، دونوں قومیں ایک دوسرے سے قریب آ جائیں، ان میں معاشرتی میل جول پیدا ہو، اُن کے ادب اور تہذیب میں فرق باقی نہ رہے تو موجودہ فضا کو دیکھتے ہوئے اور اُس ذہنیت کا لحاظ رکھتے ہوئے جو بد قسمتی سے اس وقت دونوں فریقوں میں نمایاں معلوم ہوتی ہے یہ غرض ایک زبان رائج کرنے کے اصرار سے بجائے پورے ہونے کے فوت ہوتی نظر آتی ہے۔ کم از کم پچھلے تیس چالیس سال کا تجربہ تو یہی ثابت کرتا ہے۔ اس بحث کے سلسلے میں جو مضامین اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں اُن میں ایک ہی معقول تجویز اس مسئلہ کے حل کے متعلق پیش ہوتی ہے کہ جس سے وہ غرض جو بظاہر ایک زبان رائج کرنے کی بتائی جاتی ہے بخوبی پوری ہوتی ہے لیکن

اس تجویز پر افسوس ہے کہ اتنی توجہ نہیں کی گئی کہ جس کی وہ مستحق تھی۔ تجویز یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں میں شروع ہی سے اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کی پڑھائی لازمی کی جائے۔ میں اس تجویز کی پوری تائید کرتا ہوں۔ اگر کوئی طریقہ ممکن العمل ایسا ہے کہ جس سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی زبان۔ لٹریچر۔ روایات حیات و جذبات سے واقف ہو سکیں اور ان میں ایک دوسرے کے طرز معاشرت سے یگانگت پیدا ہو۔ ایک دوسرے کی روایات و جذبات کا احترام اور رواداری مدنظر رہے تو وہ یہی طریقہ ہے۔ اسی کو ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد سمجھنا چاہیئے۔ اس طرح ذہنیت کے بدلنے سے دونوں قوموں میں سیاسی و اقتصادی اغراض کی یکسانیت کا حسن بآسانی پیدا ہو سکے گا۔ یہی ایک تجویز ایسی ہے کہ جس پر عمل کرنے میں ہندو اور مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔ ایسے نصاب تعلیم کی ترمیم کی دقتیں تو یہ ایسی نہیں کہ جو حل نہ ہو سکیں۔ کم از کم یہ اُن دشواریوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں کہ جو اس وقت ایک زبان رائج کرنے کی کوشش میں پیش آ رہی ہیں اور جن کا کوئی حل سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تو ایک زبان رائج کرنے کی ضرورت یا اُس کے ممکن العمل ہونے کا قائل نہیں تاہم اگر ہمارے سامنے اس معیار کا رکھنا مناسب ہے، اگر یہ کسی طرح ممکن العمل ہو سکتا ہے، اگر تاریخ کا ورق پلٹا جا سکتا ہے اور کبھی کسی زمانہ میں جس کا اندازہ ابھی ہم نہیں کر سکتے شمالی ہند میں بجائے اُردو اور ہندی کے ایک زبان رائج ہو سکتی ہے تو اس کی داغ بیل اسی طرح ڈالی جا سکتی ہے کہ اردو اور ہندی دونوں ہمارے مدرسوں میں لازمی قرار دی جائیں۔

ہندی اور اُردو کی بحث سے قطع نظر کر کے اب ہندوستانی زبان کے مسئلہ کو لیجیئے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر اردو میں سے فارسی اور عربی لفظ نکال دیے جائیں اور ہندی میں سے سنسکرت لفظ تو ہندوستانی زبان بنکر رائج ہو جائے گی۔ اس کے ثبوت میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ اب ہندوستان کے بڑے حصہ میں ہندوستانی زبان بولی جاتی ہے اور تقریباً تمام ہندوستان میں ہندوستانی سمجھی جاتی ہے۔ یہ بیان ایک حد تک صحیح ہے لیکن صرف ایک حد تک یعنے ٹوٹی پھوٹی اُردو اور بگڑی ہوئی ہندی، پنجاب میں پنجابی لب و لہجہ میں اور بہار میں بہاری تلفظ کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ ہمارے صوبہ میں پوربی ضلعوں میں ایک قسم کی ہندی اور پچھمی ضلعوں میں ایک قسم کی اُردو بولی جاتی ہے۔ اسی طرح دیہات میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ ہندی سے ملتی جلتی ہے اور شہروں میں جس زبان کا استعمال ہے وہ اُردو سے ملتی جلتی ہوتی ہے ہم جہاں تک بولی کا تعلق ہے آپ اس کو ہندوستانی بولی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح صاحب لوگ خانساماؤں اور بہراؤں کی بولی بھی ہندوستانی ہوتی ہے، اس ٹوٹی پھوٹی زبان کو بھی جو بمبئی کلکتہ وغیرہ کے اطراف میں مسافر اپنا مطلب نکالنے کے لیے بازاروں میں بولتے ہیں وہ بھی ہندوستانی

کہلاتی ہے۔ اور اس معنی میں یہ کہنا کہ ہندوستان کے بہت بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے ٹھیک ہے۔ لیکن
بولی ایک چیز ہے اور ادبی اور مجلسی زبان بالکل دوسری چیز۔ جس وقت آپ یہ کوشش کریں گے کہ
یہ ہندوستانی زبان ادبی اور مجلسی زبان قرار دی جائے لابدی طور پر وہ یا تو ہندی کی شکل اختیار کرے گی
یا اردو کی۔ کیونکہ اس ہندوستانی بولی کی جس کو تمام ملک کی زبان قرار دینے کا خیال ہے حیثیت اور
مرتبہ ہی زبان کا نہیں اور نہ اس میں زبان بننے کی اہلیت ہے۔ پچھلے پچاس برس میں اردو اور ہندی نے
جس فضا میں نشو و نما پائی، جس تہذیب معاشرت اور تمدن کی نزاکت کے لیے انھوں نے زبان کھولی
اس نے انھیں مجبور کیا کہ نئے نئے خیالات اور نازک ترین حسیات و جذبات کے اظہار کے لیے نئے
نئے علوم و فنون کی ترجمانی کی غرض سے اُردو فارسی اور عربی سے اور ہندی سنسکرت کی مدد سے نئی
نئی اصطلاحات، نئی نئی ترکیبیں اور محاورے گڑھے اور انھیں رائج کرے۔ انگریزی سے بھی مدد ملی۔
اس طرح سے دونوں زبانوں میں ارتقا ہوا اور ان کا خزانہ ایک حد تک مالا مال ہوا۔ اب آپ کی
کوشش یہ ہے کہ فارسی اور سنسکرت کی یہ اصطلاحیں، ترکیبیں اور محاورے جو دونوں زبانوں میں رائج
ہوگئے ہیں اُن کو خارج کیا جائے تو کام کس طرح چلے گا۔ آپ زبان کو بجائے مالا مال کرنے کے اور
کنگال بنائیں گے۔ اس سے زبان کی ترقی ہوگی یا تنزل؟ کہا جاتا ہے کہ بجائے فارسی اور سنسکرت کے
ہندوستانی زبان میں انگریزی اصطلاحات اور محاوروں سے کام لیا جائے۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ
اُردو کا فارسی اور عربی سے اور ہندی کا سنسکرت سے تو کچھ واسطہ اور رشتہ بھی ہے، لیکن ہندوستانی
زبان سے انگریزی کا کیا رشتہ ہے اور اس طرح جو زبان بنے گی اس کی صحت، نظافت اور پاکیزگی کا کیا
حشر ہوگا۔ دنیا کی مستند زبانوں کی مجلس میں اس کی کونسی اور کہاں جگہ ہوگی۔ جو احباب "ہندوستانی"
کی حمایت میں مضامین لکھتے ہیں وہ بھی ہندی یا اُردو سے تجاوز کر کے ابھی تک "ہندوستانی" زبان کا
کوئی نمونہ پیش نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ کوشش یہ ہوئی ہے کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" سو
اس میں 'ایجاد' فارسی ہے "مری چٹھی" اور "کھڑی کمیٹی" بھی بعض اخبار والے لکھنے لگے ہیں۔ مگر یہ تو
صاحب زبان کا بنانا نہیں بلکہ خون کرنا ہے۔ منشی پریم چند صاحب نے رسالہ زمانہ میں اپنے ایک مضمون
میں لکھا ہے کہ جب انگریزی کے محاورے اور اصطلاحات رائج ہو جائیں گے اور ہمارے کان اُن سے
مانوس ہو جائیں گے تو وہ انوکھے نہ معلوم ہونگے جس طرح کہ اب پاجامہ اور اچکن کے ساتھ ہیٹ، بُرا
نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے بھی بعض جدت پسند نوجوانوں کو غرارہ دار پاجامہ، ململ کا کرتہ اوپر سے انگریزی
کوٹ اور ہیٹ پہنتے دیکھا ہے لیکن وہ مجھے اتنا پسندیدہ نہیں معلوم ہوتا۔ خیر۔ یہ تو اپنے اپنے حس

اور شعور کی بات ہے مگر آج تک کم از کم میں نے کسی کو سنجیدہ گفتگو میں یہ تجویز پیش کرتے نہیں سُنا کہ غرارہ دار پائجامہ، کرتا، اچکن یا کوٹ اور اس کے ساتھ "ہیٹ" ہمارا قومی لباس قرار دیا جائے بلکہ ایسی مجلسوں اور مجموں میں جہاں آداب مجلس کا لحاظ کیا جاتا ہے ایسی حرکتوں پر انگلیاں اُٹھتے ہی دیکھی ہیں۔ رہے تراشے ہوئے بال تو شاید منشی پریم چند صاحب کو معلوم نہیں کہ ولایت میں اب فیشن بدل گیا۔ اب تو لانبے گیسو اور نیچا سایہ ہی مقبول ہو رہا ہے۔ اب تک اس کے متعلق جو کچھ کہا گیا اُس سے غرض یہ تھی کہ اُردو یا ہندی کی جگہ "ہندوستانی" زبان رائج کرنے کا خیال زبان کی ترقی اور نشو و نما کے لحاظ سے مناسب نہیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ ایسا کرنا یا ایسا ہونا ممکن العمل بھی ہے؟ کیا ہندوؤں کی کثیر تعداد ہندی کو چھوڑنے اور مسلمانوں کی کثیر جماعت اُردو کو الوداع کہنے کے لیئے تیار ہے؟ پچھلے چالیس سال میں ایک زبان رائج کرنے کی تحریک نے کس قدر کامیابی حاصل کی ہے؟ کیا اس تحریک کا یہ اثر نہیں ہوا کہ ہر ایک فریق اپنی ہی زبان رائج کرنے اور اس کو ترقی اور اشاعت دینے پر زیادہ تُل گیا تو اب کس طرح امید کی جاتی ہے کہ "ہندوستانی" کے رائج کرنے کا خیال، نقارخانہ میں طوطی کی آواز سے زیادہ اہمیت رکھے گا۔ بالفرض مان بھی لیا جائے کہ "ہندوستانی" رائج کرنے پر ایک کثیر جماعت راضی ہو جائے گی تو اس کے لیے رسم خط کونسا تجویز کیا جاتا ہے۔ فارسی یا ناگری۔ کیا اردو والے فارسی رسم خط کو چھوڑ کر ناگری کے اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے یا ہندی والے فارسی پر۔ اگر نہیں تو کیا رومن یا لیٹن رسم خط جاری کیا جائے گا کیا یہ مناسب یا ممکن ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ حال میں ٹرکی میں مصطفےٰ کمال نے حکومت اور قانون کے زور سے پوشاک میں ہیٹ، اور رسم خط لیٹن لازمی قرار دے کر رائج کر دیا ہے۔ اول تو معلوم نہیں کہ اس انقلاب کا آگے چل کر کیا حشر ہوگا اس کے علاوہ اس محکوم قوم میں تو کسی مصطفےٰ کمال کا نمودار ہونا بھی گمان غالب نہیں۔ جہاں تک میری عاجز رائے کام کرتی ہے میرے خیال میں تو اس ملک میں نہ ایک زبان کی ضرورت ہے، نہ ہندی اور اُردو کی جگہ "ہندوستانی" کا رائج کرنا مناسب ہے۔ نہ ان تینوں میں سے کسی ایک کا بھی سارے ملک کی زبان قرار پانا موجودہ فضا میں ممکن العمل ہے۔

میں نے اس مضمون کے شروع میں عرض کیا تھا کہ اس مسئلہ کے دو پہلو ہیں ایک محض سیاسی اور دوسرا ادبی۔ سیاسی پہلو کے متعلق مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا عرض کر چکا۔ اب مختصراً کچھ ادبی پہلو کے متعلق عرض کروں گا۔ نئے دور کے تعلیم یافتہ طبقے میں کچھ عرصے سے اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ اُردو اور ہندی دونوں میں ثقیل اور غیر مانوس عربی اور فارسی اور سنسکرت لفظوں کی بھرمار کر کے انھیں خواہ مخواہ دقیق بنایا جا رہا ہے گو ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں زبانوں کو عام فہم اور سلیس بنایا جائے۔ اس لحاظ سے

دونوں زبانیں فوری اصلاح کی محتاج ہیں۔ یہ خیال ایسا ہے کہ شاید ہی کسی کو اس سے اختلاف ہو۔ زبان کو مقبول عام بنانے کی غرض سے یہ تحریک نہایت مبارک ہے اور مجھے اس سے قطعی اتفاق ہے مگر یہ تحریک اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے کہ جب اس کو ملک کی ایک زبان رائج کرنے کی تحریک یا ایک رسم خط جاری کرنے کے پروپیگنڈا سے قطعی علیحدہ رکھا جائے اور اس پر سیاسی اغراض اور قومی تعصب کا کسی قسم کا شبہ نہ ہو سکے۔ ورنہ اگر اسے اس قومی اور سیاسی جھگڑے میں خلط ملط کر دیا گیا تو اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو اردو، ہندی یا ہندوستانی کے نعروں کا ہو رہا ہے۔ اس تحریک کو دو جانب سے مشکلوں کا سامنا ہوگا۔ ایک تو مولوی اور شاستری صاحبان کی طرف سے جو اُردو اور ہندی میں عربی اور سنسکرت لفظوں کو خواہ مخواہ ٹھونس کر انھیں دقیق بناتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اپنی ذہنیت اور وضع سے مجبور ہیں۔ عمر بھر کی عادتیں چھوڑی نہیں جا سکتیں دوسرا خطرہ جس کا تذکرہ کم ہوتا ہے انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی طرف سے ہے کہ جن کی زبان پر انگریزی لفظ، محاورے اور اصطلاحات چڑھ گئے ہیں اور وہ ان کا استعمال نہ صرف روزمرہ کی بول چال بلکہ سنجیدہ تقریر و تحریر میں بھی بُری طرح کرتے ہیں۔ ایک ہی جملہ میں آدھے لفظ اُردو یا ہندی کے اور آدھے انگریزی کے ان کا انداز گفتگو ہو گیا ہے۔ اگر ہم کو اپنی زبان کو سلیس اور عام فہم بنانا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ادبی اور مجلسی لحاظ سے بھی ہماری زبان کا مرتبہ دنیا کی اور زبانوں سے کمتر نہ رہے تو ان دونوں خطروں سے ہم کو بچنا چاہیے۔ ان کی تفصیل ذیل میں مختصراً کی جاتی ہے بیسیوں لفظ انگریزی کے اب ایسے مستعمل ہو گئے ہیں اور دونوں زبانوں میں کھپ گئے ہیں کہ ہر کس و ناکس ان کو سمجھتا ہے مگر ہمارے یہاں کے ادیب ان کے لیے خواہ مخواہ عربی اور سنسکرت لفظ ڈھونڈھ کر نکالتے ہیں اور ان کے رائج کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اڈیٹر کے لیے مدیر، نوٹس کے لیے شذرات یا ملاحظات، تھرمامیٹر کے لیے مقیاس الحرارت، وائرلس کے لیے لاسلکی تار برقی ایسی اُترنگ کی باتیں ہیں کہ جن سے زبان کو بجائے فائدے کے نقصان پہنچتا ہے۔ اسی طرح سیدھے سادے اردو اور ہندی لفظوں کو جو مدتوں سے رائج ہیں اور جو زبان میں کھپ چکے ہیں اب رد کر کے ان کی جگہ فارسی، عربی یا سنسکرت کے نئے نئے لفظ گھڑے جا رہے ہیں مثلاً "امتحان میں فوت ہونے کے معنی ہیں۔ طالب علموں کی جگہ طیلسانیں[۱]۔ ہوائی جہاز کی بجائے طیارہ وغیرہ۔ ایسی حرکتوں سے زبان کو گرانبار کرنا کیا نفع پہونچا سکتا ہے۔ یہ صرف اُردو کے ادیبوں کا ہی قصور نہیں۔ ہندی والے بھی یہی کرتے ہیں۔ جلدی کی جگہ شکرہ۔ پانی کی جگہ جل۔ آدمی کی بجائے منش۔ عرضی کی جگہ پرارتھنا وغیرہ مروج کیے جا رہے ہیں۔ جہاں کسی نئے خیال یا اصطلاح کے لیے معمولی لفظ نہ ملے وہاں تو نیا اور ثقیل

---

[۱] حیدرآباد میں گریجویٹس کو کہتے ہیں۔ طالب علموں کو نہیں کہتے۔ ایڈیٹر

لفظ بھی مجبوراً استعمال کرنا ہی پڑے گا مگر یہ زبردستیاں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ایسی ہیں کہ جن کے لیئے کوئی عذر نہیں۔ اُردو کے معمولی جمع بنانے کے طریقے کو ترک کرکے عربی یا فارسی ترکیب سے کام لینا بھی کم قابل اعتراض نہیں۔ اسی طرح ہمارے پُرانے املا کا طریقہ بھی اصلاح طلب ہے۔ یہ اصلاح مشکل سے جاری ہوگی لیکن میری رائے عاجز میں ہمارا پُرانا طریقہ اصلاح طلب ہے۔ مثال کے طور پر دو تین لفظوں کا حوالہ دیا جاتا ہے "مسالا" نہایت روزمرہ کا لفظ ہے اس کو "مصالح" لکھنا کم از کم آجکل کے زمانے میں تو خواہ مخواہ کی زبردستی ہے۔ معمولی آدمی کے لیے تو لفظ کا سمجھنا ہی مشکل ہو جائے گا۔ اسی طرح "زمانہ" کی جگہ "زمانا" اور "بالکل" کی بجائے "بلکل" کیوں نہ رائج کیا جائے۔ اگر چند ذی مرتبہ احباب جو زبان کی اصلاح کے جائز طور پر حامی سمجھے جائیں یکجا ہو کر اس کے لیے قواعد ترتیب دیدیں تو املا کی اصلاح کا راستہ بھی کھل سکتا اور صاف ہو سکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں مجھے حال کی ایک بحث یاد آتی ہے جس کا تذکرہ کر دینا بھی بیجا نہ ہوگا۔ ہندوستانی اکیڈمی کے "تماہی" رسالہ کے جاری ہونے پر اس کے لفظ تماہی کے استعمال پر اردو کے ادیبوں کے حلقوں میں اس کی بڑی لے دے ہوئی لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ آخر کیوں دربار اکبری میں مولانا محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے تبارہ کا لفظ ایک جگہ نہیں غالباً دس جگہ استعمال کیا ہوگا۔ کسی کو یہ کہتے نہیں سُنا کہ یہ لفظ یا ترکیب غلط ہے۔ تو پھر آخر تماہی میں کیا قیامت برپا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ چھ ماہی کا لفظ اُردو میں بلا تکلف جاری ہے میرے خیال میں ایسی بحثوں سے علاوہ وقت ضائع ہونے کے اُردو کا نام بدنام ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کم قابل اعتراض نہیں کہ اُردو یا ہندی میں لفظوں کے ہوتے ہوئے ان کی جگہ خواہ مخواہ ان لفظوں کے لیے انگریزی لفظ ٹھونسے جائیں یا انگریزی کے محاوروں اور اصطلاحوں کا ایک لفظی ترجمہ کیا جائے جو زبان میں کسی طرح نہ کھپ سکے محترمی پنڈت منوہر لال زتشی صاحب کے اس مضمون کا آخری حصہ جو اُنھوں نے حال میں ہی رسالہ "زمانہ" کانپور میں شائع کیا ہے یہاں پر نقل کرنا بے محل نہ ہوگا۔ پنڈت صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ "مجھ کو اس رائے سے اتفاق ہے کہ یورپ کی نئی نئی ایجادوں کے ساتھ جو فرنگی الفاظ ہماری زبان میں آرہے ہیں اُن سے بھاگنا خلاف مصلحت ہے۔ اور اُن کی جگہ اُن سے زیادہ ثقیل اور غیر مانوس عربی یا سنسکرت الفاظ ٹھونسنا زبان کے حق میں اچھا نہیں۔ تھرما میٹر کو مقیاس الحرارت سے زیادہ لوگ سمجھتے ہیں اور زیادہ سہولت سے اس کو ادا کر سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حیدرآباد دکن کے دارالترجمہ میں عربی کا بڑا زور ہے اور وہاں کی کتابوں میں اُردو کو معرب کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ کوشش قابل تحسین نہیں۔ اس سے بچنا چاہیے ہاں ایک بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ انسان کی طرح زبان کا بھی مزاج ہوتا ہے۔ ذوق سلیم اس کو پہچان لیتا ہے اور اس کے خلاف عمل نہیں کرتا۔

Standing Congress Committee کا ترجمہ کھڑی کانگرس کمیٹی یا Dead Letter Office
کو مری چھٹی کا دفتر کہنا زبان کی گردن کو کند چھری سے ریتنا ہے۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جو بجنسہٖ غیر زبان سے
لے لیے جاتے ہیں جیسے کوٹ۔ بعض ایسے ہیں جن میں جزوی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے جیسے پتلون۔ جو
لوگ زبان دانی کا دعوےٰ کرتے ہیں اور زبان کی ترقی اور اصلاح کے واسطے کوشاں ہیں اُن کو اس بات
کا پورا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ زبان کو وسعت ضرور دی جائے اختراع کا دروازہ ضرور کھلا رہے۔ نئی لفظیں ضرور
قبول کی جائیں مگر جو کچھ ہو ذوق سلیم کے ماتحت ہو۔ کج فہمی، ضد اور فرقہ بندی کو اس میں دخل نہیں ہونا چاہیے
اس کل بحث کا لب لباب یہ ہے کہ چاہیئے تو یہ تھا کہ زبان کے مسئلہ پر محض ادبی حیثیت سے نگاہ ڈالی
جاتی اور ضروریات زمانہ کے لحاظ سے اصلاحیں پیش کر کے زبان کو ترقی دینے کی کوشش کی جاتی لیکن ہو
یہ رہا ہے کہ اس مسئلہ کو سیاسی جھگڑوں میں ڈال کر فرقہ دارانہ جوش اُبھارا جاتا ہے جس سے اردو اور ہندی
کی اشاعت تو ضرور ہو رہی ہے لیکن ادبی زبان کی اصلاح اور ترقی میں شبہ ہے۔ جہاں تک "متحدہ قومیت"
کا سوال ہے یہ تو صحیح ہے کہ جن ملکوں میں مذہب، زبان، لباس اور خورد و نوش کی یکرنگی میسر ہوتی ہے
وہاں "متحدہ قومیت" کے ارمانوں کو پورا کرنے میں اس سے مدد ملتی ہے لیکن یہ خیال غلط ہے کہ یہ عناصر
"متحدہ قومیت" کے خیال کی تکمیل کے لیے لازمی اور ضروری ہیں۔ موجودہ تہذیب و تمدن کے زمانے میں
سیاسی و اقتصادی اغراض و ضروریات ہی دراصل قوموں کی شیرازہ بندی کرتی ہیں۔ تمام دنیا میں یہی ہوا ہے
اور ہو رہا ہے۔ یہی ہندوستان میں بھی ہو کر رہے گا۔ اس کے لیے اُردو یا ہندی کو سارے ملک کی زبان
قرار دینے کا خیال نہ ضروری ہے نہ فائدہ مند۔ اس سے تو ملک کی موجودہ بگڑی ہوئی فضا میں اور بھی زیادہ
الجھن پیدا ہوتی ہے۔ ہندو اور مسلمانوں میں ربط اور اتحاد پیدا کرنے کی اس سلسلہ میں اگر کوئی صورت
ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں میں شروع ہی سے اردو اور ہندی کی پڑھائی لازمی قرار دی جائے
اور جہاں تک ادبی زبان کی اصلاح و ترقی کا تعلق ہے اردو اور ہندی دونوں کو بجائے دقیق بنانے کے
سلیس اور عام فہم بنانے کی کوشش کی جائے۔ میرے خیال میں یہ اہم کام ہمارے صوبہ کی "ہندوستانی اکیڈمی"
بخوش اسلوبی ادا کر سکتی ہے۔ یہی ایک انجمن ایسی ہے جو ادبی حیثیت سے اس کی اہل ہے اور اس میں قومی
تعصب اور فرقہ وارانہ جوش کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ میں امید کرتا ہوں کہ اس اکیڈمی کے ذمہ دار احباب اس
جانب توجہ مبذول فرمائیں گے۔ میں نے جو کچھ اس بحث کے سلسلہ میں عرض کیا ہے مجھے معلوم ہے کہ اکثر احباب
کو وہ خوشگوار نہ معلوم ہوا ہوگا۔ میں اس کی معذرت چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ سمجھ کر کہ جو کچھ کہا گیا
محض نیک نیتی سے کہا گیا ہے وہ مجھے معاف کریں گے۔

ہمیں پنڈت جی کی اس راے سے کلیۃً اتفاق ہے کہ

"قومیت" کے لیے زبان کا عنصر لازم نہیں" قومیت" کے لیے مذہب کا عنصر بھی لازم نہیں.......

"قومیت" کی بنا سیاسی اغراض کی یکجہتی پر ڈالی جاتی ہے اور اس کا خمیر اقتصادی اغراض کی یکسانیت سے گوندھا جاتا ہے"

البتہ پنڈت جی کا یہ فرمانا ہمارے نزدیک محل نظر ہے۔

"ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان انگریزی قرار پاگئی اور ہم میں سے ہر ایک بادل خواستہ یا ناخواستہ اُسے ہمارے ملک کی زبان تسلیم کرتا ہے۔ ہماری تمام سیاسی اور سوشل زندگی کا دارومدار اس پر ہے۔ یہ ہماری تمام ضرورتوں کو پورا کرتی ہے اور جب تک ہندوستان میں انگریزی زبان کے کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہیں اور میرے خیال میں خود مختاری اور آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی یہ قائم رہیں گے اُس وقت تک انگریزی زبان ہی سارے ملک کی زبان رہے گی۔ اُردو یا ہندی اس کی جگہ نہیں لے سکتی۔ محض اس وجہ سے کہ جن ضرورتوں کو جس خوبی اور آسانی کے ساتھ انگریزی زبان پوری کرتی ہے اُس کی اہلیت نہ ہندی میں ہے نہ اُردو میں"

ہمارا خیال اس کے خلاف ہے۔ ہندی کے متعلق ہماری واقفیت ایسی نہیں کہ ہم اُس کے بارہ میں اعتماد کے ساتھ کچھ کہہ سکیں مگر اُردو میں اس کی پوری صلاحیت موجود ہے کہ اگر حالات مساعد ہوں تو وہ اُن تمام سیاسی اور سوشل ضروریات کو پورا کردے گی جو اب انگریزی پورے کر رہی ہے۔ اب سے بیس بائیس سال پیشتر کانگریس میں، مسلم لیگ میں، ایجوکیشنل کانفرنس اور دوسری مختلف کانفرنسوں میں انگریزی جس قدر ناگزیر معلوم ہوتی تھی اب ایسا نہیں ہے اور حیدرآباد میں تو ریاست کا سارا کاروبار اردو ہی کے ذریعہ ہو رہا ہے اگر انگریزی عہدہ داروں کا اقتدار نہ ہو جس کا سبب ظاہر ہے کہ ہندوستان پر برطانوی تسلط ہے تو وہاں اتنا بھی انگریزی کا تحریری کام نہ رہے جتنا اب ہے۔

بات اصل یہ ہے کہ ہم جب تک محکوم ہیں اُسی وقت تک یہ صورت حال ہے۔ خود مختار و آزاد ہونے کے بعد بھی کچھ دنوں تک انگریزی زبان کا ہم پر تسلط رہے گا لیکن رفتہ رفتہ یہ حالات بدلیں گے اور جس طرح آج ہندوؤں کی اکثریت عربی و فارسی سے بیگانہ ہوتی جا رہی ہے ایک وقت آئے گا کہ اہل ہند انگریزی زبان سے بے نیاز ہو جائیں گے۔

غالباً دنیا کی کوئی بڑی زبان ایسی نہیں جو ملک کی سیاسی اور سوشل ضروریات کو پورا کرنے کی اہمیت نہ رکھتی ہو۔ بشرطیکہ اُس کو اس کے مواقع حاصل ہوں۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جو دوسری زبانوں سے

بلکہ اس سے زیادہ ہو۔ خود انگریزی میں ہزاروں لفظ مختلف یورپین اور ایشیائی زبانوں کے موجود ہیں۔ کاروباری اور بین الاقوامی ضروریات کے لیے بھی نہ صرف انگریزی بلکہ یورپ و ایشیا کی متعدد زبانوں سے واسطہ رہیگا اور اس کے لیے کچھ لوگ ہمیشہ دوسری زبانوں کی تحصیل کرتے رہیں گے۔

اس وقت بھی ہندوستان میں ایسے انگریزی خواں لوگوں کی تعداد مشکل سے دو تین فیصدی نکلے گی جو انگریزی سے اپنا کام چلا رہے ہوں۔ بیشتر کام دیسی زبانوں ہی سے چل رہا ہے۔

پنڈت جی ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"اب ہندوستان کے بڑے حصہ میں ہندوستانی زبان بولی جاتی اور تقریباً تمام ہندوستان میں ہندوستانی سمجھی جاتی ہے۔ یہ بیان ایک حد تک صحیح ہے لیکن صرف ایک حد تک...... لیکن بولی ایک چیز ہے اور ادبی اور علمی زبان دوسری چیز"

کیا یہ صرف ہندوستان کی خصوصیت ہے؟ کیا انگلستان میں ایسا نہیں۔ جو انگریزی کتابوں، اخباروں اور رسائل میں لکھی جاتی ہے، کیا فوجی گورے بھی وہی بولتے ہیں۔ کیا آئرلینڈ۔ اسکاٹلینڈ اور ویلس کے دیہاتوں میں بھی اسی کا رواج ہے؟

انگلستان میں پریس پہلے رائج ہوا، قومی حکومت ہونے کی وجہ سے عام تعلیم پر خاص کوشش کی گئی نقل و حمل کی آسانیوں نے میل جول کے مواقع زیادہ بہم پہنچائے اور چھوٹا سا ملک تھا اسلیے انگریزی زبان سارے ملک پر چھا گئی پھر بھی لہجہ، تلفظ اور محاورات وغیرہ کے اختلافات موجود ہیں۔ ہمارا ملک بڑا ہے۔ نقل و حمل کی آسانیاں کم ہیں اندو دیر میں پیدا ہوئیں مطبع بہت دنوں میں قائم ہوا اور سب سے بڑھکر یہ کہ قومی حکومت نہیں، اسلیے ہندوستانی (اردو) کی اشاعت و ترویج کی رفتار بھی کسی قدر سست ہے۔

راقم الحروف کو پہلی بار ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۱۰ء تک دو مرتبہ اور جانا ہوا۔ اور ۲۰ سال کے بعد گذشتہ سال پھر حاضری کی نوبت آئی۔ حیدرآباد کے باشندوں کی عام بول چال لہجہ اور تلفظ جو ۱۹۰۵ء میں تھا اب نہیں رہا۔ پڑھے لکھے کسی مجمع میں جائیے اور آپس کی بات چیت سنیئے تو آپ کو مشکل سے اس کا احساس ہوگا کہ آپ شمالی ہند کے کسی شہر میں نہیں بلکہ دکن میں بیٹھے ہیں۔

یہی حال پنجاب کا ہے ۱۹۰۳ء ہی میں پہلی بار لاہور بھی جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اور درمیان میں چار مرتبہ جانے کے بعد امسال پھر جانے کا اتفاق ہوا۔ باوجودیکہ وہاں پنجابی عام بول چال کی زبان ہے لیکن پڑھے لکھے لوگ پہلے کے مقابلہ میں اردو بہت صاف اور شستہ بولنے لگے ہیں۔ ۱۹۰۳ء میں غالبًا منشی محمد الدین فوق کے سوا کوئی دوسرا پنجابی ادیب و شاعر ایسا نہ تھا جو نثر و نظم میں صحیح اردو استعمال کرنے پر

قادر ہو۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب اُس وقت حیدر آباد میں تھے۔ مگر اب ایک دو نہیں درجنوں ادیب شاعر ایسے موجود ہیں جو بے تکلف صحیح اُردو لکھتے ہیں۔

ملک کو حکومت خود اختیاری دیجئے اور دیکھیے کہ ہندوستانی (اردو) انگریزی کی جگہ کام دیتی ہے یا نہیں۔ علمی اور فنی اصطلاحات کی کمی ہرگز اس راہ میں حائل نہ ہو گی۔ آخر جب اس ملک میں مسلمانوں کی حکومت تھی تو کیا ملک کی سیاسی اور سوشل ضروریات نہیں پوری ہوتی تھیں اور جن ممالک میں اس وقت انگریزی کا رواج نہیں ہے مثلاً جاپان یا ایران میں، کیا وہاں انگریزی کے بغیر کام نہیں چل رہا ہے۔

اس سلسلہ میں پنڈت جی کا یہ فرمانا ضرور درست ہے کہ

جس وقت آپ یہ کوشش کریں گے کہ ہندوستانی زبان ادبی اور علمی زبان قرار دی جائے لا بدی طور پر وہ یا تو ہندی کی شکل اختیار کرے گی یا اُردو کی ۔

ہم اس سے گھبراتے نہیں۔ ہندی ہو یا اُردو، دونوں اسی دیس کی زبانیں ہیں اور دونوں کا حق بمقابلہ انگریزی کے فائق ہے۔ خود ان دونوں میں ترجیح کا حق کس کو ہے؟ جو لوگ دونوں زبانوں کے ادیبوں سے واقف ہیں جیسے کہ ہمارے مکرم پریم چند صاحب یا اختر حسین صاحب رائے پوری وہ اس بارہ میں بہتر رائے قائم کر سکتے ہیں۔ خود ہمارا رجحان قدرتاً اردو کی طرف ہے۔ رہا یہ کہ سارا ملک اُسے ترجیح دیگا یا نہیں، یہ مستقبل کا سوال ہے۔

ہندی ادب یا اُس کی تاریخ سے ہمیں براہ راست کوئی واقفیت نہیں لیکن جو سُنی سنائی باتیں کانوں میں پڑی ہیں اُن کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس بیسویں صدی کے ۲۵ سال میں ہندی ادب میں جو کچھ اضافہ ہوا ہو لیکن اس سے قبل اُس کا ذخیرۂ ادب بہت محدود تھا۔ چند مذہبی کتابیں، کچھ افسانے، بعض شاعروں کا کلام۔ بس یہ تھی ساری کائنات ہندی ادب کی۔

برخلاف اس کے اُردو میں اس صدی سے قبل جو ذخیرہ فراہم ہوا تھا اُس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انجمن ترقی اُردو کا دفتر جب پہلی بار حیدر آباد میں مولانا شبلی مرحوم کے تحت میں قائم ہوا تو اُن کے ایما سے انجمن کے اسسٹنٹ سکریٹری سجاد مرزا بیگ دہلوی مرحوم نے اُردو کتابوں کی ایک فہرست مرتب کرنا شروع کی جو غالباً ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ فہرست اگرچہ بالکل نامکمل ہے لیکن اس میں بھی کم سے کم آٹھ ہزار کتابیں درج تھیں جن میں سے شاید ایک ہزار سے زائد موجودہ صدی کی شائع شدہ ہونگی اور ادب، تاریخ اور علوم و فنون کے تمام مروجہ شعبوں کی کتابیں اُس میں ملیں گی۔ اسی طرح آٹھ دس سال ہوئے جب راقم الحروف کو اپنے صوبہ کے ایک بڑے کتب خانہ کی فہرست سے ایسی کتابوں کا انتخاب کرنا

پڑا جواب بازار میں نہیں ہیں تو دو ہزار سے اوپر کی کتابوں کی فہرست تیار ہوئی ان میں سے شاید دس پانچ ہی کتابیں ایسی ہوں گی جو موجودہ صدی کی ہوں۔

دکن و گجرات کے شعرا کا ذکر نہیں اگر صرف دہلی کے نامور شعرا کے وقت سے موجودہ عہد تک کے اُردو کے سرمایہ شاعری ہی کو دیکھا جائے تو ہندی ادب میں اس کا جواب نہیں ملے گا۔ اور یہ ایسا فضل اُردو کو حاصل ہے جو ہمیشہ اُسے ہندی اور شاید ہندوستان کی تمام دیسی زبانوں سے ممتاز رکھے گا۔ قلت سرمایہ، کم ہمتی اور سرگرمی و جوش نہونے کے باعث خادمان اُردو موجودہ صدی میں حامیان ہندی کے مقابلہ میں بظاہر پچھڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مگر جو کتابیں اُردو اور ہندی میں تیار ہوئی ہیں اُن کا موازنہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ تعداد میں ہندی کتابیں زیادہ نکلیں لیکن باطنی محاسن اور سود مندی کے لحاظ سے امید ہے کہ اُردو ہیٹی نہیں رہے گی۔ کم سے کم انجمن ترقی اُردو، دارالمصنفین اور عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ نے جو کتابیں تیار کی ہیں اُن کے مقابلہ کی کتابیں تو ہندی میں نہیں ہیں۔

بنگالی، گجراتی، مرہٹی، ٹامل اور ٹیلگو کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں لیکن ان زبانوں کی حیثیت جس طرح اس وقت صوبجاتی ہے غالباً آئندہ بھی رہے گی اس لیے اُردو کا اُن سے کوئی مقابلہ نہیں۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ ایسے لوگ جو ہندوستان کی ان زبانوں کے ادب سے واقف ہوں اُن کے متعلق اُردو میں مفصل مضامین لکھ کر ہمیں آگاہ کریں کہ اُن زبانوں میں اب تک کتنا کام ہوا ہے اور کیسا ذخیرہ مہیا ہے تاکہ اُردو کے ذخیرہ سے ہر زبان کے ذخیرہ کا موازنہ آسانی کے ساتھ کیا جا سکے اور جو کمی اُردو کے ذخیرہ میں پائی جائے اُسے پورا کرنے کی فکر کی جائے۔ ہم نے کئی ایسے دوستوں سے جو ہندی کے ادیب ہیں ذاتی طور پر اس کی تحریک کی مگر افسوس کہ اب تک اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی۔

ہمیں پنڈت جی کی اس رائے سے بھی اتفاق نہیں کہ

"اُردو اور ہندی کا مسئلہ صرف شمالی ہند تک محدود ہے اور محدود رہنا چاہیئے۔ ان کی عملداری صوبہ سرحدی سے لے کر صوبہ بہار تک ہے۔"

بے شبہ ہندی بنگال اور دکن وغیرہ کے علاقوں میں رواج پذیر نہیں بلکہ شمالی ہند میں بھی صوبہ سرحد اور پنجاب میں اس کا چلن نہیں لیکن اُردو کو ہندی پر یہ بھی فوقیت حاصل ہے کہ شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک سارے ہندوستان میں اُسکو پذیرائی حاصل ہے۔ کونسا صوبہ ایسا ہے جہاں اُردو کے شاعر نہیں، اُردو کے مصنفین نہیں، اُردو کے اخبار نہیں، اُردو کے کتب خانے نہیں، اور یہ سب اس صورت میں ہے کہ حامیان اُردو کی طرف سے کوئی منظم اور سرگرم جدوجہد نہیں ہو رہی ہے۔ جس طرح ہندی ساہتیہ سمیلن کے

...نت میں امتحانات کے صدہا مرکز قائم ہیں یا مہاتما گاندھی جیسے نامور سردار کے زیر نگرانی ہزاروں بستیوں میں، ہندی کی تعلیم جاری ہے یا رہنما یان ہنود اور کانگریسی سرداروں کی سرپرستی میں سالہا سال سے کانفرنسیں ہو رہی ہیں اگر حامیان اُردو کی جانب سے بھی اسی طرح یہ کام ہوا ہوتا تو خدا معلوم اُردو زبان آج کس منزل پر ہوتی۔ یہ جو کچھ کامیابی اُردو کو حاصل ہے محض اپنی ذاتی خوبیوں اور رعنائیوں کی وجہ سے ہے۔ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست تانہ بخشد خدائے بخشندہ

اسی سلسلہ میں پنڈت جی نے یہ بھی فرمایا ہے کہ

"سارے ملک کو نہ اُردو کی ضرورت ہے، نہ ہندی کی۔ نہ صرف یہی بلکہ اردو اور ہندی کے لیے سارے ملک میں کوئی گنجائش نہیں۔ ان کو سارے ملک کی زبان بنانے کی کوشش خواہ مخواہ کی زبردستی ہے اور کچھ زمانہ بعد یہ کوشش ختم ہو کے رہ جائے گی۔"

جہاں تک کہ ہندی کا تعلق ہے یہ صحیح مانا جا سکتا ہے مگر اُردو کی رفتار کو دیکھتے ہوئے ہمیں مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ ہم اس رائے کا اظہار پہلے بھی کر چکے ہیں اور اب بھی اس کا اعادہ کرتے ہیں کہ ہندی اور اُردو کے حامیوں کو دونوں زبانوں کے ادبوں کو ترقی دینے اور اُن کی ترویج کرنے میں کوشش کرنے کا موقع ہے۔ دونوں اپنی سعی کر لیں۔ جس زبان میں زیادہ اہلیت ہو گی وہ خود ہی اپنی فوقیت تسلیم کرائے گی۔

آخر پنڈت جی بھی تو اسے مانتے ہیں کہ

"اگر شمالی ہند میں اُردو اور ہندی دونوں برابر سے فروغ پاتے رہیں تو حرج کیا ہے؟"

ہم کہتے ہیں کہ شمالی ہند کی خصوصیت کیا ہے۔ سارے ملک میں اگر ہندی یا اُردو کو فروغ ہو تو کیا نقصان ہو گا؟

پنڈت جی سوال کرتے ہیں کہ

"محض ایک ہی زبان رائج کرنے کی غرض کیا ہے؟"

اور پھر تحریر فرماتے ہیں کہ اگر ہندو اور مسلمانوں میں ربط و یگانگت بڑھانے کے لیے یہ جد و جہد ہے تو موجودہ حالات میں دونوں فریقوں کی ذہنیت کے لحاظ سے

"یہ غرض ایک زبان رائج کرنے کے اصرار سے بجائے پورے ہونے کے فوت ہوتی نظر آتی ہے۔"

ہم بھی اسے تسلیم کرتے ہیں۔ مگر قابل غور یہ امر ہے کہ یہ "اصرار" کدھر سے ہے؟ اور اس کی تاریخ کیا ہے؟ جہاں تک ہمیں علم ہے حامیان اُردو نے کبھی ایسی کوئی کوشش نہیں کی جسے "اصرار" کہا جا سکے۔ وہ جو کچھ

کرتے ہیں محض اپنے ذوق علم و ادب کی تسکین کے لیے یا اُن حملوں سے بچنے کی غرض سے جو مختلف رنگوں میں گذشتہ پچاس سال کے اندر "اُردو" پر کیے گئے۔ اُن کی زبان یا قلم سے کبھی یہ ضرور نکل جاتا ہے کہ اُردو کو ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہیے یا چاہتے ہیں اور ممکن ہے کہ اسی قسم کی یا اسی سے ملتی جلتی کچھ قرارداد بھی بعض جلسوں میں منظور کی گئی ہوں مگر کوئی عملی جد وجہد تو آج تک کی نہیں گئی۔ حتیٰ کہ جو چند مجالس اُردو کی ترقی و اشاعت وغیرہ کے لیے ہیں وہ بھی صرف کتب فروشی پر قانع ہیں۔

ابھی گذشتہ نمبر میں مولوی عبدالحق صاحب کے ایک مضمون کا ذکر کیا جا چکا ہے اور اُسکے اقتباسات بھی پیش کیے گئے تھے۔ اُسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حامیانِ اُردو کی روش کیا ہے۔

برخلاف اسکے ایک نہیں متعدد مواقع ایسے بتائے جا سکتے ہیں جہاں اُردو کے بجائے ہندی کو رواج دینے کی کوشش کی گئی۔ حکومت کی جانب سے نہیں کہ وہ اجنبی اور غیر ذمہ دار ہے بلکہ خود ملک کے ذمہ دار افراد اور جماعتوں کی طرف سے۔ حتیٰ کہ لکھنؤ جیسے شہر میں (جو اُردو کا مرکز ہے، جہاں کے پونے تین لاکھ باشندوں میں ایک شخص بھی غالباً ایسا نہیں جو اُردو نہ سمجھتا ہو اور جہاں کے تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں ہی نہیں بلکہ ہزاروں ہندو بھی ایسے ہیں جو ہندی زبان سے ناآشنا ہیں) کانگریس کا اجلاس ابھی حال میں ہوا تو مسلمان اخبار نویسوں کو احتجاج کرنا پڑا کہ کانگریس کے پنڈال میں، نمائش گاہ میں اور ہر مقام پر ہندی کے کتبے، سائن بورڈ وغیرہ لگائے گئے اور تمام اشتہارات اور ٹکٹ وغیرہ ہندی میں چھپے اور اُردو کو کہیں نام نہیں لگنے پایا۔

پنڈت جی نے اس مسئلہ کے سیاسی اور ادبی دو پہلو بتائے ہیں۔ جہاں تک عنوان زیر بحث کا تعلق ہے ہماری ناچیز رائے میں یہ خالص سیاسی مسئلہ ہے۔ ہندوؤں کے جو رہنما ہندی کی ترویج اور اُردو کی مخالفت کے بانی ہوئے اُنھوں نے اس کی کیا مصلحتیں سوچیں ان کا صحیح علم کم سے کم ہمیں نہیں لیکن قیاساً دو باتیں ہمارے ذہن میں آتی ہیں۔

(۱) اردو بھاشا اور فارسی کے امتزاج سے بنی ہے اور فارسی ایک ہزار سال تک عربی کے زیر سایہ رہی اس لیے اردو میں فارسی اور عربی کے بکثرت الفاظ شامل ہو گئے اور بھاشا کے صرف افعال و ضمائر رہ گئے ہیں۔ اس سبب سے ہندوؤں کو اس زبان سے وہ فطری مناسبت نہیں پیدا ہو سکی جو مسلمانوں کو ہے۔ جب تک مسلمانوں کی حکومت تھی ہندوؤں کو عربی، فارسی اور اردو میں مہارت پیدا کرنے کی حاجت تھی۔ جب مسلمانوں کی حکومت نہ رہی تو یہ ضرورت بھی باقی نہ رہی۔ اور اُنھوں نے دیکھا کہ انگریزی اقتدار کے دور مسابقت میں مسلمانوں کو اُس وقت تک ایک طرح کا تفوق رہے گا جب تک دفتری

یا عدالتی زبان فارسی یا اُردو ہے۔ فارسی اور اُردو کے بجائے اگر ہندی کو یہی منزلت حاصل ہو جائے تو
نقشہ بدل جانا یقینی تھا اس لیے کہ قدیم زمانے کے مسلمانوں نے بھاشا یا ہندی میں خواہ کتنی ہی مہارت پیدا
کی ہو اُردو کے رواج کے بعد تو فارسی تک کی طرف سے اُن کی رغبت کم ہو گئی۔ اور بھاشا یا ہندی
محض دیہاتی ضروریات کے لیے رہ گئی۔

(۲) بعض متعصب ہندو رہنما اُردو کو اسلامی عہد کی یادگار سمجھتے ہوں گے اور اگر اُن کی خواہش یہ ہو
کہ جہاں تک ممکن ہو ایسی یادگاروں اور علامتوں کو مٹایا جائے کہ آنے والی نسلوں میں کوئی خیال
مسلمانوں کے سابقہ تفوق کا باقی نہ رہے تو کوئی تعجب نہیں۔

اب جن لوگوں نے مشترکہ زبان کو ہندوستانی قومیت کے نشوونما کے لیے ضروری قرار دیا اور اس
مقصد کے لیے ہندی کو تجویز کیا کہ ہندوستان کی بعض دوسری دیسی زبانوں سے ہندی کو زیادہ قربت ہے،
اور اُن کے رسم الخط بھی یکساں ہیں، ان میں کچھ لوگ ممکن ہے کہ حقیقت میں وہی قومی مفاد پیش نظر رکھتے
ہوں جس کا اظہار کیا جاتا ہے مگر زیادہ تر وہی لوگ ہیں جن کے دل عصبیت کے جذبات سے لبریز ہیں،
البتہ اُن کے مصالح اس کے متقاضی نہیں کہ صاف طور پر اپنے حقیقی خیالات ظاہر کریں۔

ہمیں ہندی ساہتیہ سمیلن کے روح رواں بابو پرشوتم داس ٹنڈن صاحب سے کانپور کی تحقیقاتی
کمیٹی کے سلسلہ میں سابقہ رہا ہے اور اب تک اس تجویز کی نقل بھی ہمارے پاس محفوظ ہے جو اُنھوں نے کمیٹی کی
جانب سے سفارشات مرتب کرتے وقت زبان کے مسئلہ پر تیار کی تھی۔ راقم الحروف کے حلق سے تو ظاہر
ہے کہ وہ زہر کا گولا کیسے اُترتا مگر کمیٹی کے صدر بابو بھگوان داس اور اُس کے معتمد پنڈت سندر لال بھی اُس پر
راضی نہ ہو سکے اور بالآخر اُنھیں حضرات کی وجہ سے وہ تجویز بدل گئی اور موجودہ صورت میں آئی جو رپورٹ
میں موجود ہے۔ (دیکھیے الناظر بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۳۱ء صفحہ ۶۱-۶۲)

(۳) ادبی اور لسانی اصلاحات کا سوال وہ بالکل ایک جداگانہ بحث ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں حالات
و ضروریات زمانہ کے لحاظ سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور ارباب فن اصلاح و ترقی کی کوشش میں لگے
رہتے ہیں۔ ہندوؤں میں پنڈت کشن پرشاد کول صاحب اور میرے استاد محترم جناب پنڈت منوہر لال زتشی
صاحب یا سر تیج بہادر سپرو اور پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی وغیرہ جیسے اُردو کے دلدادہ اور مسلمانوں میں
ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولوی فضیل الرحمٰن صاحب وغیرہ مصلحین اُردو جو کچھ اس بات میں فرماتے
ہیں وہ سب سننے اور غور کرنے کے لائق ہوتا ہے اور جہاں تک اُن کے مشورے قابل قبول اور عملی طور
مفید ہوں کوئی اُردو کا خادم اُن کے ماننے سے انکار نہیں کر سکتا۔ باقی ان دونوں سوالات کو باہم خلط ملط

کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ مخالفین اُردو کی ایک جماعت اصلاح کی آڑ میں تخریب کے درپے ہے اور خود حامیان اُردو میں اللہ کے فضل سے ایسے اصحاب موجود ہیں جو فراوانی عقل کے باعث یا مخالفانہ کوششوں سے متاثر و مرعوب ہو کر اُردو کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔

ملک میں ایک زبان رائج کرنے کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے پنڈت جی نے تحریر فرمایا ہے کہ

"ایک ہی معقول تجویز اس مسئلہ کے حل کے متعلق پیش ہوتی ہے کہ جس سے وہ غرض جو ظاہرا ایک زبان رائج کرنے کی بتائی جاتی ہے بخوبی پوری ہوتی ہے..... تجویز یہ ہے کہ ہمارے مدرسوں میں شروع ہی سے اُردو اور ہندی دونوں زبانوں کی پڑھائی لازمی کی جائے۔"

اور پنڈت جی اس تجویز کی تائید بھی فرماتے ہیں کیونکہ اُن کی رائے ہیں

اگر کوئی طریقہ ممکن العمل ایسا ہے کہ جس سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی زبان، لٹریچر، روایات، حسیات و جذبات سے واقف ہو سکیں اور ان میں ایک دوسرے کے طرز معاشرت سے یگانگت پیدا ہو۔ ایک دوسرے کے روایات و جذبات کا احترام اور رواداری مدنظر رہے تو وہ یہی طریقہ ہے اسی کو ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد سمجھنا چاہیے۔ اس طرح ذہنیت کے بدلنے سے دونوں قوموں میں سیاسی و اقتصادی اغراض کی یکسانیت کا حسن آسانی پیدا ہو سکے گا۔ یہی ایک تجویز ایسی ہے کہ جس پر عمل کرنے میں ہندو اور مسلمانوں کو کوئی اعتراض نہ کرنا چاہیئے۔"

پہلا اقتباس غمازی کر رہا ہے کہ ایک زبان رائج کرنے کی غرض جو بیان کی جاتی ہے پنڈت جی کے نزدیک وہ خود مشتبہ ہے اور دوسرے اقتباس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ امر غیر مشتبہ طور پر طے پا گیا ہے کہ ہندی ہندوؤں کی زبان ہے اور اُردو مسلمانوں کی زبان۔

مولوی عبدالحق صاحب نے اپنے مضمون "بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی اصل حقیقت" میں ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ

"مہاتما گاندھی نے ایک ایسی بات کہی جسے سُن کر مجھے بے حد تعجب اور افسوس ہوا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اُسے بنایا اور پھیلایا مسلمان چاہیں تو اُسے رکھیں اور پھیلائیں۔"

مہاتما جی نے بقول مولوی صاحب کے "یہ بات ناواقفیت کی بنا پر کہی ہے" کیونکہ مولانا محمد علی مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر محمود جیسے لوگوں سے بہت میل جول رکھنے کے باوجود وہ اردو زبان و ادب کی تاریخ اور اُس کے سرمایہ کی نوعیت سے بے خبر ہیں مگر پنڈت جی تو اُردو کے ادیب ہیں۔ برسوں

ہندوستانی اخبار کی ادارت کرتے رہے اور نصف درجن کتابیں لکھ کر شائع کرا چکے ہیں۔ کیا وہ اتنا نہیں جانتے کہ سارے ملک میں نہ سہی تو کم سے کم شمالی ہند میں اور دیہات کے اندر نہ سہی تو کم سے کم شہروں اور قصبات میں اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی زبان ہے۔ اور اگر مسلمانوں کی مذہبی کتابیں اُردو میں ترجمہ ہو کر آگئی ہیں تو ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کا بھی ایک معقول ذخیرہ اُردو میں ہے۔ دیبی بھاگوت، شریمد بھاگوت، رامائن بالمیکی، مہابھارت، بھگوت گیتا کے متعدد تراجم۔ منوسمرتی۔ جوگ بشسٹ وغیرہ آخر اُردو میں موجود ہی ہیں۔ ہندی میں بھی یہ کتابیں ترجمہ ہی ہو کر آئی ہیں۔ پہلے سے موجود نہ تھیں اور شاید وہ ترجمے بھی اُردو ترجموں سے کچھ زیادہ پُرانے نہیں۔

جہاں تک کہ اصل تجویز کا تعلق ہے وہ بظاہر معصوم بھی ہے اور معقول بھی۔ کسی زبان کی تحصیل نہ مسلمانوں کے لیے گناہ ہے اور نہ غالباً ہندوؤں کے نزدیک پاپ۔ اور صوبۂ متحدہ میں اس تجویز پر عمل بھی ہو رہا ہے۔ مگر اول تو یہ ایسی تجویز ہے جس پر صرف محدود رقبے میں عمل ہو سکتا ہے سارے ملک میں اس کا نفاذ ممکن نہیں کیونکہ جن صوبجات کی اپنی مستقل زبانیں ہیں وہ اسے کیوں گوارا کریں گے کہ اپنی مادری یا صوبہ واری زبان کے علاوہ ایک نہ چھوڑ تین زبانوں کی تعلیم لازمی کر لیں یعنی اپنے بچوں کو انگریزی اُردو اور ہندی تین اور زبانیں پڑھائیں۔ ایسی صورت میں ایک زبان کا جو مقصد ظاہر کیا جاتا ہے وہ بھی حاصل نہ ہوگا۔ اسکے علاوہ مختلف السنہ کی تعلیم پر جس قدر وقت اور توجہ صرف ہوگی دوسرے علوم و فنون کی تعلیم میں اُسی نسبت سے کمی ہونا لازمی ہے۔ شاید اسے بھی عام طور پر لوگ پسند نہ کریں گے۔ اور ممکن ہے کہ ذہنی و دماغی ارتقا میں اس بارے کچھ تقلیل واقع ہو اور کشاکش حیات میں بھی قدرے دشواری۔

صوبہ متحدہ میں اس وقت بھی دو قسم کے تجربے کیے جا رہے ہیں۔ اُردو اور ہندی، ہندو مسلمانوں دونوں کے لیے مدارس میں لازمی ہے۔ اس کے علاوہ ایسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جو مضمون کے لحاظ سے یکساں ہوتی ہیں صرف رسم الخط بدلا ہوتا ہے۔ ہندی دانوں کے لیے ناگری حروف میں اور اُردو دانوں کے لیے فارسی حروف میں کتابیں چھپتی ہیں۔ کہیں کہیں مشکل الفاظ بدلے ہوتے ہیں۔ آئندہ پچیس تیس سال کے بعد اس کے نتائج ظاہر ہوں گے اُس وقت رائے قائم کی جائے گی کہ کہاں تک کامیابی ہوئی اور ہندو مسلمانوں کے تعلقات کو بہتر بنانے میں کہاں تک یہ نسخہ کارگر ہوا۔

یہ امر بھی مشتبہ ہے کہ مدارس میں جس قسم کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں اُن سے وہ نتائج و ثمرات مترتب ہو سکتے ہیں جن کی پنڈت جی توقع کرتے ہیں۔ رہیں تو اس میں بھی شبہ ہے کہ السنہ کی تعلیم کا جو طریقہ ہے اس سے کہہ سے کم ثانوی تعلیم کے مدارس کے طلبا اُن زبانوں سے اتنے بھی واقف ہوتے

ہیں کہ معمولی مکاتبت صحت و روانی کے ساتھ کر سکیں۔

اصل یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلاف کی بنیاد اس کو قرار دینا کہ دونوں کی زبان ایک نہیں بجائے خود غلط ہے۔ آخر بنگال میں بنگالی اور پنجاب میں پنجابی، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی زبان ہے۔ پھر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان صوبجات کے ہندو مسلمان بمقابلہ صوبہ متحدہ یا صوبہ بہار کے زیادہ متحد ہیں، زیادہ ایک دوسرے کے روایات وجذبات کا احترام کرتے ہیں۔

اختلافات کے وجوہ دوسرے ہیں۔ اور جب تک اُن وجوہ کے دفع کرنے کی سعی نہ ہوگی، اختلاف نہیں رفع ہو سکتا۔ غلط تنقیح قائم کرکے اُردو کے خلاف جد وجہد کرنا محض سیاسی بازیگری ہے اور ہمیں افسوس ہے کہ نہ صرف بہت سے نادان مسلمان اہل قلم جو سیاسیات کو ایک شجر ممنوعہ تصور کرتے ہیں اُس کے فریب میں آجاتے ہیں بلکہ ہمارے مکرم پنڈت جی کے سے سیاست داں بھی مغالطہ کھا گئے۔

اُردو کا قدیم نام ہندی تھا یا ہندوستانی۔ اب تک کی تحقیقات سے یہ امر واضح نہیں ہو سکا کہ قدیم نام ترک کرکے جدید نام کیوں رکھا گیا، کب اور کس نے رکھا مگر یہ واقعہ ہے کہ انگریزوں میں اُردو کے بجائے ہندوستانی ہی رائج ہے۔ جب سر انٹونی میکڈانلڈ کے عہد میں ہندی اُردو کی نزاع اس صوبہ میں چھڑی اُسی وقت سے بعض لوگوں کا خیال اس طرف رجوع ہوا کہ اگر ہندوستانی کا نام رائج کیا جائے تو شاید اس پردے میں اُردو کی کچھ حفاظت ہو جائے۔ چنانچہ مرحوم مولوی عزیز مرزا اس کے بڑے حامی تھے اور اگر ہماری یاد غلطی نہیں کرتی تو ناگپور کے ایک اجتماع میں (ایجوکیشنل کانفرنس یا مسلم لیگ کی مجلس مضامین میں) ایک تجویز بھی اُنھوں نے اسی مضمون کی پیش کی تھی۔

مولوی عزیز مرزا مرحوم کی تجویز تو غالباً منظور نہیں ہو سکی تھی مگر اُس وقت سے بعض مسلمان اس لفظ کی حمایت کر رہے ہیں اور عاقبت اندیشوں کی ایک جماعت تو یہ سمجھتی تھی کہ اس لفظ کو مقبول بنانے کے لیے اردو کا نام ترک کر دینا چاہیے۔ مگر ہماری رائے اس کے خلاف تھی۔ ہمارا خیال تھا اور ہے کہ ہندی اور ہندوستانی کے بجائے اُردو کا لفظ زبان کی قدرتی اور ارتقائی حالت کا مظہر ہے مذہبی تعصب یا فرقہ وارانہ ذہنیت کا نتیجہ نہیں اور اسی وجہ سے اس کو ایسا حسن قبول حاصل ہے کہ ہندوستان کے بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ اب اس کو بدلنے کے لیے غیر معمولی مسلسل کوشش کی ضرورت ہے جو محض تضیع اوقات کا باعث ہوگی۔ صاحب معارف بھی اس "غیر معروف لیکن صحیح نام کو" فروغ دینے کے حامی ہیں اور اُن کی رائے میں انگریزوں سے پہلے بھی اردو کا نام ہندوستانی ہی تھا۔ مگر ہمیں یہ بھی اندیشہ تھا کہ ادھر حامیانِ اُردو کی جانب سے اُردو کو ہندوستانی کے نام سے مشہور کرنے کی واقعی کوشش شروع ہوئی اُدھر

فوراً ہی ہندی کے حامی ہندی کو ہندوستانی مشہور کرنے کی جدوجہد شروع کر دیں گے اور چونکہ ہمارے مقابلہ میں اُن کے ذرائع وسیع اور اُن کی علمی قوتیں زیادہ بیدار ہیں اس لیے وہ جلد کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ اس پر زور نہ دیا جاتا۔ چنانچہ اب بھارتیہ ساہتیہ پرشد کی کارروائی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندی زبان کے حامیوں نے یہی راہ اختیار کر لی ہے اور جو فتنہ اب تک خوابیدہ تھا، ہمارے عاقبت اندیش دوستوں کی عنایت سے بالآخر بیدار ہو گیا ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ملک کی زبان کا نام ایسا ہونا چاہیے کہ آسانی سے اُس ملک کی طرف منسوب ہو سکے۔ جیسے فرانس کی زبان فرانسیسی، روس کی زبان روسی، عرب کی زبان عربی، فارس کی زبان فارسی وغیرہ مگر اس دنیا میں ایک براعظم امریکہ بھی ہے جس کے مختلف خطوں کی مختلف زبانیں ہیں اور وہ اُن ملکوں کے نام سے کوئی نسبت نہیں رکھتی ہیں۔ مثلاً کنیڈا اور ممالک متحدہ امریکہ کی زبان انگریزی ہے۔ میکسیکو اور جنوبی امریکہ کی دوسری ریاستوں کی زبان پرتگالی ہے یا ہسپانی۔ گویا وہ طریقہ پُرانا ہے اور یہ نیا۔

زبان کی اصلاح اور ادب کی ترقی کا خیال بہت اچھا ہے۔ مگر اول تو ہر شخص میں اس کی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اس خدمت کو انجام دے سکے۔ یہ کام درحقیقت اُن لوگوں کا ہے جو مختلف زبانوں کے عالم ہوں اور خود اُس زبان کے ماہر جس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے اصلاح ہمیشہ آہستہ آہستہ اور تدریجی طور پر ہوتی ہے۔

اصلاح کے سلسلہ میں یہ بات بھی نہ بھولنا چاہیے کہ یہ امر قطعاً ناممکن ہے کہ تمام اہل قلم یکساں طور پر سلیس اور عام فہم عبارت لکھنا پسند کریں۔ انگریزی اور فارسی میں بھی ایسا نہیں ہے۔ ہر انشا پرداز کا ایک جدا رنگ اور اسلوب ہوتا ہے۔ ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است۔ نازک اور دقیق خیالات کو عام فہم زبان میں بیان کرنا آسان بات نہیں۔ پھر ہر موضوع اور ہر فن کی تحریروں کے لئے جداگانہ انداز بیان درکار ہے۔ فلسفہ اور دیگر علوم کے مضامین، تاریخ یا افسانہ کی طرح سلیس اور عام فہم نہیں بنائے جا سکتے۔

اُردو کے چار نامور انشا پردازوں کی تصانیف قریب قریب ہر کتب خانہ میں رہتی ہیں اور کوئی اہل قلم ایسا نہیں جس نے اُن کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ ان چاروں کا طرز تحریر جدا ہے اُن میں سے کسی ایک کی تصانیف کو ادبیات اُردو میں سے خارج کر دیا جائے تو جو جگہ خالی ہو گی اُس کا پُر کرنا آسان نہ ہوگا۔ یہی حال شاعروں کا ہے۔ ذوق و غالب، آتش و ناسخ ایک ہی دور کے شاعر ہیں مگر ہر ایک کا رنگ جدا ہے۔ کیا ان میں سے کسی ایک کے دیوان کو ذخیرۂ ادب سے خارج کرنا ممکن ہے۔ بعینہٖ یہی کیفیت آجکل کے انشا پردازوں اور شاعروں کی ہے۔ مولانا ابوالکلام اور مولانا سید سلیمان سے امید کرنا کہ وہ اپنا اسلوب بیان ترک کر کے

خواجہ حسن نظامی اور راشد الخیری کا طرزِ تحریر اختیار کریں یا اقبال اور اصغر سے توقع کرنا کہ وہ اپنے اندازِ بیان کو چھوڑ کر آرزو اور حسرت موہانی کے رنگ میں کہنے لگیں غلطی ہی نہیں مضحکہ انگیزی و تمسخر کے مرادف ہوگا۔

کسی زبان کے ادبیات کی تکمیل و ترقی کے لیے یہ تنوع اور اندازِ بیان کا یہ اختلاف ضروری ہے ناگزیر ہے۔ لوگوں کے قدرتی میلان کو روکنا اور ان کو کسی خاص اسلوبِ تحریر کا پابند بنانے کی سعی کرنا اُنکے ساتھ یا ادب کے ساتھ دوستی نہیں ہے۔ اور نہ یہ کسی کے بس کی بات ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی یا انجمن ترقی اردو کوئی بھی اس غیر فطری کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

انجمن ترقی اُردو اور ہندوستانی اکیڈمی دونوں نے پتھر کی طباعت کے بجائے ٹائپ کی چھپائی کو اختیار کیا۔ نتیجہ سامنے موجود ہے۔ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں کتابیں ذخیرہ میں بھری رکھی ہیں اور کوئی اُنکا پرسان حال نہیں ہے۔ یہی کتابیں پتھر پر چھاپی گئی ہوتیں تو لاگت بھی کم آتی اور ملک میں اُن کی مانگ بھی زیادہ ہوتی۔ کاش یہ دونوں مجلسیں اب بھی اپنی ضد اور ہٹ سے باز آئیں تاکہ جس قدر قومی سرمایہ اور سرکاری روپیہ ضائع ہو رہا ہے اور ادب اُردو کی اشاعت میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے اُس سے نجات ملے اور اُن کا دائرہ خدمت پوری وسعت حاصل کر سکے۔

مجذوب کی بڑ

(جناب خواجہ عزیز الحسن غوری صاحب مجذوبؔ اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس)

جی اُٹھے مُردے تری آواز سے
پھر ذرا مطرب اُسی انداز سے

گنگناؤگے جو اس انداز سے
خود تڑپ نکلیں گے نغمے ساز سے

انتہا میں ہے نظر آغاز سے
ہوں مخاطب عور کی آواز سے

اب زمیں پر بھی نہیں پڑتے قدم
آرہا ہوں کس کی بزمِ ناز سے

پھر ہو تازہ واقعاتِ کوہِ طور
پھر اُٹھے پردہ حریمِ ناز سے

اہلِ محفل فرشِ محفل ہوگئے
بزم میں آئے وہ اس انداز سے

سب نے کی حرزِ جاں وردِ زباں
بات جو نکلی لبِ اعجاز سے

کیوں اُلٹ دوں میں نہ ہر بزمِ سخن
دردِ دل پھر دکھ بھری آواز سے

دل، لبر کا تو اے مجذوب اگر
بس ارے بس، اپنے گزر انداز سے

مقالات قزوینی

(جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی۔اے)

مقالہ ۶

زبان فارسی کی قدیم ترین کتاب کون ہے؟

(بخدمت مدیر مجلہ "ایرانشہر") (پیرس ذیقعدہ ۱۳۴۱ھ)

آپ نے دریافت فرمایا ہے کہ زبان فارسی موجودہ کی سب سے قدیم ترین کتاب کون ہے۔ تو اس کا جواب دینا جس طور پر کہ آپ دریافت فرماتے ہیں بہت مشکل ہے اس وجہ سے کہ ملک ایران پر عربوں کو مسلط ہوئے تیرہ سو برس گذرے۔ اس عرصہ میں ہمارے پاس کوئی وسائل باقی نہ رہے جس سے دریافت کیا جا سکے کہ سب سے پہلی کتاب جو زبان فارسی میں موجودہ رسم الخط میں، نہ کہ خط پہلوی و پازند میں، لکھی گئی تھی وہ کس زمانہ میں تھی۔ اس کا موضوع کیا تھا اور اس کا مؤلف کون تھا۔ البتہ اگر مسئلہ اس طور پر بیان کیا جائے کہ سب سے قدیم کتاب زبان فارسی موجودہ کی کہ جو اب بھی باقی ہے کون ہے تو البتہ اس کا ایک مجمل عام جواب دینا ممکن ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ سب سے قدیم کتب زبان فارسی کی کہ جو بعد تسلط اسلام اب بھی باقی ہیں تین کہی جا سکتی ہیں اور ان تینوں کتابوں کا زمانۂ تالیف قریب ہی قریب ہے۔

پہلی کتاب۔ ترجمۂ فارسی تاریخ کبیر ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) یہ ترجمہ ابو علی محمد بن محمد بن عبداللہ البلعمی متوفی ۳۶۳ھ وزیر منصور بن نوح ششم بادشاہ سامانی (۳۵۰ھ۔ ۳۶۶ھ) نے بادشاہ کے حکم سے ۳۵۲ھ میں یعنے اصل کتاب کی تالیف سے پچاس برس بعد اسانید و احادیث حذف کر دینے کے بعد زبان فارسی میں کرایا تھا۔ اور جیسا کہ معلوم ہے اس کتاب کے متعدد نسخے اب بھی موجود ہیں۔ اور لکھنو میں چھپ بھی گیا ہے اور یہ ترجمہ (نہ کہ اصل متن عربی میں) مختلف زبانوں میں مثلاً ترکی مشرقی و ترکی عثمانی و فرنچ میں ترجمہ ہوا اور ترکی شرقی اور فرنچ میں چھپ بھی گیا ہے۔[1]

دوسری کتاب۔ ترجمۂ فارسی تفسیر کبیر انھیں طبری کی ہے اور یہ بھی اسی بادشاہ سامانی یعنے منصور بن نوح کے حکم سے ترجمہ ہوئی مگر اس کی تاریخ کا صحیح طور پر تعین نہیں کیا جا سکتا۔ صرف اسی قدر کہا

[1] اصل متن عربی تاریخ طبری سب سے پہلے ۱۸۷۹ء سے ۱۹۰۱ء بمقام لیڈن ۱۵ جلدوں میں اور نیز ۱۳۲۶ھ مصر میں ۱۳ جلدوں میں چھپا ہے

جا سکتا ہے کہ بادشاہ مذکور کی سلطنت کے زمانہ میں جو درمیان ۳۵۰ھ اور ۳۶۵ھ کے تھا تحریر ہوئی اور جہاں تک کہ خاکسار کو علم ہے اس کتاب کے دو نسخے اب بھی موجود ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ دونوں ناقص ہیں جن میں سے ایک جو سات جلدوں میں سے ایک جلد نہایت نفیس و ممتاز و قدیم سورۂ فاتحہ سے سورۂ نساء تک کی تفسیر ہے پیرس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ نسخہ ۶۲۴ھ کے قبل کا لکھا ہوا ہے اور راقم سطور نے اُس کے دیباچہ کا ایک حصہ محض اُس زمانے کی زبان فارسی کے نمونہ کے طور پر "مرزبان نامہ" کے مقدمہ میں نقل بھی کیا ہے جس کا ایک ٹکڑا اُسی املائے قدیم کے ساتھ بعینہ بدون ایک حرف اور ایک نقطہ کی کمی زیادتی کے ذیل میں دیا جاتا ہے :—

"و این کتاب تفسیر بزرگ ست از روایت محمد بن جریر الطبری رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ کردہ بزبان پارسی و دری راہ راست و این کتاب را بیاوردند از بغداد چہل مصحف بوذ این کتاب نبشتہ بزبان تازی و با سنادہاے دراز بوذ و بیاوردند سوے امیر سید مظفر ابو صالح منصور بن نوح بن نصر بن احمد بن اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہم اجمعین پس دشخوار آمد بروے خواندن این کتاب و عبارت کردن آن بزبان تازی و چناں خواست کی مرین را ترجمہ کنند بزبان پارسی پس علما ء ماوراء النہر را گرد کرد و این از ایشاں فتوے کرد کی روا باشد کما این کتاب را بزبان پارسی گردانیم گفتند روا باشد خواندن و نبشتن تفسیر قرآن بپارسی مر آن کسے را کہ او تازی نداند از قول خداے عز و جل کی گفت وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ گفت من هیچ پیغامبری را نفرستاذم مگر بزبان قوم او و آن زبانی کایشان دانستند و دیگر آن بوذ کاین زبان پارسی از قدیم باز دانستند از روزگار آدم تا روزگار اسمٰعیل علی ہمہ پیغامبران و ملوکان زمین بپارسی سخن گفتندی و اول کسی کی سخن گفت بزبان تازی اسمٰعیل پیغامبر بوذ علی و پیغامبر ما صلی اللہ علیہ از عرب بیروں آمد و این قرآن بزبان عرب بر او فرستاذند و اینجا بدین ناحیت زبان پارسی است و ملوکاں این جانب ملوک عجم اند پس بفرموذ ملک مظفر ابو صالح تا علمائے ماوراء النہر را گرد آوردند از شہر بخارا چون ..... و ہم ازین گونہ از شہر سمرقند و از شہر اسبیجاب و فرغانہ و از ہر شہرے کی بوذ بماوراء النہر اندر ہمہ را بیاوردند و ہمہ خطہا بداذند بر ترجمۂ این کتاب کاین راہ راستست پس بیروں آمد فرمان امیر سید ملک مظفر بر دست کسہاے او و نزدیکان او و وزیران او و بر زبان خاصۂ او و خادم او ابو الحسن فایق الخاصۃ سوی این جماعت مرداں و این علما تا ایشاں از میان خویش ہر کدام داناتر اختیار کردند تا این کتاب را ترجمہ کردند و از جملہ این مصحف اسنادہاے دراز بیفگندند و اقتصار کردند بر متون اخبار آنچ"

اور دوسرا نسخہ برٹش میوزیم لنڈن میں ہے۔ اس میں سورۂ فاتحہ سے سورۂ مائدہ تک کی تفسیر اور سنہ ۴۸۳ھ کا لکھا ہوا ہے[1]۔

تیسری کتاب علم طب میں ہے۔ اس کا نام "کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ" تالیف ابو منصور موفق بن علی الہروی کی ہے اور یہ بھی اُسی زمانے میں یعنے منصور بن نوح سامانی کے عہد میں مابین سنہ ۳۵۰ھ و ۳۶۵ھ تصنیف ہوئی۔ اس کتاب کا صرف ایک نسخہ جو ایک ہی جلد میں ہے بخط علی بن احمد طوسی اسدی شاعر مشہور مولف "گرشاسپ نامہ" و "فرہنگ فارسی معروف بہ لغات اسدی" کتب خانہ ونیا (Vienna) میں موجود ہے۔ اس نسخہ کی تاریخ تحریر ۴۴۷ھ اور خط کوفی یا شبیہ بہ کوفی ہے[2]۔

یہ اسدی جس کو اسدی صغیر یا اسدی ثانی کہنا چاہیے اسدی اول یعنے ابو نصر احمد بن منصور الطوسی کا بیٹا ہے ثانی الذکر مشہور قصائد مناظرہ کا مصنف ہے مثلاً مناظرہ درمیان مغ و مسلم اور درمیان شب و روز وغیرہ اور فردوسی کا معاصر اور بعض کے قول کے موافق اُس کا اُستاد بھی تھا اور سلطان مسعود غزنوی کے زمانے میں یعنے درمیان سنہ ۴۲۱ھ و ۴۳۲ھ اس نے وفات پائی۔ اُس کے بیٹے اسدی ثانی (جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں) کی تاریخ وفات صحیح طور پر ہم کو نہیں معلوم مگر قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ۴۵۸ھ کے بعد ہوئی جو "گرشاسپ نامہ" کی تالیف کا سال ہے اور اُن شعرا کا نام دیکھنے سے جن کے اشعار "لغات اسدی" میں مذکور ہیں مثل معزی و بہرامی و ابو طاہر خاتونی وغیرہ کے، صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اسدی ۴۵۸ھ کے بہت بعد تک زندہ تھا[3]۔ اس نکتہ کو نہ بھولنا چاہیے کہ اکثر ارباب تذکرہ نے ان دونوں اسدیوں کے درمیان خلط کر دیا ہے اور ان دونوں میں کوئی تمیز باقی نہیں رکھی "کتاب الابنیہ" کے خصائص میں سے یہ ایک بڑی خصوصیت ہے کہ علاوہ اصل کتاب کے قدیم ہونے کے یہ نسخہ قدیم ترین قلمی کتاب فارسی کا ہے جو اس وقت دنیا میں موجود ہے یعنے جہاں تک کہ ہم کو کتب خانہائے یورپ و مصر و ٹرکی و ہندوستان کی فہرستوں سے پتہ چلتا ہے۔ والا ممکن ہے کہ ایران یا ترکستان یا کسی دوسری جگہ کے کتب خانہ میں جس کی فہرست ہنوز چھپی نہیں ہے کوئی اس سے بھی قدیم تر کتاب موجود ہو مگر اُس کا حال ہم کو نہیں معلوم۔

---

[1] اصل متن عربی تفسیر طبری کا سنہ ۱۳۲۳ھ لغایت سنہ ۱۳۳۰ھ میں ۳۰ جلدوں میں بولاق (مصر) میں چھپا ہے۔

[2] اس کے بعد اصل کتاب میں کتاب الابنیہ کے پہلے صفحہ کا عکس دیا ہوا ہے جو بسبب وقت طوالت کے ترجمہ میں نہیں دیا جا سکتا (مترجم)

[3] قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ "لغات اسدی" "گرشاسپ نامہ" کے بعد تالیف ہوئی کیونکہ اُس میں "گرشاسپ نامہ" کے بعض اشعار بطور سند کے دیے ہوئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۹۷ء میں باہتمام مشہور مستشرق پاول ہارن برلن میں چھپ گئی ہے۔

میو زلیگمان (F. R. Seligmann) نے ۱۸۵۹ء میں اسی نادر کتاب (کتاب الابنیہ) کو نہایت عمدگی اور صحت کے ساتھ چھاپا ہے اور اصل نسخہ کے تین ورق کا عکس بھی بطور نمونے کے کتاب میں شامل کر دیا ہے تاکہ پڑھنے والے کو اُس زمانے کے رسم الخط اور املائے قدیم کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اور اس کتاب کا ترجمہ زبان جرمن میں عبد الخالق آخوندوت بادکوبہ (Bakku) نے کیا ہے۔

مذکورۂ بالا واقعات سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ یہ تینوں کتابیں یعنے ترجمۂ تاریخ طبری اور ترجمہ تفسیر طبری اور کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ (باوجود معین ہوتے تاریخ ترجمہ طبری کے کہ جو ۳۵۲ھ ہے) ایک ہی عہد یعنے منصور بن نوح سامانی کے زمانے کی لکھی ہوئی ہیں اور یہ زمانہ ۳۵۰ھ لغایت ۳۶۶ھ ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان تینوں میں سے تقدم زمانی کس کو حاصل ہے۔ اسی بنا پر قدما کی تقلید میں ان تینوں کتابوں کو قدیم ترین کتب فارسی کہ جو اس وقت موجود ہیں شمار کیا ہے۔

مگر راقم سطور کے عقیدہ میں ان تین کتابوں سے قدیم تر ایک کتاب یا تالیف ایسی موجود ہے کہ جس کو اگرچہ "کتاب" نہیں کہہ سکتے مگر پھر بھی وہ نثر فارسی کی ایک تالیف ضرور ہے۔ میرا مطلب شاہنامہ کے اُس قدیم دیباچہ سے ہے جو کبھی کبھی بعض قلمی شاہناموں میں دیکھا جاتا ہے۔ مگر یہ دیباچہ اُس دیباچہ سے بالکل مختلف ہے جو زیادہ تر قلمی نسخوں اور عام طور پر چھاپہ کے نسخوں میں بالفعل موجود ہے۔ یہ دیباچہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں دیباچۂ بایسنغری کے نام سے مشہور ہے کیونکہ بایسنغر (متوفی ۸۳۷ھ) نے نواسۂ امیر تیمور کے حکم سے اس کو جمع کیا تھا۔

بعض دلائل کی بنیاد پر کہ جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے اور جن کا ذکر نمبر ۲ جلد ۵ "کاوہ" صفحہ ۱ میں کر دیا گیا ہے یہ مقدمۂ شاہنامہ (یا صحیح طور پر اس مقدمہ کا اتنا حصہ جو ابتدا سے لے کر فردوسی اور سلطان محمود کی ملاقات تک کا ہے) بلا کمی و زیادتی و بلا تغییر عین وہی مقدمہ ہے جو اس شاہنامہ نثر کے واسطے تحریر ہوا تھا جو ابو منصور محمد بن عبد الرزاق طوسی کے اہتمام سے ۳۴۶ھ میں جمع ہوا اور فردوسی نے اسی شاہنامہ کو نظم کیا تھا۔ پس اس حساب سے یہ مقدمہ ترجمہ تاریخ طبری سے، جو ۳۵۲ھ کا ہے، چھ سال قدیم تر اور منصور سامانی کے جلوس سے چار سال پیشتر ہے۔

نمبر ۲ جلد ۲ "کاوہ" دور جدید میں ایک تفصیلی مضمون اسی نثر کے شاہنامہ کے متعلق نہایت تحقیق و تامل سے فاضل علامہ آقائی "محصل" کے قلم کا لکھا ہوا موجود ہے جو یورپی مستشرقین علی الخصوص مشہور اُستاد نولدکہ کے تتبع میں تحریر ہوا تھا اور "کاوہ" کے آخر تین سال کے مختلف نمبروں میں فاضل مذکور نے اپنی تحقیقات سے بھی اُس پر اضافہ کیا ہے اگر کوئی شخص ان مضامین کو دیکھنا چاہے تو وہ "کاوہ" کے

اُن نمبروں کی طرف رجوع کرے۔

افسوس اور صد ہزار افسوس کہ یہ بیش قیمت مقدمہ بسبب بعد زمانی کے (یعنے تقریباً ہزار برس کا پرانا ہے) کاتبوں کی غفلت اور ناسمجھی سے بالکل خراب اور فاسد ہوگیا ہے یہاں تک کہ بعض مقامات پر وہ مسخ ہوکے رہ گیا ہے۔ راقم سطور نے بارہ نسخے اُس کے جو پیرس اور لندن اور کیمبرج اور برلن کے کتب خانوں میں موجود ہیں اور جن کا قدیم ترین نسخہ ۶۷۵ھ کا ہے آپس میں مقابلہ کرکے اپنے امکان بھر اُن کی تصحیح کردی ہے اور یہ خیال تھا کہ کبھی اُس کو چھپواؤں گا مگر چونکہ اب بھی اُس کے بعض مقامات بالکل سمجھ میں نہیں آتے اور قطعاً غیر صحیح ہیں لہذا اس کی جرأت نہ کرسکا کہ اپنے اس خیال پر کاربند ہوں۔ شاید کوئی شاہنامہ ایسا نکل آئے کہ جو ۵۶۰ھ کے قریب یا اُس سے پیشتر کا ہو اور اُس میں یہ مقدمہ بھی موجود ہو تو اُس سے یہ دقت رفع ہوجائے۔

حسّیات جلیل

(جناب جلیل احمد صاحب جلیل قدوائی ایم۔ اے)

حفظ آداب پہ عشاق ہی مجبور نہیں
ترک عادات حسینوں کا بھی دستور نہیں

کس طرح تیرگی ہجر کٹے گی یا رب
نور امید سے دل عشق کا معمور نہیں

کیا تعجب جو کرے مجھ کو بھی سیراب جمال
آپ کی چشم عنایت سے یہ کچھ دور نہیں

ہم کہیں اور رہیں آپ کہیں اور رہیں
اس طرح عشق میں جینا ہمیں منظور نہیں

پاس کس طرح کہوں اُنکو کہ وہ پاس نہیں
دور کس طرح کہوں اُنکو کہ وہ دور نہیں

آنکھ محروم سہی دل نہیں محروم جمال
آنکھ سے دور ہیں وہ دل سے مگر دور نہیں

ہم جو چاہیں تو کریں غم میں بھی راحت پیدا
حسن مختار ہے تو عشق بھی مجبور نہیں

یوں بھی ہوتا ہے کہ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں
[illegible] زمانے سے یہ کچھ دور نہیں

واہ کیا ظرف ہے عشاق کا اللہ اللہ
کثرت ضرب حوادث سے بھی دل چور نہیں

کچھ تو ہے اب جو گوارا ہے مجھے تلخی ہجر
ورنہ کیا قرب کی لذت مجھے منظور نہیں

جملہ اسباب مسرت تو ہیں حاصل دل کو
شومیِ بخت سے مجبور ہے مسرور نہیں

حسن بیتاب ہے خود درد محبت سے جلیل
کم کے ملنے کا مگر حسن کا دستور نہیں

ہندوستانی قدیم صنعتوں کے زوال کے اسباب

(جناب مولوی محمد احمد صاحب سبزواری (عثمانیہ)۔)

ماہ مئی سنہ ۳۶ء کے "الناظر" میں جو مضمون "ہندوستان کی قدیم صنعتیں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس سے یہ امر تو بخوبی ثابت ہوگیا کہ ہندوستان قدیم زمانہ میں زرعی ملک ہونے کے ساتھ ساتھ صنعتی ملک بھی تھا۔ اور یہاں کی مصنوعات اُس زمانہ میں غیر ممالک کی مصنوعات سے مقابلہ کرتی تھیں اور اپنی پائداری، عمدگی اور نفاست کا ساری دنیا سے خراج تحسین حاصل کر چکی تھیں لیکن اب سوال یہ ہے کہ آخر یہ صنعتیں کہاں گئیں اور اگر مٹ گئیں تو اس کے اسباب کیا ہیں۔ قدیم صنعتوں کا زوال بذات خود ایک تلخ اور طویل داستان ہے۔ مگر اس کا اجمالی حال اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔

میجر باسو لکھتے ہیں:—

"ہندوستانی صنعتوں کے زوال کی ابتدا اُس دن سے ہوتی ہے جبکہ مغل شہنشاہوں نے ایشیائی فیاضی اور مشرقی شاہانہ روایات کے مطابق عیسائی سوداگروں کو ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کی رعائتیں عطا کیں۔ یہ وہ عظیم الشان رعایت تھی جو آج کوئی عیسائی قوت کسی دوسری عیسائی یا غیر عیسائی قوم کو دینے کا خیال بھی نہیں کر سکتی۔"

اس قسم کی رعائتیں موجودہ زمانہ میں کسی ملک کی فتح کے مرادف ہیں۔ چنانچہ ہربرٹ اسپنسر اپنے ایک جاپانی دوست کو ایک خط میں لکھتا ہے:—

"جاپان سے امریکن اور یورپین اقوام کو جتنی دور رکھ سکتے ہو رکھو۔ طاقتور حکومتوں کے سامنے تمہاری قوت بہت کم ہے۔ غیر اقوام کو جو رعائتیں دی جائیں ان میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ جو حقوق ان کو مل چکے ہیں ان میں کسی قسم کا اضافہ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ ان باتوں کی فروگذاشت سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں تو ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرو۔"

قدیم صنعتوں کے زوال کے اسباب مختلف ہیں۔ چنانچہ ڈت لکھتے ہیں:—

"بلا شک و شبہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی پارلیمنٹ کی صد سالہ خود غرضانہ پالیسی اور طرز عمل سے ہندوستانی صنعتیں تباہ ہوئیں اور انگریزی مصنوعات کی ترقی ہوئی۔ اُس وقت کمپنی اور حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ ہندوستان برطانوی مصنوعات کا بازار بن جائے اور ہندوستان برطانیہ کے

کارخانوں کے لیے خام مال مہیا کرے۔ اس سلسلہ میں مختلف قسم کی تدابیر اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کیلیے اختیار کی گئیں مثلاً ہندوستانی صناعوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ کمپنی کے کارخانوں میں کام کریں۔ انگلستان میں یہاں کی مصنوعات پر بھاری بھاری محصول لگا دیے گئے۔ بعض اشیا کی درآمد کو قانوناً ممنوع قرار دیدیا۔ اور انگلستان کا مال ہندوستان میں بلا محصول یا برائے نام محصول ادا کرکے داخل ہونے لگا۔"

سر ولیم ڈبلیو ہنٹر اس طرح تصویر کھینچتا ہے:۔

"ایک طرف تو مقامی درباروں کے زوال سے ملکی صنعتوں کو نقصان پہونچا اور دوسری طرف انگریزی سرمایہ داروں نے یہاں کے صناعوں کو کچل ڈالنے کا تہیہ کرلیا اور ایسی تدابیر اختیار کیں کہ دیسی صناع ان کا مقابلہ نہ کرسکے۔ اور حالات وواقعات نے ان غریبوں کو مجبور کیا کہ وہ زراعت کی جانب متوجہ ہوجائیں اور اس طرح ہزاروں چھوٹی چھوٹی صنعتیں تباہ ہوگئیں۔"

یورپ کا صنعتی انقلاب ہماری صنعتوں کو تباہ کردینے کا بنیادی سبب کہا جاسکتا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے ہندوستانی مصنوعات کی نفاست، باریکی اور عمدگی کا مقابلہ مشین کا تیار کیا ہوا سامان نہ کرسکا۔ مگر مشینوں کے ذریعہ سامان کثیر مقدار میں تیار ہونے لگا اس وجہ سے اس کی قیمت ارزاں ہونے لگی۔ اور غریب و متوسط طبقہ کمی قیمت کی وجہ سے اس کو خریدنے لگا۔ صرف اعلےٰ طبقہ صناعوں کا قدرداں رہ گیا۔ مگر فیشن میں تبدیلی ہوتے ہی صناع اس طبقہ کی سرپرستی سے بھی محروم ہوگئے۔

اس کے علاوہ مقامی درباروں کا زوال، حکومت کی ریلوے پالیسی، آزادانہ تجارت کی حمایت، میلوں اور نمائشوں کی کمی وغیرہ بھی ایسی چیزیں ہیں جن کے اثرات ہماری صنعتوں پر پڑے۔ اب ہم تفصیل سے الگ الگ ان کا حال بیان کریں گے۔

برنیر لکھتا ہے:۔

"ہندوستانی صنعتوں کا کبھی کا خاتمہ ہوچکا ہوتا تھا۔ اگر حکومتیں اور امراان کی سرپرستی نہ کرتے۔ درباروں میں اور امرا کے یہاں مختلف صناع ملازم ہوا کرتے تھے جو بچوں کو کام سکھاتے تھے اور انعام کے لالچ اور کوڑے کے ڈر سے عمدہ سے عمدہ کام کیا کرتے تھے۔ تجار اور سوداگر صناعوں کو عمدہ کام پر معقول اجرتیں دیتے تھے اس وجہ سے ملک میں یہ کام ترقی پر تھا۔"

ابوالفضل لکھتا ہے:۔

"دربار دہلی مصنوعات کا بڑا بازار تھا۔ اعلےٰ سوسائٹی میں فیشن آئے دن بدلتے رہتے تھے خود دربار مصنوعات کا سب سے بڑا گاہک ہوا کرتا تھا۔ دربار کی ضروریات کافی ہوا کرتی تھیں۔ سالانہ

دو مرتبہ (سالگرہ پیدائش و تخت نشینی) شہنشاہ کی جانب سے تمام منصب داروں کو خلعت ملتے تھے"

۱۶۶۵ء میں منصب داروں کی تعداد ۱۱۵۰۰ تھی۔ اس کے علاوہ شاہزادے، شاہی خاندان کے افراد، باج گذار رئیس، درباری امرا الگ تھے۔ ہر خلعت میں مختلف قسم کے پارچے ہوتے تھے جو لوگ باہر سے آتے تھے اور دربار میں حاضر ہوتے تھے ان کو خلعت ضرور ملتا تھا۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں وہ بڑے آدمی جو اسلام قبول کر لیتے تھے خلعت سے مشرف ہوتے تھے۔

سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار کا انتقال ۱۸۶۲ء میں ہوا۔ اور اسی وقت سے سلطنت مغلیہ کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔ سلطنت مغلیہ کا زوال گویا ہندوستانی صنعتوں کا زوال تھا۔ کیونکہ مصنوعات کا سب سے بڑا بازار ہاتھ سے نکل گیا۔ امرا کو زمانہ نے مجبور کر دیا اور وہ اپنی قدیم روش پر قائم نہ رہ سکے۔ چند امرا البتہ ایسے تھے جو کچھ عرصہ تک صناعوں کی سرپرستی کرتے رہے مگر بعد میں وہ بھی جاتی رہی۔ سرپرستی ختم ہو جانے سے صناع اور دستکار بھوکے مرنے لگے اور ہزاروں تباہ و برباد ہو گئے۔

لکھنؤ کی مردہ صنعتوں میں کچھ عرصہ کے لیے نوابان اودھ نے جان ڈال دی تھی مگر ۱۸۵۶ء میں یہ صوبہ انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا۔ چنانچہ اس وقت کے متعلق مسٹر ہیو لکھتے ہیں کہ "غدر کے چند سال بعد تک لکھنؤ کی آبادی میں نمایاں طور پر تخفیف ہوتی رہی وہ تجار اور سوداگر جو دربار کی مراعات کی وجہ سے شہر میں رہتے تھے انھوں نے شہر چھوڑ دیا" ڈھاکہ کی صنعتوں کا زوال تو اسی دن سے شروع ہو گیا تھا جب علی وردی خاں نے اپنا پایۂ تخت مرشد آباد بنا لیا۔ اور اس کے بعد جوں جوں دربار بنگال کو زوال آتا گیا بنگالی صنعتیں بھی ختم ہوتی رہیں۔ وجیا نگر کا دربار بھی زمانہ کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اور وہاں کی دیسی صنعتیں بھی رفتہ رفتہ مٹ گئیں۔ ۱۸۹۱ء کی رپورٹ مردم شماری مدراس میں لکھا ہے:-

"دربار کا وجود خواہ وہ برائے نام ہی کیوں نہ ہو شہری آبادی پر غیر معمولی اثر ڈالتا تھا۔ اور وہاں مختلف قسم کے صناع کھنچ کھنچ کر آتے تھے۔ ان درباروں کے ختم ہونے کے بعد اکثر صناع دیسی ریاستوں میں چلے گئے جہاں ان کو سرپرستی کی امید تھی۔ بعض جگہ ان کی قدر ہوئی اور بعض جگہ ناقدری کے ہاتھوں تنگ آ کر انھوں نے دوسرے پیشے اختیار کر لیے"

اٹھارھویں صدی میں بنگال اور ملک کے دوسرے حصوں میں چنگی کا رواج تھا لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کو جب اقتدار حاصل ہو گیا تو اس نے شاہی فرمان کے ذریعہ اپنی درآمد و برآمد پر محصول معاف کرا لیا اور کمپنی کا مال انگریزی ریزیڈنٹ یا مہتمم کارخانہ کے دستخطوں پر محصول سے مستثنیٰ ادھر سے ادھر

بلا روک ٹوک جانے لگا۔ جس کشتی پر انگریزی جھنڈا ہوتا تھا یا جس کے پاس کمپنی کا "دونہ" (پروانہ) ہوتا تھا اُس سے کسی قسم کی مزاحمت کرنے کا حق نواب کے عہدہ داروں کو نہ تھا۔ اس طرح کمپنی نے بنگال کی اندرونی تجارت پر قبضہ کر لیا۔ بنگال کے تجار اس نامنصفانہ مقابلہ کو برداشت نہ کر سکے اس وجہ سے وہ بازار سے ہٹتے گئے اور کمپنی کو بنگال کی اندرونی تجارت کا اجارہ حاصل ہو گیا۔

ہنری ورلسٹ جو بعد میں بنگال کا گورنر ہوا لکھتا ہے "ملک کے اندر تجارت بلا محصول ہوتی ہے اور اس سلسلہ میں رعایا پر بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں" نواب میر قاسم نے گورنر بنگال سے شکایت کی تھی کہ انگریزی سرداروں اور گماشتوں کی بدولت نواب کے عہدہ داروں کی کوئی وقعت نہیں۔ ہر شخص جس کے پاس کمپنی کے دستخط موجود ہوتے ہیں اپنے آپ کو کمپنی سے کم نہیں سمجھتا۔ نواب بنگال نے گورنر ورلسٹ کو ایک خط میں لکھا تھا :-

> "کمپنی کے گماشتے زبردستی رعایا اور سوداگروں کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اور وہ اس سامان کی چوتھائی قیمت ادا کرتے ہیں۔ وہ اپنی طاقت اور قوت کے زور سے ایک روپیہ کا مال پانچ روپیہ میں فروخت کرتے ہیں۔ اس قسم کی بدعنوانیوں سے ہم کو ہر سال ۲۵ لاکھ روپیہ کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے"

مسٹر جنٹ ہری گو لکھتا ہے "ہر گماشتہ زبردستی لوگوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کا مال خریدیں اور اسی کے ہاتھ اپنا مال فروخت کریں۔ اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے اُن کو کوڑوں سے پیٹا جاتا ہے یا قید کر دیا جاتا ہے" اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسی دیسی باشندہ میں اتنی سکت نہ رہی کہ وہ ملکی تجارت میں حصہ لے سکے۔ ڈھاکہ کا کلکٹر لکھتا ہے "ملکی پور اور ڈھاکہ کے کارخانے داروں اور سوداگروں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ تنباکو، روئی، لوہا وغیرہ کمپنی کے آدمیوں سے خریدیں اور یہ اُن کے ہاتھ بازار سے گراں قیمت پر مال بیچتے تھے۔ پھر قیمت بھی زبردستی وصول کی جاتی تھی"

وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل ہونے سے پہلے اپنے خط موخرہ ۲۵ر اپریل ۱۷۶۲ء میں ہنری وین سی ٹارٹ کو لکھتا ہے :-

> "اس وقت میں آپ کی توجہ ایک اہم معاملہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس سے میرا مقصد وہ مظالم ہیں جو کمپنی کے نام سے ملک میں ہوتے ہیں۔ نواب اور اس کی رعایا ان چیزوں سے بہت تنگ ہے۔ یہ خرابی صرف ہمارے آدمیوں تک محدود نہیں ہے بلکہ سارے ملک میں اس کا رواج ہو گیا ہے۔ مجھے جب دریائے گنگا میں سفر کرنے کا اتفاق ہوا تو ہر مقام پر انگریزی جھنڈے والی کشتیاں

نظر آتی تھیں۔ مجھے مشکل سے ایسی کشتیاں نظر آتی تھیں جن پر انگریزی علم نہ لہرا رہا ہو۔ اس طریقہ کا نواب کی آمدنی پر ناپاک اثر ہوتا ہے اور خود ہمارے قومی وقار کو صدمہ پہونچتا ہے اس لیے ہمارا فرض ہے کہ اس خرابی کو دور کرنے کی جلد از جلد کوشش کریں"

دت لکھتے ہیں" غالباً تاریخ عالم ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر رہے گی کہ غیر ملکی سوداگروں نے ملکی تجارت پر اس حد تک قبضہ کر لیا ہو اور ایک بڑے اور خوشحال ملک کی تجارت پر اس طرح قابض ہوں جس طرح کہ ہندوستان میں ہوا" بہر حال ان تلخ اور ناگوار واقعات کو دیکھ کر خود ایک انگریز اسپنر لکھ دیتا ہے "تصویر کا دوسرا رُخ دیکھو کہ کمپنی کے ڈائرکٹر یہ جانتے ہوئے کہ داخلی تجارت میں ہر قسم کے مظالم ہو رہے ہیں خاموش ہیں"

نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے اندر تمام سامان اجارہ کے تحت پیدا ہونے لگا۔ انگریزی کمپنی کے دیسی گماشتے ان سے کم قیمت پر مال خریدتے تھے۔ اور صناعوں کی حالت غلاموں سے بدتر ہو گئی تھی جرمانہ، سزا اور قید وہ باتیں تھیں جن سے صناعوں کو قابو میں کر لیا گیا تھا۔ صناعوں کی عظیم اکثریت کے نام گماشتوں کی فہرست میں درج ہوتے تھے اور اُن کو دوسروں کے لیے کام کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ۱۵ سے ۴۰ فیصدی کم قیمت دینے کا رواج ہر جگہ جاری و ساری تھا۔ غریب صناع اکثر اوقات اپنی محنت کا صحیح اور حقیقی معاوضہ حاصل کرنے کے لیے اپنی مصنوعات فرانسیسی یا ولندیزی تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے تھے جو ان کا سامان خریدنے کے لیے ہر وقت بخوشی تیار رہتے تھے۔ جب گماشتوں کو اس بات کا علم ہو جاتا تھا تو وہ اپنے سپاہی صناعوں کے گھروں پر مقرر کر دیتے تھے تاکہ وہ گز بھر ٹکڑا بھی نہ کاٹ سکیں۔ اسی سلسلہ میں اکثر کپڑا تیار کرنے والے صناعوں کے انگوٹھے کاٹ ڈالے گئے تاکہ وہ آئندہ کام ہی نہ کر سکیں۔

اس قسم کے حالات کے تحت کسی صنعت کا ترقی کرنا نہ صرف ناممکن بلکہ محال تھا۔ پہلے یہاں سے ریشم کی مصنوعات بڑی تعداد میں انگلستان جاتی تھیں مگر جب خود وہاں اس صنعت کو ترقی ہوئی تو کمپنی نے صاف طور پر ۱۷ مارچ ۱۷۶۹ء کے خط میں واضح کر دیا کہ آئندہ سے صرف خام ریشم پیدا کرنے والوں کی ہمت افزائی کی جائے اور کپڑا تیار کرنے والوں کو ہر طرح سے پریشان کیا جائے چنانچہ بنگال کے تمام صناعوں کو جو ریشمی کپڑا بُنتے تھے گھروں پر کام کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور اُن کو مجبور کیا گیا کہ وہ کمپنی کے کارخانوں میں کام کریں۔ مختلف قانون بنائے گئے تاکہ صناع ان باتوں کی خلاف ورزی نہ کر سکیں۔ چنانچہ ۱۷۹۳ء کے بنگال قانون میں صاف طور پر اس بات کی تشریح کر دی گئی کہ وہ تمام [illegible] کمپنی کی فہرست میں درج ہیں یا جن کو کمپنی پیشگی رقم ادا کرتی ہے اپنا مال کمپنی کے

سوا کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔

۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کا حق عطا ہوا اور یہی وہ زمانہ ہے جبکہ برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستانی معاملات پر سرگرم تقریروں کا آغاز ہوا۔ اُس وقت دارالعوام کی جانب سے ایک منتخبہ کمیٹی مقرر کی گئی جس کا مقصد ہندوستانی تجارت کی تحقیقات کرنا تھا۔ اس میں وارن ہیسٹنگز، سرجان میلکم، تھامس منرو وغیرہ شامل تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اسی سال نپولین بونا پارٹ کی وجہ سے تمام براعظمی بندرگاہوں کی تجارت برطانیہ کے ہاتھ سے نکل گئی اور اس سے برطانوی تجارت کو سخت نقصان پہونچا۔ اس کی تلافی کرنے کے لیے سارے ملک کی توجہ ایک نئے حاصل کردہ ملک کی طرف مبذول ہو گئی کیونکہ اُن کے خیال میں ہندوستان ڈھینگ۔ (مال کھپانے) کے لیے اچھا بازار تھا۔ اسی زمانہ میں بمبئی، بنگال اور مدراس کے علاقوں میں زبردست قحط پڑے۔ اور ۵۰ سال تک ان کا سلسلہ جاری رہا۔ ان دونوں باتوں سے انگلستان کا بیوپار یہاں ترقی کرتا گیا۔

وارن ہیسٹنگز سے دریافت کیا گیا کہ تم اپنی معلومات اور ہندوستانیوں کی عادتوں سے واقفیت کی بنا پر جواب دو کہ ہندوستان میں کن برطانوی مصنوعات کی طلب پیدا کی جا سکتی ہے۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہندوستان کے غریب طبقہ کی احتیاجات بہت کم ہیں اور جو کچھ ہیں وہ مقامی طور پر پوری ہو جاتی ہیں۔ اپنی غذا اور لباس کی ضروری اشیاء وہ لوگ اپنے گرد و نواح سے ہی حاصل کر لیتے ہیں۔" لارڈ ڈمنی منرو کہتے ہیں کہ مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جس کا بازار ہندوستان میں پیدا ہو سکے۔ تھامس لکھتے ہیں:-

"ہم ہندوستانی کپڑوں کی نفاست اور باریکی کی نقل نہیں اُتار سکتے۔ اور ان مقامی مصنوعات کا مقابلہ سخت دشوار ہے۔ اور یہاں کے باشندے اپنی طلب مقامی طور پر ہی پوری کر لیتے ہیں۔ ادنی مصنوعات اگرچہ برطانیہ کی ادنی مصنوعات کے مقابلہ میں اچھی نہیں ہوتیں مگر وہ یورپ کے سرد ممالک کی سردیوں کا مقابلہ بخوبی کر سکتی ہیں۔"

انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ میرے پاس ایک ہندوستانی شال ہے جس کو میں ۷ سال سے برابر استعمال کر رہا ہوں اور میرا خیال ہے کہ اب بھی انگریزی شالیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

انگلستان کی خوش قسمتی تھی کہ جب یورپ کے اور ممالک آپس کے جھگڑوں میں مبتلا تھے اُس کے یہاں صنعتی انقلاب ہوا اور بہت ہی قلیل مدت میں پیدائش کے پرانے طریقے بدل گئے۔ جس کی وجہ سے بڑے پیمانہ پر مال تیار ہونے لگا اور اس کے لیے بازاروں کی ضرورت ہوئی۔ نیز سستے ملکوں کی بھی ضرورت ہوئی جہاں سے خام پیداواریں حاصل کی جا سکیں۔ اسی سلسلہ میں بین الاقوامی تعلقات سے

استوار کرنے کے لیے انگلستان نے آزاد تجارت کو اپنا مسلک بنا لیا۔ مگر یہ نئی پالیسی ہندوستان کے لیے مفید ثابت نہ ہوئی۔ چنانچہ خود ایک انگریز نے سنہ ۱۸۴۰ء میں دارالعوام کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا

"آزاد تجارت کا یہ مطلب سمجھنا کہ درحقیقت وہ آزاد تجارت ہے، غلط ہے۔ انگلستان ضرور ہندوستان کے ساتھ آزادانہ تجارت کرتا ہے لیکن ہندوستانی مصنوعات کے لیے انگلستان کے دروازے بند ہیں۔"

انگلستان میں اٹھارھویں صدی کے اوائل میں کوئی عورت ہندوستانی دریس کا لباس پہننے کی قانوناً مجاز نہ تھی۔ ہندوستانی دریس، چھینٹیں، ململ، رنگے اور چھپے ہوئے کپڑے سنہ ۱۷۰۰ء کے قانون کی رو سے وہاں ممنوع قرار دیے گئے تھے۔

سنہ ۱۸۱۳ء سے سنہ ۱۸۳۲ء تک ہندوستانی مصنوعات پر جو محصول انگلستان میں عائد کیے گئے وہ حسب ذیل ہیں :-

نام اشیا	سنہ ۱۸۱۲ء	سنہ ۱۸۲۴ء	سنہ ۱۸۳۲ء
زردوزی	۱۷ فیصدی	۵۰ فیصدی	۳۰ فیصدی
ململ	۳۷ ⅓ "	۳۷ ½ "	۱۰ "
دریس	۷۱ ⅓ "	۹۶ ½ "	۱۰ "
اونی مصنوعات	۲۷ ⅓ "	۵۰ "	۲۰ "
شال	۷۱ "	۶۷ ½ "	۳۰ "
قالین	۶۸ ⅓ "	۵۰ "	۲۰ "

ولسن جو کہ ایک غیر جانب دار مورخ ہے لکھتا ہے :-

"بعض شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی ریشمی اور سوتی کپڑے انگلستان میں وہاں کی مصنوعات کے مقابلہ میں ۴۰ اور ۵۰ فیصدی کم قیمت پر فروخت ہوتے تھے اس لیے یہ ضروری معلوم ہوا کہ یا تو ان پر ۷۰، ۸۰ فیصدی محصول لگایا جائے یا پھر ان کے متعلق امتناعی احکام نافذ کیے جائیں۔ اگر یہ دونوں باتیں اختیار نہ کی جاتیں تو مانچسٹر اور پیزلی کے کارخانوں کا ترقی کرنا ناممکن تھا۔ اگرچہ ان کے پاس بھاپ کی طاقت موجود تھی مگر ان کی ترقی ہندوستانی مصنوعات کی قربانیوں کی رہین منت ہے۔ اگر ہندوستان خود مختار ہوتا اور برطانوی مصنوعات پر بھی ایسے ہی بھاری بھاری محصول لگاتا تو برطانوی مصنوعات یہاں ہرگز داخل نہیں ہو سکتی تھیں اور اس طرح یہ ملک اپنی صنعتوں کو تباہی سے بچا سکتا تھا۔"

اگر اس کو حفاظت خود اختیاری کا موقع دیا جاتا تو یہ صورت ممکن تھی مگر غریب ہندوستان الکاہل دو مسروں کے

بس میں تھا۔ برطانوی مال یہاں بلا محصول ادا کیے داخل ہوتا تھا سیاسی طاقتوں نے ایسے حریف کو جس سے مساویانہ طور پر مقابلہ کرنا ممکن تھا بالکل کچل دیا۔

حفاظت خود اختیاری کا مسلک جس نے سب سے پہلے اختیار کیا وہ میر قاسم تھا۔ اُس نے اندرونی محاصل ہی اُڑا دیے۔ کمپنی والوں کو یہ بات ناگوار گذری کیونکہ اس میں اُن کا نقصان تھا۔ اور میر قاسم سے جو جنگ ہوئی اُس کی بڑی وجہ یہ تھی۔ چنانچہ ۱۷۶۳ء میں اس کو شکست ہوئی اور معزول شدہ میر جعفر پھر تخت بنگال پر بیٹھا۔ میر جعفر اور اس کا بیٹا نظام الدین دونوں برائے نام نواب تھے۔ بنگال کی حکومت ۱۷۶۵ء سے کمپنی کے قبضہ میں آچکی تھی۔ اختیارات زیادہ حاصل ہوگئے اور ان کو زیادہ بیدردی سے استعمال کرنے کے مواقع بھی بکثرت پیدا ہوگئے۔ پہلے فی گاڑی یا فی جانور (جس پر سامان لدا ہو) محصول لیا جاتا تھا اب فی عدد محصول مقرر ہوا۔ پہلے اس کی مقدار کم تھی اب اس کا تناسب بڑھا دیا گیا۔ پہلے جو سامان نزدیک جاتا تھا اُس پر کم اور جو دور جاتا تھا اُس پر زیادہ محصول لینے کا قاعدہ تھا مگر اب فاصلہ کی قید اُڑا دی گئی۔ بعض اشیا پر دو اور تین مرتبہ محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ مثلاً پہلے خام پیداوار پر پھر اس کی تیار شدہ مصنوعات پر۔ حکومت کے محاصل کی آمدنی کا اندازہ مسٹر ہالٹ میکنزی نے ۴۳ لاکھ بتایا ہے۔ اس زمانہ میں سوداگروں کو جو دقتیں ہوتی تھیں وہ ناقابل بیان ہیں، جوگیوں اور ناگوں پر جو مظالم ہوتے تھے وہ بذات خود ایک طویل داستان ہے۔ پھر طرہ یہ کہ اکثر انگریزوں نے بھی اس طریقہ کی مذمت کی خود کمپنی کے ڈائرکٹر بھی سب کچھ جانتے اور سمجھتے تھے مگر انھوں نے اپنی پالیسی میں ذرہ برابر تبدیلی نہ کی اور بنگال میں ۱۸۳۶ء اور مدراس میں ۱۸۴۴ء تک اس قسم کی کارروائیاں شدت سے جاری رہیں۔

ہندوستان کا جو سامان انگلستان جاتا تھا اور اس پر جو محصول لیا جاتا تھا وہ معلوم ہو چکا۔ پھر اندرون ملک محاصل کی جو کیفیت تھی وہ بیان ہو چکی اب ہندوستان کی درآمد اور اُس کے محصول کو بھی دیکھ لیجیے

۱۸۵۲ء کے اعداد و شمار

سامان	محصول	سامان	محصول
برطانوی کتابیں	بلا محصول	برطانوی دھاتوں کا سامان	۵ فیصدی
غیر ممالک کی کتابیں	۳ فیصدی	غیر ممالک کی دھاتوں کا سامان	۱۰ فیصدی
برطانوی اونی اور ریشمی مصنوعات	۵ ؍	برطانوی اون	۵ ؍
غیر ممالک کی اونی و ریشمی مصنوعات	۱۰ ؍	غیر ممالک کی اون	۱۰ ؍
برطانوی سوئی تاگہ	۳½ ؍	شراب وغیرہ	۵ ؍

سامان	محصول	سامان	محصول
غیر ممالک کا سوتی تاگہ	۷ فیصدی	چاے	۱۰ فیصدی
گھوڑے اور دوسرے جانور	بلا محصول	نمک	۵ شلنگ فی من

ہماری صنعتوں کے زوال کا ایک سبب طبقہ امرا کی تباہی و بربادی بھی تھی۔ قدیم امرا تو زراعت کی طرف متوجہ ہو گئے اُن کے جانشین انگریز اور ہندوستانی ہوئے۔ اور اُن ہی کو اصولاً دیسی صناعوں کی سرپرستی کرنا چاہیے تھی مگر انگریز عہدہ داروں نے اپنے وطن کی مصنوعات کو دیسی مصنوعات پر ترجیح دی اور ہندوستانی عہدہ داروں نے فیشن کی تبدیلی کی وجہ سے ان کی سرپرستی سے ہاتھ اُٹھا لیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صناع سرپرستی سے بالکل محروم ہو گئے۔ مسٹر نکلسن لکھتے ہیں:-

"یورپین اقوام کے پاس سلطنت آتے ہی ہندوستانیوں نے مغربی تہذیب کی تقلید شروع کر دی اور وہ ہر اُس چیز کو پسند کرنے لگے جو انگریزی طرز کی ہوتی تھی۔ وہ فیشن اور طور و طریق جن کی تقلید پہلے فخریہ کی جاتی تھی اب نظر حقارت سے دیکھے جانے لگے۔"

برطانوی حکومت کے زمانہ میں دیسی صنعتی پنچایتیں بھی روز بروز کمزور ہوتی گئیں اور پروفیسر گڈگل نے اس کو بھی زوال کا ایک سبب قرار دیا ہے کیونکہ اب خام مال کی نگہداشت کرنے والا اور صناعوں کی وقتی امداد کرنے والا کوئی ادارہ نہ رہا اور تیار شدہ مال کو فروخت کرنے کا کوئی انتظام نہ رہا۔ اور ان چیزوں سے تنگ آ کر صناعوں نے اپنے اپنے پیشوں کو خیرباد کہہ دیا۔

ہماری صنعتوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب انگلستان کا صنعتی انقلاب ہے۔ مشینی بھاپ کا استعمال عام ہو گیا۔ مشینوں اور ذرائع آمد و رفت میں اس نئی ایجاد سے مدد لی جانے لگی۔ مال کثیر مقدار میں سرمایہ دارانہ طریقوں پر تقسیم عمل کے تحت تیار ہونے لگا۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ہماری پیدائش کم ہونے لگی۔ اس انقلاب کے مختلف اسباب ہیں۔ مسٹر بروکس آدم لکھتے ہیں کہ پلاسی کی لڑائی کے بعد بنگال کی دولت انگلستان پہونچی اور انقلاب کا باعث بنی۔ ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی ہوئی اور ۱۷۶۰ء میں لنکا شائر میں کپڑا بننے کے لیے پہلی مرتبہ مشین استعمال ہوئی۔ اسی سال لکڑی کے بجائے پتھر کے کوئلہ کا استعمال شروع ہوا۔ ۱۷۶۰ء میں بننے کی کل، ۱۷۶۴ء میں کاتنے کی مشین، ۱۷۶۸ء میں اسٹیم انجن، اور ۱۷۸۵ء میں مشین کا چرخہ (Power-Loom) تیار ہوا۔ بات یہ ہے کہ ایجادات ہوتی رہیں مگر ان کو تجارتی بنانے کیلیے روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس ضرورت کو بنگال کی دولت نے پورا کیا۔

اس طرح ہندوستان کو دوہرا نقصان برداشت کرنا پڑا ایک تو بنگال کی دولت سے برطانوی کارخانوں کو

مد ملی دوسرے وہاں کی مصنوعات یہاں آنے لگیں ۔ پھر ایک تو وہ خود ہی ارزاں قیمت پر تیار ہوتی تھیں دوسرے حکومت نے ان پر برائے نام ہی محصول لگایا اور اس ترکیب سے وہاں کی مصنوعات یہاں کے بازاروں میں پھیلتی اور یہاں کی صنعتوں کو تباہ کرتی رہیں ۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ صنعتی انقلاب سے نہ صرف انگلستان بلکہ دوسرے ممالک کو بھی فائدہ پہونچا مگر ہمارے یہاں اس کو زوال کا ایک سبب قرار دیا جاتا ہے تو آخر اس کی وجہ کیا ہے ۔ ابتدا میں اس انقلاب کی بدولت خود انگلستان کے صناعوں کو زبردست نقصان پہونچا ۔ اور یہ لوگ بے روزگار ہوگئے ۔ اُنھوں نے پارلیمنٹ سے درخواست کی کہ ہم کو کینڈا بھیج دیا جائے تاکہ وہاں ہم اپنی روزی حاصل کرسکیں ۔ اُنھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ مشینوں کو قانوناً ممنوع قرار دیا جائے اور جب ان کی ان باتوں کی شنوائی نہ ہوئی تو اکثر لوگوں نے مشینیں توڑ ڈالیں ۔ مگر حالات بہت جلد سنبھل گئے کیونکہ معاش کے نئے نئے راستے اور جدید کارخانے روز بروز کھل رہے تھے ۔ اور ۴۰، ۵۰ سال کے عرصہ میں پہلے سے زیادہ لوگوں کو کام مل گیا اور ان کی اجرتوں میں بھی معقول اضافہ ہوگیا ۔ لیکن چونکہ یہ انقلاب انگلستان میں ہوا اس لیے اس کے تمام فوائد بھی وہیں کے باشندوں کو حاصل ہوئے اور ہمارے حصہ میں سوائے نقصان کے اور کچھ نہ آیا ۔

ریل نے بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طریقوں سے ہماری صنعتوں کو نقصان پہونچایا ۔ لارڈ ڈلہوزی نے اپنی مشہور ریلوے یادداشت میں لکھا ہے :-

"انگلستان کو روئی کی ضرورت ہے جو ہندوستان میں کافی مقدار میں پیدا ہوتی ہے اور مزید مقدار میں مہیا کی جا سکتی ہے ۔ شرط صرف یہ ہے کہ اندرونی علاقوں سے بندرگاہوں تک اسکو منتقل کرنے کے معقول ذرائع ہونا چاہیئے ۔ یہی حال اکثر دوسری پیداواروں کا ہے ۔ جہازوں کے ذریعہ سے برطانوی مال بہت آسانی سے بندرگاہوں تک پہونچ جاتا ہے لیکن اندرون ملک نہیں جا سکتا ۔ اس وجہ سے بازاروں کی وسعت میں ترقی نہیں ہوتی دوسرے ذرائع نقل وحمل میں سہولت نہ ہونے کی وجہ سے چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ ہوجاتا ہے ۔ اگر ذرائع آمدورفت میں آسانیاں پیدا کردی جائیں تو یہ دونوں فائدے خودبخود حاصل ہوجائیں گے "

چنانچہ لارڈ صاحب نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ پوری ہوئی اور ریلوں کے جاری ہونے کے بعد یہاں کی خام پیداواریں باہر جانے لگیں اور برطانوی مصنوعات اندر آنے لگیں ۔ ۱۸۴۹ء میں ہندوستان میں بدیسی سوتی مصنوعات ۳۰ لاکھ کی درآمد کی گئیں تھیں لیکن ۱۸۵۸ء میں ۲۲ لاکھ کی ملک میں درآمد ہوئیں روئی ۱۲ لاکھ کی باہر جاتی تھی اب ۳۰ لاکھ کی گئی ۔ چنانچہ اس حالت کو دیکھ ایک انگریز نے لکھا ہے

"ہندوستان برطانیہ کا زرعی مزرعہ بن گیا ہے۔"

ہندوستانی ریلوں پر چند اور بھی اعتراضات کیے جاتے ہیں مثلاً ریلوں کی تعمیر و توسیع کے ساتھ ہندوستانی لوہے اور فولاد کی صنعت کو کیوں نہ ترقی دی گئی، ہندوستانی سرمایہ ریلوں میں کیوں نہ لگایا گیا۔ سرمایہ پر شرح سود کیوں زیادہ دی گئی۔ یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوالات ہیں جن کا حکومت کی جانب سے کبھی بھی تشفی بخش جواب نہ مل سکا۔ اور اس کی وجہ یہی تھی کہ ریلیں بنانے میں حکومت کے پیش نظر دو باتیں تھیں ایک تو برطانوی مصنوعات کو اندرون ملک پہونچانا، دوسرے خام پیداواروں کو بندرگاہوں تک لانا۔ چنانچہ ابھی کچھ عرصہ تک ریلوے پالیسی یہ تھی کہ وہ خام پیداواروں کا کرایہ کم لیتی تھی اور ان کی تیار کردہ اشیا کا کرایہ زیادہ وصول کرتی تھی۔

ریلوں کے ایجاد ہو جانے سے پیداواروں کی مانگ بڑھی اور بازاروں میں ان کی قیمت زیادہ ملنے لگی اس وجہ سے آبادی کا کثیر طبقہ زراعت کی جانب جھک گیا۔ اور اس پیشہ کو نفع بخش تصور کیا جانے لگا۔ حالانکہ کرایہ وغیرہ میں معقول رقم نکل جاتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ریلوں سے ملک کو فائدے بھی پہونچے مگر چونکہ پالیسی غلط تھی اس وجہ سے فائدوں کے مقابلہ میں نقصانات کی مقدار زیادہ رہی مسٹر الفریڈ چیسٹرٹن لکھتے ہیں:۔

"سڑکوں، ریلوں، تار، نہر سویز، اور دوسرے اندرونی و بیرونی اور خشکی و تری کے عمدہ ذرائع آمد و رفت نے ہندوستانی صناعوں کی مشکلات میں بڑا اضافہ کر دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مقابلہ میں نہ ٹھہر سکے اور ان کو میدان سے ہٹ جانا پڑا۔"

سب سے پہلی بین الاقوامی نمائش لندن میں ۱۸۵۱ء میں ہوئی۔ اس میں ہندوستانی مصنوعات کی بھی بڑی تعداد شامل تھی۔ اسی وقت پہلی مرتبہ برطانوی باشندوں کو یہاں کی مصنوعات کی نفاست، عمدگی، اور باریکی کا احساس ہوا اور انھوں نے ہندوستانی مصنوعات کو تیار کرنے کے گر سیکھنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر جان فوربس رائل جن کی نگرانی میں ہندوستانی مصنوعات کا شعبہ تھا ان کو لندن میں ہندی مصنوعات رکھنے کیلئے ایک میوزیم قائم کرنے کا حکم دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب تو بہت جلد چل بسے مگر ان کے جانشین ڈاکٹر واٹسن نے اس کی تکمیل کی چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"ہندوستانی مصنوعات کا تمام تفصیلی حال اور ان کے نمونے ۱۸ کتابوں میں شائع ہوئے۔ ان کے ۲۰ سٹ تیار کیے گئے۔ ہر سٹ میں ۱۸ جلدیں تھیں۔ ۱۳ سٹ انگلستان میں اور ۷ ہندوستان میں تقسیم کیے گئے۔ پہلے تو یہی خیال تھا کہ سب کو انگلستان ہی میں تقسیم کیا جائے۔ ان میں ہندوستان کی ہر چیز کا

حال، اُن کی مکمل تصویریں پھر جدا جدا حصوں کی تصویریں اور نمونے درج تھے۔ اس طرح .. ، ہندوستانی اشیا کا حال قلم بند کیا گیا۔ ان کتابوں کے تیار کرنے کے مقصد یہ دو تھے۔ ایک تو ہندوستانی فیشن کو سمجھا جائے دوسرے برطانوی صناعوں کو تعلیم دی جائے کہ وہ بھی اس قسم کا سامان تیار کریں۔ اب تک کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا جس سے ہندوستانیوں کے ذوق کا پتہ چل سکے۔ لیکن اس مجموعہ سے بہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہندوستانیوں کو کن کن چیزوں کی ضرورت ہے اور ان کا مذاق کیا ہے۔"

یہ سب مصیبت کس لیے اُٹھائی گئی وہ خود ڈاکٹر صاحب نے بیان کر دی ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ معلوم کرنا تھا کہ ہندوستانی کیسے کپڑے پسند کرتے ہیں تاکہ اس قسم کے کپڑے تیار کر کے ۲۲ کروڑ انسانوں کی آبادی کے وسیع بازار پر قبضہ کیا جائے۔

میجر جے، بی، کیتھ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"ہر شخص اپنے تجارتی رازوں کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہمارے برتن بنانے والے کارخانہ دار سے دریافت کرے کہ وہ اتنے عمدہ برتن کیسے بناتا ہے تو وہ اس کو بڑی خوش اسلوبی سے ٹال دے گا۔ مگر اس نظر سے "انڈین ہاؤس ڈیپارٹمنٹ" نے بہت ہی قابل قدر کام انجام دیا ہے اور مانچسٹر کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ ہندوستان سے کروڑوں روپیہ سالانہ وصول کر سکے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہوا جبکہ برطانیہ کو ہندوستان پر سیاسی حقوق حاصل تھے۔ اگرچہ رعایا کو ان معلومات کا معاوضہ بھی کافی دیا گیا ہے۔"

حکومت ہند کی عدم مداخلت کی پالیسی بھی بڑی حد تک ہماری صنعتوں کے زوال کا باعث ہے۔ [illegible]ری سلطنت کی ترقی اور وہاں کے بڑے بڑے شہر، فراعنہ کے مقابر، پاٹلی پترا، دہلی، آگرہ، میسور اور لکھنؤ [illegible] نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی ترقی کا صنعت و حرفت پر بہت اثر پڑتا ہے اسی کے تحت باہر سے صناعوں اور کاریگروں کو بلایا جاتا تھا اور ان کی سرپرستی کی جاتی تھی۔ حکومت اسے اپنے فرائض کا [illegible]زمی جزو تصور کرتی تھی کہ پیشہ ور صناعوں کی حفاظت کرے، سڑکیں بنوائے، دوسروں کے مال پر محاصل لگائے اور اس قسم کی تدابیر اختیار کرے کہ ملک میں سونا اور چاندی درآمد ہو۔ اس کے بعد ملکی مصنوعات کو دوسرے [illegible]ملوں میں فروخت کرنے کا انتظام بھی حکومتوں کے ذمہ ہوا۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت ملکہ الزبتھ کے عہد [illegible] انگلستان میں بہت سی ترقیاں ہوئیں۔ ہندوستان کی تلاش میں امریکہ کا مل جانا بھی اسی سلسلہ کی ایک [illegible]الی تھی۔ مگر انقلاب کے بعد سے تو حکومت کا صنعت و حرفت میں عمل دخل بہت بڑھ گیا۔ صنعتی تعلیم، صنعتی [illegible]بنک، سرمایہ جمع کرنے کے ذرائع اور ایسے انتظامات رکھنا کہ ملکی صنعتوں کو نقصان نہ پہونچے، ریلوے

پالیسی ایسی ہو کہ ملکی سامان کا کرایہ کم لیا جائے اور بیرونی سامان کا کرایہ زیادہ وصول ہو سب حکومت کے فرائض میں داخل ہیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی جب تک تجارتی کمپنی رہی اس وقت تک تو البتہ ہندوستانی صنعتوں کو فائدہ ہوا کیونکہ وہ یہاں کی مصنوعات انگلستان اور یورپ لے جا کر فروخت کرتی تھی۔ مگر جوں ہی اس کے قدم یہاں جمے اور انگلستان میں صنعتی انقلاب ہوا اس کی پالیسی بدل گئی۔ اور یہ پالیسی آج سے ۱۵-۲۰ سال پہلے تک رہی۔ جب کبھی حکومت سے کہا گیا کہ وہ ان معاملات میں ہماری مدد کرے اس نے یہی کہا کہ حکومت کا کام معاشی معاملات میں دخل دینا نہیں ہے۔ حالانکہ جس وقت حکومت ہند یہ کہہ رہی تھی اُس وقت حکومت انگلستان وہ تمام طریقے اختیار کر رہی تھی جن سے ملکی صنعتوں کو فائدہ ہوتا تھا۔ بیسویں صدی کے شروع میں اگرچہ تمام ہندی صنعتیں ختم ہو چکی تھیں پھر بھی بعض مقامات پر ایک آدھ صنعت اپنی زندگی کی آخری سانس لے رہی تھی اُس وقت وہاں کے مقامی عہدہ داروں کو خیال ہوا کہ ان کو زندہ کرنے کی کوشش کی جائے چنانچہ صوبہ مدراس اور ممالک متحدہ میں معاشی جدوجہد کے آثار پیدا ہو رہے تھے کہ سنہ ۱۹۱۰ء میں وزیر ہند کا ایک مراسلہ آیا جس میں صاف طور پر اس کا اظہار کیا گیا کہ ملکی صنعتوں کی براہ راست امداد کرنا ہماری پالیسی کے خلاف ہے۔ چنانچہ اس دن سے یہ جدوجہد پھر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد پھر حکومت کو کس طرح احساس ہوا اور اس کی پالیسی میں کیوں تبدیلی ہوئی اس موجودہ دور کا ذکر ہے اور قدیم صنعتوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں اس وجہ سے اس کا تذکرہ کرنا بیکار ہے۔

ان تمام اسباب کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی صناع زراعت کی جانب مائل ہوتے گئے اور دیسی صنعتیں بالکل ختم ہو گئیں۔ ذیل کے نقشہ سے معلوم ہو گا کہ ۵۰ سال میں کتنی آبادی زراعت پیشہ بن گئی۔

	سنہ ۱۸۷۱ء	سنہ ۱۸۸۱ء	سنہ ۱۸۹۱ء	سنہ ۱۹۰۱ء	سنہ ۱۹۱۱ء	سنہ ۱۹۲۱ء
زراعت	۵۷٫۲ فیصد	۶۰٫۴ فیصد	۶۱٫۰ فیصد	۶۱٫۲ فیصد	۷۲٫۵ فیصد	۷۳٫۱۵ فیصد
صنعت	۱۲٫۱ "	۰ "	۱۵٫۴ "	۱۲٫۰ "	۱۱٫۳ "	۱۰٫۴۹ "

ان تمام واقعات کے بعد ہندوستان کی جو حالت ہوئی اس کی تصویر مسٹر رانا ڈے نے ان الفاظ میں کھینچی ہے:-

"ہندوستان خام پیداواروں کی منڈی بن گیا ہے۔ وہ خام پیداواریں برطانوی گماشتوں کے ذریعہ برطانوی جہازوں پر برطانیہ کے کارخانوں کے واسطے روانہ کرتا ہے، یہ چیزیں برطانوی کارخانوں میں، برطانوی سرمایہ اور ہوشیاری سے تیار ہو کر برطانوی دوکانوں اور برطانوی سوداگروں کے ذریعہ سے پھر ہم تک پہونچ جاتی ہیں۔"

خمیازہ

(جناب مولوی اسمٰعیل احمد مینائی صاحب تسنیم بی اے - ایل ایل بی)

(بسلسلۂ الناظر ماہ جون ۱۹۳۶ء)

(۴)

نصیر کی مدلل اور موجہ بحثوں کا منیر پر بہت اثر پڑا اور اگر وہ اپنی بیوی کے اس درجہ زیر اثر نہ ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ زبیدہ کے طریقۂ تعلیم و تربیت میں کسی قدر کچھ گونہ تغیر ہو جاتا مگر زبیدہ کی ماں میں تو مشربیت خون کی طرح سرایت کر چکی تھی ع

یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے

دو چار روز منیر نے اصرار کیا مگر بیوی نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ نصیر بھی ظہیر کی طرح قدامت پسند اور تنگ خیال ہے آجکل دنیا کا رنگ ہی یہی ہے، کہاں تک کوئی اس کی مخالفت کرے گا خود نصیر بھی چند دن میں مجبور ہو کر یہی طریقہ اختیار کرے گا، آخر منیر بھی چپ ہو رہا اور ایک آدھ مہینہ میں نصیر کی باتیں بالکل بھول گیا۔

نصیر کو منیر یا اُس کی بیوی سے کوئی رنجش نہیں ہوئی لیکن پھر بھی اُس نے آنا جانا ذرا کم کر دیا، حُسنا کو البتہ آٹھویں دسویں دو چار دن کے لیے بھیج دیا کرتا تھا ایک روز حُسنا ظہیر کے یہاں تھی، کہ نصیر بھی آ گیا اُس نے دیکھا کہ گھر میں کوئی موجود نہیں ہے، محض چند ملازم عورتیں ہیں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ظہیر مع اپنے تمام اہل و عیال اور حُسنا کے شاہ عبد اللہ سالک کے مزار شریف پر گیا ہے، نصیر بھی موٹر پر سوار ہوا اور درگاہ پہونچا، جس وقت درگاہ میں گھسا تو اُس نے دیکھا کہ حسنا، حسنا کی خالہ، ظہیر اور دونوں لڑکے نیم سجود کی حالت میں مزار شریف پر سر ٹیکے ہوئے ہیں اور اُسکے برابر پڑے ہوئے رہے ہیں۔ اُس نے خاموشی سے علحدہ ہو کر فاتحہ پڑھا اور اُلٹے پیروں ظہیر کے مکان واپس چلا آیا، کچھ دیر کے بعد یہ سب لوگ بھی واپس ہوئے، اور کپڑے بدلنے کے بعد بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

نصیر نے حُسنا سے دریافت کیا، "حُسنا تم اپنی خالہ اور چچا کے ساتھ کہاں گئی تھیں"؟

حسنا نے جواب دیا "جی شاہ عبد اللہ سالک کے مزار شریف پر"!

نصیر نے پوچھا "وہاں تم نے کیا کیا کیا"؟

حُسنا نے کہا "جی پہلے تو فاتحہ پڑھا، پھر مزار کو بوسے دیے اور پیشانی ٹیکی، بعد ازاں دعا مانگ کر چلے آئے"

نصیر نے کہا "بیٹی حسنا تم نے یہ نہیں سوچا کہ جو کچھ میں کر رہی ہوں یہ شریعت اور روح اسلامی کے منافی ہے تم نے تو قرآن بھی پڑھا ہے اور حدیثیں بھی، تم کو تو میں نے فقہ کی بھی تعلیم دلوائی ہے اور تفسیر کی بھی، تم نے کہیں بھی یہ دیکھا ہے کہ مزاروں اور قبروں کو چوما جائے اور

انھیں گویا کہ سجدہ کیا جائے۔"

حسنا تو خاموش ہو رہی مگر میاں ظہیر اور اُن کے دونوں صاحبزادے جو سب کے سب خود کو بڑا عالم و فاضل تصور کرتے تھے چپ نہ رہ سکے، اور ظہیر نے کہا "بھائی جان، میں دیکھتا جاتا ہوں کہ اگر ایک طرف آپ کے عقائد بحمد اللہ آجکل کے کافروں سے بدتر مسلمانوں کے سے نہیں ہیں تو دوسری طرف آپ میں وہابیت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ قبروں کی حرمت و مکرمت، مزاروں کی تعظیم و تکریم، درگاہوں کی زیارت، تو سب جزو ایمان و مذہب ہیں۔"

"میں نے یہ کب کہا کہ قبور کی حرمت، درگاہوں کی تعظیم، مذہب کے منافی ہیں۔ مگر کیا قبروں کو سجدہ کرنا کہیں بھی مذہب سے واجب ہے، کیا مزاروں کو پوجنا کسی طرح بھی ایمان کا جزو ہے، کیا ہمارے دین کا پہلا کلمہ یہ نہیں ہے کہ لا الٰہ الا اللہ اور خدا کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں، کیا موجودہ طریقہ درگاہ پرستی کی حالت میں مسلمان ہندوؤں سے کسی طرح بہتر ہیں، تم ہندوؤں کو تو برا بت پرست اور کافر کے لقب سے یاد کرتے ہو کیونکہ وہ مورتیاں بنا کر اُن کو خدا سمجھتے اور انھیں سجدہ کرتے ہیں لیکن خود کو مسلمان اور سچا مسلمان کہتے ہو اور مورت کو نہیں تو قبر کو خدا سمجھتے اور اُسے گویا کہ سجدہ کرتے ہو۔ میں خود تم لوگوں کے پیچھے پیچھے درگاہ گیا تھا اور میں تم سے کہہ نہیں سکتا کہ مجھے تم لوگوں کو قبر پر نیم سجود کی حالت میں دیکھ کر کس قدر تکلیف ہوئی، تم کبھی خود غور کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے کہ کیا چیز مذہب میں ہے اور کیا کٹھ ملاؤں اور نیم علماء نے اس میں زبردستی داخل کر دی ہے، درانحالیکہ تم خود عالم فاضل ہو، پڑھے لکھے ہو، فقہ، حدیث، تفسیر، فلسفہ ان سب کی تم نے تعلیم پائی ہے۔"

"تو چچا جان اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ پیروں ولیوں کی بزرگی اور عظمت کے منکر ہیں، آپ کے خیال میں اُن کی تعظیم و تکریم ناجائز ہے، آپ کی نظر میں اُن کی حرمت و مکرمت ناواجب ہے۔" شکیل نے ڈرتے ڈرتے کہا

"میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ اولیائے کرام اور انبیائے عظام کی بزرگی اور عظمت سے مجھے انکار ہے اُن کی تقدیس و ریاضت کا میں قائل نہیں ہوں، نعوذ باللہ اُن کے مر[...] درویشی یا خدا رسی میں شک کرتا ہوں بلکہ صرف یہ کہ وہ بھی بہر حال باوجود ہر بزرگی و باوصف ہر ریاضت [...] کے عاجز و ناچیز بندے تھے اور اُن کو اس کا ذرا بھی اختیار نہیں کہ بندوں کی حاجت روائی کر سکیں، ہر شخص کو دینے والا، ہر حاجتمند کی حاجت برلانے والا، ہر آرزو والے کی آرزو پوری کرنے والا، خدا اور صرف خدا ہے، بزرگان کا وسیلہ یا اُن کا واسطہ میں مانتا ہوں مفید سہی لیکن اس کو اس حد تک لے جانا جہاں بجائے خدا کے خود بزرگان دین سے مانگنا شروع کر دیا جائے جہاں محض اُنھیں کی پرستش شروع کر دی جائے سراسر عقل و خرد کے منافی اور تعلیم مذہب کے خلاف ہے۔"

"لیکن چچا جان یہ درویش تو بہ سبب اپنی ریاضت اور تقدیس کے بڑے مرتبہ والے ہو جاتے ہیں حتے کہ جو کچھ ان سے کہا جائے کرا دیتے ہیں۔ میں نے خود دو چار نہیں دس پانچ نہیں سینکڑوں ایسے اولیاء اللہ کو دیکھا ہے

جو زندہ موجود ہیں اور ہر شخص کی مراد پوری کر دیتے ہیں اور وہ اس کی تعلیم دیتے ہیں کہ اُن کی گویا کہ پرستش کی جائے"، جمیل نے رک رک کر کہا۔

"بس اسی پر تو میں کہتا ہوں کہ تم لوگوں نے مذہب کو جُوجُو بنا لیا ہے، ارے میاں جس قسم کے درویشوں کا تم ذکر کر رہے ہو میں اُن کی حقیقت سے خوب واقف ہوں، ان میں نہ کوئی بزرگی ہے نہ ان کا کوئی مرتبہ، وہ تو محض ڈھکوسلا ہیں۔ عوام الناس کو دھوکا دے کر اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں، مجھے خوب یاد ہے بچپن میں میں ایک بار ابا کے ہمراہ ایک دعوت میں گیا تھا جہاں ایک بڑے مشہور بزرگ پیر حسن شاہ بھی مدعو تھے اور میری آنکھوں کا دیکھا ہوا واقعہ ہے کہ اُن کے سامنے سوئیوں کی جو پلیٹ آئی اُس میں سے ایک انگلی چکھ کر اُنھوں نے وہ پلیٹ یہ کہہ کر اپنے پاس والے مرید کے حوالے کر دی کہ "لو یہ میری چکھی ہوئی ہے اس میں سے سب تھوڑا تھوڑا تبرکاً چکھ لو جو اسے چکھے گا کبھی بیمار نہ ہوگا" اور لوگوں کی کم عقلی دیکھو کہ بعض نے تو جب پلیٹ خالی ہو گئی اور انھیں کچھ نہیں ملا تو جوشِ عقیدت میں پلیٹ ہی زبان سے چاٹ لی۔ بھلا اس حماقت کا کوئی ٹھکانا ہے بھلا کوئی پوچھے کہ حضرت پیر صاحب آپ کوئی خدا ہیں جو آپ کے فرمانے کا یہ اثر ہوگا کہ اُس پلیٹ میں سے چکھنے والا کبھی بیمار نہ ہو، پھر دعا بھی کتنی لایعنی، ہر انسان کو مرنا ہے، اور اُن چکھنے والوں میں سے اکثر ضرور فطرتی موت مریں گے یعنے بیمار ہوں گے اور مر جائیں گے تو آپ کا وہ دعوے کہاں رہا، یا ایک بار وہ جان کے عرس کے زمانے میں ابا نے مجھے لوگوں کے استقبال کے لیے مقرر کر دیا تھا تو میں نے دیکھا کہ ایک پچھتر برس کے گندم نما جو فروش درویش بخاری صاحب، جن کے متعلق میں پیشتر سن چکا تھا کہ اُنھوں نے بارہ برس کی ایک لڑکی سے حال میں شادی کی ہے مع حلقۂ مریداں کے تشریف لا رہے ہیں میرا جی تو نہیں چاہتا تھا مگر طوعاً و کرہاً میں استقبال کے لیے آگے بڑھا، ابھی میں چند قدم کے فاصلے پر تھا کہ میں نے دیکھا کہ اُن درویش صاحب نے اپنے منھ سے پان کا اُگال نکالا اور تھوڑا تھوڑا اپنے تمام مریدوں میں یہ کہہ کر تقسیم کر دیا کہ "لو اسے کھاؤ، اس کے کھانے سے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے اور عرس کی محفل میں تم سب انوارِ تجلی کا مطالعہ کرو گے" بھلا یہ درویشی کی شانیں ہیں، نعوذ باللہ من ذالک حضرت رسولِ اکرمؐ جن سے برتر اور بلند مرتبہ کا بشر وجود میں نہیں آیا اُن کی بابت بھی اس نوع کے دعاوی نہیں کیے گئے دراں حالیکہ اُن کے اور خدا کے تعلقات کا یہ عالم تھا کہ اگر آپ فرماتے تو تمام دنیا سے موت اُٹھا لی جاتی اور تمام دنیا اب تک زندہ رہتی اور غیر فانی ہو جاتی"

نصیر کے دنداں شکن جواب سن کر نظمیہ، جمیل، شکیل سب خاموش رہے نصیر کچھ دیر اور بیٹھ کر اپنے گھر واپس چلا گیا

(۵)

چار برس گذر گئے، حسنا اور زبیدہ دونوں کو [illegible] سال تھا، زبیدہ نے اسی سال بی۔ اے کا امتحان [illegible] بدرجۂ اعلیٰ کامیابی حاصل کی تھی، صوبہ کی یونیورسٹی [illegible]

اور برج کی ماہر کھلاڑی، شہر کے تمام معززین میں اکثر اُس کا اور اُس کی خوبیوں اور صفتوں کا چرچا ہوا کرتا تھا اور زبیدہ ملک کی علمی زندگی میں حصہ بھی لیتی تھی، ہر ماہانہ جلسے میں لیڈیز کلب میں تقریر کرتی تھی، ہر اہم تقریب میں اسپیچ دیتی تھی، ہر ٹینس اور برج ٹورنامنٹ میں شریک ہوتی تھی، حسنا کی البتہ وہی پہلی سی روش تھی، انگریزی تو باپ نے سال بھر سے چھڑا دی تھی صرف انٹرنس کی قابلیت اُسے حاصل ہوئی تھی باقی اُردو، اور فارسی کی تکمیل کر چکی تھی، شطرنج خوب کھیلتی تھی اور دن میں اکثر یہی مشغلہ رہتا تھا کبھی باپ کے ساتھ، کبھی سوشیلا بائی یا صفیہ خاتون کے ساتھ شطرنج کھیلتی رہتی تھی اور عموماً جیتتی تھی، نصیر خود بھی بُری شطرنج نہیں کھیلتا تھا مگر بیٹی کے مقابلے میں ہمیشہ باوجود کوشش کے ہار جاتا تھا۔

نصیر کے یہاں مولوی اُویس احمد ندوی کا وعظ تھا، ظہیر کا تمام گھر مہمان آیا ہوا تھا، منیر کی بیوی یا زبیدہ کو تو ان چیزوں سے نہ دلچسپی تھی نہ اعتقاد مگر منیر کے خوش کرنے اور کچھ نصیر کے دل سے اپنے متعلق بُرے خیالات نکالنے کی غرض سے یہ کنبہ بھی موجود تھا، وعظ میں رات زیادہ ہوگئی تو یہ طے پایا کہ شب نصیر کے یہاں گذاری جائے کھانے سے فراغت کے بعد ظہیر کی بیوی نے نصیر سے کہا

"بھائی جان، آپا نے حسنا کی پیدائش کے وقت ہی یہ کہا تھا کہ اسے میں شکیل کو دوں گی اور میں نے بھی اُن سے یہ خواہش ظاہر کی تھی، وہ اگر اس وقت زندہ ہوتیں تو اُن کو اس سے بڑا ارمان کوئی نہ ہوتا کہ شکیل اور حسنا کا پیوند ہو جائے، اب ماشاءاللہ لڑکی بھی جوان ہے اور لائق، لڑکا بھی تعلیم پا چکا ہے، لہٰذا آپ اجازت دیں تو دونوں کی منگنی کر کے شادی کا دن تاریخ مقرر کر دی جائے۔" پھر منیر کی بیوی کی طرف مخاطب ہو کے "اور ہاں چھوٹی بھابی جان میری بڑی آرزو ہے کہ آپ جمیل کو اپنی فرزندی میں قبول فرمائیں تو جمیل شکیل دونوں کی شادی میں ایک ساتھ کر دوں زندگی کا کیا بھروسہ ہے میں چاہتی ہوں اپنے سامنے ہی ان لڑکوں کا سہرا دیکھ لوں۔"

نصیر تو ابھی خاموش رہا لیکن منیر کی بیوی نے کہا "چھوٹی دولھن، تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو، بھلا جمیل کو دیکھو اور زبیدہ کو دونوں کی طبیعتوں اور تعلیم میں زمین آسمان کا فرق ہے، بھلا ان دونوں کے جوڑ سے سوائے تُو تُو فضیحتی کے اور کیا نتیجہ ہوگا۔"

ظہیر کی بیوی نے کہا "نہیں بھابی جان یہ آپ کا خیال ہے، شادی کے بعد زبیدہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی وہ ابھی بچی ہے، میاں کا رنگ دیکھ کر اسی کی طبیعت اور مزاج کے موافق خود کو بنا لیگی، ابھی بچپن ہے، مزاج میں شوخی اور کھیل ہے، پختگی آئے گی تو خود بدل جائے گی گھر ہی کے لڑکے اور لڑکیاں ہیں، آپس میں ہو جائے تو ہنسی خوشی زندگی گذار دیں گے ہم سب کی آرزو بھی پوری ہو جائے گی اور روپیہ پیسہ، جائداد مکان، جو کچھ اللہ کا دیا ہے وہ بھی گھر ہی میں رہے گا۔"

منیر کی بیوی نے کہا "چھوٹی دولھن، تم خواہ کچھ کہو میں نہیں مانوں گی کہ یہ جوڑ ٹھیک بیٹھے گا، اور پھر میرا کچھ بس نہیں

زبیدہ خود سمجھدار ہے وہ اپنا شوہر آپ تلاش کرے گی۔"
ظہیر کی بیوی منیر کی طرف متوجہ ہوئی "کیوں
چھوٹے بھائی جان آپ کا کیا خیال ہے آپ بھی تو کچھ
بولیے آخر لڑکی تو آپ کی بھی ہے، اور ہماری بھابی جان
نے یہ جو کہا کہ زبیدہ خود اپنے لیے بر تلاش کرے گی تو
بھلا ایسا ہوا ہے کہ ماں باپ، بڑے چچا سب کے ہوتے
ہوئے لڑکی اپنا بیاہ آپ کرلے"؟
ظہیر نے بھی کہا "ہاں، بھائی صاحب بولئے
آپ کی کیا رائے ہے، دیکھیے میں نے عمر بھر میں یہی
ایک خواہش آپ سے کی ہے، اور میری بات کو ضائع مت
کیجیے گا۔"

منیر یوں تو ہر بات میں بیوی کی [illegible] کا غلام تھا
لیکن کچھ بھائی بھاوج کی محبت، کچھ وہ بھی دل میں
زبیدہ کی طرز روش سے مطمئن نہ تھا، اس نے بیوی کی
ایک نہ سُنی اور زبیدہ کی نسبت جمیل سے کر دی، حُسنا
کے لیے پہلے تو نصیر نے بھی بڑی مخالفت کی، اُسے
حُسنا سے تعلق بھی بہت تھا اور وہ جمیل اور شکیل کی
طبیعتوں کے رنگ سے بھی واقف تھا کہ بالکل کھرا ملا ہیں
لیکن کچھ تو اُسے شکیل سے اُنس زیادہ تھا، کچھ بھائی
بھاوج کا اصرار اور کچھ حُسنا کی ماں کی آخری وصیت کا
خیال کہ حُسنا کو میری بہن ہی کے یہاں دینا، وہ بھی
آخرکار راضی ہو گیا۔ اور گو منیر کی بیوی نے لاکھ سر مارا
روئی پیٹی، کپڑے پھاڑ ڈالے، دیوار سے سر پٹکا، مگر
دوسرے دن دونوں نسبتیں پکی پوڑھی ہو گئیں اور
دونوں لڑکیوں کا پردہ ہو کر دو مہینے کے بعد رجب کے
چاند میں شادی کی تاریخیں مقرر ہوئیں۔

(۶)

حُسنا تو باپ کے احکام کی تابع تھی وہ تو نسبت کی خبر
سُن کر خاموش رہی، لیکن زبیدہ نے بہت نیل مچائے، اچھل
کود کی، ماں باپ سے لڑی، گھر سے چلے جانے کی دھمکی
دی مگر منیر نے جو ضد پر کمر باندھی تو ٹس سے مس نہ ہوا،
بیوی نے افیم کھالی مگر اُس بندۂ خدا نے ہاں سے نہیں
نہ کی، بیوی کا اسپتال میں علاج کرایا، وہ اچھی ہو کر گھر
میں آئی تو دن بھر مُنہ لپیٹے گھر میں پڑی رہتی تھی۔ کلبوں
جلسوں، سینما سب میں شرکت چھوٹ گئی مگر منیر کے
ارادے کو جنبش نہ ہوئی، آخر تھک کر منیر کی بیوی نے
بھی ہار مان لی، لیکن دونوں ماں بیٹیوں میں دن بھر
چپکے چپکے باتیں ہوا کرتی تھیں، رجب کے چاند میں دس
روز باقی تھے، شادی کی تیاریاں بہت اہتمام سے دونوں
طرف جاری تھیں کہ زبیدہ جو ایف۔ اے کی متعلمہ تھی
ایک دن جو گھر سے اسکول گئی تو واپس نہ آئی، رات کے
دس بجے تک تو منیر اسی انتظار میں رہا کہ اب آتی ہو گی
لیکن جب دس بج گئے، گیارہ بجے اور زبیدہ نہ آئی
تو اسے فکر ہوئی، بیوی کو بھی بہت پریشانی تھی، دوسری
موٹر نکالی اور پہلے اسکول گیا، وہاں معلوم ہوا کہ یہاں
سے چار ہی بجے جا چکی ہے تو کلب گیا، وہاں سُنا کہ
کہ آٹھ بجے یہاں سے رخصت ہوئی تھی وہاں سے مس
کینڈے کے جمنیزیم گیا، وہاں کچھ پتہ نہ چلا، دونوں بھائیوں
کے یہاں بھی ناکامی ہوئی، اب تو دونوں میاں بیوی
کی پریشانی اور ندامت کی کوئی حد نہیں رہی، ظہیر

نصیر، شکیل، تینوں نے رات بھر شہر ڈھونڈھ ڈالا لیکن
نہ زبیدہ کا پتہ چلا نہ موٹر کا، دوسرے دن ڈرائیور اسکول
کے ایک کمرے میں بند رہا ہوا ملا اور موٹر چوراہے پر۔
دو چار دن اور تلاش جاری رہی لیکن کوئی سراغ نہ ملا،
شرم کے مارے منیر نے گھر سے باہر آنا چھوڑ دیا، پولس
میں اس لیے رپورٹ نہیں کی گئی کہ خاندان کی شرافت پر
دھبہ لگے گا، شادی کی تاریخ میں ایک ہفتہ رہ گیا اور زبیدہ
کا کوئی نشان نہ ملا، اُس کی ماں کا یہ حال تھا کہ دن رات
بجز رونے کے کوئی کام نہ تھا، تقریب میں صرف دو روز
باقی تھے کہ یکایک رات کو زبیدہ واپس آگئی، ماں نے
لاکھ لاکھ پوچھا، باپ نے بید سے کر کھال گرا دی، چچا دونوں
ہزار ہزار طرح خوشامد کرتے رہے لیکن زبیدہ نے یہ نہیں
بتایا کہ وہ کہاں غائب ہو گئی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ عین شادی
کے دن جمیل نے شادی سے انکار کر دیا اور صرف حُسنا کا
عقد شکیل کے ساتھ کر دیا گیا۔

زبیدہ نے گو ماں کو بھی اپنا راز نہیں بتایا لیکن
ماں پھر ماں ہوتی ہے اور زبیدہ کی ماں جس کی یہ عین
خواہش تھی کہ زبیدہ کا عقد جمیل کے ساتھ نہ ہو، دو چار
مہینے ہی میں زبیدہ اور اُس کی ماں کا پھر وہی رنگ ہو گیا
کہ صبح سے شام تک کلبوں، جلسوں اور تھیٹر سینما سے
فرصت نہیں ملتی تھی، زبیدہ اب بھی اسکول جاتی تھی لیکن
اب معتبر ملازمہ اُس کے ہمراہ موٹر میں ہوتی تھی، منیر نے تو
زبیدہ کے واقعہ کے بعد سے خانہ نشینی اختیار کر لی گھر سے
باہر کہیں نہیں جاتا تھا، نصیر، ظہیر کبھی کبھی آ کر اُس کے
پاس بیٹھ کر اس کا جی بہلا جاتے تھے لیکن اُس نے پھر
زبیدہ کی صورت نہیں دیکھی، یوں بھولے بھٹکے کبھی
سامنا ہونے کی اور بات ہے مگر قصداً زبیدہ کو اُس نے
اپنے سامنے آنے نہیں دیا، اور یہاں زبیدہ کے معاملے
کی اصلیت یہ تھی کہ یونیورسٹی کالج کے ایک نوجوان
خوبصورت، اعلیٰ تعلیم یافتہ، پروفیسر مظہر سے تعلقات
ہو گئے تھے، پہلے تو دونوں نے بہت اسکیمیں بنائیں
کہ کسی طرح زبیدہ اور جمیل کا عقد رُک جائے لیکن جب
کچھ بن نہ پڑا تو یہ ترکیب کی کہ پندرہ روز تک زبیدہ مظہر
کے گھر میں چھپی رہی، پندرھویں دن جب شادی کی
تاریخ قریب تھی زبیدہ لڑ کر گھر واپس چلی آئی مگر ترکیب
تو کارگر ہو ہی چکی تھی نسبت منقطع ہو گئی، اُدھر وہ جھگڑا
بالکل معمولی ہی سا تھا پھر کلب میں دو چار ملاقاتوں کے
بعد صلح ہو گئی اور دونوں نے از سر نو تجدید محبت کی
اور پھر چوری چھپے ملنے لگے۔

(۷)

جمیل جوان تھا اور تندرست، تعلیم اُسے ملی تھی
بالکل دقیانوسی اور کہنہ، سختی اور نگرانی باہر آنے جانے
کی اب تک ہوتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ گھر میں ایک جوان
چھوکری ملازم تھی اُس سے تعلق ہو گیا، شکیل تو شادی
کے بعد سے الگ حصے میں رہتا تھا، جمیل کی بھی بالکل
تنہائی تھی، سال بھر تک یہ سب کھیل کھیلے، اور اُدھر
منیر کو یہ پتہ چلا کہ زبیدہ حاملہ ہے اُدھر جمیل کے تعلق سے
اُس چھوکری کے ایک لڑکی پیدا ہو گئی، وہ چھوکری تو
کم ظرف، نیچ قوم تھی ہی اُس نے یہ خبر سارے شہر میں
مشہور کر دی، ظہیر کو بے حد صدمہ ہوا اور اُس نے

جمیل کو گھر سے نکال دیا، لیکن جمیل کی داشتہ نوزائیدہ لڑکی کو ظہیر کے سر مار خود بھی کہیں چلدی۔ ان سب پریشانیوں کے ہجوم کو ظہیر کی بیوی برداشت نہیں کر سکی، جمیل سے اُسے محبت بہت تھی، لاکھ طرح ظہیر کو سمجھایا کہ اُس کا قصور معاف کر کے پھر واپس بلالے مگر ظہیر نہیں مانا اور ماں جمیل کی صورت دیکھنے کو ترس ترس کر مر گئی۔۔۔ منیر زبیدہ کے بھاگنے کے بعد سے آدھا تو ہو ہی گیا تھا، اُس کے حاملہ ہونے کی خبر سنی تو بالکل ختم ہو گیا، کھانا پینا سب ترک کر دیا، تھوڑے دنوں میں دق ہو گئی اور زبیدہ کے لڑکا پیدا ہونے سے دو دن قبل اُس نے اس دنیا کو خیر باد کہا۔ زبیدہ کی ماں کی بھی اب آنکھیں کھلیں، شوہر کا مرنا، لڑکی کی آوارگی، سب نے اُس کی کایا پلٹ دی، زبیدہ کو لاکھ لاکھ سمجھایا کہ اپنے کرتوتوں سے باز آئے مگر اُس کے دماغ میں تو مغرب کا جنون تھا پروفیسر مظہر کی محبت پر اعتبار کر کے ماں کو بھی خیر باد کہا اور ۲۶ دن کے بچے کو نانی پر چھوڑ کر رات کے وقت چلدی، پہلے مظہر کے یہاں پہونچی، وہ تو اپنا مطلب نکال ہی چکا تھا اب کیوں منھ لگاتا، اُس نے دھکے دیکر نکالا اور دروازہ بند کر لیا، عورت تھی اور پھر شریف خاندان کی شرافت کا کچھ خون رگوں میں باقی تھا ماں کو منھ دکھانے کی ہمت نہیں پڑی اور دو چار زیور اور رقم جو پاس تھی اُس کے بوتے پر شہر چھوڑ کر دوسرے شہر چلی گئی۔۔۔ جمیل کو باپ نے گھر سے نکالا تو وہ ایک ماہ در نصیب کے پاس رہا پھر وہاں سے بھی غائب ہو گیا اور خوبی قسمت اور اتفاق روزگار دیکھیے کہ اُسی شہر میں پہونچا جہاں زبیدہ یوں خانماں خراب پہونچی تھی اُس نے ایک مدرسہ میں معمولی ملازمت کر لی آوارگی تو فطرت اور تعلیم کا جزو تھی وہ کہاں جاتی عصمت اور عزت سے کیسے رہتی، بدنام ہوئی اور رفتہ رفتہ جمیل سے بھی تعلقات پیدا ہو گئے جو اب ایک اسلامی انجمن اور یتیم خانہ کا منیجر تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہچانا اب زبیدہ کی آنکھیں کھلیں اور گو دل ہی دل میں پشیمان ہوئے مگر اس پر خدا کا شکر ادا کیا کہ بہر حال ایک ہی خاندان کے قریبی عزیز ہیں۔ جلد ہی دونوں کا نکاح ہو گیا اور زبیدہ پرانی حرکتوں کو چھوڑ کر شرافت سے رہنے لگی۔ بہر حال جس جگہ پہلے منیر اور ظہیر دونوں کو عزت آرام لانا چاہتے تھے آخر کار رُسوا ہو کر وہیں پہونچے۔ سہ

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم

(۸)

شکیل بھی ظہیر کا لڑکا تھا اور جمیل کا بھائی اور گو فطرت میں صلاحیت اور نیکی جمیل سے بہت زیادہ تھی مگر تعلیم و تربیت کا اثر کہاں جاتا شادی کے دوسرے ہی دن سے حسنا پر بیجا اور بے محل سختیاں شروع کیں ماں کے دم تک ذرا کمی رہی لیکن ادھر اُس کی آنکھ بند ہوئی اُدھر شکیل نے نادر شاہی حکومت شروع کی۔ الگ مکان بنوایا تھا وہیں جا کر رہنے لگا۔ حسنا کچھ زبیدہ کی طرح مغربی رنگ میں تو ڈوبی ہوئی تھی نہیں وہ خود بھی تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھی اور روشن خیال باپ کی بیٹی اور تربیت یافتہ بھی، اُس نے

جو شوہر کا یہ رنگ دیکھا تو ٹھان لی کہ میاں کو اپنا کر کے چھوڑے گی، سمجھدار اور لائق تھی اول دن ہی سے کوشش کرنا شروع کر دی، ایک روز شکیل نے اپنے چند دوستوں کی دعوت کی، کھانا کھا کر سب لوگ مردانے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ بارش ہونے لگی، رعد اور بجلی کا وہ زور تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا ابھی قیامت آجائے گی اسی حالت میں شکیل اپنے دو ایک احباب کو رخصت کرنے کے لیے باہر نکلا، صحن میں ایک بڑا نیم کا درخت تھا تینوں آدمی باتیں کرتے پہونچے تھے کہ کڑک کر درخت پر بجلی گری شکیل کے دونوں دوست تو وہیں ختم ہو گئے شکیل کو جب اسپتال پہونچایا تو قدرے جان باقی تھی، بڑی دوڑ دھوپ اور دوا دوش سے اسکی جان بچی مگر ہاتھ پیر مفلوج ہو گئے۔ بیماری کی حالت ہی میں حُسنا نے جو تیمارداری اسکی کی تھی وہ قابل صد ستائش تھی لیکن شکیل کے صحت پانے کے بعد جو خدمت اُس نے اسکی کرنا شروع کی وہ اگر پتھر کا دل ہوتا تو اُسے موم کر دیتی، صبح سے شام تک میاں کے پیچھے لونڈی غلاموں سے بدتر بنی رہتی تھی، شکیل تو ہاتھ پیروں سے بالکل معذور تھا، نوالہ بھی منہ میں نہیں رکھ سکتا تھا لیکن شاباش ہے حسنا کے گردے کو کہ اُسکے پیچھے ہمہ تن خدمت ہو گئی، شکیل اپنے عیب کی وجہ سے بدمزاج اور چڑچڑا ہو گیا تھا، جھڑکتا بھی تھا، خفا بھی ہو جاتا تھا بُرا بھلا بھی کہتا تھا لیکن وہ اللہ کی بندی خاموشی اور صبر سے سب سنتی اور برداشت کرتی تھی، یہ سب کچھ تھا مگر شکیل کا رنگ نہ بدلا حُسنا کی بے عذر خدمتگذاری کا صلہ یہ دیا کہ اسکو باپ سے محض اس بنا پر ملنے سے منع کر دیا کہ وہ شکیل کو قصوروار سمجھتا تھا انصاف شرط ہے جس عورت کا دنیا میں بجز ایک باپ کے کوئی نہ ہو اور وہ بھی کیسا باپ لاکھوں کروروں میں ایک اس سے ملنے کو شوہر منع کر دے تو اس کے دل پر کیا گذرے گی مگر حسنا ہی کا کلیجہ تھا کہ اُف نہ کی اور آٹھویں دن کا بند منٹ کیلیے باپ کے گھر کا جانا بھی چھوڑ دیا، نصیر کو اطلاع ملی تو بیتاب ہو گیا اور خود دوڑ کر آیا، مگر میاں شکیل کا تو لولے لنگڑے ہونے کے بعد سے دماغ پھر گیا تھا، چچا کو بھی گھڑکیاں دیکر گھر میں آنے سے منع کر دیا، نصیر آن کا آدمی تھا اور گو اُسے حسنا سے بیحد محبت تھی مگر اُسنے تہیہ کر لیا کہ شکیل کے گھر میں مرتے دم تک قدم نہ رکھے گا۔ بیچاری حُسنا باپ کے دیکھنے کو بھی ترس گئی لیکن اللہ رے ضبط کہ کبھی لب پر شکایت کا ایک لفظ نہ لائی وہی طاعتگذاری، وہی بے عذری اور خدمت کرنا، میاں نے حکم دیا کہ شوخ رنگ کے کپڑے پہننا چھوڑ دو اُسنے سفید لباس اختیار کر لیا، میاں نے کہا کہ دن بھر اور رات بھر برقعہ پہنے رہا کرو، بیچاری سخت گرمی میں وہی موٹا برقعہ اوڑھے رہتی تھی، شکیل کی پٹی سے پاس بیٹھے حسنا نے ایک نہیں متواتر کئی کئی راتیں جاگ کر گذاری تھیں اور یہ ایک دفعہ نہیں کئی بار لیکن صبح کو ابرو پر بل تک نہیں ہوتا تھا، میاں کی ممانعت تھی کہ نہ کہیں جاؤ نہ آؤ نہ کسی سے ملو نہ کسی تقریب میں شریک ہو نہ کسی کو بلاؤ نہ کسی سے راہ و رسم رکھو حُسنا نے اس پر بھی اُف نہ کی، بیچاری نے اس پابندی کے مارے برسوں سے گھر کے دروازے کی شکل نہ دیکھی تھی، نصیر کے چلے جانے کے بعد سے ظہیر میں بالکل تبدیلی ہو گئی تھی وہ اب نصیر کے ڈھنگ پر چل رہا تھا اُس نے بیٹے کو لاکھ لاکھ سمجھایا کہ حُسنا پر اس قدر ظلم نہ کرے

لیکن شکیل نے باپ کے نصائح اور احکام کی بھی پروا نہ کی اور اُسپر طرہ یہ ہوا کہ جمیل کی ناجائز لڑکی صبیحہ جسے ظہیر نے پرورش کے لیے حُسنا کے سپرد کردیا تھا اور جسے حُسنا اسلیے بہت چاہتی تھی کہ اُسکے خود کوئی اولاد نہ تھی، اسپر سختی کرنا شروع کی، صبیحہ آٹھ برس کی تھی حُسنا نے اُسکے لیے ایک اُستانی رکھی کہ قرآن شریف اور اُردو پڑھائے اور ایک میم انگریزی اور عام معلومات سکھانے کیلیے، شکیل نے اس اُستانی کو بھی نکال دیا اور اُس میم کو بھی، اُسکی رائے میں لڑکیوں کو تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ اُستانیاں اور میمیں اُن کے لیے رکھی جائیں ایک ملانی بی اُس نے مقرر کردیں جو صبیحہ کو محض قرآن شریف پڑھایا کرتی تھیں، بیچاری حُسنا نے خود اُسے بوقت فرصت میاں سے چوری چھپے پڑھانا شروع کیا مگر ایک ہی مکان تھا کب تک بات چھپی رہتی شکیل کو اطلاع ہوہی گئی اور اُس نے حُسنا اور صبیحہ دونوں کو ہزاروں بے نقط سُنائیں اور ستم یہ کہ صبیحہ کے ماں باپ کو بھی بُرا بھلا کہا، دقیانوسی وضع کے آدمیوں میں عموماً وسعت نظر کا فقدان ہوتا ہے جو شکیل میں بھی تھا، بیچاری صبیحہ کا اس میں کیا قصور تھا کہ اُسکے ماں باپ نالائق تھے یا اُسکی ماں ایک کم ذات عورت تھی مگر شکیل نے اسپر اُسے ہزاروں طعنے دیے، صبیحہ بہت سمجھدار بچی تھی اسپر طرہ حُسنا کی صیقل، بہت ضبط سے اُسنے ان سب طعن و تشنیع کو سہا لیکن بچی تھی تنہائی میں خوب روتی تھی، حُسنا کی روح پر اسکی بھی بہت تکلیف تھی، ہر نماز کے بعد خدا سے شکیل کی کایا پلٹ کیلیے دعائیں مانگتی تھی مگر بارگاہ ایزدی میں ابھی دیر تھی اُسکی تکلیفوں اور کلفتوں میں کمی کے بدلے اضافہ ہی ہوتا گیا۔

صبیحہ کو دسواں برس تھا، حُسنا میاں کو سوتا دیکھ کر اُسے کوٹھے پر بیٹھی انگریزی اور فارسی کا سبق دے رہی تھی کہ باپ کے گھر کی ماما نے آکر نصیر کو طاعون ہونے کی خبر بد سُنائی، پانچ برس سے بیچاری نے باپ کی صورت نہیں دیکھی تھی تڑپ گئی دوڑی دوڑی شکیل کے پاس پہونچی تو اُسے سوتا پایا خیال کیا کہ جگا لوں معاملہ جلدی کا ہے مگر پھر وہم گذرا کہیں سوتے سے جگانے پر بگڑ نہ جائیں اور جانے کی اجازت ملنے کے متعلق جو کچھ رہی سہی امید ہے وہ بھی جاتی رہے، معلوم نہیں حُسنا نے کن مصیبتوں سے وہ دو گھنٹے ٹہل ٹہل کر بسر کیے، دو گھنٹے کے بعد شکیل جاگا تو حُسنا نے اجازت مانگی لیکن وہاں تو بھوت سوار تھا حکم ہوا کہ جی چاہے تو چلی جاؤ مگر پھر میرے گھر میں واپس نہ آنا، بیچاری دُکھیا خون کے گھونٹ پی کر رہگئی اور ماما کو واپس کردیا کہ ابا سے میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ آپ کی لونڈی کی قسمت میں آپ کا دیدار نہیں لکھا ہے، ماما شکیل کو بُرا بھلا کہتی ظہیر کے پاس پہونچی، وہ بیتاب ہو کر بھائی کے پاس پہونچا اُسکی آخری حالت پائی، شہر بھر کے اچھے سے اچھے اطبا جمع تھے مگر موت کی دوا تو لقمان سے بھی نہیں ہوئی، نصیر نے یاس سے ظہیر کو دیکھا، زبان بند ہو چکی تھی لیکن آنکھوں نے خاموش پیغام سنایا کہ حُسنا کے دیدار کو ترس رہی ہیں، دوڑا دوڑا شکیل کے پاس پہونچا، چلایا، خفا ہوا، رویا پیٹا، خوشامد کی، خدا رسول کے واسطے دیے، عقبیٰ کا خوف دلایا لیکن وہاں نہیں کی رٹ لگی تو ہاں نہیں ہوئی ظہیر نے تنگ آکر حُسنا کو گھسیٹا کہ چلی تو

اس جہنمی پر خاک ڈال اور میرے ساتھ چل، بعد کو دیکھا جائے گا، مگر آفریں ہے حسنا کی ہمت کو چچا کے قدموں پر سر رکھ دیا کہ "چچا ابا، آپ رہنے دیجئے، میرے مقدر میں نہیں کہ ابا کو دیکھوں" ظہیر روتا ہوا چلا آیا، پہونچا تو نصیر کا آنکھوں میں دم تھا، حسرت سے ظہیر کو تک رہی تھیں، ظہیر کو تنہا آتے دیکھ کر ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

(۹)

منیر کی بیوہ نے زبیدہ کے لڑکے سہیل کو اس طرح پالا جیسے کوئی اپنی اولاد کو پالتا ہے، زبیدہ کا انجام دیکھ کر آنکھیں کھل چکی تھیں، سہیل کی تعلیم و تربیت میں نصیر کا تتبع کیا، سہیل بڑا ہوا تو نصیر کا نمونہ نکلا، وہی صورت شکل، وہی طبیعت، وہی عادات و اخلاق، وہی تعلیم و خیالات، حسنا قدرتاً اُسے بہت چاہنے لگی۔ سہیل کا معمول تھا کہ روز سہ پہر کو حسنا کے پاس جاتا کچھ دیر بیٹھ کر اُس سے اور شکیل سے باتیں کرتا اور پھر چلا آتا لیکن اُسکے آنے جانے کی وجہ زیادہ تر صبیحہ تھی، صبیحہ، صورت شکل میں مزاج اور تعلیم میں حسنا کا نمونہ تھی، ہر شخص جو اُس کے پاس بیٹھتا تھا اُس کا گرویدہ ہو کر اُٹھتا تھا، سہیل اور وہ قریب قریب ہم عمر بھی تھے اسلیے سہیل کا اُس سے محبت کرنے لگنا کچھ قابل تعجب نہ تھا، حسنا کو اسکا علم بہت دنوں سے ہو گیا تھا اور اُسے مسرت تھی کہ سہیل سا شوہر صبیحہ کو ملے گا اُس کو سہیل میں اپنے باپ کی تصویر نظر آتی تھی اور وہ گھنٹوں خاموش بیٹھی سہیل کو دیکھا کرتی تھی، اور عجیب بات یہ تھی کہ شکیل کو بھی اگر دنیا میں کسی سے اُنس باقی رہ گیا تھا تو وہ سہیل تھا اُس پر نہ وہ کبھی خفا ہوتا تھا نہ بگڑتا تھا بلکہ اُسکی ہر ضد کو پورا کرنے کو تیار رہتا تھا۔

سہیل اور صبیحہ دونوں کو بیسواں برس تھا کہ حسنا نے شکیل سے ان دونوں کی شادی کی اجازت مانگی بس پھر کیا تھا شکیل کو جلال آ گیا، اُسے معلوم نہیں کیوں صبیحہ کے نام سے نفرت تھی ہزاروں ہی تو سُنا ڈالیں، بیچاری حسنا کا دل ٹوٹ گیا لیکن کیا کرتی مجبور تھی رو بیٹھ کر خاموش ہو رہی، مگر سہیل اور صبیحہ کے تو دل کو لگی تھی دونوں نے خفیہ نکاح کیا اور غائب ہو گئے۔ صرف حسنا ایسی تھی جسے اصلی واقعہ کا علم تھا، ظہیر اور منیر کی بیوہ ناواقف تھے ان دونوں نے صبیحہ اور سہیل کو اپنی اولاد کی طرح پالا تھا، ان پر بڑا اثر پڑا، ضعیف اور شکستہ خاطر پہلے ہی سے تھے۔ پہلے ایک اور پھر دوسرا، صبیحہ اور سہیل کی روپوشی سے چھ ماہ کے اندر آگے پیچھے دونوں ختم ہو گئے۔

(۱۰)

سہیل بی اے پاس تھا، نکلا تو حسن اتفاق سے اُسی شہر میں پہونچا جہاں برسوں پہلے جمیل اور زبیدہ آئے تھے دونوں اب تک زندہ تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے گو اب ادھیڑ عمر کے ہو چکے تھے اور اپنے گذشتہ اعمال پر منفعل تھے۔ زبیدہ اب تک زنانہ اسکول میں مدرس تھی اور جمیل انجمن کا منیجر، سہیل گھر سے بے یار و مددگار بغیر کسی روپے پیسے کے نکلا تھا، یہاں پہونچ کر روزگار کی فکر ہوئی تو ٹھوکریں کھاتا جمیل کے پاس پہونچا اُسنے شریف صورت دیکھکر انجمن کے دفتر میں معمولی سی جگہ دیدی، لیکن اس قلیل تنخواہ میں دونوں کی گذر کیسے

ہوتی مجبور ہوکر سہیل نے صبیحہ کو بھی زنانہ اسکول میں ملازم رکھا دیا جمیل نے صبیحہ کو زبیدہ سے ملا دیا زبیدہ نے بہت شفقت اور مہربانی کا اُس سے سلوک کیا اور ہر قسم کی ہمدردی اور امداد کی اس طرح ان چاروں میں بہت یگانگت اور محبت ہوگئی لیکن کسی کو اس کا علم نہیں ہوا کہ دوسرا کون ہے، سہیل اور صبیحہ نے تو اپنا پتا چھپایا اور زبیدہ اور جمیل کو ان دونوں نے کبھی دیکھا نہیں تھا جو پہچانتے بلکہ ان دونوں سے تو کبھی ان کا ذکر بھی نہیں کیا گیا تھا۔

(۱۱)

شکیل کے فالج کا برسوں سے علاج ہوتا تھا لیکن فائدہ کہیں نام کو بھی نہ تھا، اتفاق سے جرمنی کا ایک ڈاکٹر جو بغرض تفریح ہندوستان آیا ہوا تھا اُس شہر میں آنکلا، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کافی ہے اُسکی شہرت سنکر شکیل نے اُسے بُلا بھیجا، اُس نے دیکھ کر امید دلائی لیکن یہ کہا کہ انسانی خون کی ضرورت ہوگی اور کثیر مقدار میں، بھلا ایسا کون تھا جو شکیل کے لیے اپنے خون کا ایک قطرہ بھی دیتا لیکن حسنا کا ظرف دیکھو تیار ہوگئی، آپریشن ہوا، حسنا کے جسم سے سیروں خون شکیل کے جسم میں داخل کردیا گیا لیکن اُس بندی کی پیشانی پر میل تک نہیں آیا، ایک آدھ ہفتے میں شکیل بالکل اچھا ہوگیا، اب تک حسنا اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی لیکن اصل میں تو وہ محض ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی جل جل کر نیم مردہ پہلے ہی سے ہو چکی تھی، خون کے نکلنے نے مردوں سے بدتر کردیا، شکیل کھڑا ہوا تو وہ گر پڑی اب نبض فطرت کو حرکت ہوئی اور شکیل کو ہوش آیا تو بیوی کی قربانیوں اور اُسکے ایثار کا احساس ہوا، بیوی کے قدموں پر سر رکھ کر روتا تھا لیکن حسنا کا بچانا اب اُسکے بس کا تھا نہ کسی اور کے، بہترین طبی علاج سے اتنا ہوا کہ دس کے بجائے بیس دن کی زیست ہوگئی، شکیل کو صحت پائے چوتھا روز تھا کہ حسنا نے سہیل اور صبیحہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، اُسکے پاس تو سہیل کے خط آتے جاتے ہی تھے اُس نے شکیل کو پتہ بتا دیا اور شکیل نے فوڑا سہیل اور صبیحہ کو بلانے کا تار دیدیا، جواب میں سہیل نے لکھا کہ وہ، صبیحہ، اور اُن کے دو محسن، زکیہ اور جلیل دوسرے روز پہونچیں گے، زبیدہ اور جمیل نے اپنے نام تبدیل کرکے زکیہ اور جلیل رکھے تھے، دوسرے دن صبح کو یہ سب حُسنا کے مکان پر پہونچے، شکیل زبیدہ اور جمیل کے جانے کے بعد سے علحدہ مکان میں رہتا تھا، اس لیے جمیل کو دروازے میں داخل ہوتے وقت تک کوئی شبہ نہیں ہوا لیکن جب اُس نے شکیل کو برآمدے میں کھڑا دیکھا تو بیہوش ہوگیا اُدھر زبیدہ زنانے میں حُسنا کو دیکھ کر غش کھا گئی، شکیل بھی قریب تھا کہ بیہوش ہوجائے لیکن سہیل اور صبیحہ کا حال دیکھ کر اُس نے آپ کو سنبھالا، اور بھائی کو ہوش میں لانے کی تدابیر کیں، وہاں اندر صبیحہ نے بمشکل زبیدہ کو سنبھالا، اب شکیل سہیل اور جمیل کو لے کر اندر آیا، زبیدہ کی آنکھیں فرط ندامت سے نیچی تھیں مگر اُٹھ کر شکیل کو سلام کیا اور لپٹ کر رو دی، کمرے میں سے حُسنا نے رونے کی آواز سُنی تو پوچھا کہ کون روتا ہے جمیل ہاں ہاں

کرتا ہی رہا مگر شکیل نے پکار کر کہہ دیا کہ جمیل اور زبیدہ آئے ہیں، دفعتاً اتنی غیر متوقع اطلاع ملنے پر حسنا بیہوش ہو گئی بمشکل ہوش میں لائی گئی لیکن اس بیہوشی نے اسکی رہی سہی قوت بھی سلب کر لی تھی، زبیدہ اور جمیل سے ملی، صبیحہ اور سہیل کو پاس بلا کر پیار کیا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی، گھر میں کہرام مچ گیا، سب کا روتے روتے برا حال تھا اور خصوصاً شکیل کی یہ حالت تھی کہ دیواروں سے سر مارتا تھا، بمشکل جمیل اور زبیدہ نے تسلی دیکر آدمی بنایا اور حسنا کی تجہیز و تکفین کی فکر کی اور قریب شام حسنا اپنے باپ کے پہلو میں جا سوئی۔

(۱۲)

شکیل نے اپنی سب جائداد اور دولت سہیل اور صبیحہ کے نام لکھ دی، جمیل اور زبیدہ سے اُسنے بہت اصرار کیا کہ کچھ لے لیں لیکن اُنھوں نے انکار کیا، اور زبیدہ اپنے لڑکے اور جمیل اپنی لڑکی سے رخصت ہو کر اپنی اپنی ملازمتوں پر واپس چلے گئے، شکیل نے فقیری اختیار کر لی، دن رات نصیر اور حسنا کی قبروں کے درمیان میں بیٹھا ذکر الٰہی میں مشغول رہتا ہے، صبیحہ اور سہیل اُسکے خبر گیراں رہتے ہیں اور خوشی و خرمی سے زندگی گذارتے ہیں، کبھی کبھی زبیدہ اور جمیل بھی آتے ہیں اور چاروں مل کر نصیر اور حسنا کی تربتوں پر پھول چڑھا کر ان دونوں بے مثال باپ بیٹی کی یاد میں آنسو بہاتے ہیں جنھوں نے دوسروں کے لیے اپنی زندگیاں قربان کر دیں۔

نوجوان ملت سے خطاب

(جناب مولوی حاجی محمود حسن خاں صاحب محمود اسرائیلی)

یہ لمحے قیمتی ہیں تیری زندگانی کے — کرے گا شکوۂ تقدیر نارسا کب تک؟
کم التفاتیِ عالم بجا سہی لیکن — سنیں گے تیری زباں سے یہ ماجرا کب تک؟
فریب کاریِ احباب و اقربا تسلیم — یہی ہے فطرت انساں تو پھر گلا کب تک؟
تو اے زندہ کو مردہ بنا لیا تو نے — رہے گا عالم غفلت میں مبتلا کب تک؟
کچھ اپنے عزم و خرد سے بھی کام لینا تھا — یہ پست ہمتی، اے بندۂ خدا کب تک؟
ہوائے یاس نے گل کر دیا چراغ اُمید — تو ہی بتا کہ میں سمجھوں تری بقا کب تک؟
تجھے خیال کی قوت سے آشنا کر دوں — رہے گا دہر میں تو مائل فنا کب تک؟

خیال خاکہ ہے تصویر زندگانی کا
ہے اُس کی وسعتوں میں راز کامرانی کا

جہانِ آرزو پر ایک نظر

(جناب منشی غلام احمد صاحب فرقت جوائنٹ ایڈیٹر اخبار حقیقت لکھنؤ)

دنیا کروٹیں بدلتی ہے اور بدلتی رہے گی۔ زمانہ پلٹے کھاتا ہے اور پلٹے کھائے گا۔ انقلاب آتے ہیں اور آئیں گے۔ طبیعتوں میں۔ مزاجوں میں۔ بات چیت میں۔ آداب و اطوار میں۔ وضع قطع میں۔ اُٹھنے بیٹھنے میں رہنے سہنے میں فرق ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ ابتدائے آفرینش سے اب تک یہی ہوا ہے کہ جو کل تھا وہ آج نہیں اور جو آج ہے وہ کل نہ ہوگا۔

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیس   عروج مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا

یہی حال انسانی جذبات۔ انسانی تاثرات۔ انسانی احساسات اور انسانی تخیلات کا ہے۔ جو چیز بچپن میں مرغوب ہوتی ہے وہ شباب میں بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ جس چیز کو جوانی میں چھاتی سے لگا لینے کو دل چاہتا ہے اُس سے بڑھاپے میں طبیعت کو نفرت ہو جاتی ہے۔

اور ہے بچپن جوانی اور ہے پیری کچھ اور   تین نقشے تین پردوں میں ہیں اک تصویر کے

شاعری کا بھی یہی حال ہے خواہ وہ اردو شاعری ہو یا ہندی عربی ہو یا فارسی انگریزی ہو یا فرانسیسی۔ دنیا کی کسی زبان کسی دیس کسی ملک کی ہو یہی سلسلۂ لامتناہی جاری ہے اور جاری رہیگا بلکہ ایک شاعری پر کیا موقوف ہے ہر چیز کا یہی حال ہے دنیا نام ہے انقلاب پسندی اور تغیر طلبی کا۔ العالم متغیر

اس صحبت میں جس چیز کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ بھی انھیں تغیرات انھیں انقلابات اور انھیں تبدیلیوں سے متاثر نظر آتی ہے۔ اس وقت حضرت آرزو لکھنوی کا تازہ دیوان جہان آرزو ہمارے پیش نظر ہے۔ بچپن سے سن کہولت تک کا کلام آپ مختلف اخبارات مختلف جرائد مختلف رسالوں میں دیکھ چکے ہیں تنقیدیں بھی ہوئی ہیں اور تبصرے بھی۔ غزلیں تو بچے بچے کی زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔ فغان آرزو تو آپ کی نظر سے گذرا ہی ہوگا اب جہان آرزو کی باری ہے جس میں آرزو کے جذبات کا وہ انمول خزانہ اور منتخب کلام درج ہے جو موصوف نے سن کہولت کے بعد سے اس وقت تک نظم کیا ہے۔ فغان آرزو میں کچھ آہیں تھیں۔ کچھ نالے تھے۔ کچھ دل و جگر کی تراشیں تھیں۔ کچھ صوفیانہ ٹکڑے تھے۔ کچھ ہجر و وصال کی داستانیں تھیں جنکو قرطاس ابیض پر الفاظ کا رنگین جامہ پہنا کر پیش کیا گیا تھا۔ غرض آرزو کے بچپن اور شباب کی ساری کائنات، ساری دنیا ساری پونجی ساری مایہ اور ساری کمائی جس کو تخیل نے انکے کاسۂ دماغ میں جمع کیا تھا فغان آرزو کی صورت میں

لٹا دگئیں بکھیر دگئیں نچھاور کر دگئیں۔ لوٹنے والے لوٹ لیگئے۔ جمع کرنے والوں نے جمع کر لیا۔ قدردانوں نے سینوں سے لگا یا۔ سخن فہموں نے دلوں کی گہرائیوں میں محفوظ کر لیا اور پھر بیقرار نظریں ان جواہر پاروں کی تلاش میں آرزو پر جم گئیں کہ شاید موتی بکھیرنے والا اور پھول نچھاور کرنے والا کچھ اور موتی بکھیرے کچھ اور پھول نچھاور کرے۔ آخر انتظار کی مدت ختم ہوئی۔ بیچینی کی گھڑیاں کٹ گئیں۔ فراق کے لمحے گذر گئے اور جہان آرزو تیار ہوگیا۔ جوانی کا امنگوں کا دور دورہ ختم ہونے پر جب دل کو قدرے تسکین ہوئی۔ تخیلات کے سیلاب کا زور کم ہوا۔ دھارے کا بہاؤ رُکا درد کی ٹیس میں کمی ہوئی اور جذبات کی تڑپ اور چمک مائل بہ سکون ہوئی تو تخیل نے ایک کروٹ بدلی آنکھ کھلی تو دنیا بدلی ہوئی تھی بے اختیار مُنھ سے نکل گیا

بُجھ گیا دل ہو گئی گونگی زباں اگلی پچھلی سب کہانی ختم ہے

آندھی...نی آئی اور چلی گئی۔ جذبات کا سیلاب اُٹھا اور گذر گیا اور راز و نیاز کی باتیں اور محبت کے افسانے تقویم پارینہ بن گئے۔ اب بڑھاپے کا پاس ہے دنیا والوں کا لحاظ ہے اسلیے جو بات آرزو کے منھ سے نکلتی ہے حکمت میں ڈوبی ہوئی۔ فلسفے سے بھری ہوئی۔ تصوف میں رنگی ہوئی لیکن پھر بھی فطرت بدلتے بدلتے بدلتی ہے آنسو تھمتے تھمتے تھمتے ہیں۔ درد و محبت، حسن و عشق، ہجر و وصال کا زمانہ بھولتے بھولتے بھولتا ہے۔ گو جذبات کے شعلے دب چکے ہیں لیکن آگ اب بھی سلگ رہی ہے۔ دھواں اب بھی نکل رہا ہے۔ نالے کم ہوئے ہیں لیکن زیرلب آہیں اب بھی باقی ہیں۔ طبیعت کو لاکھ لاکھ روکتے ہیں لیکن یہ ظالم رکتی نہیں اور خود بخود منھ سے نکل جاتا ہے۔

جمع ہوئے ہیں کچھ حسیں گرد مرے مزار کے پھول کہاں سے کھل گئے دن تو نہ تھے بہار کے

مندرجہ ذیل اشعار میں جو جہان آرزو سے انتخاب کیے گئے ہیں ادبی جواہر پارے بھی ہیں اور زیر لب آہیں بھی۔ حکمت بھی ہے اور تصوف بھی۔ پند بھی ہے اور نصائح بھی۔ وادی ایمن کی شرر باریاں بھی ہیں اور روح انسانی کے احساسات کو تڑپا دینے والی چنگاریاں بھی۔ غرض لعل و گوہر سے زیادہ گراں جواہر پارے تشنگان ذوق کیلیے جہان آرزو میں بدرجہ اتم موجود ہیں جو روح انسانی کیلیے آبحیات ہیں۔ فلسفۂ زندگی۔ شاعرانہ محاسن۔ دقیق اور مشکل مسائل بہ نسبت سے خشک مضامین کچھ اس پیرائے میں ادا ہوئے ہیں کہ بس سر دُھنتے کو جی چاہتا ہے۔ ان اشعار کو پڑھیے اور ذوق سلیم کی کسوٹی پر کسیے۔ الفاظ کی نشست و ترکیب پر غور کیجیے۔ نئے نئے محاوروں سے زبان کا لطف اُٹھائیے اور چٹخارے

میں چپ آسرا لگائے اور اُنھیں یہی بہانا کہ یہ مُنھ سے کچھ تو کہتا جو امیدوار ہوتا
یہی حد نہ تھی وفا کی کہ قضا پہ ختم کر دی ابھی اور کیا نہ کرتے اگر اختیار ہوتا
وہ کہیں کہ آرزو کو مری غفلتوں نے مارا ابھی ہم یہ بات کہتے تو نہ اعتبار ہوتا
بے کہے ہونے لگا ظاہر جو دل کا راز تھا خود سکوت بے محل فریاد بے آواز تھا

وحشت انگیزی میں یکرنگی گریباں گیر تھی　　جتنے دیوانے تھے سب کا ایک ہی انداز تھا

جان کر وارفتہ اُن کے چھیڑنے کی دیر تھی　　پھر تو دل اک ہوش میں آیا ہوا دیوانہ تھا
بن گیا دم بھر میں شعلہ ہو گیا حاصل سکوں　　مضطرب پروانہ تھوڑی دیر کو پروانہ تھا

جو درد مٹتے مٹتے مجھی کو مٹا گیا　　کیا اُس کا پوچھنا کہ کہاں تھا کہاں نہ تھا
عہد ازل میں اصل حقیقت جو پوچھیے　　سب آپ ہی کا قول تھا میرا بیاں نہ تھا

دل بھر آیا جو عدو کا بھی سہارا ٹوٹا　　آنکھ سے اشک گرا چرخ سے تارا ٹوٹا
ہم کو اتنا بھی رہائی کی خوشی میں نہیں ہوش　　ٹوٹی زنجیر کہ خود پاؤں ہمارا ٹوٹا
آرزو اشک رکے ڈوب پسینے کے چلے　　اُٹھا طوفان جو بہتا ہوا دھارا ٹوٹا

وہ اُن کا اک مٹاتے ہوئے کو مٹا رنا　　وہ کانپ کر زمین سے اُٹھنا غبار کا
بدلی کی چھاؤں سی ادھر آئی اُدھر گئی　　جھپکی پلک کہ ختم تھا موسم بہار کا

چمن وسیع ہے محدود قوت پرواز　　ٹھکانا روز بدلتا ہوں آشیانے کا
بڑے مزے کے تھے الزام اگرچہ جھوٹے تھے　　پھر آج ہاں کوئی ٹکڑا اُسی فسانے کا

ہوا سمیٹے رہی مشت خاک وحشی کی　　ہمیشہ ایک بگولہ رواں دواں دیکھا
تھے اختیار بھی دے کر وہ جبر پر مجبور　　اسیر کر لیا جس کو رواں دواں دیکھا

جیسی جس کی طینت ہوگی دنیا سب کو بتائے گا　　داغی آئنہ جب دیکھو گے دھبا منہ پر آئے گا
کل نہ سہی دیدار کا وعدہ حشر کے بھی کچھ بعد سہی　　جا ہی رہا ہے جاتا زمانہ وہ دن بھی آ جائے گا

کوئی بھی جز قیس لیلے کا نہ دیوانہ ہوا　　شوق نے پردے دیے جس کو وہ پروانہ ہوا
دل کے ہر ذرہ میں اب ہے پرتو برق جمال　　ایک شیشہ چور ہو کر آئنہ خانہ ہوا
اللہ اللہ حسن کی یہ پردہ داری دیکھیے　　بھید جس نے کھولنا چاہا وہ دیوانہ ہوا

رسوائی مزید کا امکاں نہیں رہا　　ان دھجیوں کا نام گریباں نہیں رہا

قریب صبح یہ کہہ کر اجل نے آنکھ جھپکا دی　　ارے سے ہجر کے مارے تجھے اب تک نہ خواب آیا

اس حسن ظن پہ ہمسفروں کے ہوں پا بہ گل　　مجھ بے خبر کو رہبر منزل بنا دیا
ساتھ آئیں تیری یاد کے اتنی مسرتیں　　سنسان دل کو غیرت محفل بنا دیا

بھاگتی ہے ہر قدم میری ہوا سے اُڑ کے گرد　　اب نکل جائے گی ویرانی بھی ویرانے سے کیا
اک پہیلی ہے جسے سمجھا کرو بوجھا کرو　　بات کچھ مطلب ہے کچھ پوچھو گے دیوانے سے کیا

وہ جزر و مد ہے کہ جس میں ہے جوشِ بحرِ حیات — ملال بعد خوشی کے خوشی ملال کے بعد
ناتواں بیمارِ غم اس پر تھپیڑے موت کے — بجھ گیا آخر چراغِ صبح لہرانے کے بعد

شرحِ بربادیِ دل مجھ سے نہ پوچھ — ہے ترا حسنِ سراپا موجود

ہے نگاہِ باغباں میں آج بجلی کی چمک — ہمصفیرو اپنے اپنے آشیاں سے ہوشیار

ہے یہ از خود رفتگی قائم تو پھر کیسی دوئی — اپنا دھوکا ہو چلا ہے آپ کی تصویر پر

او دشمنِ تمنا اس کا جواب دیدے — یہ ہاں بنے تو کیا ہو مرتا ہوں جس نہیں پر
نکلی شریکِ قسمت بربادیِ نشیمن! — تنکے جہاں پڑے تھے نوچے گئے وہیں پر

تاخیر کی بنیاد ہے خود عجلتِ بے جا — جلدی ہے جو لکھنے کی تو رکتا ہے قلم اور
اس دل شکن انکار کا اقرار ہے انجام — ہاں ترکِ محبت کی قسم ایک قسم اور

پیمانہ ہے چھلکا ہوا اور جی نہیں بھرتا — قابو میں نہیں پھر بھی زباں پر ہے کہ ہاں اور
کڑیاں نہ بڑھا قید کی او کوشش ناکام — تھکنے سے بھی بڑھ جاتی ہے زنجیرِ گراں اور
پھر شام عذاب دیکھیں گے اے آہِ سحرگاہ — جلنے کا دھواں اور ہے بجھنے کا دھواں اور

ہاں ہاں بجا ہے پرسشِ تیغِ ادائے ناز — لیکن نہ امتحانِ رگِ جاں کیے بغیر

دوریِ منزل سے ہے واماندگی بھی شوق بھی — بیٹھتی اُٹھتی چلی جاتی ہے دیوانے کی خاک

دینا جو نہیں تو نہ اصلا دو بخشش کی ادا ہی دکھلا دو — اک بھر کے ادھر بھی لُنڈھکا دو چھلک جائینگے خالی جام ہم
خود کام کبھی ناکام کبھی اور آرزوِ بدنام کبھی — اللہ رے جلتے ہیں اُس بزم میں کس کس نام سے ہم

دلوں میں فرق ہوا جب تو چاہ پیار کہاں — چمن چمن ہی نہیں آئے گی بہار کہاں
امنگ تھی یہ جوانی کی یا کوئی آندھی — ملا گئے خاک میں ہم کو گئی بہار کہاں

مشق پر بھی چھا گئیں رعنائیاں — اُف تری توڑی ہوئی انگڑائیاں
پرتو خلوت ہے جلوت کا طلسم — دوڑی دوڑی پھرتی ہیں پرچھائیاں
عشق کوئی کھیل لڑکوں کا نہیں — جو سبھی چھو آئیں جا کر ڈھائیاں

تم کو غارتگریِ دل کا اب آیا ہے خیال — اور میں پہلے ہی سے صبر کیے بیٹھا ہوں
آہ میں درد کی تاثیر لیے بیٹھا ہوں — دل میں اک خون بھرا تیر لیے بیٹھا ہوں
جوہرِ شیشہ پہ نظر پڑتے ہی دل یاد آیا — مٹنے والے تری تصویر لیے بیٹھا ہوں
قید کو توڑ کے سمجھا کہ سہارا توڑا — ہاتھ میں پاؤں کی زنجیر لیے بیٹھا ہوں

مرا ہنسنا ہے دنیا میں چراغِ صبح کا ہنسنا — سنبھالا لے کے جو مرتا ہو اُس مرغ کی بحالی ہوں

اُن کی بیجا بھی سنوں آپ بجا بھی نہ کہوں — آخر انسان ہوں میں بھی کوئی دیوار نہیں

عہدِ وفا یہ ہے کہ قسم ایک خود غرض — ممکن تو ہے کہ ہاں ابھی کہہ دے مگر نہیں

کئی چاک اُن کے ہاتھوں کے کچھ آنسو اپنی آنکھوں کے — دیا ہے جو مقدر نے لیے بیٹھا ہوں دامن میں

جہاں کے انقلابوں سے ہے زندہ میری بیتابی — ابھی تک کروٹوں پر کروٹیں ہیں کنجِ مدفن میں

مٹی ہوئی سی ہوں تصویر اپنی حسرت کی — گیا ہوا ترے وعدہ کا اعتبار ہوں میں

چاک دامانِ یوسف کو ہوا میں نہ اُڑا — کہیں دُھرا دے نہ کوئی اسی افسانے کو

ذکرِ جفا بُرا نہیں گر ہو بطرزِ جوششِ شوق — لب شکوہ مند دیکھ کم نہ وفا کی شان ہو

یوں چھپاتا ہوں میں رہ رہ کے کسی کی تصویر — تاڑ لے دیکھ کے وہ بھی جو نظر باز نہ ہو

مرنے والوں سے طلب کرتے ہو دعوے کا ثبوت — جان پر کھیل نہ جائے کوئی ناشاد ابھی

اول شب وہ بزم کی رونق شمع بھی تھی پروانہ بھی — رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی

قید کو توڑ کے نکلا جب میں اُٹھ کے بگولے ساتھ ہوئے — دشتِ عدم تک جنگل جنگل بھاگ چلا ویرانہ بھی

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر — اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

بگولے اُٹھ کے یہ کہتے ہیں خاکِ بیکس سے — کسی غریب کی میت پڑی نہیں رہتی

نہ بھول حالتِ حق گو نہ توڑ مہرِ سکوت — زبانِ دار پہ ہے قصۂ رسن باقی

خزاں نہ چھوڑ چکی ہے بہار کا دامن — سوائے رنگ نہیں بوئے یاسمن باقی

پھر اک نگاہِ کرم ساقیِ الست کی خیر — کہ اب نہیں اثرِ بادۂ کہن باقی

تھی گراں زنجیرِ آہن بھی جنوں بھی زور پہ — جو کڑی ٹوٹی صدا نکلی مبارکباد کی

بنے تھے اس لیے بجلی کی آنکھ جھپکا دو — بدل کے بھیس بھی رکتے ہو سامنا کرتے

پابندیِ رسوم کہاں شوقِ دل کہاں — اک کشمکش میں ڈال دیا ہے مگر مجھے

دنیا بدل گئی جو کھلی بند ہو کے آنکھ — آئینۂ ازل ہے یہاں ہر سحر مجھے

ٹکڑے ابھی جڑ سکتے ہیں ٹوٹے ہوئے دل کے — شیشہ یہ پگھل جائے گا تو ہاتھ لگا دے

اے جلوۂ نیرنگ یہ ہے کونسا انصاف — جس رنگ پہ ہم مٹنے لگیں اُس کو مٹا دے

اک نیا دوزخ بنا کر جھونک دے یہ سب قبول — جن سے تو ناراض ہے اُن میں نہ کر شامل مجھے

جو ترے عمل کا چراغ ہے وہی بے عمل ہے تو داغ ہے — نہ جلا کے بیٹھ اُسے صبح سے نہ بجھا کے سو اُسے شام سے

اگر آرزوئے دل اُمنڈ پڑے تو بھلا اشک روکے سے کیا رُکے
کوئی مے نہیں کہ اُبل چلے تو پلٹ لو شیشہ میں جام سے

جمع ہوئے ہیں کچھ حسیں گرد مرے مزار کے
پھول کہاں سے کھل گئے دن تو نہ تھے بہار کے

پستیٔ ہمت اور شے بے بسی اور چیز ہے
ٹوٹ کے بھی نہ تھک سکے پاؤں اُمیدوار کے

مُنہ پہ تو اُنکے تھی ہنسی کھنچ گئی دل سے ٹھنڈی سانس
لے لو ہوا سنک چلی آگئے دن بہار کے

بیانِ حال ہیں نقشے بدلتی چتون کے
بگڑ رہی ہے مری بات آج بن بن کے

بھلے دن آئے تو آزار بن گیا آرام
قفس کے تنکے بھی کام آگئے نشیمن کے

تعلقاتِ چمن قطع کر رہی ہے صبا
قفس پہ گرتے ہیں تنکے مرے نشیمن کے

مٹا کے پھر جو بنانے پہ اب [illegible] قابو
وہ سر جھکائے کھڑے ہیں قریب مدفن کے

اس پر منحصر ہے دہر کی ہنگامہ آرائی
کوئی آزار کش کوئی غریب آزار ہوتا ہے

یہ ہے دارِ محن اس سے سکونِ دل کو کیا نسبت
کمی ہونے سے بےچینی کا نام آرام ہوتا ہے

خلوت کدۂ دل کا بھرم جائے گا اے شوق
آواز نہ دینا کہ یہاں کوئی نہیں ہے

ہاں پاس ہمارے بھی ہے اک حسن کا معیار
تم اتنے ہی پیارے ہو نظر جتنی حسیں ہے

تقدیر میں ناکامِ محبت کی ازل سے
آغاز ہی آغاز ہے انجام نہیں ہے

مرتا ہوں اس انداز پہ بے موت کہ جس میں
شیوہ تو اجل کا ہے اجل نام نہیں ہے

درد کا دل کے اثر نالۂ غماز میں ہے
کھا گیا چوٹ کھنک شیشہ کی آواز میں ہے

بن گئے سیکڑوں قصے مری خاموشی کے
اور جو راز کی تھی بات وہ پھر راز میں ہے

پھڑپھڑانے سے قفس ٹوٹتا جاتا ہے تو کیا
گھٹتی جاتی ہے جو طاقت پرِ پرواز میں ہے

میرے گونجے ہوئے نغموں کا اثر عالم میں
کچھ نہ ہونے پہ بھی اتنا ہے کہ ہر ساز میں ہے

تھک کے جب یاس پلٹی حد سے ٹکرا کر نگاہ
آئی آواز اُدھر آ چھپنے والا دل میں ہے

پرسشِ دل کے بعد بھی حالتِ دل ہے گو مگو
پھیر کے منہ وہ ہنس دیے اور کہا نہیں کہ ہے

ناتوانی نے کیا گم ترے دیوانے کو
اب تو زنجیر ہی زنجیر نظر آتی ہے

حسنِ بے پردہ کا پردہ ہے یہی نیرنگی
ہر جگہ اک نئی تصویر نظر آتی ہے

نشۂ مے مانگے کی چیز اسکی بھی کوئی ہستی ہے
کیفِ جوانی کیا کہنا مستی اپنی مستی ہے

ہیرا بھی ہے دل تو پتھر ہی ہیں قدر نہیں کچھ ہوتی ہے
ہاں پانی ہو کر بہ نکلے پھر جو قطرہ ہے موتی ہے

رکتا ہوں تو منزل کی تھکن دیتی ہے آواز
او ڈھونڈنے والے تجھے اپنا بھی پتا ہے

کیوں وادیٔ ایمن کے پھیرے کیوں طور کا آنا جانا ہے وہ شمع ہی دل ہی میں روشن جس شمع کا دل پروانہ ہے

اب دل ہی کو ہوش میں لے آئے یا اپنے ہوش بھی کھو بیٹھے دیوانے بنیں تو کام چلے دیوانہ کو سمجھانا ہے

شعلے کی لپک پر شک جو ہوا جسنے دیکھا اُسنے ٹوکا اے جلنے والے یہ تو بتا تو شمع ہے یا پروانہ ہے

کیسی اُلٹی دنیا ہی بسی ان شہر خموشاں والوں کی اندر اندر ہے آبادی باہر باہر ویرانہ ہے

الفت کا چھبیلا دل خود حسن کی ہے دنیا آئینہ جہاں ٹوٹا پھر آئینہ خانہ ہے

کشا کش میں حیات و موت کی ہوں سانس کیا ٹھہرے یہ بےچینی کی گھبراہٹ ہے آنا ہے نہ جانا ہے

جوانی ہے تو دل دیوانے پن سے بچ نہیں سکتا اثر اتنا ہی مہلک ہے سماں جتنا سہانا ہے

اسی شہر خموشاں میں جہاں چھایا ہے سناٹا کسی دن حشر جاگ اُٹھے گا وہ کہرام ہونا ہے

جذب نگاہ شعبدہ گر دیکھتے رہے دنیا انھیں کی تھی وہ جدھر دیکھتے رہے

تھا شوق دید تابع آداب بزم ناز یعنی بچا بچا کے نظر دیکھتے رہے

نکلی جو در ہلا کے قفس کا نسیم باغ تا دیر تول تول کے پر دیکھتے رہے

پردے کی جنبشوں میں بھی لہریں تھیں حسن کی جو دیکھنا تھا اہل نظر دیکھتے رہے

آنکھ جھپکی تیور آئے ہٹتے ہی چہرے سے زلف اللہ اللہ دھوپ اس بدلی کی کتنی تیز ہے

آگئی پیری جوانی ختم ہے صبح ہوتے ہی کہانی ختم ہے

لیتی ہوئی دستار کو بھی سر سے اُڑی ہے وہ گرد کہ جو اپنی ہی ٹھوکر سے اُڑی ہے

شب کو بھی میرے داغ سوزاں میں روشنی آفتاب کی سی ہے

نیند سے جاگتے ہیں چشم حسیں کھلتی کوپل گلاب کی سی ہے

دم بخود بیٹھ کے خود جیسے زباں کیلی ہے سانس کیا لوں کہ ہوا دہر کی زہریلی ہے

چمک بجلی کی کہتی ہے کہ ٹکرائے ہیں دو بادل وہی قصہ ہمارا ہے وہی اُنکی کہانی ہے

سُنا دینا مرا دُکھڑا اے نسیم آہ گر جانا یہ اک پیغام چھوٹا سا ہے اور وہ بھی زبانی ہے

دل کی بےچینی سے ماتھے پر پسینہ آئے ہے بس بس اے ساقی کہ اب تو جام چھلکا جائے ہے

اخفائے راز شان وفا امتحان صبر آج ایک خاموشی نے بڑے حق ادا کیے

ہنستے ہو اشک و آہ پہ یہ سوچتے نہیں کس کس طرح غریب نے مطلب ادا کیے

اسی چمن میں کہ وسعت ہے جس کی نامحدود نہیں پناہ کی جا ایک آشیاں کے لیے

واقعہ تو یہ ہے کہ لکھنؤ کے مستند اور باکمال شعرا میں سے اب رہا ہی کون ہے یہی آرزو۔ ثاقب اور صفی رہ گئے ہیں جو گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہیں۔ بس چراغِ سحری سمجھیے۔ باہر والوں نے تو لکھنؤ والوں کی وہ بعد کی ہے کہ لکھنؤ کا ذرہ ذرہ فریادی ہے۔ بزم لکھنؤ لکھنؤ والوں سے خالی اور سونی ہو چکی۔ جو بچے ہیں وہ اپنے آپ کو لکھنؤ والا کہتے شرماتے ہیں کیونکہ باہر سے آنے والوں نے تو محفل کا رنگ ہی بگاڑ دیا۔ لکھنؤ میں آ کر لکھنؤ کی مذمت ہوتی ہے۔ لیکن یہاں والے چپ ہیں۔ خاموش ہیں ان کا جی کڑھتا ہے۔ بے قدریوں سے دل پھنکتا ہے۔ قدرداں اٹھ چکے ہیں۔ ان کی باتیں سمجھنے والے رہے نہیں۔ غیروں کے سامنے وہ کیا زبان کھولیں کیا بات کریں۔ گونگے ہیں نہ منھ سے بولتے ہیں نہ سر سے کھیلتے ہیں۔ مشاعروں میں شرکت ترک کر دی ہے۔ گھر سے نکلنا بند کر دیا ہے۔ افلاس میں مبتلا ہیں، ناداری میں گرفتار ہیں نہ اب اگلے سے مشاعرے رہے نہ پچھلی سی صحبتیں رہیں۔ اب تو مشاعروں میں قوالوں کی محفلیں لگتی ہیں۔ علم موسیقی کی راگ راگنیاں چھیڑی جاتی ہیں۔ گلے بازی کے جوہر دکھائے جاتے ہیں۔ بھلا ایسی محفلوں ایسی صحبتوں میں بوڑھے پرانے لوگوں کا کیا کام؟ شاعری بچوں کا کھیل ہو گئی ہے جس نے دو حرف سیکھ لیے وہ شاعر بن بیٹھا۔

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

یہ اپنی عزت لیے بیٹھے ہیں اور اس وقت کے منتظر ہیں جس کا ہر دنیا میں آنے والا آخری عمر میں انتظار کرتا ہے۔

نالۂ بسمل

(جناب مولوی سید امین الحسن رضوی صاحب بسمل موہانی سشن جج حیدرآباد)

نمودِ حسن کی بے پردگی حجاب میں ہے
یہ کس طرح کا فسوں عالمِ شباب میں ہے

نگہ نواز بھی ہے شوق آفریں بھی ہے
غضب کی جلوہ نمائی ترے نقاب میں ہے

سرور ملتا ہے جو چشمِ مست ساقی سے
اُسی کا پرتو سحر آفریں شراب میں ہے

یہ دل اگرچہ مرا ہے مری نہیں سنتا
جنابِ شیخ کی تلقین کس حساب میں ہے

ادائیں غور دہیں فدا پیارے سونے والے پر
جگا کے عشق و محبت کو حسن خواب میں ہے

بے حیا ندی میں تلاطم جو دل کی دنیا میں
نقاب اُلٹے ہوئے کوئی ماہتاب میں ہے

کہاں کا طور کہ اب تو نگاہِ بسمل کی
بھنسی ہوئی ترے جلووں کے آب و تاب میں ہے

تاریخ انتقال علامہ چودھری شیخ ممتاز حسین صاحب عثمانی مدیر اودھ پنچ

(جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی)

دل ہے کہ سنبھالے سے سنبھلتا ہی نہیں ہے
آشفتہ وہ پیوست ہے نشتر رگ جاں میں

کیا کیا نہیں مانگی ہیں دعاؤں پہ دعائیں
دیدے مرے اللہ اثر میری زباں میں

مالک مرے سن لے مرا ممتاز سنبھل جائے
لیکن نہ دعاؤں میں اثر تھا نہ فغاں میں

اے دست اجل تو نے بجھا کر اسے چھوڑا
جو شمع کہ لو دے رہی تھی بزم جہاں میں

دنیائے ادب آج ہے اجڑی ہوئی دنیا
سادے نظر آتے ہیں ورق علم بیاں میں

اجمال کو تفصیل سے آئینہ بنا دے
یہ زور ہے اب کس کے قلم کس کے بیاں میں

واللہ لرزتے تھے قلم خوف سے تیرے
پاتے تھے نہ دم اہل زباں اپنی زباں میں

تا دل کے پردوں میں نہ چھپتی تھی حقیقت
ڈوبی ہوئی نظریں تھیں تری راز نہاں میں

چن لیتی تھیں نقطے وہی نقاد نگاہیں
دبتے ہے جو ہوتے تھے نہاں طرز بیاں میں

ہر علم میں تھا منزل تحقیق کا مالک
ایسے متبحر کہیں ہوتے ہیں جہاں میں

جو نقطۂ علمی نہ جماعت سے ہوئے حل
پانی نظر آتے تھے ترے حسن بیاں میں

دیتی تھی تری عقل وہاں درس سیاست
پھنس جاتے تھے ذی ہوش جہاں سود و زیاں میں

تھی ذات تری مرکز اوصاف و کمالات
سو درد کے پہلو ہیں تری ایک فغاں میں

ہر جادۂ تحقیق تری راہ گذر تھا
آتی نہیں تمثال کوئی وہم و گماں میں

نازاں تھی ظرافت ترے انداز قلم پر
تہذیب پھڑکتی تھی وہ شوخی تھی بیاں میں

ہر نقد ظرافت پہ پھڑک جاتی تھی فطرت
اک کیف سا تھا تیری نہیں میں تری ہاں میں

پھرتی ہیں تڑپتی ہوئی مایوس نگاہیں
تجھ سا نظر آتا جو نہیں کون و مکاں میں

اف اف تری خودداری انداز کے انداز
رہتی تھی اسی بات پہ ان بن دل و جاں میں

بن بن کے ترے آتش فرقت سے بگولے
پھرتے ہیں مرے دیدۂ خوں نابہ فشاں میں

اب درد و الم بن کے ابھر آئے ہیں چھالے
اک ٹیس سی اٹھتی ہے مرے سوز نہاں میں

تاریخ اب آشفتہ سنائے بدل (یاس)
ممتاز حسین آج گئے قصر جناں میں
۱۳۵۵ھ

قرض

(جناب مولوی محمد اسحاق صاحب مائل انصاری خیرآبادی)

(۱)

قرض! اے دشمن آرام و بنائے آلام — بیٹھے بیٹھے مجھے جس وقت تو یاد آتا ہے
سوچتا ہوں ہوئی برباد حیات ناکام — ایک کانٹا سا مرے دل میں کھٹک جاتا ہے

(۲)

تیری خاطر ہوئی برباد مری آزادی — خوب انداز عروسانہ سے تو پاس آیا
میں یہ سمجھا کہ ہوئی گھر کی مرے آبادی — لیکن افسوس کسی طرح نہ تو راس آیا

(۳)

دوست دشمن ہوں تری ذات سے اے خانہ خراب — دو دلوں میں بڑھے ہر وقت کدورت تجھ سے
سنگدل ہونے میں لاریب نہیں تیرا جواب — دور رہتی ہے بہت بوئے محبت تجھ سے

(۴)

آبرو تجھ سے نہ محفوظ نہ خودداری ہی — ہمدیا طل کی بھی واللہ نہیں مد تجھ سے
خاک میں جاتی ہیں مل غیرتیں انسانوں کی — کیا کریں سیکھ ہی جاتے ہیں خوشامد تجھ سے

(۵)

گھر سے مقروض کا ہے آہ نکلنا بھی محال — گویا باہر کی فضا کاٹے اسے کھاتی ہے
دل خراش اور جگر سوز جو ہے تیرا خیال — دھیان آتے ہی ترا روح لرز جاتی ہے

(۶)

شاہد خواب سے مقروض کو حاصل نہیں وصل — چونک پڑتا ہے وہ بیچارہ سدا راتوں کو
کس طرح سود میں دوں کیسے ادا ہو زر اصل — سوچتا رہتا ہے دن رات انھیں باتوں کو

فوراً آکر مجھ سے مخفی طور پر کہا کہ ایک شخص مع اپنی عورت و لڑکے کے چور کھڑکی پر کھڑا ہے اور کسی خفیہ امر کے اظہار کے لیے طالب ملاقات ہے۔ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ میں نے چاروں طرف مخبر لگا رکھے تھے اس وقت مجھ کو یہی خیال گذرا کہ انھیں میں سے وہ ہوں گے میں نے فوراً اُن کو بلا لیا اور علیحدہ کھڑے ہو کر خفیہ طور پر اُن سے کچھ پوچھا تھا کہ دفعتاً بھید اُن کا ظاہر ہوگیا کہ درحقیقت اس بھیس میں ہمارے دوست صادق کپتان الگزنڈر صاحب اور اُن کی میم اور مس بابا ہیں۔ مجھ کو اُس وقت اُن کی مصیبت زدہ حالت دیکھ کر سخت صدمہ ہوا۔ اُن تینوں کو دو روز کا فاقہ تھا۔ اور ہر ایک کا لباس نہایت میلا اور دریدہ مثل ایک غریب کسان اور اُس کے خاندان کے تھا پیروں میں کسی کے جوتہ نہ تھا۔ بوسیدہ چیتھڑوں سے بندھے تھے اور رنگت بھی اُن کے چہرہ ہاتھوں و پیروں کی گرد و غبار و یا اور کسی مصنوعی طریقہ سے مائل بسیاہی تھی اور جسم پر جابجا خراش اور خفیف زخموں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رات کے اندھیرے میں دریا کے کھڈوں یعنے نشیب و فراز راستہ پر نادانستہ گر گرا اور تیز جھاڑیوں میں مجبوراً گھس کر یہ حالت اُن کے جسموں کی ہوگئی۔ میں نے اُس وقت کچھ دریافت حال اُن سے کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ اُس کا اثر اُن کے مصیبت زدہ دلوں پر نمک بر جراحت ہوگا۔ بہرحال میں نے اپنے معزز مہمانوں کی دلجوئی اور مہمانداری اور اُن کے آرام و آسائش اور حفاظت میں جہاں تک ممکن ہوا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ فوراً میں نے میم صاحبہ و مس بابا کو اپنی نیک بی بی کے مکانات زنان خانہ میں جو اندر قلعہ کے نہایت وسیع اور ہوادار تھے بھجوا کر بعد تاکید خدمت گذاری اُنکے کے صاحب کے پاس آکر اُن کو اچھی طرح سے غسل دلوایا اور کوٹ و پائجامہ اپنا جو دو ایک جوڑے سیر و شکار کے لیے اس قسم کے نیم انگریزی طیار رہا کرتے تھے ایک جوڑا حسب پسند صاحب موصوف مع جوتہ انگریزی کے اُن کو پہنایا اور اسی طرح پر میم صاحبہ و مس بابا کی بھی خدمت گذاری میری بی بی نے زنان خانہ میں بعد غسل دلانے کے کپڑا وغیرہ پہنانے میں ہر ایک کی کی۔ مگر کوئی زنانہ پوشاک انگریزی نہ تھی اسلیے میری بی بی نے اپنے ہندوستانی کپڑوں میں سے حسب پسند میم صاحبہ کے ایک جوڑا نہایت صاف و سادہ اُنکو پہنایا کہ وہ بھی اپنی قطع پر چنداں ناموزوں نہ تھا۔ اور مس بابا کی بھی تبدیل لباس کا انتظام اُنکے ہم عمر بچوں کے لباس سے جو ایک معزز ملازمہ کے تھے کر دیا۔ بعد فراغت طعام کے اُن کے آرام کے لیے ایک کمرہ وسیع و ہوادار میں کوچ و پلنگ و آرام کرسیاں عمدہ و نفیس مع فرش و بچھونوں کے لگا دی گئی تھیں۔ مگر افسوس کہ وہ موقع زیادہ ٹھہرنے کا نہ تھا۔ صاحب نے فرمایا کہ جہاں تک جلد ممکن ہو ہم لوگوں کو فوراً یہاں سے روانہ کروا دیا جاوے کر کپتان بردن صاحب ڈپٹی کمشنر سے آگرہ کے راستہ پر

ملنا چاہیے ورنہ پھر یہاں سے بچ کر نکلنا مشکل بلکہ غیر ممکن ہوگا۔ اور زیادہ تر عجلت اور گھبراہٹ اس
وجہ سے بھی تھی کہ باغیان افواج جھانسی جنھوں نے سخت بیرحمی کا برتاؤ قتل افسران اپنے و نیز دیگر
حکام انگریزی جلیل القدر سے کیا تھا ایک جمعیت کثیر کے ساتھ جالون ہوکر عنقریب کانپور جانے والے
تھے اور خبر آمد آمد اُنکی کی گرم تھی لہذا میں بھی ہراساں اُن کا ہوکر تہیہ سفر اُنکے میں مصروف ہوا۔ اول اُن سے
یہ کہا کہ آپ لوگوں کو کئی راتیں جاگتے ہوئے گذری ہونگی پانچ چھ گھنٹے یہاں بہ آرام و اطمینان تمام
سوکر ماندگی راستہ کی رفع کیجیے۔ میں اس عرصہ میں انتظام سواری وغیرہ کا کرکے چار بجے صبح کو جگا دونگا
اُس وقت اندھیرے میں باہر نکل جانے کا موقع بہت اچھا ہوگا۔ یہ کہہ کر میں کچہری کے مکان میں چلا گیا۔
یہاں آکر باورچی کو واسطے تیاری ناشتہ کے سخت تاکید کی اور مسٹر منگر صاحب نائب تحصیلدار اپنے کو جو
جنرل منگر صاحب کے خاندان میں ایک ہندوستانی عورت کے بطن سے تھے بلا کر گھوڑا اُن کا جو نہایت
مضبوط و شائستہ تھا صاحب کے لیے اور اطلاقی نویس تحصیل کا ایک عمدہ و خوبصورت میانہ جو بہت کشادہ و
ل پالکی کے سایہ دار تھا میم صاحبہ و [illegible] بابا کے لیے اُن کے مکانوں سے کہ قلعہ کے اندر تھے منگا کر
طیار رکھا۔ کہاروں کے اکٹھا کرنے میں البتہ کسی قدر دقت ہوئی مگر بعدہ اس طرح باسانی رفع ہوگئی
یعنے چار نفر کہار جو عدالتہاے دیوانی و فوجداری میں ٹٹی ہاے خس کی آبپاشی پر نوکر تھے لے لیے گئے اور
چھ نفر کہار ٹھاکران اندرون قلعہ سے مانگ لیے گئے اور انھوں نے بپاس خاطر میرے انکے دینے میں کچھ عذر
نہیں کیا بلکہ دس نفر ٹھاکران جوان شائستہ مسلح خود ہمراہ جانے پر آمادہ ہوگئے۔ علاوہ اُنکے دس نفر
چپراسیان تحصیل واسی قدر بر تعداد ازان تھانہ کو بلا تحتی ولیم داری جمعدار تحصیل قوم فرانسیسی از خاندان
اسکنر صاحب کے جس کی بہادری و وفاداری پر مجھ کو ہر طرح کا بھروسہ تھا مع ضروری ہتھیاروں کے موقع
پر موجود رکھا۔ اور ناشتہ دان کو عمدہ و خشک کھانوں سے اس قدر بھر کر کہ تین چار روز تک لیے کافی ہو
منجملہ ہمراہیان کے ملنگ خاں چپراسی کے حوالہ کر دیا جس کو سلیقہ خدمتگاری کا بھی کسی قدر تھا۔ اور ہمیں
عین وقت مقررہ پر اُن تینوں معزز مہمانوں کو جگا کر حسب تجویز بالا گھوڑے و میانہ پر ہر ایک کو سوار
کرکے مع اُس کل جمعیت مسلح مذکورہ بالا کے باہر بہ ناکے لے گیا اور احتیاطاً خود بھی اپنے گھوڑے
پر مسلح سوار ہوکر اُس وقت تک اُن کے ساتھ رہا جب تک کہ کل خطرناک راستہ وہ سب طے کرکے بے خطر
راہ پر نہ پہونچ گئے اور یہ جملہ کارروائی مع واپسی میرے کے اندھیرے ہی اندھیرے میں بفضلہ تعالیٰ
ایسی انجام پائی کہ اُس وقت تک کانوں کان کسی کو کچھ خبر نہ ہوئی اور امن و امان کے ساتھ وہ سب چلے
گئے بعد ازاں دن شہرت اس کی تمام پھیل گئی مگر بجز کف افسوس ملنے اور مجھ پر غبار کھانے کے مخالفین کو

اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ البتہ شام کو چار بجے کے وقت ایک نئی بات اُن کی جانب سے یہ ہوئی کہ بناک راؤ
جس مردود اور نمک حرام کا ذکر اوپر ہو چکا ہے مع ایک لفافہ سربمہر مرسلہ راجہ کے میرے پاس آیا اور
نہایت فخر و مسرت کے ساتھ طالب جواب اُسکے کا ہوا۔ میں نے اُسے کھول کر دیکھا تو اُس میں ایک
حکم تحریری دستخطی راجہ ملعون ملفوف تھا جس کا مضمون یہ تھا کہ آج کی تاریخ سے تمام علاقہ میں عملداری
نانہا صاحب پیشوا کی بجائے انگریزوں کے جن کا قلع قمع پوری طور پر ہر جگہ ہو گیا ہے پیشور کی دیا سے
ہو گئی ہے اور اعلان اس کا بذریعہ منادی کل علاقہ میں ہو گیا ہے۔ لہذا آپ کو چاہیے کہ اپنے دل سے
خیال ملازمت انگریزوں کا دور کر کے پیشوا صاحب کا نوکر اپنے کو سمجھیے اور چونکہ پیشوا صاحب نے اس
علاقہ کا صوبہ مجھ کو مقرر کیا ہے اس لیے آپ زیر حکم و ہدایت میری کے انتظام قلعہ اور کل علاقہ اپنے کا
کریں اور زر تحویل سرکاری جو کچھ خزانہ تحصیل میں ہو وہ حوالہ خزانچی ہمراہی لشکر ہمارے کے بعد سمجھانے
حساب کے کر دیں۔ بناک راؤ وکیل سرکار واسطے پیروی مقدمات و نگرانی کام ہر صیغہ کے مقرر ہوا ہے
اُس کا دورہ تمام ضلع میں رہا کرے گا۔ میں یہ سُن کر مارے غصہ کے آگ بگولہ ہو گیا کہ یا الٰہی جو لوگ
پہلے میری اطاعت و فرماں برداری میں سرنگوں رہتے تھے وہ دفعتاً ایسے سرکش ہو کر یوں حکومت اپنی
جتاتے ہیں۔ اور اسی حالت غیظ و غضب میں اُس کاغذ کو پھاڑ کر اُس مردود کے منھ پر پھینک دیا۔
تراب علی تھانہ دار نے یہ حال دیکھ کر برقندازوں کو اشارہ کیا کہ اُنھوں نے خوب ہی مرمت اُس کی
ڈنڈوں و جوتوں سے کی اور پھر دونوں کان اُس کے کھینچ کر ایسا مروڑا کہ نیم جان ہو گیا۔ آخرش باہر
پھاٹک کے گھسیٹ کر لے گئے اور خندق میں پھینک کر چلے آئے۔ صبح کو غالباً ہوش میں آ کر تمام اس
واقعہ کو راجہ صاحب سے اُس نے بیان کیا کہ اُسی وقت سے لڑائی شروع ہو گئی۔ قبل اس کے یہ لکھنا
مناسب ہے کہ منجملہ سپاہیان باغی نمبر ۱۵ متعینہ مقام اورئی کچھ تو کپتان الگزنڈر صاحب کمان افسر
اپنے کو قید کیے ہوئے کانپور لیے جاتے تھے کہ وہ اثنائے راہ میں مقام کالپی سے بھاگ کر جیسا کہ اوپر
لکھا گیا ہے قلعہ جالون میں پناہ گزین ہوئے تھے باقی حصہ کثیر اُن کا راجہ نے لوبھ ملازمت کی لالچ دے کر
یا اپنا اقتدار دربار پیشوا (؟) میں ظاہر کر کے روک لیا تھا کہ وہ سب بشرکت سپاہیان راجہ کے
قلعہ کو گھیرے ہوئے اُن کے حکم کے منتظر تھے۔ گو جمعیت راجہ کی قریب قریب المضاعف کے ہو گئی
تھی مگر توپیں صرف دو یا تین ضرب ہندوستانی وضع کی بنی ہوئی تھیں کہ وہ ہمراہ اپنے گڑھ سرائے سے
لایا تھا۔ بہرحال اس جنگ کے چھڑ جانے سے گو دن رات توپوں اور بندوقوں کی آواز آیا کرتی تھی
مگر قلعہ میں کسی کو کچھ نقصان نہیں پہونچتا تھا۔ بجز اس کے کہ توپوں کے گولے قلعہ کی دیوار کے خام میں

گھس گھس کر سرد ہو جاتے تھے۔ اور ایسا ہی حال بندوقوں کی گولیوں کا بھی تھا۔ اور کچھ نتیجہ اس کا نہیں نکلتا تھا برخلاف اس کے ادھر کے نشانہ بازوں کی ضربات گولی سے جو فصیلوں پر بیٹھے تھے دس بارہ آدمی غنیم ہی کے ہلاک ہوتے تھے۔ اسی حالت جنگ میں تیسرے روز چند عملہ ہائے دیوانی و تحصیل (جو قلعہ میں حسب تحریر بالا رہا کرتے تھے) میرے پاس آکر براہ ہمدردی مشورہ کے طور پر کہنے لگے کہ گو بصورت موجودہ آپ کو ہر طرح کا اطمینان ہے اور واقعی آپ کے حسن انتظام سے جو حالت قلعہ کی ہے اُس پر کچھ قابو راجہ کا نہیں چل سکتا مگر جھانسی کی فوج باغیان کا کیا علاج ہے جو جمعیت کثیر مع سامان حرب و ادوات قلعہ شکن عنقریب بقصد کانپور یہاں آنے والی ہے اُس وقت کچھ بندوبست آپ کا کام نہیں رہے گا اور دم کے دم میں وہ قلعہ میں گھس کر باعث خرابی و فضیحتی آپ کے اور آپ کے خاندان کے ہوں گے۔ بہتر ہے کہ آپ اس وقت راجہ سے صلح کر لیجئے بعد انتظام گھر کے لوگوں کے آپ کو اختیار ہے کہ جو کچھ مزاج میں آوے کیجئے۔ میں نے اُن کے مشورہ کے جواب میں یہ کہا کہ صلح کے معنی یہ ہیں کہ میں حسب تحریر راجہ قلعہ پر اُس کو دخل دیدوں اور جو دس بارہ ہزار روپیہ خزانہ میں موجود ہے وہ خزانچی ہمراہ راجہ کے حوالہ کردوں اور عملداری نانا مردود کی تسلیم کر کے بطور نوکران اُسکے کے حسب ہدایت راجہ کا کام کروں سو یہ ذلت اپنی اور اپنے آقا کے ساتھ نمک حرامی ہرگز ہرگز مجھ سے نہ ہوگا چاہے جو کچھ میرے اور میرے خاندان کے ساتھ ہو۔ اور اسی عقیدے پر قائم رہنا صرف میرا ہی نہیں بلکہ کل مسلمانوں کا مذہبی اصول یہی ہے اور برخلاف اس کے داخل نافرمانی حکم خدا و رسول ہے جو بدتر از کفر ہے۔ میں اُسی خداوند کریم کے بھروسہ پر یہاں بیٹھا ہوں وہی میری ناموس کا محافظ ہے۔ اس تقریر میری سے وہ سب قائل ہو کر خاموش ہو رہے اور پھر صلاح مشورہ مجھ کو نہیں دیا۔ مگر میں نے منشا اُن کا پاکر عیالداران کو عام اس سے کہ وہ عمال و یا سپاہیان میں سے ہوں قلعہ چھوڑ کر باہر نکل جانے کی اجازت دیدی کہ وہ سب اسکلے روز بستی میں مع متعلقین اپنے کے اُٹھ گئے۔ راجہ کو اس تین چار روز کی جنگ میں جب کامیابی نہ ہوئی اور وہ سمجھا کہ میری موجودگی میں کچھ بس اُسکا نہ چلے گا تو ایک مضبوط سپاہی کو جس کی دلیری و ہمت پر اُس کو ہر طرح کا اطمینان تھا میرے قتل پر آمادہ کیا۔ وہ نہ معلوم کس وقت چہار دیواری سے خفیہ طور پر آکر قلعہ میں کہیں چھپ کر موقع کا منتظر رہا۔ چار بجے شام کو کچہری کے بعد حسب عادت اپنے رفع حاجت کے لیے میں اوپر گیا تو بعد فراغ لوٹتے ہوئے ایک گراں ڈیل شخص کو برہنہ تلوار کھینچے ہو زینہ کے بالائی دروازہ پر دیکھا۔ اُس وقت ایک پیر اُس کا آخری زینہ پر اور دوسرا چھت پر تھا اور وہ چاہتا تھا کہ وہاں سے جھپٹ کر مجھ پر حملہ کرے اُس وقت خداوند کریم حافظ حقیقی نے ایسی جرأت مجھ کو

دی کہ ایک لات میں نے اُس کو اس زور سے ماری کہ وہ مع تلوار اپنی کے اُلٹا قلابازی کھاتا ہوا گرا اور نیچے تک پہونچتے پہونچتے کہ سیڑھیاں بہت تھیں ادھ مرا ہو گیا اور تلوار اُس کی ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی چند برقنداز ان تھا نہ اُس وقت وہاں کھڑے تھے اُنھوں نے یہ حال دیکھ کر اس قدر اُس کو مارا کہ روح اُس کی پرواز کر گئی آخرش نعش اُس کی گھسیٹ کر خندق میں پھینک دی گئی۔ اس واقعہ نے اور بھی راجہ کے آتش غضب کو بھڑکا دیا مگر کیا کر سکتا تھا دانت پیس کر رہ گیا۔ گو وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میرا یہ زور و شور چند روزہ ہے جھانسی کی فوج آنے پر وہ بالکل ٹھنڈا ہو جاوے گا اور فوج مذکورہ اُس پر قابض ہو جاوے گی تاہم وہ اپنی ناموری و سُرخ روئی دربار نانا میں اسی بات پر سمجھتا تھا کہ قلعہ اُس کے نام سے فتح ہو اور سہرا فتحیابی کا اُس کے سر پر باندھے۔ ادھر تائی بائی صاحبہ اصل رئیسہ جالون بھی ناٹلی تھیں۔ بلی کی طرح داؤ لگائے ہوئے ریاست کے بازیافت میں دیکھی ہوئی وقت کی منتظر بیٹھی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خود نانا اور اس کی ہم قوم (دکھنی پنڈت) ریاستوں کو یہ خبط سمایا ہوا تھا کہ اب برٹش عملداری ہمیشہ کیلیے اُٹھ گئی ہے اس وقت جو کچھ جس طور سے جس کے ہاتھ لگے حاصل کرنا چاہیے خواہ جان تک کام آ جاوے اور اسی وجہ سے راجہ بھی اس بات پر اڑا ہوا تھا اور سو سو تدبیریں کر رہا تھا کہ میں ہی اس قلعہ کو قبل از ورود فوج جھانسی کے فتح کر دوں تاکہ یہ کل علاقہ مفتوحہ میرا متصور ہو کر حق حکومت کا حاصل ہو۔ میں ازادانہ یہ بھی کہوں گا کہ اُس وقت کے انقلابات عظیم نے جو ہر چہار جانب دور دور پھیلا ہوا تھا نہ صرف نانا اور اُس کی ہم قوم کو خبط مذکورہ میں ڈال رکھا تھا بلکہ بہت سے عقلا و دور اندیشاں بھی جنھیں پولٹکل معاملات میں پورا پورا ادراک تھا اگر کلیتاً نہیں تاہم اُس خبط سے بالکل خالی نہ تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمیشہ کے لیے نہیں مگر ایک مدت دراز تک اُٹھ جانے عملداری کا میرے بھی خیال میں تھا۔ میں نے جو کچھ کیا وہ کسی امید آئندہ کی بہبودی کے لیے نہیں کیا بلکہ اپنی نظرتی نیک دلی سے مصیبت زدگاں کی ہمدردی کی اور اپنے آقا کا حق نمک جاں بکف ہو کر بے غرضانہ ادا کیا۔ آخرش وہ ہولناک وقت آ پہونچا جس کا پہلے سے مجھ کو اندیشہ تھا یعنے بیشمار باغیان افواج جھانسی نے مع بھاری توپ خانوں و دیگر کثیر سامان حرب کے یہاں پہونچ کر ایک وسیع میدان سایہ دار میں کیمپ اپنا تھوڑے فاصلہ پر علیحدہ قائم کیا اور کل محاصرین قلعہ مع راجہ اور سپاہیان اُس کے اور نیز سپاہیان باغی رجمنٹ نمبر ۵۳ کے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ راجہ نے اپنی مدد کے لیے اُن کو روک رکھا تھا کیمپ مذکورہ میں جا کر شریک اُن کے ہو گئے۔ اور بہ اظہار کل حالات میرے کے اُن کو میری طرف سے ایسا برہم کیا کہ وہ مارے غصہ کے آگ ہو کر مع کسی قدر فوج و بھاری توپوں کے ہمراہ مخالفین مذکورہ کے بجانب قلعہ روانہ ہوئے۔ یہاں

آتے ہی اُنھوں نے پھاٹک کو ضربات اتواب قلعہ شکن سے گرا کر اندر گھس آئے۔ تراب علی تھانہ دار کھڑا تھا اُس کو
فوراً حسب اشارہ بناک راؤ کے (جس کے کان اُس نے بر قند از ان سے پکڑوا کر دوڑایا تھا) قتل کیا۔ اور
پھر مجھ پر حملہ آور ہو کر زمین پر گرا دیا اور کل ہتھیار چھین کر قید کر لیا اور مشکیں کس کر روبروے افسر اعلےٰ
اپنے کے کھڑا کیا۔ اُس ملعون نے غصہ میں دانت پیس کر شیر کی طرح غرّا کر کہا کہ اے کمبخت تو نے
یہ کیا غضب کیا کہ کل فوج کو جو اپنے دین و ایمان پر سینہ سپر ہے اُس لکھوکھا روپیہ کی لوٹ مار سے
محروم رکھا جو خزانہ صدر میں تھا۔ اور نیز ہم لوگوں کی ناموری و عزت افزائی کا خون کیا جو ہم سب کو
بڑے بڑے جلیل القدر انگریزوں کے حوالے پیش کرنے سے دربار نانا صاحب پیشوا میں حاصل ہوتی
اس کا جواب میں نے نہایت استقلال کے ساتھ یہ دیا کہ میں نے کوئی امر خلاف مذہب و حکم خدا کے
نہیں کیا بلکہ اپنا فرض منصبی ادا کرنے میں یہ سب باتیں میں نے کیں جن کا الزام ناحق مجھ پر رکھتے ہو اور
تم سب بھی یہی کرتے جو میں نے کیا ہے اگر بدقسمتی سے باغی نہ ہوتے۔ بدقسمتی کے لفظ پر وہ بہت خفا
ہوا اور ناناجی سے مخاطب ہو کر کہا کہ اس کا قصور اس درجہ کا نہیں ہے کہ صرف قتل پر اکتفا کیا جاوے
بلکہ یہ اس قابل ہے کہ نانا کے روبرو سب کی عوض میں پیش کیا جاوے اور بعد سخت تکلیف جسمانی کے
اپنے کیے کا پھل پاوے۔ میں چپکا یہ سب سنا کیا مگر جب میں نے یہ دیکھا کہ چند افسران مع ایک غول
سپاہیان کے زنانخانہ کی طرف جا رہے ہیں تو میں نہایت مضطر و بیقرار ہوا اور اُسی حالت میں چلّا کر
میں نے کہا کہ اُس میں مستورات میری ہیں اُن کی بے پردگی نہ ہونے پاوے۔ اُدھر حاجی دولت ایک پرانا
ملازم میرے باپ کے وقت کا جو کہ میری دادی کے ہمراہ حج بیت اللہ شریف بھی کر آیا تھا زنانی ڈیوڑھی پر
کھڑا تھا اُس نے آگے بڑھ کر خوشامد درآمد اُن کی بے حد کی۔ اُس بزرگ صورت کی خوشامد نے اُن کے
دلوں کو کسی قدر نرم کیا اور شاید میرے چلّانے کا بھی کچھ اثر ہوا کہ آخرش یہ امر قرار پایا کہ کل زیور
طلائی و نقرئی جو گھر میں علیحدہ رکھا ہو یا عورتیں پہنے ہوں وہ سب اپنا اپنا اکٹھا کر کے ایک صندوق
کے اندر باہر چبوترہ پر جہاں وہ کھڑے تھے رکھ دیا جاوے۔ اور پھر عورتیں چادر اوڑھ کر ایک گوشہ
میں باہر بیٹھ جاویں اور کل مکانات مع جملہ سامان کے سپاہیان کی لوٹ کے لیے چھوڑ دیا جاوے۔ چنانچہ
اس طریقہ پر اُن ظالموں نے سوائے اُن کپڑوں کے جو جسم پر تھے اور کل مال از قسم زیورات و پارچہ ہائے
قیمتی از آں میرے اور میری بیوی کے جن میں اُن کے جہیز کا مال بہت بقایا تھا چند راسان گھوڑہائے
بیش قیمت و گاڑیاں نفیس کے جو میرے اصطبل میں تھے اور جن کا شوق مجھے از حد تھا لوٹ کر اپنے کیمپ میں
لے گئے۔ اور توپ خانہ کی گاڑیوں پر مستورات چادر پوش کو مع حاجی دولت کے بٹھا کر نہایت ذلت کے

ساتھ سپاہیان کی حراست میں لے گئے۔ اور میری مشکیں کس کر ایک مسلح گارڈ کے حلقہ میں تمام شہر کے اندر گھماتے ہوئے اپنے کیمپ میں لے جا کر ایک چھوٹی سی پرانی راؤٹی میں (جس کے اندر چودہ پندرہ قیدی پہلے سے نہایت تکلیف کے ساتھ قید تھے اور ایک تل تک دھرنے کی گنجائش نہ تھی) ٹھونس دیا اور باہر اُس کے پانچ چھ قدم کے فاصلہ پر میرے گھر کے لوگوں کی بھی گاڑی بحراست سپاہیان کھڑی کر دی گئی اور راؤٹی پر ڈبل پہرا مقرر کر دیا۔ منجملہ اُن قیدیان کے جو پہلے سے اُس راؤٹی میں مقید تھے چھ مرد اور آٹھ عورتیں و بچے تھے۔ مردوں میں دو انگریز ڈپٹی کلکٹران (مسٹر گریفتھ صاحب و جارج پیانہا صاحب) اور ایک یورپین سول سرجن جن کا نام یاد نہیں) ضلع ہذا کے مع میم و بچوں اپنے کے تھے۔ باقی چار مردوں کو جو بظاہر یورپین معلوم ہوتے تھے میں نہیں جانتا کہ وہ کون اور کس ضلع کے تھے۔ مسٹر گریفتھ صاحب و پیانہا صاحب جن کی شکلیں ہندوستانیوں سے ملتی جلتی تھیں انگریزی لباس میں نہ تھے۔ اُن میں سے پیانہا صاحب جن کی عمر ۵۰ برس سے کچھ زیادہ ہو گی بوجہ قدامت و حسن اخلاق اپنے ہر دلعزیز تھے اُن کے بیان سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مع گریفتھ صاحب کے ہندوستانی کپڑے پہن کر اسی ضلع میں کسی زمیندار کے مکان میں جو پہلے سے اُن کا دوست تھا چھپے ہوئے تھے کہ باغیان فوج جھانسی نے اثنا راہ جھانسی و جالون میں پتہ اُن کا لگا کر یا کسی شریر النفس مخبر کی اطلاع پر انھیں گرفتار کر لیا تھا۔ اور ایسا ہی دیگر صاحبان بھی اپنی اپنی گرفتاری مختلف طور و واقعات کے ساتھ بیان کرتے تھے جو اب اتنی مدت کے بعد مجھے یاد نہیں۔ راؤٹی میں بجز اُس مقام کے جہاں بانس کھڑا تھا چاروں طرف سر تک اُٹھانے کی گنجائش نہ تھی اور قیدیوں کی کشمکش سے گویا شکنجہ میں ہر ایک کسا ہوا تھا۔ ہندوستان میں بندیلکھنڈ کی لوٗ دھوپ مشہور ہے خصوص مہینہ مئی و جون کے نصف النہار میں جو حالت شدت اُس کی ہوتی ہے وہ بھی اظہر من الشمس ہے اور اُس پر آفت یہ کہ راؤٹی مذکورہ کسی درخت کے زیر سایہ بھی نہ تھی۔ تمام دن مثل تنور کے گرم رہتی تھی۔ اور رات کو احتباس ہوا و کثرت قیدیان سے کہ سانس تک لینا مشکل تھا ایک دوسرے پر لدا ہوا تھا بلیک ہول اگر کہا جائے تو بجا نہیں ہے مگر حیات باقی تھی کہ بچ گئے۔ دو روز تک اسی حالت مصیبت میں کہ زندگی وبال ہو گئی تھی بدشواری تمام کٹے تیسرے روز قریب چار بجے شام کے ایک غول سپاہیان مسلح نے جس میں دس پندرہ نفر سے زیادہ تھے قریب راؤٹی کے میرا نام لے کر پکارنا شروع کیا کہ ان میں عنایت حسین نامی جو کوئی ہو باہر نکل آوے۔ میں خوش ہوا کہ اب وقت موت کا جو اس زندگی سے بدرجہا بہتر ہے آ گیا ہے اور کلمہ طیب پڑھتا ہوا باہر نکلا تو برخلاف توقع کے انھوں نے بعد سلام علیک کے نہایت اخلاق کے ساتھ مجھ سے مصافحہ

گیا اور بعض اُن میں سے بغلگیر ہو کر میری مصیبت پر آبدیدہ ہوئے اور بکمال ہمدردی کے کہا کہ اب آپ ہمارے ڈیروں میں چل کر بہ آرام تمام رہیے کسی کی مجال نہیں ہے کہ کوئی آپ پر ٹیڑھی نگاہ تک ڈالے۔ میں نے کہا کہ تم لوگ آگے بڑھو میں اپنے گھر کے لوگوں کو کہ نہایت پریشان ہیں تسلی دیکر ابھی آتا ہوں اور اس کہنے سے مطلب میرا یہ تھا کہ ان پناہ دہندگاں کی غیبت میں ان بیچاروں کو جو میرے ساتھ شریک مصیبت رہے ہیں تشفی دے کر کچھ ہدایتیں مخفی طور پر بمصلحت وقت کرتا آؤں چنانچہ اول میں اپنی بیوی کی گاڑی کی طرف جو قریب ہی کھڑی تھی گیا اور بعد اُن سے ملنے اور اصلی کیفیت ظاہر کرنے کے سید عابد اوٹی میں مسٹر پیانہا صاحب کے پاس آیا اور اُن سب کو جو وہاں تھے کہا کہ سب خاطر جمع رکھیے میں بغیر آپ لوگوں کے رہا کرائے اس کیمپ سے باہر نہیں جاؤں گا بشرطیکہ میری ہدایت پر آپ سب متفق ہو کر عمل کریں یعنے ہندوستانی کپڑے پہنکر مسلمان ہو جانا اپنے کو ظاہر کریں اور نماز و وظیفہ وغیرہ ارکان مذہبی جیسا کہ پیانہا صاحب بتلاتے جاویں بظاہر اُس وقت تک ادا کریں جب تک کہ میری تدبیروں کی تکمیل ہو کر پوری طور پر اس مصیبت سے مخلصی نہ ہو۔ اور چونکہ مسٹر پیانہا صاحب ایک ہندوستان زاعیسائی تھے اور اُن کا ارتباط دن رات کی صحبت خاص کر مسلمانوں کے ساتھ ایسی تھی کہ وہ اُن کے طریقہ عبادت وارکان نماز یعنے رکوع و سجود وغیرہ سے جو روزمرہ کا مذہبی شغل ہے پورے طور پر آگاہ تھے لہذا اُن پر صرف اسی قدر تاکید کافی تھی کہ باقی ماندگاں کو وہ مسلمان صورت بنا کر نماز و وظیفہ میں ایسا اُنھیں مشغول رکھیں کہ دیکھنے والے اُنکو پکا مسلمان سمجھیں۔ میری ان ہدایتوں پر وہ بجائے سر تسلیم خم کر کے ازحد شکر گذار میرے ہوئے اور ایک اُمید روح پرور اُن کے دلوں میں (جو ہولناک مظالم ناحق سے لرزاں تھے) پیدا ہو گئی۔ اُس کے بعد میں اپنی بیوی کے ساتھ اپنے پناہ دہندگاں کے ڈیروں کی طرف چلا گیا جہاں اُنھوں نے ایک عمدہ راؤٹی میری بیوی کے رہنے کے لیے علٰحدہ نصب کرا دی تھی۔ اور میں اُن کے ساتھ بہ آرام تمام مثل ایک معزز مہمان کے رہنے لگا۔ ناظرین کو میری اس تبدیل حالت پر کہ چشم زدن میں کیا سے کیا ہو گیا واقعی سخت حیرت ہو گی مگر میں دیر تک اس تعجب میں نہیں رکھنا چاہتا اصل حقیقت یہ ہے کہ اُس کیمپ میں جہاں ہزارہا ہندو مسلمان افواج باغی دور دور تک پھیلے تھے تھے اُن میں قریب دو سو کے مسلمان سپاہیان ایسے تھے جو قصبۂ مؤائمہ ضلع الہ آباد کے رہنے والے تھے اور جن کے علاقہ کا بندوبست میرے والد مرحوم نے بزمانۂ ڈپٹی کلکٹری اپنے کے باتحتی سر ولیم میور صاحب بہادر مہتمم بندوبست کے (جو بعد کو لفٹنٹ گورنر ہو گئے تھے) کیا تھا۔ حاجی دولت کی (جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے کہ میرے والد کا پُرانا ملازم تھا) اُن میں سے اکثروں کی شناسائی و ملاقات اُس زمانہ کی تھی

امیر مینائی مرحوم

- امیر اللغات (نامکمل) عہ
- صنمخانۂ عشق
- مراۃ الغیب عہ
- محامد خاتم النبیین ۲ر
- مکاتیب امیر مینائی

جلال لکھنوی مرحوم

- سرمایۂ زبان اردو
- رسالہ تذکیر و تانیث ۲ر
- قواعد المنتخب ۴ر

مرزا محمد عباس ہوش

- افسانہ نادر جہاں
- پیاری سہیلی ۱۲ر

مرزا رسوا مرحوم

- اختری بیگم ۲ر
- خونی شہزادہ
- شریف زادہ عہ

ریاض خیرآبادی

- حرم سرا
- ناشاد ۸ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد کامل
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلیٰ بطرز ناول

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین ۴ر
- حاجی بغلول ۴ر
- پیاری دنیا ۴ر
- کایا پلٹ ۴ر
- میٹھی چھری ۴ر
- طرحدار لونڈی ۸ر
- طلسمی فانوس

منشی جوالا پرشاد برق

- مرنالنی ۸ر
- مار آستین ۸ر
- بنگالی دولہن ۱۲ر
- پرتاب ۱۰ر

سید عاشق حسین عاشق

- تارا
- شادی غم ۱۲ر

مولانا عبدالحلیم شرر

- ثانی اثنین ۲ر
- ذی النورین ۱۰ر
- ابوالحسنین ۸ر
- خواجہ معین الدین چشتی ۲ر
- حسن بن صباح ۲ر
- عصر قدیم
- تاریخ یہود
- مسیح اور مسیحیت
- عرب قبل از اسلام عہ
- صقلیہ میں اسلام ۱۲ر
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور ۱۰ر
- الفانسو ۱۲ر
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین عہ
- نیکی کا پھل عہ
- بابک خرمی
- طاہرہ
- مینا بازار عہ
- فردوس بریں ۸ر
- فلورا فلورنڈا

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ ۸ر
- عالم خیال ۸ر
- دیوان شوق

منشی محمد احسن وحشی

- نغمۂ حرم ۱۲ر
- اشک حسرت عہ
- معشوقۂ عرب عہ
- محبوس کنشت عہ

خواجہ عبدالرؤف عشرت

- تذکرہ آب بقا
- زبان دانی ۲ر
- اصلاح زبان اردو ۲ر
- قواعد میر ۲ر
- اصول اردو ۲ر
- جان اردو ۲ر
- شاعری کی چار کتابیں
- لغات اردو
- ہندو شعرا
- مضمون نویسی ۸ر
- [illegible] ۳ جلد

مولانا اسلم جیراجپوری

- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنی عباس
- عباسیہ مصر
- عباسیہ بغداد
- خلافت آل عثمان

قاضی سلیمان منصورپوری

- رحمۃ للعالمین ۳ جلد
- سفرنامہ حجاز

مولانا نجم الغنی رامپوری

- بحر الفصاحت
- تاریخ اودھ ۵ جلد
- تاریخ حیدرآباد دکن
- تاریخ راجگان ہند
- تعلیم [illegible]
- مذاہب اسلام

مولانا حکیم عبدالحی مرحوم

- تاریخ [illegible]
- گل رعنا

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

منشی احمد علی بی اے

- تاریخ تمدن ۲ جلد
- شباب لکھنؤ

مولانا حسرت موہانی

- شرح دیوان غالب
- مکمل دیوان حسرت
- نکات سخن ۲ حصے

سید سجاد حیدر بی اے

- خیالستان
- حکایات و احتسابات
- پرانا خواب اردو افسانے
- ثالث بالخیر
- زہرہ
- جلال الدین خوارزم شاہ
- جنگ و جدال

مسٹر ظفر عمر بی اے

- مستقبل اسلام
- چوروں کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری
- لال کھنڈر

مرزا محمد عسکری بی اے

- ادبی خطوط غالب
- تاریخ ادب اردو
- نوادر

منشی امیر احمد علوی بی اے

- تاریخ اندور ۱۲ر
- روزنامچہ حج
- شاہان مالوہ
- طرۂ امیر
- گوتم بدھ
- بہادر شاہ ظفر
- مثنویات ۱۲ر
- تاریخ زوال

مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے

- تاریخ امریکہ
- سیر المصنفین ۲ جلد
- تاریخ مغربی یورپ
- خیالات ارونگ

سید مسعود حسن رضوی ایم اے

- ہماری شاعری
- امتحان وفا

مولوی سید سلیمان ندوی

- ارض القرآن
- سیرت عائشہؓ
- حیات امام مالکؒ
- خیام

مولوی عبد السلام ندوی

- اسوۂ صحابہ ۲ جلد
- سیرۃ عمر بن عبد العزیز
- انقلاب الامم
- شعر الہند ۲ جلد

مولوی سعید انصاری

- سیر الانصار ۲ جلد
- سیر الصحابیات

حاجی معین الدین ندوی

- خلفائے راشدین
- مہاجرین حصہ اول

شاہ معین الدین ندوی

- مہاجرین حصہ دوم
- سیر الصحابہ جلد ششم
- سیر الصحابہ جلد ہفتم

خواجہ حسن نظامی دہلوی

- میلاد نامہ
- ذکر غوث پاک ۱۲ر
- کرشن جیون
- سیپارۂ دل
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۲ر
- اتالیق خطوط نویسی ۱۲ر
- میاں بیوی کی تعلیم
- میاں بیوی کی تربیت
- اولاد کی شادی
- جگ بیتی کہانیاں ۱۰ر
- بچوں کی کہانیاں ۱۲ر
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے ۱۲ جلد

سید ظہور احمد وحشی

- اسلامی زندگی
- تصویر معاشرت
- درس عبرت
- زندگی کی صبح و شام
- طوفان زندگی
- عروج زندگی
- مالی پریشانیوں کا علاج
- وسائل معاش

مولانا راشد الخیری

- امت کی مائیں
- آمنہ کا لال
- سیدہ کا لال
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی ۲ جلد
- نوحۂ زندگی ۱۲ر
- در شہوار ۱۰ر
- منازل السائرہ ۲ جلد
- جوہر قدامت
- عروس کربلا
- یاسمین شام
- تیغ کمال
- محبوبۂ خداوند ۱۲ر
- نانی عشو ۱۰ر
- وداع ظفر

نیاز فتحپوری

- جذبات بھاشا
- گہوارۂ تمدن (گیتانجلی)
- شہاب کی سرگذشت
- نگارستان
- جمالستان

بنام خداوند جاں آفریں

جامیت جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجراء الناظر ۱۳۲۷ھ) (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر:- ظفر الملک علوی

جلد ۴۲	ستمبر ۱۹۳۶ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

قیمت ۵ فی پرچہ ۵ روپے ۲ ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُردو کی بہترین کتابیں

بہترین انشا پرداز
انعامی مقابلے کے چھ مضامین آزاد، حالی، نذیر احمد و شبلی کی تصانیف پر تبصرہ اور انکی انشا پردازی کے نمونے قیمت

تاریخ عرب
عربوں کے فتوحات انکے تمدن، علمی کمالات ایجادات و اختراعات کا قابل دید بیان از موسیو سیدیو فرانسیسی قیمت

مرزا غالب مرحوم
- اردوئے معلی غالب
- عود ہندی
- مکمل دیوان غالب

سر سید مرحوم
- خطبات احمدیہ
- مکمل مجموعہ لکچر مجلد
- اسباب بغاوت ہند
- مضامین تہذیب الاخلاق
- خطوط سرسید

نواب محسن الملک مرحوم
- مضامین تہذیب الاخلاق
- مکمل مجموعہ لکچر
- مکاتیب

مولانا حبیب الرحمن شروانی
- اسلامی اخلاق
- سیرۃ الصدیق
- علمائے سلف

مولانا آزاد مرحوم
- آب حیات
- دربار اکبری
- نیرنگ خیال
- سیر ایران
- ڈراما اکبر
- مجموعہ نظم آزاد
- مجموعہ مکتوبات آزاد
- دیوان ذوق مرتبہ آزاد

مولانا ابو الکلام آزاد
- ترجمان القرآن ۲ جلد
- تذکرہ
- ذکرے
- آخری پیغام فی القرآن
- جہاد اور اسلام
- قول فیصل

مولانا محمد یونس مرحوم
- ابن رشد
- روح الاجتماع

مولانا نذیر احمد مرحوم
- بنات النعش
- مرأۃ العروس
- توبۃ النصوح
- رویائے صادقہ
- ایامیٰ
- فسانہ مبتلا
- ابن الوقت
- مجموعہ نظم بے نظیر
- مکمل مجموعہ لکچر ۲ جلد

مولانا شرر مرحوم
- حیات انیس
- ایشیائی شاعری
- نورجہاں بیگم
- سلطان صلاح الدین

مرزا حیرت دہلوی مرحوم
- الف لیلہ و نیا زاد
- قصہ حاجی بابا اصفہانی
- سوانح عمری عمرو عیار

مولانا حالی مرحوم
- یادگار غالب مجلد
- حیات سعدی
- مقدمہ شعر و شاعری
- دیوان حالی
- مسدس حالی
- مجموعہ نظم حالی
- مقالات حالی

مولوی عبد الباری آسی
- تذکرۃ الخواتین
- تذکرہ خندہ گل
- شرح دیوان غالب

مصنفہ مرزا ہادی رسوا
- بزم خیال
- دور فلک
- مرقع ادب
- مشاطۂ سخن ۲ حصے
- حسن خیال
- اصلاح الاصلاح

مولانا شبلی مرحوم
- سیرۃ النبی جلد اول مجلد
- جلد دوم مجلد
- جلد سوم مجلد
- جلد چہارم مجلد
- جلد پنجم مجلد
- الفاروق
- سیرۃ النعمان
- الغزالی
- المامون
- سفرنامہ مصر و شام و روم
- علم الکلام
- الکلام
- رسائل شبلی
- مقالات شبلی
- شعر العجم ۵ جلد
- موازنۂ انیس و دبیر
- مضامین عالمگیر
- مجموعہ کلام شبلی اردو
- مکاتیب شبلی ۲ جلد
- خطوط شبلی

الناظر بک ایجنسی۔ لکھنؤ

بنام خداوند جان آفریں

الناظر لکھنؤ

نمبر ۳ جلد ۴۲ — ستمبر ۱۹۳۶ء

لکھنوی شاعری

(جناب منشی مشیر احمد علوی ناظر کاکوروی بی۔اے)

شاعری کا ستارہ اودھ میں اُس وقت چمکا جب کہ تیموری اقبال لب بام تھا اور شاعری رفتہ رفتہ ایک پیشہ ہوکر رہ گئی تھی۔ اور اُس عصر کے شاعر اپنے متاع ہنر کو کاسۂ گدائی بنائے ہوئے دربدر آوارہ گردی کر رہے تھے۔ نظام سلطنت کے اجزا خزاں کے تند جھونکوں سے منتشر ہو چکے تھے۔ دلی کا رنگ پلٹ گیا تھا۔ حالات موافق نہ تھے۔ ضروریات زندگی کے ذرائع محدود تھے۔ شعرا رنگ زمانہ سے متاثر ہوکر بصد حسرت و یاس پورب کی طرف چل کھڑے ہوئے اور وادیٔ غربت میں قدم رکھا۔ بیت الاسلام دہلی کی حالت خواہ کچھ ہی ابتر کیوں نہ رہی ہو لیکن وہ جماعت جس نے اپنی عمر عزیز اُسکی گلیاں چھاننے میں گذاری ہو اُس نے اپنے قلوب پر پتھر رکھ کر وطن نہیں عزیز وطن کو خیرباد کہا مگر عمر بھر یہ داغ مفارقت دمٹا۔

اس آوارہ منش تاراج شدہ قافلہ کو لکھنؤ میں امن و عافیت کی جگہ نصیب ہوئی اور سلطنت اودھ نے اپنی بساط بھر ان باکمال افراد کو سر آنکھوں پہ جگہ دی عزت و منزلت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی آسایش بہم پہونچائی مناصب مقرر کیے مسافر نہیں مہمان عزیز سمجھا۔ ایران گرامی قدر مخدوموں نے پردیسیوں کی ایسی خدمت کی کہ مہاجرین کرام غربت کے شدائد کو بھول گئے۔ اور وہ نغمات جو کسی وقت دولت مغلیہ کی ہم نوائی میں الاپے جاتے تھے اب سلطنت اودھ کی ثناگری میں صرف ہونے لگے۔ دلی کے

شاہزادہ شہنشاہ شاہ عالم کے صاحبزادہ مرشدزادہ آفاق مرزا سلیمان شکوہ بھی لکھنؤ میں داد عیش دے رہے تھے۔ صاحب عالم کی ڈیوڑھی ہر محتاج کیلئے ملجا و مامن تھی۔ وہی آن بان تھی اور وہی دبدبہ و طنطنہ نواب اودھ مورچھل ہلاتے تھے نذریں پیش ہوتی تھیں دلی سے جو جاتا پہلے حضور میں قدم بوس ہوتا وہ شاعر تھے شعر و سخن سے فطری ذوق تھا شعرا اور اہل کمال کی عزت افزائی ہوتی تھی۔ مصحفی اور سرور کاکوروی اسی دربار گہر آبدار سے منسلک تھے۔ غرض کون تھا جس نے اس آستانہ عالی کی جبیں سائی کرنا فخر و سعادت تصور نہ کیا ہو۔

ہم کو اسی دور سے تعلق ہے کیونکہ لکھنوی شاعری کا سنگ بنیاد صاحب عالم کی وساطت سے رکھا گیا اور تاریخی حیثیت سے یہ عہد سنہ ۱۱۸۸ھ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

لکھنوی شاعری تاریخی حیثیت سے حسب ذیل ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے اور ہر دور کے دو عہد گذرے ہیں طبقہ متقدمین و طبقہ متوسطین اور طبقہ متاخرین۔ لیکن ایک جدید طبقہ کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے یعنے دور حاضر اس طرح بآسانی لکھنوی شاعری کے چار دور قائم ہو سکتے ہیں۔

(۱) دور متقدمین | اس دور میں محض ایک ہی شاعر کا نام لیا جا سکتا ہے جن کو غلطی سے اکثر و بیشتر تذکرہ نگار دکنی لکھتے رہے ہیں حالانکہ مخدوم شیخ سعدی قصبہ کاکوری کے باشندے تھے اور آج تک قصبہ کاکوری میں وہ محلہ جہاں مخدوم شیخ سعدی کا مزار موجود ہے شیخ سعدی محلہ کے نام سے موسوم ہے۔ مخدوم شیخ سعدی کا ذکر بدایونی نے اپنی تاریخ منتخب التواریخ میں علمائے کرام کے سلسلہ میں تفصیل سے کیا ہے۔ سعدی لکھنوی شاعری کے بے ضابطہ اور باضابطہ حیثیت سے امام اور قافلہ سالار تھے۔ آپ کا رنگ سخن نغز ہے اور تقریباً اس دور کے جملہ شعرا کا آئینہ دار ہے۔

(۲) طبقہ وسطی | طبقہ وسطی اردو شاعری کے شباب کا عہد تسلیم کیا جاتا ہے سودا میر سوز اس عہد کی خاص پیداوار ہیں اور تاریخی حیثیت سے بھی یہ دور بہت اہمیت رکھتا ہے اور اگر عہد زریں سے اس دور کو تعبیر کریں تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ ظاہر ہے نواب آصف الدولہ کا دور حکومت ہر حیثیت سے زرپاش اور زرخیز تعبیر کیا جا سکتا ہے آصف خود شاعر تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کو ظفر کو چھوڑ کر ایسا قادر الکلام بادشاہ میسر نہیں ہوا۔ اس دور میں مصحفی کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ تاریخی حیثیت سے شجاع الدولہ کا دور بھی اس عہد وسطی کی یادگار ہے۔ میر سنہ ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ آئے سودا سنہ ۱۱۸۵ھ میں فیض آباد آئے۔ اور پانچ سال تک میر و سودا لکھنؤ میں ساتھ رہے۔ اس دور کے ایک تیسرے باکمال شاعر سوز بھی تھے جن کا نام سید محمد میر پاپیر تھا وہ سنہ ۱۱۹۱ھ میں لکھنؤ آئے۔ لیکن رنگ محفل دیکھ کر مرشد آباد چلے گئے سنہ ۱۲۱۲ھ میں دوبارہ لکھنؤ آئے

اور نواب آصف الدولہ کے اُستاد مقرر ہوئے اور یہیں ۱۲۱۳ھ میں انتقال کیا۔

دورِ وسطیٰ کا طبقہ اولیٰ | شعرائے دہلی میں سب سے پہلے نواب اشرف نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد آئے اس کے بعد سودا پھر سوز اور سب سے آخر میں میر تقی میر نے لکھنؤ کی شہرت کو آسمان تک پہنچا دیا۔ میر، سودا، سوز فنِ شاعری میں اس بلند درجہ پر فائز ہیں اور ان حضرات کا کلام اس قدر مطالعہ میں آچکا ہے کہ کسی تفصیلی محاکمہ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

سودا کا مرتبہ شاعری کی وسعت و ہمہ گیری کو مدنظر رکھتے ہوئے بہت بلند ہے۔ مثنوی، قطعہ، غزل، ہجو، ترجیع بند، مخمس، رُباعی وغیرہ سب ہی کچھ اُن کی یادگار ہے۔ ہر صنف میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شیر صحرا ہے جو نیستاں کو چیرتا پھاڑتا چلا آرہا ہے لیکن اُن کی یہی صفت غزل گوئی کے منافی تھی اس لیے وہ اس صنف میں زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔

میر کی غزل گوئی پر کچھ لکھنا آفتاب کو روشنی دکھانا ہے دوست و دشمن دونوں نے اُن کو خدائے سخن تسلیم کر لیا ہے اور واقعہ بھی یوں ہے کہ میر اُس اعلیٰ منزل پر گامزن ہیں جہاں آئندہ مستقبل کی کامیابیاں اور کامرانیاں بھی انگشت بدنداں رہیں گی کیونکہ زبان کی حلاوت عاشقانہ فتادگی والہانہ ربودگی خستگی و تشنگی کونسی ایسی شے ہے جو میر کی غزل میں نمایاں نہیں ہے۔

میر سوز کی غزل گوئی البتہ محتاج تعارف ہے اُن کی غزلوں سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی شخص انتہائی بے تکلفی سے رودادِ محبت بیان کر رہا ہے اور بڑے مزے لے لے کر الفاظ سہل سے سہل ہیں، تصنع کا کوسوں پتہ نہیں ہے، حالِ دل بیان ہو رہا ہے اور تشبیہ و استعارہ کی پیچیدگیاں درمیان میں حائل نہیں ہیں غرضکہ شاعری کی اصل روح ہر جگہ کارفرما نظر آتی ہے۔

خدمت ادب کے لحاظ سے بھی یہ عہد بہت قابل قدر ہے۔ کیونکہ بہت سے نامانوس الفاظ ہندی کے جو دلی سے تبرکاً ساتھ آئے تھے اس عہد میں ترک کر دیے گئے اور زبان صاف و شستہ ہو گئی۔ اسی عہد میں قائم چاندپوری بھی دربار اودھ سے متعلق ہوئے لیکن اُن کا کلام سودا کی شاعری سے متاثر نظر آتا ہے معاملاتِ محبت میں وہ بہت منفرد ہیں۔

آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا　　　　درد دل کچھ کہا نہیں جاتا

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قائم　　　　مرا کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

محفل وعظ تو تا دیر رہے گی قائم　　　　یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

اسی دور میں ضیاء الدین ضیا بھی لکھنؤ آئے لیکن وہ زیادہ عرصہ لکھنؤ میں نہ رہے کیونکہ اُن کو درباداری

پسند نہ تھی اور دربار اودھ میں حسد و رشک رقابت و غمازی و سازو باز کی گرم بازاری تھی۔ عیاریاں اور افترا پردازیاں ہورہی تھیں اور جدتیں اپنا اپنا فرض مذہبی بجالا رہی تھیں۔ ضیاءالدین ضیاء ایک سنجیدہ شاعر تھے اُن کو یہ رنگ، رلیاں ایک آن نہ بھائیں اور راجہ شتاب رائے عظیم آبادی کے طلب کرنے پر عظیم آباد چلے گئے اور وہیں کے ہو رہے۔ شعر خوب کہتے تھے۔

میں نے کل پوچھا ضیاؔ سے دل کو کید ھر کھو دیا   اُس نے کوچے کو ترے بتلا کے ٹپ دے رو دیا

کبھی دل تھا تو میں رو رو کے اک دریا بہاتا تھا   برس لے ابر جتنا چاہے تو اب تیری باری ہے

کل کی رسوائی تجھے کیا کم نہ تھی اے ننگ خلق   اس کے کوچے میں ضیاؔ تو آج پھر جانے لگا

اس عہد کا ذکر نامکمل رہے گا اگر دو باکمال شعرا کا تذکرہ چھوڑ دیا جائے یعنے آصف و حسن۔ آصف شاید بہتوں کو معلوم بھی نہ ہوگا کہ لکھنو...... کا سب سے پہلا جذباتی شاعر تھا وہ ۱۱۶۱ھ میں پیدا ہوا ۱۱۸۷ھ میں تخت نشیں ہوا اور ۱۲۰۲ھ میں اُس کا انتقال ہوگیا۔ نواب آصف الدولہ فرمانروایان اودھ میں اپنی مخصوص فیاضیوں کی بنا پر بہت مشہور رہے۔ جب وہ تخت نشیں ہوئے تو سودا میر سوز مصحفی و انشا کا طوطی بول رہا تھا۔ اُن کے کلام میں نہ تو سودا کا رنگ ہے، نہ مصحفی کا اتباع ہے نہ انشا کا البتہ سوز کا ہلکا رنگ کہیں کہیں نظر آتا ہے تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا ہے کہ ۱۲۱۲ھ میں سوز مرشدآباد گئے اور پھر اسی سال واپس آئے اور آصف الدولہ شاگرد ہوئے اور چند ماہ کے بعد اُن کا انتقال ہوگیا۔ بہرحال اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ وہ سوز کے شاگرد تھے تو چند ماہ کی شاگردی کیا معنی رکھ سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مصحفی و انشا کی رنگین صحبتوں کا یہ اثر تھا کہ آج آصف الدولہ کی شاعری بہت بلند نظر آتی ہے۔ وہ قدرت کی جانب سے نہایت پاکیزہ ذوق سخن لائے تھے۔ نواب آصف الدولہ کی ماں کی بھی تاریخ اودھ میں غیر معمولی شخصیت مسلم تھی اور آج بھی لکھنؤ و فیض آباد میں بہو بیگم کے نام سے مشہور ہیں۔ اور سیکڑوں نہیں ہزاروں بیواؤں و یتیموں کی نان شبینہ کا ذریعہ بنی ہوئی دنیا میں بیٹھے کر ثواب حاصل کر رہی ہیں۔ مشہور مورخ منشی فیض بخش کاکوروی مولف تاریخ فرح بخش بھی بہو بیگم کی سرکار میں ملازم تھے اور اُن کے دفتر کے میر منشی تھے۔

آغاز نے تو عشق کے یہ حال دکھایا   اب دیکھیو کیا ہووے گا انجام ہمارا

کچھ بھی نہ سوجھتا تھا اس بن مجھے تو آصفؔ   جس روز ہائے یاں سے وہ رشک مہ گیا تھا

قصۂ جاں گداز اے آصفؔ   تھوڑی سی بات میں تمام کیا

ایک کروٹ سے سو نہیں سکتا   اس دل بیقرار کے باعث

گر یہی نالے میں ملے دل تو تری شورش سے   رہنے پاویں گے نہ ہم کوچۂ دلدار کے بیچ

آصف کو عشق ہے وہ نہ مانے گا ایک بات　　کیوں اس پہ زیست کرتے ہوا ہے شیخ و شاب تلخ
لینا خبر تو اس کی جس کا ہے نام آصف　　مدت سے وہ گلی میں تیری رہا کرے ہے
بھولوں سے بولتا ہے یہ مجھی سے ؟　　نہیں کچھ بولتا کیا جانے کیا ہے

اب رہے حسن تو یہ وہ باکمال ہیں جن کی مثنوی سحر البیان اُردو زبان کی بے نظیر مثنوی خیال کی جاتی ہے یہ ضیاء کے شاگرد تھے اور میر و سودا کی شاعری سے متاثر سنہ ۱۲۱۱ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

دل کو کھویا ہے کل جہاں جا کر　　جی میں ہے آج جی بھی کھو آ ؤں
اظہار خموشی میں ہے سو طرح کی فریاد　　ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
قمار محبت میں بازی سدا　　وہ جیتا کیا اور میں ہارا کیا
کیا قتل اور جان بخشی بھی کی　　حسن اس نے احساں دوبارہ کیا
اس بُت کی زندگی سے نہ آزاد ہو حسن　　یہ بات بھی کہیں نہ خدا کو بُری لگے
پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ　　بس آج کی شب بھی سو چکے ہم
تیرے ہم نام کو جب کوئی پکارے ہے کہیں　　جی دھڑک جاتا ہے میرا کہ کہیں تو ہی نہ ہو

اس دور میں حاشیہ پر افسوس[1] و حسرت کو بھی جگہ مل سکتی ہے آخری عمر میں نواب شجاع الدولہ کی سرکار سے متوسل ہوئے ان کا نشو ونما خالص اودھی ہے۔ شاعری میں حیدر علی حیراں اور سوز سے مشورہ کیا اور یہیں سے وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں کلکتہ چلے گئے اور اردو زبان کی وہ نمایاں خدمات انجام دیں جو ہر آئینہ مسلم ہیں۔

مرزا جعفر علی حسرت بھی اسی دور کے پروردہ خاص تھے اور سرب سنگھ دیوانہ سے مشورہ سخن کرتے تھے اکبری دروازہ میں عطاری کی دوکان تھی۔ ترک لباس کے بعد سنہ ۱۲۰۷ھ میں انتقال کیا جرأت اور خواجہ حسن انھیں کے نامور شاگرد تھے۔ اُن کا کلام پاکیزہ ہوتا تھا اور زبان کی صفائی اور موزونی ترکیب خاص پایہ کی ہوتی تھی وہ بھی جذباتی شاعر تھے۔

تمھیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی　　چلو اب ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

---

[1] میر شیر علی افسوس ولد سید علی مظفر خاں

کیا فائدہ جو پوچھیے احوال دل افسوس سے　　منہ دیکھ رو دیتا ہے وہ پر بات کچھ کہتا نہیں
منزل عشق تک نہ ہو پہنچا آہ　　میں تو چلتے ہی چلتے ہار گیا
پاس سے اس کے سب گئے خورسند　　ایک افسوس سوگوار گیا

ناظر

یہ بھی اک ستم تھا کہ خواب میں مجھے شکل اپنی دکھا گئے کبھی نیند برسوں میں آئی تھی سو وہ اس طرح سے جگا گئے

بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے اتنا کہ گلشن میں گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

دور وسطیٰ کا عہد ثانی | دور وسطیٰ کا عہد اول ختم ہو چکا اب عہد ثانی میں جرأت و مصحفی و انشا نے جس قدر شہرت پائی وہ کسی کو نصیب نہ ہوئی انشا بلا کے ذہین تھے۔ اور دنیا کی کوئی ایسی حرکت نہیں ہے جسے وہ شعر میں نہ کہہ سکتے ہوں۔ جس چیز کا نام تغزل ہے وہ ان کے مقدر میں نہ تھی لیکن قسمت کے دھنی تھے۔ نواب سعادت علی خاں کے مزاج میں درخور تھا۔ اور مصحفی ایسے باکمال کی کچھ نہ چل سکی۔ انشا، جرأت، مصحفی، خواجہ تاش اور ہم پیشہ تھے اول اول شاعرانہ چشمک رہی بعد میں یہ رنگ جنگ و جدال اور فحش اور پھکڑ تک پہنچ گیا۔ ہزلیات میں مصحفی و انشا نے وہ کیچڑ اچھالی کہ تہذیب نے آنکھیں نیچی کر لیں حیا اور غیرت نے پردہ کر لیا۔ لیکن لطف یہ کہ نواب اور صاحب عالم بھی ان ہنگاموں سے لطف اندوز ہونے لگے اور شہر والوں کو ایک دلگی ہاتھ آئی نتیجہ یہ ہوا کہ انشا اپنی طراری تیزی اور رسوخ سے بازی لے گئے اور مصحفی کو خفت ہوئی۔ اب صاحب عالم مرزا سلیمان شکوہ کی نگاہیں بھی بدل گئیں اور تنخواہ میں بھی تخفیف ہو گئی۔ آخر حصہ عمر میں قطع تعلق کر کے خانہ نشین ہو گئے[1]۔

مصحفی اپنی ہمہ گیر طبیعت کے لحاظ سے سودا تھے اور تغزل میں تو سودا سے بھی افضل۔ اس میں شک نہیں کہ گو حکومت اودھ نے اُن کی قدر نہ کی لیکن لکھنؤ کی شاعری اُن کی ہمیشہ زیر بار احسان رہے گی کیونکہ جس قدر شاعران نامور گذرے ہیں وہ سب تقریباً مصحفی کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد تھے۔ ناسخ اسی دبستاں کے پرورش یافتہ تھے۔ آتش نے وہیں فیض پایا۔ متاخرین میں اسیر انیس و دبیر سب اسی میخانہ سے سیراب ہو چکے تھے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ انشا فاضل تھے اور ذہانت اس کا حصہ خاص تھا لیکن افسوس ہے کہ فطری ودیعت سے وہ خاطر خواہ مستفید نہ ہوئے۔

مصحفی	انشا
یار کا صبح تک ہے وعدۂ وصل	نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
ایک شب اور بھی جیسے ہی سبنے	تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

---

[1] اپنی تنخواہ کا ذکر کس حسرت سے کیا ہے

چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لائق تھا مرد معمر کہیں دس بیس کے لائق

ملے دو اسے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں ملتے ہم بھی کبھی روزوں میں تھے پچیس کے لائق

استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

مصحفی

جب اُس نے اُٹھائی تیغ ہم پر
ہاتھوں کی پناہ ہم نے کر لی
تلوار کو کھینچ ہنس پڑے وہ
ہے مصحفی کشتہ اس ادا کا
مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

انشا

عجیب لطف کچھ آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے
کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے
غصے میں ترے ہم نے بڑا لطف اُٹھایا
اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

شیخ قلندر بخش جرأت کا نشو و نما فیض آباد میں ہوا عنفوان شباب میں بینائی جاتی رہی اور موسیقی کا شوق پیدا ہوا۔ ستار اچھا بجاتے تھے۔ حسرت سے مشورہ سخن کیا۔ مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ انشا سے خوب خوب چوٹیں چلیں۔ ۱۲۲۵ھ میں نواب سعادت علی خاں کے عہد میں انتقال کیا۔ یہ محض غزل گو شاعر تھے۔ اور میر کے متبعین میں ان کا درجہ یقیناً بلند تھا۔ لیکن معاملات حسن و عشق میں ایک طرز خاص کے موجد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ شوخی، رندی اور بیباکی کے عناصر ان کی شاعری میں نمایاں ہیں۔

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا — چمپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا
خدا جانے کرے گا چاک کس کس کے گریباں کو — ادا سے ان کا چلنے میں اُٹھا لینا یہ داماں کا
آئے جو مرے پاس تو منہ پھیر کے بیٹھے — یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا

شیخ غلام علی راسخ بھی میر کے شاگرد تھے گو عظیم آباد وطن مالوف تھا لیکن زیادہ حصہ اُن کا لکھنؤ میں گذرا اور کبھی اپنے استاد کے رنگ سے متجاوز نہ ہوئے ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۶ سال کے سن میں ۱۲۳۸ھ میں نواب غازی الدین حیدر شاہ اودھ کے عہد میں انتقال کیا۔

تھا جی میں کہ دشواری ہجر اُس سے کہیں گے — پر جب سے ملے کچھ رنج و محن یاد نہ آیا
مجھے ہوش والوں سے کیا گلہ مجھے رشک ہے تو انھوں سے ہی — جنھیں تیرے جلووں کے سامنے مری طرح بے خبری رہی
چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا — مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

مرزا سعادت یار خاں رنگین بھی اسی دور کے شاعر تھے اور صنف ریختی کے موجد۔ بہت ذہین بذلہ سنج و بیباک تھے۔ انشا سے بڑا اتحاد تھا۔ [illegible]ھ میں یہیں پیدا ہوئے اور ۱۲۵۱ھ میں ۸۰ سال کے سن میں انتقال کیا۔ یہ واقعہ ہے کہ باوجود فحاشی اور غزل گوئی کے ریختہ میں جذباتی رنگ کی جھلک اُن کے کلام میں نمایاں ہے۔

جو ترے پاس سے آتا ہے میں پوچھوں ہوں سہی — کیوں جی! کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

دورِ وسطیٰ کا عہدِ ثانی ناتمام رہے گا اگر مصحفی کے تین نامور شاگردوں کا ذکر نہ کیا جائے یعنے نواب مرزا محمد تقی خاں ہوس۔ کرامت علی شہیدی۔ شیخ پیر بخش مسرور کاکوروی۔ ہوس کا رنگ کلام ملاحظہ ہو۔

عاشق تو تھا ہوس کبھو دیوانہ کب ہوا — تو اُٹھ گیا حجاب بڑا ہی غضب ہوا

جس سے کل خون میں ڈوبا قفس اے مرغ اسیر — تو نے پھر آج وہی زمزمہ میں نا دیکھا

شغلِ شب تنہائی کس سے کہیں ہم اپنا — دو چار گھڑی رو کر بہلاتے ہیں غم اپنا

شہیدی کا رنگ ملاحظہ ہو۔

عام ہیں اس کے تو الطاف شہیدی سب پر — تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

رحم آتا ہے مجھے اس نوجوانی پر تری — اے شہیدی رات دن کا رنج و غم اچھا نہیں

وہ وقت تو آنے دے بتا دیں گے شہیدی — بن اس کے کسی شخص پہ مر جاتے ہیں کیسے

دل کے جانے کا شہیدی واقعہ ایسا نہیں — کچھ نہ رونے آہ گر ہم عمر بھر رویا کیے

مسرور کاکوروی کا رنگ سخن یہ ہے۔

اس کشتۂ دیدار کے اوسان تو دیکھو — جو ذبح کے دم تک بھی ترے قاتل نگراں تھا

اک نالہ میں اس دم دلِ سوزاں سے نکالا — دربان نے جو تجھ کو درِ جاناں سے نکالا

سبزہ رنگوں کی یہ ہے زہرِ محبت کا اثر — بعد مرنے کے بدن جو تن زار ہرا دھانی ہے

یہ فیضِ مصحفی ہے کہ مسرور ان دنوں — ہر سمت غلغلہ ہے تری واہ واہ کا

(۳) متاخرین کا عہدِ اوّل — متاخرین کا عہدِ اوّل ناسخ آتش اور شاہ نصیر سے شروع ہوتا ہے اس عہد میں شاہ نصیر کا نام برائے بیت داخل کیا جا سکتا ہے کیونکہ شاہ نصیر دہلوی تھے اور شاہ محمدی مائل کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار تھا۔ پیش رو شعرا کی طرح وہ اودھ میں تشریف لائے۔ یہ عہد مصحفی و انشا کا تھا اس لیے یہ سمجھ کر کہ ان باکمال شعرا کو دیکھتے ہوئے اُن کو کوئی نہ پوچھے گا وہ دہلی واپس چلے گئے لیکن پھر پریشانیوں نے ستایا مجبوراً لکھنؤ آئے لیکن اب ناسخ و آتش کا زمانہ تھا۔ لہٰذا اس بار بھی وہ دکن چلے گئے۔

شیخ امام بخش ناسخ اپنے دور کے مجدد اور امام فن تصور کیے گئے ہیں۔ انھیں نے لکھنؤ اسکول قائم کیا اور تصنع۔ ضلع جگت۔ آورد لکھنوی دبستان میں انھیں کی ایجاد ہے۔ ۱۲۰۰ھ میں ولادت ہوئی ۱۲۵۴ھ میں وفات پائی۔ غزلیں، رباعیات، قطعات اور تاریخیں بھی ان کی یادگار ہیں۔ قصائد کی طرف اُنھوں نے

مطلقاً توجہ نہ کی حالانکہ جو کمالات اُن میں موجود تھے اُن کو دیکھتے ہوئے یقیناً وہ بہت زیادہ اس صنف غلس میں کامیاب ہوتے۔ غزل میں اُن کا انداز یکسر تصنع ہے اور سوائے رعایت لفظی شوکت الفاظ مبالغہ اور بیجا بلند پروازی کے جذبات سے مطلقاً کوئی علاقہ نہ تھا۔ مگر نا انصافی ہوگی اگر یہ احسان اُن کا نہ مانا جائے کہ زبان کی صفائی وصحت کی طرف بیشک انھوں نے توجہ کی اور بہت سے نامانوس الفاظ بھی ترک کیے۔

مانع صحرا نوردی پاؤں کو ایذا نہیں　　دل دکھا دیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا
سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے　　کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا رہتا ہے انساں سے
فرقت قبول رشک کے صدمے نہیں قبول　　کیا آئیں ہم رقیب تری انجمن میں ہے

کہیں کہیں اس رنگ کے بھی شعر موجود ہیں۔

تاب سننے کی نہیں بہر خدا خاموش ہو　　ٹکڑے ہوتا ہے جگر ناسخ تری فریاد سے
خواب ہی میں نظر آتا وہ شب ہجر کہیں　　سو مجھے حسرت دیدار نے سونے نہ دیا
میں خوب سمجھتا ہوں مگر دل سے ہوں ناچار　　اے ناصحو بے فائدہ سمجھاتے ہو مجھ کو

اور نیاز صاحب کے خیال میں تو اس امام فن نے تمام عمر میں صرف یہ گیارہ شعر کہے ہیں باقی اللہ اللہ خیر صلا!

ہم ضعیفوں کو کہاں آمد و شد کی طاقت　　آنکھ کی بند، ہوا کو چہ جاناں پیدا
سمجھے تھے بعد قضا پائیں گے راحت ناسخ　　حشر تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا
گیا وہ چھوڑ کر رستے میں مجھ کو　　اب اس کا نقش پا ہے اور میں ہوں
گو نہیں پوچھتے ہرگز وہ مزاج　　ہم تو کہتے ہیں دعا کرتے ہیں
اپنے کاموں میں رہو مشغول تم اے غافلو　　اس کی باتوں پر نہ جاؤ ناسخ اک دیوانہ ہے
روز مرگ آرزو ہے تا کبے غم کیجئے　　تا کجا دست دعا کو وقف ماتم کیجیے
تاب سننے کی نہیں بہر خدا خاموش ہو　　ٹکڑے ہوتا ہے جگر ناسخ تری فریاد سے
خانہ ویراں مجھے کہتا تھا ہر اک اے ناسخ　　ابتو آباد ہوا خانۂ زنداں مجھ سے
اُڑا کے ساتھ یہ مشت غبار لیتا جا　　مجھے رکاب میں او شہسوار لیتا جا
وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں　　ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں
جنوں پسند مجھے چھاؤں ہے ببولوں کی　　عجب بہار ہے ان زرد زرد پھولوں کی

خواجہ حیدر علی آتش کے اجداد دہلی کے رہنے والے تھے لیکن نواب شجاع الدولہ کے عہد میں اُن کے والد خواجہ علی بخش دلی سے فیض آباد آگئے اور وہیں آتش پیدا ہوئے لیکن وہ اوائل عمری ہی میں یتیم ہوگئے اور نواب محمد تقی کے ساتھ لکھنؤ آئے اُس عہد میں جرأت انشا و مصحفی کا طوطی بول رہا تھا یہ مصحفی کے شاگرد ہوگئے۔ غزل گوئی میں ان کا رنگ منفرد ہے اس لیے خوب نام مشہور ہوا۔ بہت دوست پرست تھے اس لیے عسرت میں زندگی بسر ہوئی اور ۱۲۶۲ھ میں انتقال کیا۔ عمر بھر تغزل ہی سے کام رکھا اور حقیقت یہ ہے کہ صحت زبان اور صفائی محاورات میں وہ کسی طرح "امام فن" ناسخ سے کم نہیں ہیں۔ بلکہ سوز و گداز کے لحاظ سے ان سے برتر و فائق۔

دوستوں سے اس قدر صدمے اٹھائے جان پر　　دل سے دشمن کی شکایت کا گلہ جاتا رہا
آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اُٹھ بھی کھڑے ہوئے　　میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا
بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا　　جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے　　ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
موت مانگوں تو رہے آرزوِ خواب مجھے　　ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

آتش کے شاگردوں میں میر دوست علی خلیل میر وزیر علی صبا نواب سید محمد خاں رند آغا حجو شرف نواب مرزا شوق اور پنڈت دیا شنکر نسیم بہت بلند پایہ شاعر ہیں حقیقتاً ان شعرائے دبستان لکھنؤ کی منزلت ثریا تک پہنچا دی۔ نسیم و شوق مثنویات کے لیے بہت مشہور ہوئے اور خلیل و صبا و رند اپنی غزلوں کی وجہ سے جن میں "رعایت لفظی اور ناموزوں بلند پروازی کے سوا اصلی تغزل بہت کم ہے۔"

ناسخ کے شاگردوں میں خواجہ محمد وزیر وزیر نے بہت کافی شہرت حاصل کی یہ خالص لکھنوی تھے استعداد علمی اچھی تھی اور عمر بھر گوشہ نشین رہے سلطان عالم واجد علی شاہ نے طلب بھی کیا تو بھی گوشہ نشینی سے باہر نہ نکلا۔ اور ۱۲۷۰ھ میں انتقال کیا۔ رنگ شاعری ناسخی تھا رعایت لفظی ان کا حصہ خاص تھا۔

ملا ہے او دلِ راحت طلب کیا شادماں ہو کر　　زمین کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر
کیا قتل اس نے غیروں کو مرے ہم رشک کے مارے　　اجل بھی دوستو آئی نصیب دشمناں ہو کر
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دلگیر کو　　کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو
ہے چشمِ نیم باز عجب خواب ناز ہے　　فتنہ تو سو رہا ہے درِ فتنہ باز ہے
میں مرا اور اُن کے گھر شادی رہی　　خون کے چھاپے سے لگے دیوار پر

ناسخ کے تین شاگرد اور بھی بہت مشہور ہوئے مرزا محمد رضا برق میر علی اوسط رشک اور شیخ امداد علی بحر

برق واجد علی شاہ اختر کے مصاحب تھے۔ ناسخ کے شاگرد تھے واجد علی شاہ کے استاد بھی ہوئے اور اُن کے ساتھ کلکتہ بھی گئے۔ اور وہیں سنہ ۱۲۷۳ھ میں انتقال کیا۔ بہت پُرگو تھے لیکن رنگ وہی تھا جو ناسخ اسکول کی توجہ وعنایت سے ہر دلعزیز ہو چکا تھا۔ اُن کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ رباعیاں۔ قطعات۔ مسدس وغیرہ سب ہی کچھ موجود ہے۔

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

اُٹھا کے آئینہ دکھلا دیا اُسے میں نے
نہ سوجھی عارض گلگوں کی جب مثال مجھے

رشک (میر علی اوسط) کا نشو ونما عروس البلاد لکھنؤ میں ہوا۔ فاضل و تربیت یافتہ تھے۔ ناسخ کے شاگرد تھے تصحیح زبان۔ اور تحقیق لغات میں خصوصیت سے مشہور تھے ان کا لغات نفس اللغات جناب نشتر کاکوروی نے دفتر نور اللغات سے شائع کیا تھا اس لغت کی تدوین استاذی علامہ نور الحسن صاحب نیر مدظلہ العالی مولف نور اللغات نے کی لیکن ملک کی ناقدری کہ ایسا نایاب لغت مقبول نہ ہو سکا اور صرف حصہ اول ہی شائع ہو کر رہ گیا۔ رشک کو تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ ناسخ و آتش سے بھی زیادہ اصلاح زبان پر توجہ کی اور بہت سے ایسے الفاظ بھی جو اردو میں مستعمل تھے شعر میں داخل کیے۔

محفل میں شمع چاند فلک پر چمن میں پھول
تصویر روئے انور جاناں کہاں نہیں

کہاں یہ لطف چیتے نے اگر پائی کمر پتلی
تمہارے ہونٹ پتلے انگلیاں پتلی کمر پتلی

فقط تجھ میں عناصر نے عجب ترکیب پائی ہے
بدن شفاف شانے گول قد موزوں کمر پتلی

شیخ امداد علی بحر ناسخ کے شاگردوں میں بہت مشہور ہوئے ہیں تحقیق الفاظ و صحت زبان اور فن عروض کے لحاظ سے ناسخ کے تلامذہ میں رشک کے بعد ان کا درجہ ہے۔ سنہ ۱۲۲۵ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۳۰۰ھ میں انتقال کیا کلام بہت صاف تھا۔ اور دلکشی کے نقوش بھی کسی حد تک موجود تھے۔

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں میں کیا
میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

ظالم ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ
اتنا بھی دل جلوں کا ستانا بھلا نہیں

گئی برسات گذرا سال یہ بھی آہ و شیون میں
خبر ہم کو نہیں بادل کدھر آیا کدھر برسا

آتش کے شاگردوں میں بہ لحاظ اصلاح زبان آغا حجو شرف کا مرتبہ بہت بلند ہے انھوں نے عریانی و ہوسناکی و رندی کے اظہار کے لیے جو فارسی کے الفاظ رائج تھے ترک کیے انتزاع سلطنت کے بعد سلطان عالم واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج چلے گئے۔

ٹھہر گیا ہے لا کے جو منزل میں عشق کی
کیا جانے رہنما تھا کہ رہزن تھا کون تھا

نکل کے جاؤں کدھر تیری انجمن کے سوا　　چمن کی بو ہوں بسوں پھر کہاں چمن کے سوا
درد دل بھی انھیں صیاد نے کہنے نہ دیا　　رہ گئے مرغ قفس کھول کے منقاروں کو

میر دوست علی خلیل بھی آتش کے شاگردوں میں تھے اور سوا رعایت لفظی کے اُن کے کلام میں کوئی ممتاز خصوصیت پائی نہیں جاتی۔

بزم سے یار نے یہ کہہ کے نکالا ہم کو　　اُٹھیے گھر جائیے دم لے چکے ستائے بہت

میر وزیر علی صبا آتش کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۲۷۱ھ میں انتقال کیا زبان کی صحت وصفائی کا بہت لحاظ تھا۔

کوچہ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے　　خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

آتش کے شاگردوں میں نواب سید محمد خاں رند کو غیر معمولی شہرت نصیب ہوئی۔ رند کی شاعرانہ حیثیت مسلم ہے وہ کسی حد تک جذباتی شاعر تھے۔ پہلے دفا تخلص کرتے تھے اُن کے کلام میں نہ خیال کی نزاکت ہے اور نہ مضموں آفرینی لیکن فی الجملہ ہلکی سی تاثیر ضرور ہے جس کا تعلق وجدان سے ہے۔

پھینکدوں دل کو ابھی چیر کے پہلو اپنا　　تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا
آعندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں　　تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل
وعدے پہ تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے　　کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے

دلی کی شاعرانہ حیثیت مسلم لیکن ہم کو اس دبستان شعر سے کوئی علاقہ نہیں ہے ہاں مومن کے شاگردوں میں نسیم سے ہم کو ایک گونہ تعلق ضرور رہے وہ اس طرح کہ نسیم کے شاگرد تسلیم تھے اور تسلیم کے حسرت موہانی جنکو ہم دور حاضر کا امام المتغزلین کہتے ہیں۔ اب یہ دور ادلی متاخرین کا ختم ہوتا ہے۔

عہد ثانی | عہد ثانی میں نسیم تسلیم اسیر امیر فقیر محمد خاں گویا جلال امانت شاہ اختر محمد صادق اختر قلق بحر سحر محسن غلام امام شہید شاہ تراب علی تراب خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اصغر علی خاں نسیم مومن کے شاگرد تھے انتزاع سلطنت سے کچھ اور قبل لکھنؤ آئے بعض امرائے شاہی نے زانوئے ادب تہ کیا۔ سنہ ۱۲۸۳ھ میں انتقال کیا۔ مثنوی خوب کہتے تھے۔ غزلوں میں انھوں نے دہلوی رنگ نہیں چھوڑا روانی وسلاست تو ان کا حصہ خاص تھا۔ ساقی نامہ خوب لکھتے تھے رنگ سخن ملاحظہ ہو:-

کہے دیتی ہیں یہ نیچی نگاہیں　　کہ بالائے زمیں کیا کیا نہ ہوگا
نام میرا سنتے ہی شرما گئے　　تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

ہاتھ میں خنجر کمر میں تیغ تیز ~~~ یہ ارادے ایک مشت خاک پر
آنکھوں میں ہے لحاظ تبسم فزا ہیں لب ~~~ شکر خدا کہ آج تو کچھ راہ پر ہیں آپ

آسیر (امیر مظفر علی) امیٹھی میں پیدا ہوئے۔ مصحفی کے شاگرد تھے۔ ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا۔ بہت پُرگو شاعر تھے۔ اور فن شعر کے اچھے جاننے والے تھے۔ رنگ تغزل اپنے استاد مصحفی سے بالکل جداگانہ تھا لیکن ناسخ کا رنگ ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان کے شاگردوں میں امیر شوق ریاض نے خاص شہرت حاصل کی اُن کے صاحبزادے حکیم و افضل بھی اچھے شاعر تھے۔ اور اُن کے پر پوتے محمد علی خاں آزاد بھی اپنے اجداد کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ لیکن اس دور میں جو شہرت امیر و محسن کو نصیب ہوئی وہ دوسرے کا حصہ نہ تھا۔ امیر فضل و کمال کے لحاظ سے بڑے مرتبہ کے شخص تھے لیکن میرا یہ خیال ہے کہ امیر شاعر پیدا نہ ہوئے تھے اور اُن کی شاعری اکتسابی تھی لیکن اکتساب کا بھی یہ حال تھا کہ غزل مثنوی قصیدہ سب ہی کچھ تھا اور حقیقت یہ ہے کہ زبان کی صحت اور لغت کی تحقیق اور محاورہ کے استعمال۔ الفاظ کی بندش اور مضمون آفرینی کے لحاظ سے وہ اپنے فن کے استاد تھے۔ لیکن جہاں تک جذبات کا تعلق ہے اُن کے کلام میں کوئی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ امیر ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۱۸ھ میں انتقال کیا۔

شاہ تراب علی تراب خانقاہ کاظمیہ کاکوری کے سجادہ نشین تھے۔ بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ علم و فضل میں بھی اُن کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ صوفیانہ شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اُن کا دیوان موجود ہے اور ہر خوش ذوق اُس زندہ میکدہ سے مخمور ہو سکتا ہے۔

محمد محسن محسن ۱۸۲۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۵ء میں اُن کا انتقال ہوا نعت گوئی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر گئے اگر انیس و دبیر مرثیہ کو ختم کر گئے تو بے شبہ محسن کا بھی اس فن خاص میں جواب نہیں ہو سکتا ہے محسن نے قصیدوں اور مثنویوں میں حضرت رسول اکرم صلعم کی نعت گوئی شروع کی اور اسی کو اپنی شاعری کا نصب العین قرار دیا اور اُردو شاعری میں نعت گوئی کی ابتدا باضابطہ طور پر محسن نے شروع کی غلام امام شہید بھی اس صنف کے رہرو تھے لیکن محسن سے گوئے سبقت نہ لے جا سکے شہید کا کلام بھی بہت مقبول ہے۔

اس عہد میں ایک اور باکمال شاعر بھی لکھنؤ میں گذرا جن کا نام حکیم ضامن علی جلال تھا۔ وہ ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے۔ جلال کے شاگرد تھے اور رشک سے بھی اصلاح لی۔ برق سے بھی مشورہ کیا۔ محاورہ دانی زباں بندی پر اُن کو بجا ناز تھا۔ اُن کی سرمایہ زبان اُردو بہت مستند اور مشہور ہے۔ تذکیر و تانیث میں بھی ایک رسالہ موجود ہے حیرت ناک امر یہ ہے کہ باوجود لکھنوی ہونے کے انھوں نے دہلوی رنگ تغزل

پسند کیا اور وہ پہلے لکھنوی شاعر ہیں جس نے ناسخ کے دبستان شعر کے صنم اکبر کو شہید کیا اُنھوں نے ۱۳۳۵ھ میں انتقال کیا۔

حشر میں کہتے پھرے ہم جلوہ اُس کا دیکھ کر ۔۔۔ حوصلہ یاں بھی نہ نکلا شوق خاطر خواہ کا

یاد رہ جائے گی فرقت کی یہ مجبوری بھی ۔۔۔ دم نہ ہم توڑ سکے موت پہ قابو نہ ہوا

تغافل کے گلے سُنکر جھکا لیں تم نے کیوں آنکھیں ۔۔۔ مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بیباک ہونا تھا

آپ کو بھول گئے دیکھ کے اُس بت کو جلال ۔۔۔ حق ادا ہو نہ سکا پھر بھی شناسائی کا

عاشق کو جلال آپ وہ فرما گئے ناشاد ۔۔۔ اس پر بھی تو کمبخت کو شاداں نہیں دیکھا

دعوے کرتے تو ہو وفا کا جلال ۔۔۔ دیکھو وہ شوخ سب سے وفا نہ سُنے

حشر میں چھپ نہ سکا حسرت دیدار کا راز ۔۔۔ آنکھ کمبخت سے پہچان گئے تم مجھ کو

پھر ہم اُن کے روٹھ جانے پر فدا ہونے لگے ۔۔۔ پھر ہمیں پیار آگیا جب وہ خفا ہونے لگے

اس دور میں ایک اور باکمال شاعر بھی قابل ذکر ہے یعنی نواب فقیر محمد خاں گویا لیکن اُن کی شاعری ناسخ کے رنگ سے متجاوز نہ ہو سکی۔

اب رہے امانت تو وہ تمثیلی شاعری کے لیے بہت ممتاز ہیں اُن کی اندر سبھا اپنے رنگ خاص میں منفرد ہے۔

اور بحر و سحر بھی واجد علی شاہی دور کے کامیاب شاعر ہیں۔ ان میں خالص لکھنوی رنگ موجود ہے اور جو شاعری کا رنگ امیر و اسیر کا ہے وہی بحر و سحر کا بھی ہے۔

واجد علی شاہ اختر بھی اس دور میں کامیاب شاعر تھے لیکن اصلیت و واقعیت سے اُن کو کوئی علاقہ نہ تھا۔

ہاں انھیں کے ہم نام اختر (قاضی محمد صادق) البتہ بلند پایہ شاعر تھے۔

ایک دوسرے بزرگ اسی دور میں حکیم محب علی بھی تھے جو مرزا غالب کے معاصر تھے اور اُن سے خط و کتابت بھی کرتے تھے۔ اُن کو محسن سے تلمذ تھا اور اس دور میں منشی احمد علی بلیغ بھی ایک بلند پایہ بزرگ تھے اور امیر حسن تسلی بھی کامیاب شاعر تھے جن سے مرزا غالب کی چشمک تھی۔ اس دور میں خواتین میں بھی ذوق سخن پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ عالم بہت مشہور ہوئیں۔ اور واجد علی شاہ کا پری خانہ تو نکیسر شعر تھا۔

لکھنوی شاعری کا خاکہ اگرچہ مصحفی اور انشا ہی کے زمانے میں قائم ہو چکا تھا تاہم اب تک شاعری کے

مختلف اسکول قائم نہ ہوئے تھے۔ لیکن ناسخ و آتش نے اس رنگ کو زیادہ نمایاں کیا۔ جب لکھنؤ اسکول قائم ہوا تو اُس کی خصوصیات یہ قرار پائیں۔

(۱) لکھنؤ کے تمدن و معاشرت میں عام طور پر نسائیت پیدا ہوگئی۔

(۲) شعرائے لکھنؤ اکثر نہایت سیر حاصل غزلیں لکھنے لگے جن کی انتہا بسا اوقات دو غزلہ سہ غزلہ اور چو غزلہ پر ہوتی تھی جس کا انجام یہ ہوا کہ تمام قوافی خواہ مخواہ باندھے گئے اور اس طرح بہت سے مبتذل مضامین بھی پیدا ہو گئے۔

(۳) شعرائے لکھنؤ کے کلام میں روحانی جذبات بہت کم پائے جاتے تھے اور محبوب کے خارجی اوصاف پر سر دُھنا جاتا تھا اور اُنکے کلام کو پڑھکر تغزل کا لطف بہت کم آتا تھا۔

(۴) رعایت لفظی کا عام میلان پایا جاتا تھا اور اس صنعت کو نہایت درجہ ابتذال کے ساتھ استعمال کیا گیا تھا۔

(۵) ابتذال بھی شعرائے لکھنؤ کا حصہ خاص رہا۔

(۶) معاملہ بندی شعرائے لکھنؤ کا حصہ خاص رہا جس نے اعتدال سے بڑھ کر بازاری رنگ اختیار کر لیا ہے اسلیے کلام میں متانت مفقود ہے۔

ان خصوصیات کے ساتھ شیخ ناسخ اور خواجہ آتش نے بھی علیحدہ علیحدہ اپنے مدارس قائم کر لیے تھے اور خود لکھنؤ میں شاعری کے دو مدارس قائم ہو گئے تھے اور دونوں کے مقابلہ و موازنہ کا مسئلہ شاعری کی تاریخ میں ایک اہم مسئلہ بن گیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ آتش کا کلام ناسخ سے زیادہ لطیف سبک اور شستہ تھا۔ ان کے اشعار رواں اور بندشیں چُست تھیں اور مضامین میں شوخی رنگینی اور رعنائی بھی پائی جاتی تھی اور زبان صاف و شُستہ تھی اور اُن کی شاعری عشق و محبت کے رموز کو بھی آشکارا کرتی ہے۔ خارجی مضامین میں بھی وہ بہت لطیف اور دلچسپ عنوان استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات کی لطافت آمیز سادگی نے بھی اُنکے کلام کو زیادہ مقبول بنا دیا ہے۔

لیکن یہ مدارس متاخرین کے دور تک علیحدہ قائم نہ رہ سکے۔ ناسخ کا رنگ تو خود اُنکے تلامذہ نہ نبھا سکے آتش کے تلامذہ نے بے شبہ اُس کو ترقی دی اور رند خلیل صبا اور شرف کے عہد تک یہ ترقی محدود رہی اس لیے متاخرین اساتذہ لکھنؤ یعنے امیر و جلال نے بحر برق رشک کی طرز میں کہنا شروع کیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے ابتدائی دور میں لکھنوی رنگ اس قدر مبتذل ہوگیا کہ ایک شعر بھی آج اس مجلس میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس تذکرہ میں منیر شکوہ آبادی کا ذکر قصداً نہیں کیا ہے کیونکہ وہ شکوہ آباد کے

رہنے والے تھے لیکن جملہ تذکرہ نگار منیر کو لکھنؤ کے اساتذہ سخن میں شریک کرتے ہیں اور وہ امیر و جلال کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ منیر بہت بلند پایہ شاعر تھے اُن کا اصلی ہنر رامپور میں کھلا۔
شیخ امیر اللہ تسلیم بھی اسی عصر کی یادگار تھے ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے اور نسیم کے شاگرد ہوئے مطبع نولکشور لکھنؤ میں تصحیح کتب کے لیے بیس روپیہ ماہوار پر نوکر تھے۔ ۹۶ سال کی عمر میں ۱۳۲۹ھ میں وفات پائی۔

ہائے کب تک نہ میں گھبراؤں گا اے دشت جنوں اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤں گا
محبت میں یہ بے رحمی کہ جینا ہو گیا مشکل خدا نا کردہ کیا ہوتا جو وہ کافر عدو ہوتا
اللہ رے اضطراب تمنائے دید یار اک فرصت نگاہ میں سو بار دیکھنا

امیر کے شاگردوں میں جلیل ریاض اصغر نے خاص شہرت حاصل کی لیکن جلیل نے امیر و جلال دونوں کا رنگ سخن اختیار کیا اور اصغر و ریاض اپنے اپنے رنگ میں منفرد ہیں۔
جلال کے شاگردوں میں اب سید انور حسین آرزو بے شبہ دور حاضر کے بہت کامیاب اور عمدہ شاعر ہیں اور تسلیم کے لیے ہی کیا کم فخر ہے کہ اُنھیں فضل الحسن حسرت موہانی ایسا باکمال شاگرد نصیب ہوا کہ جس کے سامنے اگلے سخنوروں کا بازار سرد ہو گیا اور چراغ ٹمٹمانے لگے۔
اس دور کے سب سے آخر ذیلی شاعر شرر اور نظم طباطبائی بھی ہو سکتے ہیں۔
اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ناسخ نے لکھنؤ کو بے حد بدنام کیا اور جس لغو شاعری کی بنیاد اُنھوں نے ڈالی وہ دور متاخرین تک علیٰ حالہ قائم رہی۔
لکھنوی شاعری میں اگر انیس و دبیر کا ذکر نہ کیا جائے تو غالبًا یہ تذکرہ نامکمل رہے گا مرثیہ گوئی میں انیس و دبیر کو جو شہرت نصیب ہوئی وہ کسی سے مخفی نہیں ہے اور اگر لکھنوی دبستان میں سوا انیس دبیر اور محسن کوئی دوسرا شاعر پیدا نہ ہوتا تو اُس کے لیے یہی کیا کم باعث فخر تھا کہ نعت اور مرثیہ اُسی کے دبستان سے نکلا اور کوئی دوسرا دبستان اس کا نقش ثانی پیدا نہ کر سکا۔ انیس و دبیر کو تو دہلوی کسی حد تک کہہ سکتے ہیں لیکن محسن تو خالص لکھنوی فضا کے پروردہ تھے گو ہادی علی رشک سے اصلاح لی تھی۔ ناسخی اسکول کے پیرو تھے لیکن پھر بھی اپنے رنگ سخن میں منفرد ہیں۔
گذشتہ ربع صدی میں ملک کا رنگ سخن بہت کچھ بدل گیا ہے اب غزلوں سے زیادہ نظموں کی جانب توجہ کی جانے لگی ہے لیکن اس دور میں بھی لکھنؤ اسکول کا اثاثہ اپنے رنگ مخصوص میں منفرد اور افضل ہے۔
لکھنوی شاعری میں علمائے کرام اور خانوادۂ اجتہاد نے بھی اردو ادب کی بہت نمایاں خدمات

انجام دی ہیں فرنگی محل کے خانوادۂ علم و فضل میں مولانا شمشاد لکھنوی مولانا رضا فرنگی محلی مولانا مجید فرنگی محلی مولانا حمید فرنگی محلی نے خاصا نام شاعری میں پیدا کیا اور اب بھی مولانا نجیب اللہ فرنگی محلی اور سحر البیان خطیب مولانا شہید انصاری کی شاعری عام سطح سے ضرور بلند ہوتی ہے۔ فرنگی محل کے نوجوان طبقہ میں ادیب انصاری اسد انصاری اور ظریف، وقت حکیم ارادت اللہ انصاری کی شاعری ملک میں کسی سے کم درجہ کی نہیں ہے بلکہ حکیم معراج الحق کی رفیقہ حیات کا ذوق سخن بہت بلند ہے اور اُن کے اکثر شعر شہر کے اکثر پختہ خیال شعرا سے بھی داد سخن لے چکے ہیں۔ چودھری خلیق الزماں صاحب کی بیگم زاہدہ خاتون اور جسٹس چودھری نعمت اللہ صاحب کی صاحبزادی بھی شاعری کے میدان میں کافی مشہور ہیں۔ اب لکھنؤ کی خواتین میں بھی ذوق سخن بہت بلند ہو گیا ہے اور وہ دن دور نہیں کہ خواتین کی نغمہ سنجیاں بھی ملک پر چھا جائیں گی ۔

خانوادۂ اجتہاد میں للن صاحب شاعر مولانا سبط حسن مرحوم مولانا ناصر حسین صاحب قبلہ کبن صاحب وغیرہ وغیرہ نے ہر ممکن حیثیت سے شاعری کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ نوابین اودھ میں شاعری سب نے کی لیکن آصف الدولہ اور واجد علی شاہ اختر خصوصیت سے بہت ممتاز ہیں اور خاتم السلاطین سلطان واجد علی شاہ اختر کا دربار تو یکسر شعر و شاعری کا مرکز تھا لیکن آصف الدولہ سے زیادہ صحیح رنگ تغزل کسی نے پیش نہ کیا۔

دورِ حاضر | دورِ حاضر میں ہم دو درجہ قائم کرنا چاہتے ہیں ایک درجہ تو اُن کا ہے جو اب اس بزم میں موجود نہیں ہیں اُن کی فہرست یہ ہے: ۔

شمشاد فرنگی محلی ۔ شبلی نعمانی ۔ شرر لکھنوی ۔ مضطر خیرآبادی ۔ رضا فرنگی محلی ۔ ریاض خیرآبادی پیارے صاحب رشید ۔ نادر کاکوری ۔ سفیر کاکوری ۔ عزیز لکھنوی ۔ محو لکھنوی ممتاز حسین عثمانی ۔ نظم طباطبائی برج نرائن چکبست ۔ مجید فرنگی محلی ۔ حمید فرنگی محلی اور رداں اناسی ۔

ان شعرا میں سب اپنے رنگ میں منفرد ہیں شمشاد کا رنگ قدیم ناسخی اسکول کا صحیح اتباع ہے۔ شبلی تاریخ کا مرد میدان ہے۔ مضطر امیر کے میکدہ سے سرشار ہو چکے تھے لیکن معاملات حسن و عشق کے پیش کرنے میں اُستاد سے بھی آگے تھے اور اُن کی بحر طویل نے اُن کو غیر فانی مقبولیت عطا کر دی۔ رضا فرنگی محلی شاعر سے زیادہ مولوی تھے۔ ریاض فن خمریات کے امام تھے رشید کی رباعیات میں سحر کارانہ حسن اُن کی غزلیات میں ہلکا یاسیت کا رنگ ایک مخصوص چیز تھی۔ نادر ۔ سفیر ۔ چکبست تقریبًا ایک ہی مدرسہ کے فارغ التحصیل طالب علم تھے۔ عزیز نے بے شبہ اُردو ادب کی خدمات انجام دیں یہ افسوسناک

حادثہ ہے کہ لکھنؤ والوں نے اُن کی صحیح خدمت نہ کی لیکن عزیز کے لئے یہی کیا کم باعث فخر ہے کہ انقلابی شاعر جوشؔ اور جذباتی شاعر آثرؔ اور رواںؔ اُن کے شاگرد ہیں۔ ممتاز حسین عثمانی طنزیہ شاعر تھے اور اپنی بساط بھر اُردو ادب کی جو خدمات انجام دیں اُس کا احاطہ یقیناً مشکل ہے۔ تاریخ گوئی میں شمس العلماء مولانا عبدالحمید فرنگی محلی کو جو ملکہ حاصل تھا اُس کا جواب اُن کے معاصر شعرا میں نہیں ملتا۔ رواںؔ کی شاعری حسرت سے متاثر ہے۔ شررؔ۔ نظمؔ اور رسواؔ یقیناً ملک کے عمدہ شاعر تھے اور انھوں نے اُردو ادب کی بڑی نمایاں خدمات انجام دیں۔

دوسرا درجہ | دوسرا درجہ اُن شعرائے کرام کا ہے جو بحمدہ بقید حیات ہیں۔ اُن میں امام المتغزلین حسرتؔ موہانی نواب فصاحت جنگ جلیلؔ مانک پوری۔ مرحوم[1] احسنؔ لکھنوی آرزوؔ۔ صفیؔ۔ تمناؔ لکھنوی۔ محشرؔ۔ ثاقبؔ۔ یاسؔ۔ آثرؔ۔ نیرؔ کاکوروی۔ آسیؔ۔ آلِ رضا رضاؔ۔ وصلؔ بلگرامی۔ نیازؔ فتحپوری۔ انند نرائن ملاؔ۔ جوشؔ ملیح آبادی۔ جگرؔ مرادآبادی افسرؔ میرٹھی۔ ظریفؔ لکھنوی۔ محبوبؔ زبیری۔ ہوشؔ ملیح آبادی۔ فرحتؔ کاکوروی۔ مسلمؔ کاکوروی۔ فروغؔ کاکوروی اصغرؔ گونڈوی۔ جلیلؔ قدوائی۔ شوکتؔ تھانوی۔ ذوقیؔ لکھنوی۔ عیشؔ کاکوروی۔ نشترؔ بلگرامی۔ غلیلؔ نہٹوری۔ نشترؔ سندیلوی۔ نانکؔ لکھنوی۔ ننھو صاحب شفیقؔ لکھنوی۔ مقبول احمد پوری۔ سراجؔ لکھنوی قدیرؔ لکھنوی۔ منظرؔ لکھنوی۔ آشفتہؔ لکھنوی۔ امیدؔ امیٹھوی۔ محبوبؔ لکھنوی (راجہ صاحب محمود آباد) کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

ان شعرا کا رنگ سخن بہت کچھ بدل گیا ہے۔ آسیؔ۔ نیازؔ۔ آفسرؔ بہت پختہ خیال شاعر ہیں۔ اور شاعر سے زیادہ ناقد اس لیے اُن کا کلام نقائص سے پاک ہے۔ جوشؔ انقلابی شاعر ہیں اور بنگالی شاعر خاص نذرالاسلام کے تراجم سے متاثر نظر آتے ہیں۔ جگرؔ شاعری میں اپنا وقار کھو چکے لیکن پھر بھی بہت سے گم کردہ شاعروں سے بہتر ہیں۔ آثرؔ البتہ ایک کامیاب شاعر ہیں میری ذاتی رائے یہ ہے کہ تغزل میں لکھنؤ میں آسیؔ کا جواب نہیں ہے۔ آرزوؔ کا مخصوص رنگ ہے اور جلالؔ کی جانشینی نے اُن کے لئے سونے پر سہاگہ کا کام کیا ہے۔ اصغرؔ کی شاعری عام شاہراہ شاعری سے ہٹی ہوئی ہے اور عام فہم نہیں ہے۔ گو تصوف و فلسفیانہ نکات سے اُن کی شاعری مملو ہے۔ استاذی علامہ نیرؔ و وصلؔ بھی رنگ سخن کو سنوارنے میں اپنا حق ادا کر رہے ہیں اور خصوصیت سے علامہ نیرؔ (نورالحسن نیرؔ خلف مداح رسول مولانا محسنؔ) نے تو اپنی عمر ہی اس فن میں گذار دی اور نوراللغات کو ملک کے سامنے پیش کیا۔ ناطقؔ بھی لکھنوی شعرا میں ایک مخصوص درجہ کے مالک ہیں اور اُن کے جانشین قدیرؔ بھی بہت خوش گو شاعر ہیں۔

شعرائے مستقبل | شعرائے مستقبل میں شوکتؔ تھانوی۔ امینؔ سلونوی۔ نانکؔ لکھنوی۔ روشؔ صدیقی۔ ہوشؔ ملیح آبادی

[1] افسوس کہ ۷ ستمبر کو حضرت نیر کا انتقال ہو گیا۔ ایڈیٹر

عیشؔ کاکوروی ۔مقبول احمد پوری ۔فرقتؔ کاکوروی ۔اسلمؔ لکھنوی ۔شمیمؔ کاکوروی ۔ دردؔ کاکوروی ۔ملا لکھنوی آزاؔ اجتہادی ۔ اعظم حسین اعظمؔ ۔شہنشاہ حسین آرمؔ ۔محبوب زبیری اور موجودہ والی محمود آباد خان بہادر راجہ امیر احمد صاحب محبوبؔ ۔ساجد حسین ساجدؔ کا پایہ بہت بلند اور ممتاز نظر آتا ہے اور عجب نہیں کہ جب آج کی بساط شاعری کل کے مہروں سے خالی ہو تو یہی آج کے پیادہ کل کے بادشاہ بن کر ملک سخن پر تاجداری کریں ملک میں اور بھی اچھے شاعر ہیں لیکن ابھی ایک عمر چاہیے جب تاریخ ادب اُردو میں اُن کا نقش قائم ہو سکے ۔گو ابھی اُن شعرا کا کلام ابتدائی مراحل سے نہیں گذرا ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُن کا کلام ترقی کی راہوں پر نمایاں ہے اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ آج کے نوجوان شعرا کل دنیاے شاعری میں سریر آرائے سلطنت نہ ہوں۔

آج لکھنوی شاعری جس منزل سے دوچار ہے وہ بہت لطیف اور دلکش ہے دہلی اسکول تقریبًا ختم ہو چکا ہے ۔لکھنؤ اسکول نے حالؔی کو ڈفالی بنا بنا کر اپنا رنگ سخن درست کر لیا ہے ۔اب یہاں کے ممتاز شعرا کے کلام میں میت ۔سوگواری ۔ وصل و ہجر ۔ انگیا ۔ چوٹی اور سینہ کوبی اور نوحہ خوانی کے جذبات نظر نہیں آتے ہیں جذباتی شاعری کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے ۔لیکن اب بھی بعض کہنہ مشق شعرا نے تصوف اور شاعری کے امتزاج سے ایک نہایت درجہ خطرناک شاعری کا رنگ پیش کیا ہے لیکن نوجوان شعرا اس رنگ کو قبول نہیں کر سکتے ۔اور شہود و غیر شہود قسم کی شاعری لکھنؤ کے دبستان میں فروغ نہیں پا سکتی ۔شکر ہے کہ ناسخؔ اور اُن کے معاصرین کی شاعری کی بلا اب لکھنؤ اسکول سے دور ہو گئی ہے اور آج لکھنؤ میں جو رنگ سخن مقبول ہے وہ حسرتؔ ۔آسیؔ ۔اثرؔ ۔آرزوؔ ۔آشفتہؔ ۔رضاؔ اور شوکتؔ ۔فرقتؔ و اسلمؔ کا رہین منت ہے اور امید ہے کہ یہ رنگ سخن ابھی اور بھی نکھرے گا اور اردو ادب میں دن دونی ترقیاں ہوں گی ۔

لکھنو شاعری کی داستان ختم ہو چکی روزانہ ادبی سیکڑوں سے تشنہ کامان علم سیراب ہو ہو کر نکل رہے ہیں ان تاسیسوں کے آغوش تربیت میں پلے ہوئے نوجوان شاعر حقیقی اور سنجیدہ شاعری سے باخبر نظر آرہے ہیں اور امید قوی ہے کہ ملک میں لکھنوی اسکول کا یہ رنگ سخن ہر آئینہ مقبول ہو گا۔*

* میرے زیر تالیف تذکرۂ شمیم سخن ؍شام اودھ کا یہ ادبی مقدمہ ہے جو بزم مسلم کلب لکھنؤ کے ایک جلسہ میں سنایا تھا — عزیزی غلام احمد فرقتؔ علوی سلمہ کی فرمائش سے الناظر کے تجربہ کار اور پختہ خیال اڈیٹر صاحب کے سپرد کیا جاتا ہے اگر یہ مضمون پسند کیا گیا تو انشاء اللہ اس تذکرہ کے کچھ اور اوراق بھی پیش کیے جائیں گے ۔

مشیر احمد علوی ناظرؔ کاکوروی

خمکدۂ ریاض

گذشتہ سال قیام حیدرآباد کے زمانہ میں شیخ ارشاد حسین صاحب واثق وکیل ہائیکورٹ سے نیاز حاصل ہوا۔ صاحب ممدوح خیرآباد کے متوطن ہونے کے علاوہ حضرت ریاض مرحوم سے شرف تلمذ بھی رکھتے ہیں۔ اور آپ کے پاس حضرت ریاض کا کچھ کلام خود اُن کے قلم کا لکھا ہوا بطور تبرک محفوظ ہے۔ ہم نے واثق صاحب کی عنایت سے اُس کی نقل حاصل کر لی ہے۔ کوئی چیز اگر پہلے کبھی چھپ چکی ہے تو تند مکرر کا مزہ دے گی اور جو غیر مطبوعہ ہے اُس کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ اسی میں سے ایک غزل یہاں درج ہے۔

شگفتہ پھول حسینوں کے ہار کے قابل ۔۔۔ جو خشک ہوں تو ہمارے مزار کے قابل

ہزاروں داغ دل داغدار کے قابل ۔۔۔ ہزاروں چاند سی شکلیں ہیں پیار کے قابل

یہ سُرخ سُرخ سی اک شے سیاہ بوتل کی ۔۔۔ بغیر ابر بھی ہے سبزہ زار کے قابل

مآل حشر میں کچھ ہو مرے گناہوں کا ۔۔۔ مجھے ہے ناز کہ نکلے شمار کے قابل

جو دل میں داغ نہ ہوتا تو پیش ہم کرتے ۔۔۔ یہ ایک لاکھ میں تھا نذر یار کے قابل

بہت ہیں گورغریباں کہاں کہاں سے چنوں ۔۔۔ ہزاروں ذرّے ہیں میرے مزار کے قابل

عبث ہے رشک جوانی کو میری پیری پر ۔۔۔ ملے خزاں کو جو دن تھے بہار کے قابل

مرے گناہ مرے اعتبار کے دشمن ۔۔۔ سفید ریش مری اعتبار کے قابل

خدا ہی جانے مرا راز مٹ کے میں کیا ہوں ۔۔۔ جو کچھ زباں سے نکالوں تو دار کے قابل

وہ بن کے آنکھ کی پُتلی رہے کرم اُن کا ۔۔۔ یہ چشم کور نہ تھی انتظار کے قابل

مزے کی چیز اُتاری خدا نے دنیا میں ۔۔۔ شراب تلخ ہے مجھ میگسار کے قابل

فلک کی تاروں بھری کہکشاں بُری کیا ہو ۔۔۔ یہ چادر اچھی ہے میرے مزار کے قابل

حسین کوئی نہ اُن کی بہار دیکھ سکا ۔۔۔ یہ داغ دل تھے کسی لالہ زار کے قابل

بڑے مزے سے گذرتی ہیں جو مل جاتے ۔۔۔ حسین شوخ دل بیقرار کے قابل

دباتی گور نہ کچھ زور آسماں چلتا ۔۔۔ زمین شعر نہ نکلی مزار کے قابل

ریاض کو نہ گھسیٹو یہ کہہ کے کانٹوں میں
کہ اس کے پاؤں نہیں نوک خار کے قابل

خدا اور معجزات سے ہیوم کا انکار

(جناب مولوی سید اختر علی صاحب تلہری)

اگرچہ ڈیوڈ ہیوم نے اپنے "فلسفۂ ارتیابیت" کا ایوان تعمیر کرتے وقت بشپ برکلے کے افکار و نظریات سے پورا فائدہ اٹھایا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو کچھ بیجا نہیں ہے کہ برکلے کا فلسفہ ہی حقیقت میں فلسفۂ تشکیک کے اس مجدد اعظم کی تخلیق کا باعث ہوا ہے تاہم مآل و نتیجہ کے لحاظ سے دونوں کے خیال میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایک پکا مذہبی ہے تو دوسرا متشکک محض۔ برکلے نے فلسفہ کی سنگلاخ وادی میں قدم ہی اسلیے رکھا تھا کہ الحاد و تشکیک کا خاتمہ کر دے۔ اُس کی نگاہ میں موجود مادہ (ہیولی) کا اقرار ہی تمام خرابیوں کی جڑ تھا۔ اسی سے خدا اور روح کے عقیدہ کو ضرر پہونچتا تھا اس لیے اُس کی کوششوں کا مرکز یہ رہا کہ مادہ کا وجود باطل کر دے اور یہ بتا دے کہ درحقیقت ایسی کوئی شئے دنیا میں موجود نہیں ہے جسے "مادہ" کہا جاتا ہے لیکن صرف مادہ کا وجود باطل کر دینے سے اُس کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اُس نے اس تخریبی کوشش کے بعد "روح برتر" کے عقیدہ کی عمارت اٹھانے کی کوشش شروع کی۔

اس میں شک نہیں کہ برکلے نے مادہ کے موجود نہ ہونے کے متعلق جو دلائل پیش کیے ہیں اُن میں فلسفیانہ ژرف نگاہی کافی طور سے موجود ہے لیکن "روح برتر" (ایک ایسی ہستی جو ہم میں مختلف تصورات کی تخلیق کرتی رہتی ہے) کے اثبات کے متعلق اُس نے جو دلائل پیش کیے ہیں اُن کی بساط متکلمین کے اُس طلسم الفاظ سے زیادہ نہیں ہے جس کا مضحکہ خود برکلے نے "مبادی" میں جابجا اُڑایا ہے۔ مادہ کے وجود کا جن دلائل کی بنا پر اُس نے انکار کیا ہے اُسی قسم کے دلائل اُس کی "روح برتر" کی عمارت بھی گرا دیتے ہیں اور اس لیے صحیح معنوں میں اُس کا "فلسفۂ تصوریت" تشکیک کا پشت پناہ ہے۔ برکلے کے دلائل کی روشنی میں ان سوالات کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دیا جا سکتا کہ روح کیا ہے؟ فکر و حیات اُس کے افعال ہیں یا ماہیت؟ وہ ازلی ہے یا حادث؟ انسانی روح اور روح برتر میں کیا تعلق ہے؟ روح برتر نفوس انسانیہ پر کیونکر متصرف ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

غرضکہ برکلے نے مادہ کا وجود مشکوک ثابت کر ہی دیا تھا۔ اب ہیوم کے لیے صرف یہی باقی رہا تھا کہ "شخصی خدا" کے اثبات کے متعلق جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں، انھیں بھی مشکوک ثابت کرے چنانچہ اُس نے

اس طرف بھی قدم بڑھایا اور اُس واحد دلیل کے ابطال کی کوشش کی جس پر مذہبی جماعت کو پورا اعتماد تھا۔ وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے کہ

اثبات باری کی دلیل اور ہیوم کا اُس سے تعرض

"مذہبی حکما قدیم روایات اور کلیسا کے نظریوں سے مطمئن نہ ہوتے ہوئے اس کوشش میں منہمک نظر آتے ہیں کہ مذہب کو اصول استدلال و قوانین عقل سے ثابت کریں لیکن اطمینان آفرینی کی کیفیت پیدا کرنے کے بجائے وہ شکوک و شبہات کی تخلیق کرتے ہیں۔ وہ دنیا کی حکیمانہ نظم و ترتیب اور اُس کی خوبصورتیوں کی بڑے شاندار عنوان سے تصویر کشی کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ سوال کرتے ہیں کہ عقل و دانش کا یہ بے مثال مظاہرہ کیا بے شعور اجزائے دمیقراطیسیہ کے اجتماع کا نتیجہ ہو سکتا ہے؟ یا محض اتفاق سے ایسی چیز وجود میں آسکتی ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ بڑی سے بڑی عقل کو نہیں ہو سکتا۔"

اس تمہید کے بعد ہیوم سلسلۂ بحث کو یوں بڑھاتا ہے۔

"اُس دلیل کی بنیاد فطرت کی نظم و ترتیب پر ہے۔ چونکہ اس نظم و ترتیب میں عقل و دانش کے آثار ملتے ہیں اس لیے بے شعور مادہ یا اتفاق کو اُس کا سبب نہیں کہا جا سکتا گویا یہ معلول سے علت کے متعلق استدلال ہے۔ کام کی نظم و ترتیب سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ اس کے موجد نے اسے پہلے سے سوچ سمجھ کر بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر بحث کا یہ پہلو تشنۂ استدلال رہ جاتا ہے تو جو نتیجہ نکالنا مقصود ہے وہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس دلیل پر نظر کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مظاہر فطرت سے جو واقعتاً نتیجہ نکلتا ہے اُس سے زیادہ آگے بڑھنے کا خیال نہیں ہے۔"

مؤیدین وجود باری کی دلیل کے مقدمات کی اس فی الجملہ تشریح کے بعد لکھتا ہے:۔

"جب ہم کسی معلول سے کسی خاص علت کے متعلق نتیجہ نکالتے ہیں تو ہمارے لیے ان دونوں میں توازن کا خیال رکھنا لازمی ہے۔ ہمیں اس کی کسی نہج سے بھی اجازت نہیں ہو سکتی کہ اُن اوصاف کے سوا جو معلول کی ایجاد کے لیے کافی ہیں علت کو دوسرے اوصاف سے متصف کریں۔ اگر علت معلول کی ایجاد کے لیے کافی نہیں ہے تو پھر یا تو اُس علت کو مسترد کر دینا چاہیے یا اُس علت میں اُن اوصاف کا اضافہ کرنا چاہیے جو اس معلول کی ایجاد کے لیے کافی ہوں لیکن اگر اُس علت میں مزید اوصاف بڑھا دیے گئے یا دوسرے معلولات کی ایجاد کے قابل بھی اُسے قرار دے لیا گیا تو یہ تخیل کی بے اعتدالی ہوگی جسے استدلال سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ قاعدہ یکساں طور سے جاری ہوگا خواہ بے شعور مادہ کو علت بنایا جائے یا کسی حکیم و دانشمند وجود کو۔ اگر علت کا علم محض معلول سے ہو رہا ہے تو پھر اس علت میں ان ضروری اوصاف کے

سوا جو اس معلول کی تخلیق کے لیے کافی ہیں ہم کسی صنعت سے اُسے متصف نہیں کر سکتے اور اسی طرح ہمیں اس کا بھی کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اُس علت کے سر دوسرے معلولات کی ایجاد کا سہرا بھی باندھ دیں۔ اگر ہم کسی مصور کی دلکش تصویریں دیکھیں تو اُن سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ وہ اچھا مصور ہے لیکن اُن سے یہ نتیجہ کیونکر نکل سکتا ہے کہ وہ ایک اچھا مجسمہ ساز بھی ہے؟

علت کو معلول کے متوازن ہونا چاہیے اور اگر ہم اس توازن کی صحیح حد بندی کر لیں گے تو پھر دوسرے اوصاف سے متصف کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوگا ورنہ اُس علت کو دوسرے معلول کی ایجاد کا خواہ مخواہ ذمہ دار قرار دینے کی حاجت ہوگی۔

ہم یہ تسلیم کیے لیتے ہیں کہ دنیا کا موجد خدا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ ماننا بھی لازمی ہے کہ ہم اُس میں اتنی ہی قوت اتنی ہی دانش اور اتنا ہی رحم فرض کر لیں جو اُس کے "یہ بحث کام" کے لیے ضروری ہے۔ اس سے زیادہ دلیل سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ استدلال کی خامیاں مبالغے سے پوری کی جائیں موجودہ حالت میں جن اوصاف کا نشان ملتا ہے اُن سے زیادہ موجود ماننے کی کوئی وجہ نہیں۔ اسی طرح یہ تجویز بھی کہ مستقبل میں اُن اوصاف کا کامل ظہور ہوگا اور اس کی خیالی صفات کاملہ کی مناسبت سے دنیا کا مکمل نظام سامنے آئے گا منطقی حیثیت سے غلط ہے۔

اس کا تمھیں کوئی حق نہیں کہ دنیا (معلول) سے خدا (علت) کی طرف اُڑو اور پھر وہاں سے دوسرے معلول کی طرف نزول کرو۔ تم نے ایک مظہر فطرت دیکھا اور اُس کا سبب تلاش کیا اور تم نے پھر سمجھ لیا کہ سبب پا بھی لیا مگر آخر میں تم اپنے اس دماغی مخلوق کے اتنے گرویدہ ہوئے کہ اُسے دوسری مکمل تر عظیم تر اور شریف تر اشیاء کا مستقبل میں موجد فرض کرنے لگے گویا موجودہ نظام جو بہرحال مکمل نہیں کہا جا سکتا اُس کے اوصاف کی مظہریت تامہ کی صلاحیت نہیں رکھتا۔"

ہیوم نے اسی عنوان سے اثبات باری کی مشہور دلیل کے متعلق اپنے خیالات ایک فرضی دوست کی زبان سے ادا کیے ہیں۔ ہیوم نے بظاہر تو اس بحث سے خدا کی قدرت کاملہ کا مسئلہ مندرش کر دینا چاہا ہے لیکن حقیقت میں یہ بحث خدا ہی کے انکار تک منجر ہوتی ہے۔

اُس کے خیالات سے صاف صاف یہ مترشح ہوتا ہے کہ اگرچہ خدا کی طاقت ہماری طاقت سے زیادہ ہے لیکن اعلیٰ معیار کے لحاظ سے محدود اور غیر مکمل ہے۔ ایسی صورت میں دنیا کو کسی ناتجربہ کار دیوتا کی ابتدائی بھدی مشق قرار دینا چاہیے جسے وہ خود بعد میں ترک کر دیگا۔ ہیوم کے اس نتیجہ سے کوئی مذہبی شخص کیونکر اتفاق کر سکتا ہے؟ ناقص و محدود علت (معلول خدا) نہیں کہی جا سکتی۔ خدا سے جب کامل مطلق اور غیر محدود

ہونے کے اوصاف علیحدہ کر لیے گئے تو پھر وہ خدا نہیں رہا۔

ہیوم کے اعتراض سے اجمالی بحث بادی النظر میں ہیوم کے یہ تشکیک آفریں خیالات ضرور حق کے ترجمان معلوم ہوتے ہیں لیکن نگاہ غور کا فتوے کچھ اور ہے۔

"وجود صانع" کے متعلق ہیوم نے جو بحث اٹھائی ہے وہ محل نظر ہے۔ معلول سے علت کے وجود پر جو دلیل لائی جاتی ہے اس میں اس "مابعد الطبیعیاتی نکتہ" کے ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ عالم (مجموعہ ممکنات) کا موجد بہر حال ممکن (جس کا وجود اور عدم ضروری نہ ہو) نہیں ہو سکتا کیونکہ تمام ممکنات کے مجموعہ کو معلول فرض کیا ہے لہذا علت اس میں داخل نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورت میں اس علت کو ممکن فرض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ سلسلہ ممکنات سے بہر طور خارج ہے اور جو موجود کہ ممکن نہیں ہے اس کا واجب الوجود (جس کا ہونا اس کی ذات کے لحاظ سے ضروری ہو) ماننا لازمی ہے اور جب ہم اس نتیجہ تک پہونچ گئے کہ اس عالم کا بنانیوالا "واجب الوجود" ہے تو ہمیں اسکا ماننا بھی ناگزیر ہو گیا کہ وجوب اپنی ذات کے لحاظ سے جن خصوصیتوں اور شرافتوں کو مقتضی ہو گا واجب الوجود کا ان تمام صفات و خصوصیات سے متصف ہونا لازمی ہے۔ عالم کو خواہ امکانیت کا نقش کامل قرار دیجیے خواہ ناقص لیکن جب اسے تسلیم کر لیا کہ اسکا بنانے والا واجب الوجود ہی ہو سکتا ہے تو اپنے وجود کی خصوصیت وجوب کے لحاظ سے صانع عالم کا کامل و مکمل۔ ہر طرح کے نقص کے شائبہ سے پاک ہونا ضروری ہے۔ علت و معلول کے توازن کا نظریہ مسئلہ کی اس مخصوص نوعیت میں کوئی تغیر پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر یہ ضروری نہوتا کہ ممکن کا اصلی موجد واجب الوجود ہی بن سکے تو ہیوم کے نظریات کا وزن مانا جا سکتا تھا۔ لیکن جب دلیل سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ممکن الوجود کی خالق وہی ذات ہو سکتی ہے جو واجب بنفسہ ہو تو پھر قدرت مطلقہ اور کمال مطلق کا اسکے لیے تسلیم کرنا ناگزیر ہے کیونکہ وجوب کا تخیل ان اوصاف سے علیحدہ ہو کر بے معنی ہو جاتا ہے۔

الحاد کا ایک حربہ اور اس کا دفعیہ اس میں شک نہیں کہ واجب الوجود کا تخیل یعنے ایسی شے کا نقشہ ذہن میں کھینچنا جس کا ہونا اسکی ذات کے لحاظ سے ضروری ہو جس پر عدم کسی حیثیت سے سابق نہ ہو یعنے کوئی زمانہ ایسا نہ فرض کیا جا سکے جس میں وہ نہ پایا جاتا ہو وہ عالم مطلق بھی ہو تا در مطلق بھی ناممکن ہے ـــ محدود قوت ادراک ایک لامحدود ہستی کا تصور کر ہی نہیں سکتی اور اسی لئے بہت سے لوگ اسکا انکار کر دیتے ہیں مگر اصلیت یہ ہے کہ مصنوعات کی حقیقت امکانیہ پر جب نظر کی جاتی ہے تو ان کے لیے ایک علت وجوبیہ کی احتیاج لازمی ہوتی ہے اور وجوب کی جو خصوصیتیں ہیں ان سے اس علت کا متصف ماننا ضروری ہو جاتا ہے۔ مانا کہ علت اپنی غیر معمولی خصوصیتوں کی وجہ سے ہمارے محدود قوائے ادراک میں

نہیں سماتی لیکن "خالص عقلی استدلال" ایسی ذات کا قطعی سراغ دیتا ہے۔ ہمارا یہ طرز عمل صحیح نہیں ہو سکتا کہ جو چیز ہمارے قوائے احساس کی زد سے باہر ہو ہم اُسکے وجود کا انکار کر دیں خواہ عقلی دلائل اُس کے وجود پر قطعی شہادت دیتے ہوں۔ میں تو گذارش کروں گا کہ جب تک ان دلائل کو رد نہ کر دیا جائے ہمیں اس کا بھی حق نہیں ہے کہ وجود باری کے متعلق ایک "متشکک ایک لاادریہ" کی حیثیت اختیار کر لیں۔

علم حاصل کرنے کا ذریعہ صرف تجربہ ہی نہیں ہے | وجود اشیا کے علم حاصل کرنے کا ذریعہ صرف تجربہ ہی نہیں ہے بلکہ دوسری دلیلیں بھی ہیں جو اس منزل میں شمع راہ کا کام دیتی ہیں۔

جرمنی کا مشہور فلسفی کینٹ اگرچہ استدلالی حیثیت سے وجود باری کا اقرار کرنا نہیں چاہتا تاہم اُس نے خالص استدلال" Reasoning apriori" کی ماہیت سمجھاتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اُس سے ہمارے خیال کی پوری تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے :-

"اُس میں تو کوئی شک ہی نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارا تمام علم تجربہ سے شروع ہوتا ہے۔ علم کی قوت خوابیدہ انھیں خارجی اشیا کی بدولت عمل کے لیے جاگتی ہے جو ہمارے حواس پر نظر انداز ہوتی ہیں اور ہم میں تصورات پیدا کرتی ہیں کچھ تو ذاتی طور سے اور کچھ اس عنوان سے کہ ہماری فہم کو اس پر آمادہ کر دیتی ہیں کہ وہ بعض تصورات کا بعض تصورات سے مقابلہ کرے اب خواہ اُن کو ایک دوسرے سے ملا کر یا ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے۔ اور ایسا کیوں کرتی ہے؟ صرف اس لیے کہ ہمارے محسوسات کا جو خام مصالحہ موجود ہے اُس کو علم کی صورت میں تبدیل کر دے۔ اس لیے زمانہ کی ترتیب کے لحاظ سے کوئی علم تجربہ پر سابق نہیں ہو سکتا اور ہمارا تمام علم تجربہ ہی سے شروع ہوتا ہے لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ تمام علم تجربہ ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ خالص علم وہی ہے جو تجربہ سے بے نیاز ہو۔ تجربہ ہمیں کبھی "کلیت مطلقہ" کا پتہ نہیں دیتا۔ وہ صرف یہی بتاتا ہے کہ جہاں تک ہمارے مشاہدہ کا تعلق ہے اس قاعدہ میں کوئی استثنا نظر نہیں آتا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی ایسا فیصلہ ہو جس میں "کلیت مطلقہ" پائی جاتی ہو اور کوئی استثنا اُس میں فرض ہی نہ کیا جا سکتا ہو تو اُس علم کو تجربی نہیں کہا جا سکتا۔ اُسے تجربہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسی صورت میں یہ ماننا لازمی ہے کہ انسانی علم میں ایسے فیصلوں کا ذخیرہ بھی موجود ہے جن میں "کلیت مطلقہ" پائی جاتی ہے اور اس لیے انھیں خالص علم (Reasoning apriori) قرار دیا جائے گا۔ اس علم کی مثالیں ریاضیات کے مسائل یا اس قسم کے مسائل ہیں جیسے کہ یہ کہا جائے کہ بغیر سبب کے تغیر نہیں ہو سکتا۔"

ہیوم کا معجزات سے انکار | ہیوم ایک متشکک فلسفی ہے۔ وہ جس "فکری اقلیم" سے گذرتا ہے تشکیک کا پھریرا اُڑاتا ہوا گذرتا ہے۔ اُس نے اپنے اعلیٰ فلسفہ میں علت و معلول کے تخیل کا بھی تار و پود بکھیر دیا ہے "معجزہ" بھی اگر نے

کچھ اسی قسم کے تشکیک آفریں حربے کیے ہیں چنانچہ اُس کے مجموعہ مضامین میں ایک مضمون معجزہ (Miracle) کے مبحث پر بھی موجود ہے۔

اس مقام پر اس بحث کے اہم پہلو مختصر لفظوں میں درج کیے جاتے ہیں۔ ہیوم کا خیال ہے کہ معجزہ چونکہ خارق عادت ہوتا ہے لہذا کسی امر کے معجزہ ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ عام اور مستمر تجربہ اسکے خلاف ہو کیونکہ اس صورت کے علاوہ اس پر معجزہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص جو دیکھنے میں تندرست ہے دفعۃً مرجائے تو اُسے معجزہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اگرچہ اس قسم کے واقعات روزانہ نہیں ہوتے لیکن پھر بھی ان کا وقوع ہوتا ہی رہتا ہے۔ البتہ اگر کوئی مردہ شخص زندہ ہو جائے تو اُسے معجزہ کہا جائے گا کیونکہ عام اور مستمر تجربہ اس کے خلاف ہے۔ چونکہ تجربہ کا استمرار اور عموم بذاتہ وقوع معجزات کے خلاف ایک مکمل ثبوت ہے اس لیے اس ثبوت کے باطل کرنے کے لیے ایک ایسے ثبوت کی ضرورت ہے جو اُس سے طاقتور ہو۔ اس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ معجزہ کے اثبات کے لیے ایسی شہادت کا موجود ہونا لازمی ہے جس کا دروغ ہونا اُس واقعہ سے زیادہ معجزنما ہو جس کے ثبوت میں اسے پیش کیا جا رہا ہے۔

اگر مجھ سے کوئی شخص یہ بیان کرے گا کہ فلاں مردہ زندہ ہو گیا تو میں اس پر غور کروں گا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ شخص دھوکا دے رہا ہو یا خود فریب میں مبتلا ہو گیا ہو۔ اگر اُس کی شہادت کا جھوٹا ہونا اُس واقعہ کی بہ نسبت جسے وہ بیان کر رہا ہے زیادہ معجزنما ہو تب میں جا کر اُس واقعہ کا یقین کروں گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم معجزات کے اعتقاد میں بہت زیادہ آزاد واقع ہوئے ہیں کیونکہ کسی معجزہ کے متعلق اس قسم کی قوی شہادت موجود نہیں ہے۔ تاریخ کسی ایسے معجزہ کو نہیں بتا سکتی جس کی شہادت کافی آدمیوں نے دی ہو اور وہ اشخاص پورے طور سے عقل سلیم و فہم مستقیم کے مالک ہوں کافی پڑھے لکھے ہوں تاکہ ہمیں یہ اطمینان ہو سکے کہ وہ فریب کا شکار نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لوگ غیر مشکوک ایمانداری و دیانت کے مالک ہوں تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ وہ دوسروں کو فریب نہیں دینا چاہتے۔ اُن کی شہرت بھی ایسی ہو کہ اگر اُن کے جھوٹ کا پتہ مل جائے تو اُسے سخت صدمہ پہونچے۔ ان شرائط کے ساتھ آخری شرط یہ ہے کہ ان تصدیق کنندہ واقعات کو بیباک عنوان سے ہونا چاہیے اور دنیا کے اُس خطہ میں ہونا چاہیے جہاں انکشاف حقیقت کی تمام سہولتیں میسر ہوں۔

ہیوم کے نزدیک یہ وہ شرائط ہیں جو ہمیں انسانی شہادتوں پر یقین دلا سکتے ہیں مگر اسکا دعوےٰ یہ ہے کہ کسی معجزہ کے متعلق اس قسم کی شہادت موجود نہیں ہے۔

اس مسئلہ شہادت کو مفصل طور سے لکھ کر اُس نے انسانی فطرت کی کمزوریاں بتائی ہیں اور یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ عجائب غرائب کے یقین کر لینے کی طرف کس قدر زیادہ مائل رہتا ہے اور پھر اس قسم کے

معجزات کا ظہور زیادہ تر جاہلوں میں ہوتا ہے۔ مسئلہ کے ان تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحث کر کے ہیوم نے یہ امر بھی واضح کیا ہے کہ ہر مذہب معجزات کا مالک ہے اور وہ انھیں اپنی صداقت کے ثبوت میں پیش کرتا ہے اس لیے اگر ہم معجزات کو مانتے ہیں تو ہر مذہب کو سچا تسلیم کر لینا پڑے گا لیکن کوئی مذہبی شخص اپنے مذہب کے سوا دوسرے مذاہب کو سچا ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔

معجزہ سے متعلق ہیوم کے نظریہ کی خامی

ہیوم نے معجزہ کے متعلق جس عنوان سے بحث کی ہے وہ بظاہر گمراہ کن ہے مگر حقیقت آشنا نگاہیں اس سے فریب نہیں کھا سکتیں۔ ہیوم کا خود جو اصل فلسفہ تشکیک ہے وہ ایک حیثیت سے اس کے اس زیر بحث نظریہ کو ضعف پہونچاتا ہے۔

ہیوم "مسئلہ تعلیل" کا منکر ہے۔ وہ کسی چیز کو کسی چیز کی علت نہیں مانتا۔ اگر آسمان پر ابر محیط ہو گیا اور پانی برسنے لگا تو وہ اس پانی برسنے کو ابر کا نتیجہ نہیں مانتا۔ اُس کے خیال میں یہ سب اتفاقی امور ہیں لزوم کا علاقہ سرے سے نہیں پایا جاتا۔ اُس نے مختلف طریقوں سے اس مسئلہ تعلیل کو باطل کیا ہے اور حقیقت میں علت و معلول کا انکار ہی اُس کے فلسفہ تشکیک کی اساس ہے۔ ایسی صورت میں محیر العقول امور کے واقع ہونے پر اسکے لیے کسی تعجب کا محل نہیں ہونا چاہیے۔ جب دو چیزوں میں علت و معلول کا علاقہ ہی نہیں فرض کیا گیا اور اب اگر وہ چیزیں ایک دوسرے سے منفک یا علیحدہ ہو کر واقع ہوں تو ہیوم کو شہادت کے جھمیلے میں پڑے بغیر اُن کا واقع ہونا تسلیم کر لینا چاہیے۔ یہ امر کہ اب تک ایسا نہیں ہوا مسئلہ تعلیل سے منکر ہونے کے بعد کسی زیادہ وزن کا مستحق نہیں رہ جاتا۔ اگر سورج نکلے اور اُس سے دھوپ اور حرارت نہ پیدا ہو بلکہ سرد لہریں دنیا میں پھیل جائیں تو "منکرین مسئلہ تعلیل" کے لیے اسے بلا پس و پیش مان لینا چاہیے کیونکہ سورج اور حرارت میں کوئی لزوم تو ہے نہیں۔ دونوں کا ساتھ ساتھ وقوع محض اتفاقی امر ہے۔ ایسی صورت میں اگر سورج کے ساتھ ٹھنڈک پائی جائے تو حیرت کی بات کیا ہے اور شہادت کے مسئلہ پر اس قدر زور دینے کی حاجت کونسی ہے۔

اس کے علاوہ ہیوم نے جس عام اور مستمر تجربہ کو علم کا ذریعہ قرار دیا ہے اور اس کے خلاف تحقیق زبردست شہادت چاہی ہے تو اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس "تجربی علم" کو اُس وقت تک علی الاطلاق کسی امر کے وقوع یا عدم وقوع کے یقین یا عدم یقین کا معیار نہیں قرار دیا جا سکتا جب تک کہ یہ نہ ثابت کر دیا جائے کہ یہ مکمل علم ہے اور جس قدر امکانات فرض کیے جا سکتے ہیں اُن سب کا لحاظ رکھا گیا ہے اور اب کسی ایسی شے کا جاننا باقی نہیں ہے جو اس عام اور مستمر تجربہ کی مخالف جانب کو تقویت پہونچاتا ہو اور جس قدر یہ علم نقصان و کمال کے درجات میں ہوگا اسی قدر شہادت کو قوی یا قوی تر بنانے کی ضرورت ہوگی۔

ہیوم نے جو شرائط شہادت کے قطعی بنانے کے لیے تجویز کیے ہیں اُن میں بھی کلام کی گنجائش ہے۔ اگر تشکیک کی لے کچھ اور اونچی کر دی جائے تو ان شرائط کی فراہمی کے بعد شہادت کے قطعی ہونے کا نتیجہ نکالنا محل بحث بنایا جا سکتا ہے۔

میں دوسرے مذاہب کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے جن معجزات پر حقیقۃً زور دیا ہے اُن کے متعلق اس قسم کی مستند شہادتیں موجود ہیں جو اذعان پیدا کر سکتی ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ معجزات کو اپنی صداقت کا واحد ثبوت نہیں مانتا۔ جو لوگ علمی حیثیت سے تربیت یافتہ اور عقلی شائستگی کے سرمایہ دار ہیں اُنھیں معجزات سے بحث کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ وہ اُس کی تعلیمات کو دیکھ کر اُس کے حق یا باطل ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ معجزات انبیا کے روحانی تصرفات کا ایک مخصوص عنوان قرار دیے جا سکتے ہیں اور بسا اوقات اپنی نوعیت کے لحاظ سے کچھ دماغوں کو ان معجز نما ہستیوں کے قدموں پر ڈال دیتے ہیں۔ اس سے زیادہ انھیں کوئی اہمیت نہیں ہے۔

جہان آرزو

(جناب منشی سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

گم ہے احساس خودی ہوش کے میخانے میں
بھر کے ساقی نے یہ کیا دے دیا پیمانے میں

رو نوع حُسن کہاں حُسن کے کاشانے میں
اُف لپک شعلے کی جلتے ہوئے پروانے میں

طلب بادۂ سر جوش میں غیرت کیسی
ہوش پہلے سے ڈبو رکھے ہیں پیمانے میں

سوزش دل نہ سہی شعلۂ رخسار سہی
جمع ہیں دونوں سواد ایک ہی افسانے میں

بندۂ حُسن نہیں عشق کا منکر اے شیخ
ایک بُت اور سہی دل کے صنم خانے میں

کیوں انا الحق وہ کہے واصل حق جو ہو جائے
کچھ ابھی بوئے خودی ہے ترے دیوانے میں

یاد کو مُردہ تمناؤں کی دل سے کیا کام
خاک اُڑانے کو بہار آئی ہے ویرانے میں

دل کا ٹوٹا ہوا شیشہ ہے زبان نیرنگ
ساری دنیا کے ہیں قصے مرے افسانے میں

آرزو خود مئے بے کیف میں آجائیگا کیف
اور کچھ دور گذار دا ابھی میخانے میں

میر انیس اور اُن کی شاعری

(جناب سید علی سردار جعفری صاحب متعلم مسلم یونیورسٹی)

سنہ ۱۲۲۰ھ کا خدا معلوم وہ کونسا مبارک دن تھا جب مشرق کا ایک بہترین شاعر منظرِ وجود پر آیا۔ یہ مادرِ ہند کا قابلِ فخر فرزند تھا۔ اُردو کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ ممکن ہے کہ لوگ اسے مبالغہ سمجھیں مگر یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی کہ اگر انیس کی ہستی اُردو شاعری کی دنیا میں پیدا نہ ہوتی تو آج ہماری شاعری کا دامن تقریباً خالی ہوتا۔ یہ صرف انیس تھا جس نے ہماری بے بضاعتی کی شرم رکھ لی۔ یہ صرف انیس تھا جس نے ہماری شاعری کی وسعتیں بڑھا دیں۔ یہ صرف انیس تھا جس نے اس بات کو ثابت کر دیا کہ اُردو زبان کو دنیا میں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اُردو کا دامن ابھی بہت کوتاہ ہے اسے اپنی طفلی کی معصوم منزلوں سے نکلے ہوئے ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی اس میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اردو کم مایہ نہیں ہے۔ اس کے دامن میں کچھ ایسے موتی بھی ہیں جن کی نظیر دنیا کی کوئی دوسری زبان پیش نہیں کر سکتی۔ اس کے ملقہ بگوشوں میں کچھ ایسی ہستیاں بھی ہیں جو نہ محض ہندوستان کے لیے بلکہ ساری دنیا کے لیے باعث افتخار ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے جس کا نام آتا ہے وہ انیس ہے۔

ظاہرا انیس صرف مرثیہ گو ہے۔ اُس کا مرغِ تخیل ایک محدود فضا کے اندر پرواز کرنے والا ہے لیکن حقیقتاً وہ ایک شاعر ہے۔ ایک مکمل آرٹسٹ ہے۔ قلم اس کے ہاتھ میں عصائے شاہی ہے جس سے وہ دنیائے ادب پر حکمرانی کر رہا ہے۔

انیس کی حقیقی عظمت تک پہونچنے کے لیے پہلے مرثیہ گوئی کی تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنی پڑے گی بغیر اس کے انیس کا اصلی درجہ نہیں پہچانا جا سکتا۔

حالی نے مرثیہ کی تعریف یہ کی ہے کہ "زندوں کی تعریف کو قصیدہ بولتے ہیں اور مُردوں کی تعریف کو مرثیہ کہتے ہیں"۔ یعنی جب کسی مرنے والے کی یاد میں کچھ کہا جاتا ہے تو اس بیان کو مرثیہ کہتے ہیں۔

مرثیہ کی ابتدا حیات انسانی کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ ترکِ اولیٰ کے بعد جب حضرت آدمؑ بہشت بریں سے اس عالمِ ارضی پر آئے اور آپ کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا تو بوڑھے باپ کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ زبان سے بیساختہ چند الفاظ نکل گئے جو کیفیاتِ قلب کا صحیح نمونہ تھے۔ یہ ایک

بے گناہ کی جوان مرگی کا مرثیہ تھا۔ اس لیے تمام اصناف سخن میں سب سے پہلے ایک پیغمبر کے ذریعے مرثیہ کی ابتدا ہوئی۔

مرثیہ کی اس قدامت کو دیکھتے ہوئے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ دنیا میں مرثیہ کو تمام اصناف سخن سے زیادہ وسیع اور بلند ہونا چاہیے۔ مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ عربی شاعری جس کی ابتدا مرثیے سے ہوئی آج جو سرمایہ رکھتی ہے اس میں مرثیہ کو کوئی خاص جگہ نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح فارسی میں مثنوی اپنے عروج کمال پر پہونچی ہوئی ہے یہ فخر صرف اُردو کو حاصل ہے کہ وہ مقتضائے فطرت کے موافق مرثیہ کو اپنے سر آنکھوں پر لیے ہے۔

عرب میں مرثیہ کی ابتدا۔ نشو و نما اور زوال

شبلی کا بیان ہے کہ "عرب میں چونکہ شاعری کی ابتدا اظہار جذبات سے ہوئی تھی اس لیے سب سے پہلے شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی جو سب سے قوی تر جذبہ کا اثر ہے"

ایام جاہلیت میں مرثیہ نے کافی ترقی کر لی تھی مگر کوئی مرثیہ بیس تیس شعر سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ چونکہ زیادہ تر مرثیہ وہی لوگ لکھتے تھے جن کے دل پر کسی مرنے والے کی جدائی کا کوئی خاص اثر ہوتا تھا۔ اس لیے اُن کا انداز بیان سیدھا سادہ اور دل پر اثر کرنے والا ہوتا تھا۔

اس زمانہ کے مرثیہ گو شعرا میں خنسا اور ابن نویرہ دو مشہور ہستیاں ہیں۔ مگر جب شاعری نے اپنا لباس بدلا اور وہ جذبات کی دنیا سے نکل کر کسب معاش کی دنیا میں آئی تو مرثیہ کو خود بخود زوال ہو گیا۔ لیکن مرثیہ ایک سرے سے ختم نہیں ہو گیا تھا۔ کہنے والے اب بھی کہتے تھے اور جن کے دل دُکھے ہوئے تھے اُن کی زبان سے کوئی نہ کوئی لفظ نکل ہی جاتا تھا۔ چنانچہ جناب سیدہ کے اکثر اشعار ہم تک پہونچے ہیں جو معصومہ کبریٰ کی زبان سے جناب رسالتمآب کی وفات پر بیساختہ نکل گئے تھے۔

واقعۂ کربلا کے بعد ممکن ہے کہ مرثیہ کو پھر عروج نصیب ہوتا اور بقول شبلی کے "اگر عرب کے اصلی جذبات موجود ہوتے تو اس زور کے مرثیہ لکھے جاتے کہ تمام دنیا میں آگ لگ جاتی" عرب کے جذبات اب بھی موجود تھے مگر اموی سیاست کی فضا انھیں راس نہ آئی۔ پھر بھی اس زمانے کے چند مرثیے کتابوں میں ملتے ہیں جو اہلبیت حسینی کے نام سے منسوب ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور جناب ام کلثوم کا وہ مرثیہ ہے جو آپ معظمہ نے اُس وقت پڑھا تھا جب قید شام سے رہا ہو کر مدینہ واپس آئیں۔ آپ فرماتی ہیں ؎

مدینۃ جدنا لا تقبلینا   فبالحسرات والاحزان جینا

اے نانا کے اُجڑے ہوئے مدینہ تو ہمارا آنا قبول نہ کر۔

یہ مرثیہ کوئی تیس شعر کا ہے جس میں کربلا کی تباہی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ جب یہ لٹا ہوا قافلہ

روضۂ رسول پر پہونچتا ہے تو جناب زینب بڑھ کر دروازے کا بازو تھام لیتی ہیں اور فرماتی ہیں۔

یاجداہ انا ناعیۃ لک اخی الحسین

اے نانا میں آپ کے پاس اپنے بھائی حسین کی سنانی لے کے آئی ہوں۔

اسی طرح امام زین العابدین اور جناب زینب کے مرثیہ ہیں۔ ام البنین کے بین ہیں۔ بشیر کے کچھ اشعار ہیں

یااھل یثرب لامقام لکم بھا		قتل الحسین بکربلا مدرار

اے اہل یثرب مدینہ اب رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ حسین کربلا میں شہید ہو گئے۔ ان کا سر تو نوک سناں پر چڑھا ہوا تھا اور جسد اطہر ریگ گرم کربلا پر مل رہا تھا۔

غالباً حسین کے سب سے پہلے مراثی یہی ہیں۔

بنی امیہ کے دور کے بعد عہد عباسی میں شاعری از سر نو زندہ ہوئی لیکن مرثیہ کی صنف اب بھی پس پشت ڈال دی گئی۔

ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے ہم بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ حقیقتاً عرب میں مرثیہ کو کوئی زیادہ ترقی نہیں ہوئی۔

مرثیہ کی یہی حالت ایران میں بھی تھی۔ فردوسی اور فرخی وغیرہ کے کچھ اشعار ایسے ملتے ہیں جنھیں مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔ اسکے علاوہ امیر خسرو اور شیخ سعدی کے مرثیے ہیں جن سے درد ٹپکتا ہے۔

عہد صفوی میں جب شاعری نے نیا قالب بدلا تو مرثیہ کی طرف بھی تھوڑی بہت توجہ کی گئی۔ براؤن کے بیان کے مطابق اس سلسلہ میں محتشم کاشی کا ہفت بند سب سے زیادہ مشہور اور مؤثر ہے۔ ہم یہاں اس کے دو بند نقل کرتے ہیں۔

برخوان غم چو عالمیاں را صلا زدند		اول صلا بسلسلۂ انبیا زدند
نوبت باولیا چو رسید آسماں تپید		زاں ضربتے کہ بر سر شیر خدا زدند
پس آتشے ز اخگر الماس ریزہا		افروختند و بر حسن مجتبےٰ زدند
وانگہ سرادقیکہ ملک محرمش نہ بود		کندند از مدینہ و در کربلا زدند
وز تیشۂ ستیزہ دراں دشت کوفیاں		بس نخلہا ز گلشن آل عبا زدند
بس ضربتے کزاں جگر مصطفےٰ درید		بر حلق تشنۂ خلف مرتضےٰ زدند
اہل حرم دریدہ گریباں کشادہ مو		فریاد بر در حرم کبریا زدند
روح الامیں نہادہ بزانو سر حجاب		تاریک شد ز دیدن او چشم آفتاب

ترسم جزاے قاتل او چوں رقم زنند — یکبار بر جریدۂ رحمت قلم زنند
فریاد ازاں زماں کہ جوانان اہلبیت — گلگوں قبا بعرصۂ محشر قدم زنند
از صاحب حرم چہ توقع کنند باز — آں ناکساں کہ تیغ بہ صید حرم زنند

پس برسناں کنند سرے را کہ جبرئیل
شوید غبار گیسوش از آب سلسبیل

اس مرثیہ میں وہ تمام جذبات موجود ہیں جو انسانیت کے پہلو میں واقعہ کربلا سے پیدا ہونے چاہییں۔ اس مقام پر میں قاآنی کے اس مرثیہ کے چند شعر پیش کرنا چاہتا ہوں جو ایک انوکھے انداز سے لکھا گیا ہے ؎

بارو چہ؟ خوں! کہ؟ دیدہ۔ چساں؟ روز و شب۔ چرا؟ — از غم۔ کدام غم؟ غم سلطان کربلا!
نامش چہ بود؟ حسین۔ ز نژاد کہ؟ از علی — مامش کہ بود؟ فاطمہ۔ جدش کہ؟ مصطفٰے
چوں شد؟ شہید شد۔ بکجا؟ دشت ماریہ! — کی؟ عاشر محرم۔ نہاں؟ نہ بہ ملا

اسی طرح سوال و جواب کرتا ہوا قاآنی واقعات کربلا کو بیان کر جاتا ہے۔

مرثیوں کے علاوہ ایران میں نثر و نظم کا اور سرمایہ بھی واقعۂ کربلا کے متعلق موجود ہے۔ مثلاً روضہ خوانی اور نوحہ خوانی وغیرہ۔ یا وہ متفرق اشعار جو قطرۂ اشک کی طرح کسی کے قلم سے بیساختہ ٹپک پڑے ہیں اس وقت مجھے قرۃ العین کا ایک شعر یاد آگیا جس میں اُس نے حسین سے اپنی عقیدتمندی ظاہر کی ہے ؎

من و عشق آں مہ خوبرو کہ چو شد صلاے بلا برو — بنشاط و قہقہہ شد فرو کہ انا الشہید بکربلا

اس کے علاوہ ظہوری کے کچھ مرثیے ملتے ہیں مگر ان کو کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ یہ ابراہیم عادل شاہ کی خوشامد میں لکھے جاتے تھے۔

فارسی میں مرثیہ کا جو رنگ ابتدا میں تھا اب بھی باقی ہے۔ اقبال نے اپنی اسرار و رموز میں چند اشعار مظلوم کربلا کے نام بھی لکھے ہیں۔

آں امام عاشقاں پور بتول — سرو آزادے ز بستان رسول
اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر — معنی ذبح عظیم آمد پسر
رمز قرآں از حسین آموختیم — ز آتش او شعلہا اندوختیم
شوکت شام و فر بغداد رفت — سطوت غرناطہ ہم از یاد رفت
تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز — تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز
اے صبا اے پیک دور افتادگاں — اشک ما بر خاک پاک او رساں

اس مقام پر میں اتنا بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ انیس نے اس انداز میں مرثیہ نہ کہہ کر اپنے سے معمولی دماغوں کی کمزوریاں چھپا دیں۔ آج اُردو کے شعرا جو نظمیں حسین کے دردانگیز واقعات پر کہہ رہے ہیں وہ فارسی مرثیہ کے مدمقابل لائی جا سکتی ہیں۔ نجم آفندی نے حسین کے سفر کی تصویر جن الفاظ میں کھینچی ہے نہایت مؤثر ہے

ملک عرب کا تپتا جنگل — دھوپ سے ذرہ ذرہ بیکل
تھر کی گرمی وقت ستم کا — خشک ہے پانی دیدۂ نم کا
رو بہ رضا ہیں چند مسافر — راہ حق میں صابر و شاکر
مصحف حق کے بکھرے پارے — فرش زمیں پر چاند ستارے

جوش ملیح آبادی نے اپنی مشہور نظم "ذاکر سے خطاب" میں جہاں امام حسین کی تعریف کی ہے وہ بے مثل ہے ؎

اے چراغ دودمان مصطفےٰ کی خوابگاہ — تیرے خار و خس سے ہے تابندہ خون بیگناہ
قوت باطل ملا سکتی نہیں تجھ سے نگاہ — آ رہی ہے ذرے ذرے سے صدائے لا الٰہ
اے زمیں خوش ہو کہ تیری زیب و زینت ہے حسین
تیرے سناٹے میں محو خواب راحت ہے حسین
جو دہکتی آگ کے شعلوں پہ سویا وہ حسین — جس نے اپنے خون سے دنیا کو دھویا وہ حسین
جو جواں بیٹے کی میت پر نہ رویا وہ حسین — جس نے سب کچھ کھو کے پھر کچھ بھی نہ کھویا وہ حسین
حسن کو اسلام کے جس نے دوبالا کر دیا
خون نے جس کے دو عالم میں اُجالا کر دیا
نطق جس کا زینت دین پیمبر وہ حسین — تھا جو شرح مصطفےٰ تصویر حیدر وہ حسین
لاکھ پر بھاری ہوئے جس کے بہتر وہ حسین — تشنگی جس کی جواب موج کوثر وہ حسین
وہ کہ خوش ہیں غم کو سانچے میں خوشی کے ڈھال کر
مسکرایا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

آج[1] کل کے ایک اور نوجوان شاعر کے چند شعر ہیں ؎

نینوا کے بن میں یہ شان الٰہی دیکھنا — کشمکش میں ہیں گناہ و بے گناہی دیکھنا
شام کا ہنگامہ سورج زرد منظر سوگوار — پھیلتی جاتی ہے دنیا میں سیاہی دیکھنا
وہ شفق سی خون کی پھولی گیا ظلمت کا دور — رنگ لائی ہے کسی کی بے گناہی دیکھنا

[1] زیبا ردولوی ۱۲

وہ نظر آتا ہے نیزے پہ درخشاں آفتاب — شام کا وقت اور یہ نورِ صبح گاہی دیکھنا
السلام اے کاروانِ عشق و میر کارواں — اس طرف بھی شاہراہ حق کے راہی دیکھنا
کیا فقط زیبا تھیں دیتا ہے اشکوں کا خراج — حشر تک ہر دل پہ اپنی بادشاہی دیکھنا

غرض عربی اور فارسی زبانوں میں مرثیہ کو کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی یہی حال ترکی زبان کا ہے۔

اردو میں مرثیہ کی ابتدا اور اصناف سخن کی طرح دکن میں پڑی لیکن ابھی تک یہ نہ معلوم ہو سکا کہ سب سے پہلے مرثیہ گو شاعر کون تھا ایک مضمون "دکن کے مراثی اور مرثیہ گو" ہندوستانی بابت اپریل ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا ہے جس کی رو سے سب سے قدیم مرثیہ گو جس کا کلام دستیاب ہوتا ہے محمد قلی قطب شاہ ہے۔ موجودہ معلومات یہیں تک ہیں۔ ممکن ہے کہ مرثیہ کی ابتدا اس سے بھی پہلے ہوئی ہو۔"

اس وقت میں دکنی مرثیوں کے ارتقا کے متعلق کچھ نہ کہوں گا۔ طوالت مانع ہے۔ صرف چند مثالیں دکنی مرثیوں کی لکھی جاتی ہیں تاکہ اندازہ ہو جائے کہ مرثیہ کا ابتدائی رنگ کیا تھا۔

ذوقی جو بارھویں صدی ہجری کا ایک مشہور مرثیہ گو ہے لکھتا ہے:-

اے شمع بزم مرتضٰے گھر آج آتے کیوں نہیں — تاریک ہے تم بن جہاں جلوہ دکھاتے کیوں نہیں

اشرف جو اسی دور سے تعلق رکھتا ہے اس کے بعض اشعار میں بیان کی صفائی قابل داد ہے ؎

ہوس گلگشت رضواں کی کرے کیوں عندلیب دل — محبت کی گلی میں شاہ دیں کے ہے وطن میرا
ہوا ہے بسکہ زخمی خنجر داغ غم شہ سوں — برنگ لالہ ہے لبریز خوں دل کا چمن میرا

ولی اورنگ آبادی:-

اے ہادی سنسار تو کیوں جا بسایا کربلا — اے واقف اسرار تو کیوں جا بسایا کربلا
اے نورِ چشم مصطفٰے فرزند شاہ مرتضٰے — اے دلبر خیر النسا کیوں جا بسایا کربلا
تو دوستاں کا جان ہے تیرا ذکر ایمان ہے — تجھ پر ولی قربان ہے کیوں جا بسایا کربلا

یہ تھا دکنی مرثیہ کا رنگ جبکہ سودا اور سکندر منظر عام پر آئے۔ مرثیہ جو پہلے دو مصرعوں میں کہا جاتا تھا پھر چار مصرعوں میں کہا جانے لگا۔ سودا اور سکندر نے اسے مسدس میں کہنا شروع کیا۔ ان دونوں میں اولیت کا شرف کسے حاصل ہے تحقیق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کی کوششوں نے مرثیہ گوئی میں ایک نئی طرز کا سنگ بنیاد رکھا جس پر ضمیر نے عمارت بنائی اور اس کی آرائش انیس ایسے صناع نے کی۔ چنانچہ مرثیے کے حسب ذیل اجزائے ترکیبی قرار پائے۔

(۱) چہرہ۔ بطور تمہید ابتدا میں شاعرانہ بلند پروازیاں۔

(۲) سراپا۔ جس کا مرثیہ کہا گیا ہے اس کے قد و قامت صورت شکل کا بیان۔
(۳) رخصت۔ مرثیہ کے ہیرو کا امام حسین سے میدان جنگ کے لیے اجازت طلب کرنا۔
(۴) آمد۔ ہیرو کا میدان جنگ میں آنا۔
(۵) رجز۔ ہیرو کا خود اپنا تعارف کرانا۔ اپنے حسب و نسب پر فخر کرنا۔ اپنے اور اپنے اسلاف کے کارناموں کو بیان کرنا۔
(۶) جنگ۔ دشمن سے مقابلہ۔
(۷) شہادت۔ تلوار کے جوہر دکھا کر شہید ہونا اور امام کو پکارنا۔
(۸) بین۔ اس کی لاش پر اس کے عزیز و اقربا کا گریہ و بکا کرنا۔

یہ تمام چیزیں انیس کے یہاں موجود ہیں مگر ہر جگہ اسی ترتیب سے نہیں۔ حسب موقع ان کی ترتیب میں رد و بدل کیا گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب میں انیس کی خصوصیات شاعری سے بحث کرتا ہوں۔

کہا جاتا ہے کہ مرثیہ کی خوش قسمتی تھی کہ اسے انیس جیسا شاعر ملا اور یہ انیس کی بدقسمتی تھی کہ اُسے مرثیہ جیسی صنف سخن اختیار کرنا پڑی مجھے اس سے تھوڑا سا اختلاف ہے۔ یہ یقیناً مرثیہ کی خوش قسمتی تھی کہ اسے انیس جیسا باکمال ہاتھ آیا، مگر یہ غلط ہے کہ انیس بدقسمت تھا جو اس کے حصے میں مرثیہ آیا۔ میرے نزدیک ایک آرٹسٹ کا کمال یہ ہے کہ وہ پست چیزوں کو بلند کر دے۔ جس طرح عطر کی خاصیت ہے کہ جس شے سے مس ہو جائے اُسے مہکا دے۔ ایک آرٹسٹ بدتر سے بدتر شے کو بھی اپنے ظرف کی عظمت اور طبیعت کی ہمہ گیری سے رفیع المرتبت بنا دیتا ہے۔

انیس سے پہلے مرثیہ کا جو رنگ تھا اس کا ذکر ہو چکا ہے اگر انیس اس ڈگر پر چلتا تو اتنا کامیاب نہ ہوتا کیونکہ اس کی فضا انیس کے تخیل کی پرواز کے لیے جیسے فلک پیما کہنا چاہیے بہت محدود تھی اس لیے انیس نے اپنے واسطے ایک نیا راستہ نکالا اور مرثیہ کو رزم و بزم کا جامہ پہنا کر ایک نئی صورت بخش دی۔

انیس کے مرثیوں کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ وہ نہ محض رزمیہ شاعری کا استاد تھا بلکہ اس کا کلام تقریباً ہر صنف سخن پر حاوی ہے۔

رباعی کا تو کچھ ذکر نہیں کہ بقول آزاد کے وہ بات چیت تھی۔ سلاموں میں اتنا تغزل موجود ہے کہ اگر چند شعر نکال دیے جائیں تو غزل معلوم ہوتے ہیں ؎

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لیے شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لیے

صدا ہے فکر ترقی بلند بینوں کو ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو
پڑھیں درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو خیال صنعت صانع ہے پاک بینوں کو
یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے چُنا ہے جامۂ ہستی کی آستینوں کو
لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اس کے علاوہ میر صاحب کے مراثی میں بھی بعض بعض جگہ تغزل پایا جاتا ہے۔

لہجہ سُنو زبان فصاحت نواز کا تار نفس میں سوز ہے مطرب کے ساز کا
یوں تخت حسینان معانی اُتر آئے ہر چشم کو پریوں کا اکھاڑا نظر آئے
ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے زیب ہے خال سیہ چہرۂ گلرو کے لیے

داند آنکس کہ فصاحت بکلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

اس بند میں کس قدر تغزل ہے ؎

کچھ پھول تو دکھلا کے بہار اپنی ہیں جلتے کچھ سوکھ کے کانٹوں کی طرح ہیں نظر آتے
کچھ گل ہیں کہ پھولے نہیں جامے میں ساتے غنچے ہیں کچھ ایسے کہ جو کھلنے نہیں پاتے

بلبل کی طرح روتے ہیں فریاد و فغاں سے
کچھ بس نہیں چلتا چمن آرائے جہاں سے

مرثیہ میں رزم بھی ہے اور بزم بھی۔ نیچرل شاعری بھی ہے اور ڈرامہ کا رنگ بھی۔ مثنوی کا سا تسلسل بھی ہے اور قصیدہ کی سی بلند پروازی بھی اور جہاں لشکر شام کا ذکر کیا ہے وہاں ہجو کا رنگ بھی موجود ہے ؏

ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

یعنے انیسؔ کی بدولت دنیا کی تمام زبانوں میں صرف اُردو زبان کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس میں ایک ایسی صنف سخن موجود ہے جس میں تمام اصناف سخن سما گئی ہیں۔

فردوسیؔ کی ساری عمر کا سرمایہ ساٹھ ہزار اشعار ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ تعداد صرف اس لیے ہے کہ فردوسیؔ کو ہر شعر پر ایک اشرفی ملنے کی امید تھی ورنہ یہ تعداد اور بھی کم ہوتی مگر انیسؔ کو کوئی لالچ نہیں تھا

پھر بھی اس کے اشعار کی تعداد ڈھائی لاکھ بتائی جاتی ہے۔

انیس کا جتنا کلام اس وقت ہمارے سامنے ہے اس پر شاہد ہے کہ نظیر اکبر آبادی کے بعد اردو زبان کے سب سے زیادہ الفاظ انیس نے استعمال کیے ہیں اور اس قدر خوبصورتی اور خوش سلیقگی کے ساتھ کہ جس کا جواب نہیں۔ حالی نے لکھا ہے "زبان کا ایک معتد بہ حصہ جس کو ہمارے شاعروں کے قلم نے مس تک نہیں کیا تھا اور جو محض اہل زبان کی بول چال میں محدود تھا (انیس نے) اس کو شعرا سے روشناس کرا دیا۔" اس کے بعد مولانا تحریر فرماتے ہیں "آج کل یورپ میں شاعر کے کلام کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاتا ہے کہ اس نے اور شعرا سے کس قدر زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کیے ہیں اگر اس کو معیار کمال قرار دیا جائے تو بھی ان کو اُردو شعرا میں سب سے بڑا ماننا پڑے گا۔"

فصاحت اور بلاغت کا وہ سرمایہ جو انیس کے یہاں موجود ہے اردو زبان کے کسی شاعر یا ادیب کے یہاں نہیں۔ انیس کا اُردو جیسی بے تربیت و محدود زبان میں یہ حال ہے اگر اُسے عربی جیسی قدیم و ترقی یافتہ زبان مل جاتی تو وہ اُسے نہ معلوم کیا سے کیا بنا دیتا۔

فصاحت اور بلاغت دو علیحدہ چیزیں ہیں مگر ایک دوسرے سے اتنی قریب ہیں کہ اُن کے درمیان حد فاصل قائم کرنا بے حد دشوار ہے۔ فصاحت ایک حد تک اکتسابی ہو سکتی ہے اس لیے اس کی تعریف بھی ممکن ہے مگر بلاغت چونکہ فطری اور وجدانی چیز ہے اس لیے وہ الفاظ کے شکنجہ میں نہیں کسی جا سکتی۔ چونکہ فصاحت کا تعلق نشست الفاظ اور ان کی ہم آہنگی سے ہے اور بلاغت کا تعلق معنی سے ہے اس لیے اگر فصاحت کو موسیقی کے سروں سے تعبیر کیا جائے تو بلاغت موسیقی کے اس چھوٹے سے وقفے کو کہیں گے جس میں لاتعداد معنی پنہاں ہوتے ہیں۔ راگ اور راگنی سمجھائی جا سکتی ہیں ان کی ایک دوسرے سے ہم آہنگی ذہن نشین کرائی جا سکتی ہے ان کے زیر و بم کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے مگر ان کے اثرات جو ایک لمحہ کے خفیف سے سکوت سے پیدا ہو جاتے ہیں انھیں صاحبان فن اور صاحبان ذوق صرف محسوس کر سکتے ہیں۔ اس لیے وہ جو انیس کی فصاحت کے قائل ہیں انھیں اس کی بلاغت کا بھی اعتراف کرنا پڑے گا۔ انیس کا پورا کلام فصاحت اور بلاغت کا بہترین اور جامع مرقع ہے۔

انیس کے بعض اشعار میں یہ خصوصیت ہے کہ ان کے پڑھنے کے بعد کوئی ایسی تصویر نگاہوں کے سامنے پھر جاتی ہے جن کا ان اشعار میں اشارتاً یا کنایتاً کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ جناب عباس کے ایک مرثیہ کا پہلا مصرعہ ہے ع

آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی

اس مصرعہ میں فوج شام کا ذکر ہے نہ اس کی حالت کا تذکرہ۔ لیکن پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاروں طرف سناٹا چھایا ہے، اور رعب و جلال سے شامی لشکر پیچھے ہٹا ہوا کھڑا ہے۔

اسی مرثیہ میں آگے چل کر کہتے ہیں ؎

ہاں نورِ چشمِ فاتحِ خیبر قریب ہے — لو وارثِ کشندۂ عنتر قریب ہے

ان کو پڑھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا شہسوار گھوڑا اُڑاے ہوئے چلا آرہا ہے اس کے ساتھ ہی پہلے مصرعہ میں "ہاں" کا لفظ اور دوسرے مصرعہ میں "لو" کا لفظ گھوڑے کی رفتار ظاہر کر رہا ہے۔

حر کی میدان میں آمد کے موقع پر لکھا ہے ؎

برچھیوں اُڑتا تھا دب دب کے فرس رانوں سے — آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

ان دونوں مصرعوں میں حر کی نشست کا کوئی ذکر نہیں ہے مگر ان کے پڑھنے کے بعد یہ یقین ہو جاتا ہے کہ حر تنا ہوا بیٹھا ہے۔ پہلا مصرعہ سوار کی ہیبت تنومندی اور گھوڑے کی شوخی پر شاہد ہے اور دوسرا مصرعہ خیام اہلبیت سے دریا کی دوری کو ظاہر کر رہا ہے ورنہ آنکھ لڑ جانے کے کوئی معنی نہیں۔ اس کے علاوہ آنکھ لڑ جانے کے الفاظ سے ایک قسم کی شجاعت ٹپک رہی ہے۔

ایک دوسرے مرثیہ میں میر صاحب لکھتے ہیں ؎

اس فوج میں تو ہے یہ تزلزل یہ انتشار — ہتھیار ادھر لگائے ہیں عباس نامدار
مضطر ہیں بیبیاں، شہ والا ہیں بیقرار — بھائی کے مُنھ کو دیکھ کے روتے ہیں بار بار
بیٹا کھڑا ہے چاک گریباں کیے ہوئے
روتی ہے سوکھی مشک سکینہ لیے ہوئے

انیس نے اس بند میں جو تصویر کھینچی وہ یہ ہے کہ عباس جنگ کی تیاری کر رہے ہیں اور تمام اعزا انھیں گھیرے ہوئے ہیں مگر آخری دو مصرعے ؎

بیٹا کھڑا ہے چاک گریباں کیے ہوئے — روتی ہے سوکھی مشک سکینہ لیے ہوئے

اس پر شاہد ہیں کہ عباس اس وقت استقلال کی مجسم تصویر بنے ہوئے ہیں۔

ایک شخص جنگ پر جانے کے لیے آمادہ ہے اور اپنے جسم پر ہتھیار سج رہا ہے۔ اس کے گرد اس کے اعزا کھڑے ہوئے ہیں۔ ایک بوڑھا بھائی ہے جو بھائی کی صورت دیکھ کر روئے دے رہا ہے اور کچھ رقیق القلب عورتیں ہیں جن کی بیقراری کا بیان الفاظ میں ممکن ہی نہیں۔ سامنے بیٹا کھڑا ہے جس کا گریباں چاک ہے۔

ان کے علاوہ ایک بھتیجی ہے جو سوکھی ہوئی مشک پر مُنھ رکھے ہوئے رو رہی ہے ۔ پیاس ایک طرف اور چچا کی جُدائی دوسری طرف ۔ ننھی سی بچی ایک کشمکش میں ہے وہ سوچ رہی ہے کہ چچا کو پانی لینے کے لیے جانے دے (مگر اس میں جان کا خطرہ ہے) یا پیاس برداشت کرے اور چچا کو روک لے وہ کچھ فیصلہ نہیں کر سکتی اور سوکھی ہوئی مشک پر مُنھ رکھ کے رونے لگتی ہے ۔ وہ کونسا شفیق القلب انسان ہوگا جو اس منظر کو دیکھ کر بیتاب نہ ہو جائے گا ۔ مگر "ہتھیار ادھر لگائے ہیں عباس نامدار" گویا یہ سب باتیں اس پر کچھ اثر نہیں کر سکتیں جو راہ حق میں جان دینے جا رہا ہے ۔

یہ ہیں وہ مقامات جہاں انیس اپنی قادر الکلامی کا مکمل ثبوت دیتا ہے ۔ یہ محض چند بند ہی ایسے نہیں ہیں بلکہ انیس کا کلام ان خصوصیات سے بھرا پڑا ہے ۔ وہ ایک واقعے کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دیتا ہے مگر نہ معلوم کیا ترکیب ہوتی ہے کہ اُس وقت کے تمام مناظر خود بخود آنکھوں میں پھر جاتے ہیں ۔

(باقی)

دل کے ٹکڑے

(جناب الحاج مولوی عبد الوہاب صاحب شوق دہلوی مقیم مکہ معظمہ)

تیغ حق نے آپ کی باطل کے ٹکڑے کر دیے
حق تو یہ ہے مشرکوں کے دل کے ٹکڑے کر دیے

ہائے ظالم تو نے میرے دل کے ٹکڑے کر دیے
کیا کہوں کس جوہر قابل کے ٹکڑے کر دیے

مَیں گیا تھا کرکے دل پتھر کا اُسکے سامنے
اک نگہ میں اُس نے میرے دل کے ٹکڑے کر دیے

زندۂ جاوید ہے قاتل تری بسمل کی روح
کیا ہوا گر تو نے آب و گل کے ٹکڑے کر دیے

کس قیامت کی ہے طوفان حوادث کی یہ موج
کشتیاں تو کشتیاں ساحل کے ٹکڑے کر دیے

سخت جانی کا بھلا ہو کچھ تو بدلہ لے لیا
مرتے مرتے خنجر قاتل کے ٹکڑے کر دیے

گر یہ کشتن روز اول پر کیا تم نے عمل
جو سوال وصل پر سائل کے ٹکڑے کر دیے

جا پڑی در پردہ لیلیٰ پر جو مجنوں کی نگاہ
اُس نے خود ہی پردۂ محمل کے ٹکڑے کر دیے

عشق کے پہلے سبق میں سب کتابیں پھاڑ دیں
عمر بھر کی سعی لاحاصل کے ٹکڑے کر دیے

ایک عالم کہہ رہا تھا ساقی و مے کو بُرا
سُنتے ہیں رندوں نے اُس جاہل کے ٹکڑے کر دیے

کافروں کا جب خدا کے گھر پہ قبضہ ہو گیا
شوق نے جھنجھلا کے اپنے دل کے ٹکڑے کر دیے

نیاز صاحب کی جرأت بیجا

(جناب منشی بانک چند صاحب عشرت ایم۔اے، مولوی فاضل، معلم لائل کالجیٹ اسکول لائلپور)

جناب نیاز ایڈیٹر "نگار" چند سالوں کی مشق سے ایک رنگین نثر لکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور اسی رنگینی کے پردے میں ان کی شخصیت کی خامیاں چھپی ہوئی تھیں۔ خدا بھلا کرے کتب خانہ بھوپال اور دار الترجمہ حیدرآباد کا جن کی مدد سے آپ کچھ تاریخی باتیں اور ایک آدھ انگریزی لفظ مع اُس کے عربی مترادف کے لکھ لیتے ہیں۔ اس سے نقائص دھری ہو گئی تھیں اور آپ کا اصلی روپ سامنے نہیں آ سکا تھا۔ لوگوں کو اشتباہ ہونے لگا تھا کہ نیاز صاحب شاید کچھ سمجھ دار ہیں۔ مگر ان کی شامت کہ اُنھوں نے اپنی رنگینی تحریر کی کھال پہن کر اپنے احاطے سے باہر قدم نکالا۔ اگر اپنے احاطے میں بیٹھے حد نثاری ہی میں رہتے تو چنداں ہرج نہ تھا مگر آپ بلاغ تنقید شاعری میں پہونچ گئے۔ اور اپنی اصلی آواز نکالی۔ بس کیا تھا پتہ چل گیا کہ شیر کی کھال پہنے کوئی بول رہا ہے۔

اصغر صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا تھا اور صحیح فرمایا تھا کہ ناقد چاہے کلام کے حسن و قبح کو ظاہر نہ کر سکے لیکن وہ اپنے کو ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بہر حال پتہ چل ہی گیا کہ ڈھول کے اندر پول ہی پول ہے شعر فہمی عالم بالا شد۔

نیاز صاحب نے "نگار" ماہ مارچ ۱۹۳۶ء میں اصغر صاحب کے "سرود زندگی" پر تنقید کرنے کی جرأت بیجا فرمائی ہے "جرأت بیجا" اس لیے کہ ناقد ہونے کی اہلیت آپ میں قطعی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ کبھی آپ نے چند غزلیں بھی لکھی ہیں۔ اور بجائے خود اُستاد ہیں۔ اُردو کے عام اساتذہ کی طرح اصلاح دینے کا آپ کو خبط ہے۔ شاید اسی خبط کا نتیجہ ہے کہ آپ نے یہ تنقید لکھی۔ کیونکہ آپ نے جا بجا اصلاحیں بھی دی ہیں۔ مگر جب وہ اصغر صاحب کے اشعار کو سمجھ ہی نہیں پاتے جیسا کہ خود اُن کو اعتراف ہے، تو اصلاح کیا دے سکتے تھے۔ اصلاح دینا مشکل کام ہے۔ وہ شخص یہ کام نہیں کر سکتا جس کے پاس چند مفروضات اصلاح کے علاوہ جو مدتوں اُستاد کی جوتیاں سیدھی کرنے پر ملی ہیں اور کچھ نہ ہو۔ کیونکہ آج کل کی ادبی دنیا اس سے بہت کچھ آگے نکل گئی ہے۔

آپ اسی تنقید کے سلسلہ میں لکھتے ہیں "اصغر صاحب اپنے اخلاق کے لحاظ سے باوجود تقشف مذہبی نہایت نیک نفس انسان ہیں اور اپنے اعمال اور اوراد کے لحاظ سے اچھے خاصے مرد متورع۔ اسلئے اُصولاً

انھیں شاعری سے کوئی خاص لگاؤ نہ ہونا چاہیے تھا"

اس کے معنے یہ ہوئے کہ ادبیات کا یہ ایک مسلم الثبوت اصول ہے کہ جس شخص کے اعمال و اخلاق نیک ہوں وہ شاعر نہیں ہو سکتا۔ بیشک نیاز صاحب کے حلقہ خاص میں جہاں بداعمالی اور بداخلاقی شاعر کے لیے جزو لاینفک ہیں یہی اصول ہونا بھی چاہیے تھا ایسے لوگوں کے سامنے اصغر صاحب نے ہمیشہ سپر شاعری ڈال دی ہے۔ وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں اپنے کو شاعر کہنا ہی نہیں چاہتے۔

آگے چل کے نیاز صاحب رقم طراز ہیں کہ "خوش قسمتی سے وہ (اصغر صاحب) صاحب حال و قال صوفی بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ جب ایک صوفی "حال" سے گذر کر "قال" میں آتا ہے تو وہ اکثر شعر ہی کہتا ہے اور صرف اپنے لیے یعنی وہ خود کہتا ہے اور خود ہی سمجھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ اصغر صاحب کی شاعری کا بھی اکثر حصہ اسی قسم کا ہے ....."

یہ صحیح ہے کہ حال کی بات قال میں جوں کی توں نہیں آ سکتی۔ الفاظ اسکے حامل ہو ہی نہیں سکتے۔ اسلیے شاعر اس موقع پر اشارات کرتا ہے۔ جس میں بصیرت ہے، وہ سمجھ لیتا ہے اور جو کور سواد ہے وہ اپنی کوتاہی فہم کا رونا رویا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ حافظ۔ سعدی۔ خیام وغیرہ صوفی شعرا کے اب تک پرستار رہے ہیں۔ یورپ کی مختلف زبانوں میں اُن کے ترجمے ہو رہے ہیں۔ مگر نیاز صاحب کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے صوفی شعرا کا کلام بے معنی اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے ختم اللہ علیٰ قلوبہم کا مصداق اس سے بہتر نہیں مل سکتا۔

بہر حال نیاز صاحب کے لیے اگر صوفیانہ شاعری یا "ہمہ اوست" کا خیال ماورائے فہم ہے تو رہنے دیں۔ اور اُن کا یہ خبط کہ "غزل نام ہے اُن باتوں کا جو گوشت و پوست والے عاشق اور گوشت و پوست والی معشوقہ کے درمیان ہوا کرتی ہیں" اُن کو مبارک رہے مگر مجھے تو اعتراض اُن کی اس ادا پہ ہے کہ اُنھوں نے اصغر صاحب کے نہایت عمدہ عمدہ اشعار کو مہمل بتایا ہے۔ اور پھر نہ جانے کیا کیا مفہوم سمجھ کر اصلاح دینے کی جھک ماری ہے۔

میں ماسٹر ہوں اور میرا کام ہے کہ اگر کسی شعر کا مفہوم کسی کی سمجھ میں نہ آتا ہو تو میں اُسے سمجھا دوں۔ گو کہ نیاز صاحب ایسے سمجھدار کو سمجھانا سہل نہیں ہے۔ بہر حال اصغر صاحب کے جن اشعار کو نیاز صاحب سمجھ نہیں سکے ہیں میں اُنھیں سمجھائے دیتا ہوں اور اُن کو مشورہ دیتا ہوں کہ اگر وہ اصغر صاحب کے کلام کو بالاستیعاب سمجھنا ہی چاہتے ہیں تو چند دنوں کے لیے بلرام پور آ جائیں تب شاید انھیں یہ شکایت باقی نہ رہے کہ اصغر صاحب کے اشعار بے معنی ہیں۔

شعر اصغر | اُٹھاکے عرش کو رکھا ہے فرش پہ لاکر شہود غیب ہوا۔ غیب ہوگیا ہے شہود

اعتراض نیاز | "عرش کو فرش پر لاکر رکھنا شہود کا غیب اور غیب کا شہود ہو جانا۔ ان میں سے ہر دعوے بجائے خود ایک چیستان ہے۔ اور عقل حیران ہے کہ اصغر صاحب نے کس حال کے ماتحت تصوف کے کس سِرِّ عظیم کو اس میں ظاہر کیا ہے۔ اگر عرش سے مراد خود اُن کی ذات مراد ہے (مراد کی تکرار کس قدر خوبصورت ہے۔ عشرت) تو غیب کا شہود میں آجانا تو سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن شہود کا غیب ہوجانا کیسا؟"

عرض عشرت | سمجھ کی تعریف ہے۔ شعر کے معنی سُنیئے۔ عرش سے مراد یہاں جلوۂ حق ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نے جلوۂ حق دیکھ لیا اور اس کے بعد جب فرش یعنے دنیا پر نظر کی تو اُس جلوۂ حق کی کیفیت کو یہاں بھی لیتا آیا۔ اب دنیا کی ماہیت ہی بدل گئی ہے

مری نظروں میں کوئی جلوہ گر ہے یہ دنیا اب تو دنیائے دگر ہے (عشرت)

دنیا کی چیزیں اب دنیاوی چیزوں کی طرح نہیں دکھائی دیتیں بلکہ سب میں جلوۂ حقیقت ہی کی جھلک ہے۔ اب دنیا کا ہر گل بوٹا غائب ہوگیا یعنے شہود غیب ہوا۔ اور جلوۂ حق جو اُسکے پہلے غیب تھا اب شہود ہوگیا۔ شاید آپ کی سمجھ میں اب شعر کا مفہوم آگیا ہوگا۔ شاید اسلیئے کہہ رہا ہوں کہ آپ کی سمجھ پر مجھے زیادہ اعتماد نہیں ہے۔

شعر اصغر | کبھی سُنا کہ حقیقت ہے میری لاہوتی کہیں یہ ضد کہ ہیولائے ارتقا ہوں میں

اعتراض نیاز | "پہلے مصرع سے دوسرے مصرع کا تعلق نظر نہیں آتا..... یہ تو نقص معنوی ہوا۔ اب بیان کے سقم کو دیکھیے کہ پہلے مصرع میں (کبھی سُنا) کا ٹکڑا اور دوسرے مصرع میں (کہیں یہ ضد) اسلیئے تقابل کی صورت نہ پیدا ہوئی۔ اگر یہ شعر یوں ہوتا ہے

کبھی یہ ہٹ کہ حقیقت ہے میری لاہوتی کبھی یہ ضد کہ ہیولائے ارتقا ہوں میں

تو کم از کم سقم دُور ہوجاتا"

عرض عشرت | جب شعر ہی سمجھ میں نہیں آیا تو اصلاح کے لایعنی ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ پہلے شعر کے معنی سمجھیے۔ یہ شعر حقیقت انسانی کا حامل ہے۔ انسان کبھی کبھی پہونچے ہوئے درویشوں۔ رشیوں۔ پیغمبروں کی زبانی یہ سنتا ہے کہ انسان کی حقیقت لاہوتی ہے۔ مگر اس کے باوجود آج کل کے سائنس دانوں کو یہ ضد ہے کہ انسان محض ایک ہیولائے ارتقا ہے جو بندر سے ترقی کرکے آدمی ہوگیا ہے۔ اب اگر آپ کی اصلاح کے مطابق پہلے مصرع میں (کبھی سُنا) کے بجائے (کبھی یہ ہٹ) کردیا جائے تو شعر کتنا مہمل ہوجاتا ہے۔ یہ شعر عام انسانوں کی حالت کا آئینہ ہے۔ جو انسان اپنی حقیقت سے کما حقہ واقف نہیں ہوا وہ کیونکر "ہٹ" کرسکتا ہے کہ میری حقیقت لاہوتی ہے۔ وہ تو محض یہ کہہ سکتا ہے کہ "کبھی سُنا کہ حقیقت ہے میری لاہوتی"

دوسرے مصرع میں "کہیں یہ ضد" کے بجائے آپ نے "کبھی یہ ضد" لکھا ہے۔ مگر آپ کی اصلاح سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس کو ضد ہے۔ اس لئے شاعر "کہیں" لکھتا ہے۔ جس کے معنی ہوئے کہ ایک گروہ سے کبھی شاعر سنتا ہے کہ انسان کی حقیقت لا ہوتی ہے۔ مگر ایک دوسرے گروہ کی یہ ضد ہے کہ انسان محض ہیولائے ارتقا ہے۔ اب شاید آپ کی سمجھ میں آیا ہو کہ شاعر نے پہلے مصرع میں "کبھی سُنا"، اور دوسرے مصرع میں "کہیں یہ ضد" کیوں لکھا۔

اس کے علاوہ شاعر نے شعر میں ایک لطیف پہلو بھی رکھا ہے جس سے اشارتاً پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں نظریوں میں شاعر کا میلان کس طرف ہے۔ شاعر پہلے نظریہ سے متفق ہے۔ کیونکہ دوسرے نظریہ کے لئے وہ "ضد" کا لفظ استعمال کرتا ہے جو اچھے معنوں میں مستعمل نہیں ہے۔ مگر نیاز صاحب آپ کریں تو کیا کریں آپ نے تو اپنے استاد سے یہی سیکھا تھا کہ "بیٹا دیکھو شعر کے دونوں مصرعوں میں تقابل ہونا اچھی بات ہے۔ تقابل کیلئے اگر ایک مصرع میں ایک لفظ ہو تو دوسرے مصرع میں اُس کا مترادف لانا چاہیئے۔"

بس کیا تھا اصغر صاحب کے شعر میں اصلاح کرنے لگے۔ "کبھی سُنا" کو "کبھی یہ ضد" کے ساتھ تقابل کرنے کے لیے "کبھی یہ ہٹ" بنا دیا۔ اس بات کا کہاں خیال کہ شعر کا مفہوم برباد ہو گیا۔ اسی کو کہتے ہیں کہ "بچھو کا منتر نہ جانے اور سانپ کے بِل میں ہاتھ ڈالے۔"

شعر اصغر | یہ مجھ سے پوچھئے کیا جستجو میں لذت ہے　　فضائے دہر میں تحلیل ہو گیا ہوں میں

اعتراض نیاز | "فضا میں تحلیل ہو جانا بالکل علمی بات ہے۔ جس کا تعلق طبیعیات اور علم الکیمیا سے ہے نہ کہ تصوف اور شاعری سے۔ لیکن تھوڑی دیر کے لئے استعارتاً اس کو گم ہو جانے کے معنے میں لیا جائے تو بھی پہلے مصرع سے اسکا کوئی تعلق نظر نہیں آتا اور لذت کا ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔"

عرض عشرت | ایک زندہ انسان کا فضائے دہر میں تحلیل ہونا طبیعیات یا علم الکیمیا میں یک لخت ناممکن ہے۔ اگر ممکن ہے تو شاعری یا تصوف ہی میں ہے جس میں شاعر یا صوفی تلاش جلوۂ یار میں اسقدر منہمک ہو جاتا ہے کہ گم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اُسکو ع ہر سو دکھائی دیتے ہیں وہ جلوہ گر مجھے۔ کے مصداق ہر جگہ جلوہ کی فراوانی دکھائی دیتی ہے۔ مگر نیاز صاحب۔ آپ کو پہلے اور دوسرے مصرع کا تعلق نظر نہیں آتا۔ اور آپ کے لئے لذت کا ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ بھائی صاحب جس چیز میں انسان کو انتہائی لذت ملتی ہے اُسی میں وہ گم ہو جاتا ہے۔ اگر ایک انسان کو ایک ناول میں بھی انتہائی لطف ملنے لگتا ہے تو وہ اس کے پڑھنے میں گم ہو جاتا ہے۔ مگر پھر بھی آپ کے لئے شعر میں لذت کا ثبوت نہیں ہے۔ ثبوت ملے تو کیونکر ملے۔ آپ کیلئے لذت تو محض "گوشت و پوست والی معشوقہ" کے متعلق تغزل میں ہے۔ اس سے بالاتر آپ کی نگاہ ہی نہیں ہے

آپ ان روحانی باتوں کو کیا سمجھیں۔ ہاں ایک بات اور ہے آپ اصغر صاحب کے پہلے مصرع پر یوں اصلاح دیتے ہیں ع یہ مجھ سے پوچھیے کیا جستجو کی غایت ہے۔ جب شعر ہی نہیں سمجھے تو اصلاح کی خیر و عافیت معلوم۔ آپ کے نزدیک جستجو کی غایت محض گم ہو جانا ہے۔ گو کہ شاعر یا صوفی کے نزدیک جستجو کی غایت جلوۂ یار سے ہمکنار ہونا ہے ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

شعر اصغر | کہاں ہے سامنے آ مشعل یقیں لے کر فریب خوردۂ عقل گریزپا ہوں میں

اعتراض نیاز | "اس شعر سے یہ بات بالکل ظاہر نہیں ہوتی کہ مشعل یقیں لے کر کس کو سامنے آنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ اگر اس سے مراد علاوہ اپنے کوئی اور ہے تو انداز بیان درست نہیں۔ کیونکہ اس سے مبازر طلبی ظاہر ہوتی ہے نہ کہ التجا.... پہلے مصرع میں مشعل کا لفظ بیکار ہے۔ کیونکہ دوسرے مصرع میں تاریکی کا مفہوم کسی لفظ سے پیدا نہیں ہوتا۔ اسلیے بجائے مشعل یقیں کے حجت یقین لکھنا چاہیے تھا..... "عقل گریزپا" کے معنی ہوئے "جلد زائل ہو جانے والی عقل" کے۔ دراں حالیکہ شعر کو دیکھتے ہوئے عقل کو دیرپا ہونا چاہیے تھا.... شعر کو اس طرح بلند کیا جا سکتا ہے ؎

نہیں ہوں در خور ایقاں یہ جانتا ہوں میں فریب خوردۂ عقل گریزپا ہوں میں

عرض عشرت | نیاز صاحب آپ شعر کو بالکل نہیں سمجھے "گریزپا" کی معمولی ترکیب آپ کی فہم سے بالاتر ہے اسکے معنی آپ "جلد زائل ہونے والی" لکھتے ہیں۔ حالانکہ معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی جانتا ہے کہ "گریز" مصدر "گریختن" سے مشتق ہے جس کے معنی بھاگنے کے ہیں اور "پا" کے معنی پیر کے ہیں۔ پتہ نہیں کہ اسکے معنی آپ نے "جلد زائل ہونے والی" کیونکر نکالے۔ اسکے معنی تو ہوئے "ایک مقام پر نہ ٹکنے والی" "ایک مقام سے دوسرے مقام کو بھاگنے والی"۔

اب شعر کے معنی سمجھنے کی کوشش کیجیے تو شاید سمجھ میں آجائیں۔ عقل کے پاس دلائل کا دھیمی روشنی والا "دیا" ہے جس کی مدد سے وہ حقیقت اشیاء سے کما حقہ واقف نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ عقل پہلے ایک چیز کو بہتر سمجھتی ہے۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد دوسری چیز کی طرف بھاگتی ہے اور اُسے بہتر سمجھنے لگتی ہے۔ اسی طرح زندگی بھر میں ہزاروں بار انسان "عقل گریزپا" کے فریب میں آتا ہے۔ اس سے زچ ہو کر شاعر اپنے معشوق حقیقی سے کہتا ہے کہ "تو کہاں چھپا ہوا ہے۔ مشعل یقین لے کر آ کہ جس کی زبردست روشنی میں میں "یک درگیر و محکم گیر" کا مصداق بن جاؤں اور بار بار مجھے اپنی رائے نہ بدلنا پڑے۔

یہ مفروضات تغزل میں مسلّم ہے کہ اگر شعر میں "میں" اور "تو" یعنی واحد متکلم اور واحد حاضر آئے تو "میں" شاعر یا عاشق کے لیے ہوتا ہے اور "تو" معشوق کے لئے۔ اس بات کو مبتدی سے مبتدی شاگرد

شاعر جانتا ہے۔ مگر خدا جانے آپ نے کس اُستاد سے پڑھا کہ آپ اب تک ع مزاج تو از حال طفلی نہ گشت۔ کے مصداق ہیں۔ آپ زچ ہو کر پوچھتے ہیں کہ سامنے آنے کی کس کو دعوت دی جاتی ہے۔ شاید آپ کو پہلے مصرع میں لفظ "تو" ڈھونڈھے نہیں ملا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر زبان میں "صیغہ واحد حاضر امر" میں "تو" چھپا رہتا ہے۔ مگر پھر بھی آپ کو شک ہے آپ لکھتے ہیں "اگر اس سے مراد اپنے علاوہ کوئی اور ہے" ارے بھائی جب شعر میں "میں" اور "تو" دونوں ہوں تو ایک بچہ بھی یقین کے ساتھ کہہ دیگا کہ "تو" کی ذات "میں" سے بالکل علحدہ ہے۔ اس میں شک اور اگر مگر کیسا۔ آگے چلکر آپ کو انداز بیان پر بھی اعتراض ہے۔ آپ کو مبارزطلبی دکھائی پڑتی ہے۔ آپ بچپن میں (Hide & Seek) چھپنے اور ڈھونڈھنے کا کھیل ضرور کھیلے ہوں گے۔ ہاں لیجیے اگر آپ ابھی بچے ہیں جیسا کہ آپ کے اعتراضوں سے ظاہر ہے۔ اور آپ چھپ گئے ہیں۔ آپ کا کوئی دوست آپ کو ڈھونڈھ رہا ہے۔ وہ بہت زچ ہو چکا ہے اور آپ نہیں مل رہے ہیں۔ مگر اُسکو یقین ہے کہ آپ کہیں نزدیک ہی چھپے ہیں۔ ایسی حالت میں وہ یقیناً یہی کہے گا کہ "بھائی نیاز نکلو کہاں ہو میں تو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے پریشان ہو گیا۔ اگر اُس سے آپ سے کافی بے تکلفی ہے اور وہ زیادہ زچ ہو چکا ہے تو وہ چلا اُٹھے گا "نیازوا کہاں چھپا ہے۔ نکل" اس انداز بیان میں جو سچی التجا اور پریشانی کا سچا فوٹو ہے وہ "آپ" والے تکلفانہ انداز میں ممکن نہیں۔ مگر آپ کو اس میں مبارزطلبی دکھائی پڑے تو اس احولیت کا علاج بقول شخصے لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔

نیاز صاحب آپ بالکل بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ یہ آپ کیا کہنے لگے کہ دوسرے مصرع میں تاریکی کا مفہوم کسی لفظ سے پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں صاحب اگر آپ کا کوئی دوست کہے کہ "میں وہاں گیا تھا۔ میرے جانے کے تھوڑی دیر بعد مشعلیں منگائی گئیں اور ناچ ہونے لگا"، تو کیا آپ اُس سے اُلجھنے لگیں گے کہ واہ صاحب واہ آپ نے تاریکی کا ذکر کہیں نہیں کیا اور مشعل کا ذکر کرنے لگے۔ اور جب نثر جیسی مفصل اور شرح چیز میں بغیر تاریکی کے بیان کے مشعل کا ذکر ہو سکتا ہے۔ تو شاعری میں جو تمام تر اشارات پر مبنی ہے۔ مشعل کا ذکر بغیر تاریکی کے کیوں نہیں کیا جا سکتا۔ تاریکی کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے آپ لفظ "مشعل" بیکار سمجھتے ہیں مگر بھلے مانس یہ نہ سمجھے کہ ذکر مشعل خود تاریکی کے وجود کی دلیل ہے۔ تاریکی کا اور کیا اشارہ چاہیئے۔ شعر تو مطلق نہیں سمجھے اور لگے اصلاح کرنے۔ مشعل یقین کو محبت یقین سے بدل دیا۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ عقل و محبت سے شاعر زچ ہو چکا ہے اور آپ خواہ مخواہ اُسکو وہی لفظ دے رہے ہیں جس سے اُسکو غصہ آئے اس کے بعد آپ نے شعر کو بلند کیا ہے جس کی بلندی ظاہر ہے۔ آپ اپنی مایۂ ناز بلندی سے چلا رہے ہیں "نہیں ہوں درخور ایقان"، بیشک آپ میں یقین کی اہلیت نہیں اور یہ آپ ہی کو مبارک رہے اصغر صاحب کو اسکی

ضرورت نہیں ہے ۔ اور یقین کے بجائے " ایقان " کا روڑا جو آپ نے اصلاح میں اٹکا دیا ہے وہ لطافت شعر کے لیے کتنا گراں بار ہے اسکو ذوق سلیم ہی سمجھ سکتا ہے ۔

شعر مغر | کچھ انتہا نہیں نیرنگ زیست کی میرے حیات محض ہوں پروردۂ فنا ہوں میں

اعتراض نیاز | " پہلے مصرعہ میں تو یہ دعوےٰ کیا گیا ہے کہ نیرنگ زیست کی کوئی انتہا نہیں ہے اور ثبوت میں اس نیرنگ کے صرف دو منظر (حیات محض اور پروردگی فنا کے) پیش کیے گئے ۔ علاوہ اس کے دوسرے مصرع میں انداز بیان غیر متوازن ہے اگر "حیات محض" کہا تھا تو تقابلاً "فنائے محض" کہنا چاہیے تھا پروردۂ فنا ہونے سے وہ بات پیدا نہیں ہوتی یہ پورا شعر اس طرح بدلا جا سکتا ہے ؎

عجب تضاد ہے نیرنگ زیست میں میرے حیات محض کبھی ہوں کبھی فنا ہوں میں "

عرض عشرت | نیاز صاحب آپ یا تو تلے بیٹھے ہیں کہ کسی شعر کے مفہوم کو نہ سمجھیں گے یا آپ میں شعر فہمی کی قطعی اہلیت ہی نہیں ۔ سنیئے یہ شعر بھی حقیقت انسانی پر مبنی ہے ۔ انسان بحیثیت روح کے حیات محض ہے مگر روح کی ترقی جسم کے اندر رہ کے ہوتی ہے اور جسم فانی ہے ۔ لہذا " پروردۂ فنا " کہا گیا ۔

خدا جانے آپکے اُستاد نے آپ کو تقابل کا سبق کتنے بید مار کر یاد کرایا تھا کہ آپ اُسے بھولتے ہی نہیں اور موقع بے موقع اُسے شعر میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ آپ نے اپنی اصلاح میں " حیات محض کے تقابل کے لئے " فنائے محض " یا قافیہ کی مجبوری سے صرف لفظ " فنا " پسند فرمایا ہے ۔ مگر یہ نہ سمجھے کہ شعر حقیقت سے دور ہو کر ستیاناس ہو جائے گا ۔ انسان کو کوئی بھی سمجھدار " فنائے محض " نہیں کہہ سکتا کیونکہ اسکے اندر روح لافانی موجود ہے ۔ مگر آپ کو شعر کے معنی مطلب سے کیا واسطہ آپ کے واسطے تو شعر کی چول بیٹھ جانا چاہیے ۔ کیونکہ استاد کی مار کھا کے آپنے اتنا ہی سیکھا ہے ۔ یاد رکھیے مفروضات شاعری تو سکھائے جا سکتے ہیں مگر روح شاعری وہبی اور ودیعی ہے ۔ ع ایں سعادت بزور بازو نیست ۔ اسلیے آپ کا قصور نہیں ہے ۔ اس معاملہ میں آپ کے لیے مجبوری اور بیچارگی ہے جس کے لئے مجھے بھی تاسف ہے ۔

اس کے علاوہ آپ فرماتے ہیں کہ " نیرنگ زیست کی کوئی انتہا نہیں ہے ۔ اور ثبوت میں اس نیرنگ کے صرف دو منظر پیش کیے گئے ہیں " قربان جائیے آپ کی کور سوادی کے کہ آپ انتہا کے معنی بھی لفظ " گریز پا " کی طرح نہیں جانتے ہیں ۔ آپ شاید اس کے معنی شمار یا تعداد کے سمجھے ہیں اس لئے آپ نیرنگ زیست کے بہت سے منظروں کے طالب ہیں ۔ بھائی صاحب انتہا کے معنی حد کے ہیں ۔ اسلیے شاعر نے صرف ایک چوٹی کی مثال دی ہے ۔ وہ یہی نہیں جیسا کہ آپ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں انسان زندگی بھر حیات محض اور پروردۂ فنا دونوں بیک وقت رہتا ہے ۔ ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ آپ کی اصلاح سے ظاہر ہے کہ انسان کبھی حیات محض

بھی رہتا ہے اور "پروردۂ فنا" کبھی۔ اس پر تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی سمجھداری کی بھی کوئی انتہا نہیں۔

ہاں ایک بات اور رہ گئی۔ آپ نے اصلاح میں "کچھ انتہا نہیں" کے بجائے "عجب تضاد ہے" لکھا ہے اس سے شعر معنی اور صورت دونوں حیثیتوں سے کتنا پست ہو گیا ہے اور موسیقیت کے اعتبار سے جو شاعری کا جزو اعظم ہے کتنا فروتر ہو گیا ہے۔ صاحبان ذوق سے مخفی نہیں۔

اشعار نظم معترضہ یعنی مسلم سے خطاب

کہاں اے مسلم سرگشتہ تو محو تماشا ہے
جب اس آئینۂ ہستی میں تیرا ہی سراپا ہے

ہجوم کفر بھی جنبش ہے تیری زلف برہم کی
فضائے حسن ایماں انعکاس روئے زیبا ہے

جہان آب و گل میں ہے شرار زندگی تجھ سے
تری ذات گرامی ارتقا کا اک ہیولا ہے

تجھی سے اس جہاں میں ہی بنا آئین و حکمت کی
یہ سب مے کی بدولت اصطلاح جام و مینا ہے

ضوابط دین کامل کے دیے ہیں تیرے ہاتھوں میں
تجھی سے خلق کی تکمیل کا بھی کام لینا ہے

تجھی کو دیکھتا ہوں روح اقوام و مذاہب میں
یہ راز زندگی سن لے کہ ہر قطرہ میں دریا ہے

فرشتوں نے وہاں پر حرز جاں اس کو بنایا ہے
فراز عرش پر تیرا ہی کچھ نقش کف پا ہے

جو ہو للّٰہیت تو دین بن جاتی ہے یہ دنیا
اگر اغراض ہوں تو دین بھی بدتر ز دنیا ہے

فرائض کار ہے احساس عالم کے مظاہر میں
یہی عارف کا مقصد ہے یہی شارع کا ایما ہے

اعتراض نیاز ..... "سوائے آورد اور تصنع کے اس میں اور کچھ نہیں نہ کوئی جوش و ولولہ ہے۔ نہ کوئی تاثر و کیفیت۔ نہ بیان میں کوئی جدت ہے، نہ خیال میں..... للّٰہیت۔ ہیولا۔ ارتقا۔ عارف۔ شارع۔ عرش۔ وغیرہ اس قبیل کے الفاظ ہیں جن کو شاعری کی لطافت مشکل سے برداشت کر سکتی ہے..... اس نظم میں مسلم سے خطاب ہے اور اسی کو "مقصود آفرینش" قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن دوسرے شعر میں ہجوم کفر کو بھی اس کی زلف برہم کی جنبش بتا کر تفریق کفر و ایمان کو مٹا دیا ہے۔ الغرض نہ کوئی پیام نہ درس عمل نہ کسی مقصد العین نہ کسی منزل کی تخصیص منتشر و پریشان خیالات ہیں جنھیں زبردستی ایک سلسلہ سے وابستہ کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے"

جواب عشرت نیاز صاحب آپ کے پہلے اعتراض کا فیصلہ کہ نظم میں کوئی تاثر و کیفیت نہیں ہے صاحبان ذوق پر چھوڑتا ہوں۔ کیونکہ آپ نے اپنے دعوے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا ہے جس پر غور کیا جائے۔ میری نگاہ میں اس میں تاثر و کیفیت کافی ہے۔

لیکن آپ کا دوسرا اعتراض کہ اس میں جدت بیان یا جدت خیال نہیں ہے سرتاپا غلط ہے۔ مگر ہاں

اس میں جو جدت ہے، وہ آپ ایسے سمجھداروں کے لیے نہیں ہے آپ کا دماغ تو ایسا ہے کہ مدس حالی جو عوام کے لئے لکھا گیا ہے شاید سمجھ سکیں۔

نظم اصغر خواص کے لئے لکھی گئی ہے وہی اُس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ سنیے۔ خیال میں تو یہ جدت ہے کہ بجائے تاریخی واقعات کا بالتفصیل تجزیہ کرنے کے جیسا کہ حالی و اقبال نے اکثر کیا ہے۔ اصغر صاحب نے "مسلم" کو مقصود آفرینش اور ارتقا کا ایک ہیولا کہہ کے سب کچھ کہہ ڈالا۔ تمام تاریخی واقعات کو ایک مصرع میں ادا کر دیا۔ ع تجھی سے اس جہاں میں ہے بنا آئین و حکمت کی۔ اس کے بعد ایک دوسرا مصرع کہہ کے ع تجھی کو دیکھتا ہوں روح اقوام و مذاہب۔ وہ تمام مضامین ختم کر دیے جن پر حالی و اقبال نے صفحے کے صفحے سیاہ کیے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ حالی و اقبال نے غلطی کی اور وہ اصغر صاحب سے شاعری میں فروتر ہیں۔ میرا منشا محض یہ ہے کہ جہاں اقبال و حالی نے عوام کے لیے لکھا وہاں شرح و بسط سے کام لیا تاکہ آسانی سے سب کی سمجھ میں آجائے۔ اور اصغر صاحب نے یہ نظم خواص کیلیے لکھی ہے چونکہ عقلمنداں را اشارہ کافیست اسلیے وہ اشارات کر کے آگے بڑھ گئے۔ جو بدقسمتی سے آپ کی فہم سے بالاتر ہے۔

جدت بیان کی متعدد مثالیں اس چھوٹی سی نظم میں ہیں۔ مگر میں ناظرین کرام کے بیش بہا وقت میں زیادہ خلل انداز ہونا نہیں چاہتا۔ اس لیے صرف ایک ہی مثال پر اکتفا کروں گا۔ اور وہ ہے وہ مصرع جسے آپ قطعی نہیں سمجھ سکے یعنی ع ہجوم کفر بھی جنبش ہے تیری زلف برہم کی۔ آپ کی سمجھ میں اس مصرع سے تفریق کفر و ایماں اُٹھ گئی۔ سنیے۔ شعر کا مطلب تو آپ سمجھ نہیں سکے یہی آپ کے تمام اعتراضات کی جڑ ہے۔

یہ تو آپ نے خود تسلیم کیا ہے کہ اس نظم میں مسلم کو "مقصود آفرینش" لکھا گیا ہے۔ اگر آپ اسی جملہ پر غور کرتے تو گتھی سلجھ جاتی۔ قرآن میں آدم کے لیے صاف لکھا ہے "انی جاعل فی الارض خلیفہ" اور "جعلنا خلیفۃ فی الارض" آدم کو آپ کافر نہیں مانتے بلکہ اسلام کا پہلا نبی مانتے ہیں۔ کیونکہ آپ کا ایمان ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اور ہمیشہ سے ہے جو خاتم النبیین کے عہد میں تکمیل کو پہونچا۔ ممکن ہے آپ کو اس سے بھی اختلاف ہو مگر تمام مسلمان اسپر متفق ہیں۔ آپ کے یہاں یہ بھی ہے کہ ہر بچہ دین اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ مگر بعد کو وہ دین فطرت سے ہٹ بھی سکتا ہے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ ع بنی آدم اعضائے یک دیگر اند۔ پھر اگر کفر و اسلام دونوں کو ایک ہی جسم کے دو کرشمے شاعر نے کہا ہے تو یہ عین جدت بیان کے علاوہ عین حقیقت بھی ہے۔ مگر آپ نے جو یہ کہہ دیا کہ "کفر و اسلام کا امتیاز اٹھا دیا" اس میں آپ نے اپنی سمجھداری کا کمال دکھا دیا۔ بھلے آدمی اگر آپ نے "زلف برہم" اور "روے زیبا" کے لفظوں ہی پر غور کیا ہوتا تو آپ یہ اعتراض نہ کرتے۔ کافر و مسلم دونوں بحیثیت بنی آدم ہونے کے ایک جسم کے دو اعضا ہیں مگر ایک میں

رہی ہے اور دوسرے میں زیبائش ایک دین اسلام کے قاعدے سے سنوارا ہوا ہے اور دوسرا بھی کفر کی بے قاعدگی سے منتشر ہے۔ اب رہ گیا آپ کا یہ اعتراض کہ اشعار نامربوط ہیں یہ بھی بالکل غلط ہے۔ ربط ملاحظہ ہو۔ اول تو مسلم کو مقصودِ آفرینش کہا پھر کہا کفر و اسلام دونوں تیرے ہی جلوے ہیں۔ تو چاہے تو دونوں کو راطِ مستقیم پر چلا سکتا ہے۔ اس کے بعد ارتقا کا ہیولا کہا۔ جس سے اُن تمام خیالات کو رد کیا کہ مسلمان ترقی ہی نہیں کر سکتے۔ پھر تاریخ ماضی کی طرف دھیان دلایا کہ مسلمانوں نے کیا نہیں کیا اور کیا نہیں کر سکتے۔ ظم کے مقصد کو شاعر نے صرف ایک مصرع میں ادا کر دیا ہے۔ ع تجھی سے خلق کی تکمیل کا بھی کام لینا ہے۔ پیامِ عمل بھی اخیر میں ہے۔ جس کو آپ کی عقل و فہم تلاش نہیں کر پائی۔

سنئے پیامِ عمل یہ ہے کہ اپنی ذاتی اغراض سے علیحدہ ہونا چاہیے۔ مگر یہ جب ہی ممکن ہے کہ جب مسلمانوں میں للٰہیت ہو یعنے جو کام وہ کریں اپنے لئے نہ کریں بلکہ اللہ کے لئے کریں۔ اصغر صاحب کا یہ شعر پھر پڑھیے۔

جو ہو للٰہیت تو دین بن جاتی ہے یہ دنیا　　اگر اغراض ہوں تو دین بھی پھر تو دنیا ہے

اس مضمون کو آخری شعر میں اصغر صاحب نے اور صاف کیا ہے کہ بلا ذاتی اغراض کے فرائض (اسلام) کا احساس ہے۔ بس اسی سے سب کچھ بن جائے گا۔ آخری شعر پھر پڑھیے ؎

فرائض کا رہے احساس عالم کے مظاہر میں　　یہی عارف کا مقصد ہے یہی شانِ [illegible] ہے

بھاگوت گیتا میں کرشن جی کا پیغام بعینہ یہی ہے کہ "ذاتی اغراض چھوڑ کر فرائض کو انجام دو اور اپنا ہر کام ایشور کے سپرد کر دو"۔ اب صرف آپ کا آخری اعتراض رہ گیا کہ للٰہیت۔ ہیولا۔ ارتقا۔ عارف۔ شارع۔ عرش وغیرہ الفاظ لطافتِ شعری مشکل سے برداشت کر سکتی ہے۔ حضرت سنئے آپ کو اصولاً ہی نہیں معلوم کہ شعر میں کس طرح کے الفاظ لانا چاہئے۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ ہر شعر میں نرم و نازک [illegible] اور رنگین الفاظ استعمال کرنا چاہیے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ ع ہر سخن جائے و ہر نکتہ مکانے دارد۔ اس بات پر ہندی والوں نے بڑا غور کیا ہے۔ انھوں نے نظم کو احساسات اور جذبات کے لحاظ سے [illegible] تقسیم کیا ہے محبت اور نفرت غضب وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر بہادری کا مضمون ہے تو الفاظ اُسی کے [illegible] بھاری بھرکم استعمال کریں گے۔ اگر محبت کے لطیف جذبات کا بیان ہے تو نرم و نازک اور [illegible] الفاظ ہوں گے۔ اردو کے سمجھ دار شعراء نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ میر انیس اس کا [illegible] وہ لکھتا رہا ہوں صرف ایک مصرع میں لکھتا ہوں۔ ع نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے۔ [illegible] آپ غور کریں کہ لفظ ضیغم کے مترادف شیر۔ اسد وغیرہ بہتیرے ہیں۔ مگر ان میں سے شاعر نے ضیغم ہی کو کیوں پسند کیا اس لئے کہ اس کے صوت ہی سے گرجتے ہوئے شیر کی صولت سامنے آ جاتی ہے [illegible] اسی صوت کی

مناسبت سے "ڈکارتا ہوا" اور "کچھار" کے الفاظ ہیں۔ یہ انگریزی ادب میں ایک صنعت ہے جسے Onomatopoea کہتے ہیں جس میں محض صوت سے معنی کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔
اب جب اصغر صاحب کی نظم مسلم اور اسلام سے متعلق تھی تو آپ کیا للّٰہیت۔ عرش۔ شارع کے بجائے چاہتے تھے کہ اُن الفاظ کا استعمال کیا جاتا جو ایک حسین و نازک بدن رقاصہ کے رقص کی لوچ کیلیے استعمال کیے جانا چاہیے۔ بہرحال آپ کی عقل و دانش بہت اچھی ہے مگر ع

برین عقل و دانش بباید گریست۔

(باقی آیندہ)

نغمۂ احسان

(جناب احسان بن دانش صاحب مقیم لاہور)

گلستاں میں ہر طرف بابِ لطافت باز ہے
ہر نسیم سرد کا جھونکا پیامِ ناز ہے

حاصل صد گفتگو ہے عشق میں مُہرِ سکوت
ہر نگاہ آرزو فریادِ بے آواز ہے

آگیا ہوش و خرد کو غش نظر چکرا گئی
بیخودی! آخر یہ کس کی جلوہ گاہ ناز ہے

چاند کیا گویا ترا دھندلا سا اک نقشِ قدم
چاندنی کیا ہے تری گردِ خرامِ ناز ہے

دے مجھے ان ڈوبتے تاروں سے پھر آواز دے
سو گیا عالم تمنا گوش بر آواز ہے

خاکساری ہے تری پابندیِ دیرِ و حرم
دہر کا ہر ذرّہ تعمیر حریمِ ناز ہے

آ کہ اب تاریکیِ شامِ الم ہے ناگوار
رحم فرما چشم محرومِ تجلی باز ہے

ذرہ ذرہ ہے سراپا اک جبینِ اشتیاق
اے نظر والو کدھر وہ آستانِ ناز ہے

فاش کر دیں گے یہی کمظرف اکدن حالِ دل
نالہ میرا ہمنشیں، آنسو مرا ہمراز ہے

آہی جاتا ہے مرے انفاس میں نالوں کا رنگ
ضبطِ غم کی خامشی اعلانِ بے آواز ہے

عشق کا وجدان ہر پہلو سے ہے بے قید و بند
حُسن کو جس رُخ سے دیکھو گے اسیرِ ناز ہے

دھڑکنوں میں ہے کسی کی ٹھوکروں کی گیر و دار
دل میں یارب کون مصروفِ خرامِ ناز ہے

طالبِ خلد نظر! جشنِ بہاراں پر نہ پھول
یہ چمن کے خونفشاں انجام کا آغاز ہے

پر فشانی سے جہاں جلتے ہیں بالِ جبرئیل
عشق کو اُن رفعتوں میں رخصتِ پرواز ہے

آہ! شیخ ممتاز حسین عثمانی

(جناب سید عقیل احمد جعفری صاحب خیرآبادی)

آج لکھنؤ اُجڑ گیا ہے، اس کی خصوصیات مٹ گئی ہیں پھر بھی وہ ہندوستان کے دوسرے مقامات کی بہ نسبت اب تک کسی نہ کسی حیثیت سے کوئی نہ کوئی مقامی امتیاز رکھنے میں ممتاز رہے۔

"نئی دہلی" کی طرح یوں تو لکھنؤ بھی اب ایک نیا لکھنؤ ہوگیا ہے لیکن پھر بھی اس کا ایک حصہ پُرانے لکھنؤ کی جھلک اب تک دکھلا رہا ہے۔

ہونے کو لکھنؤ میں حضرت گنج بھی ہے اور امین آباد بھی لیکن لکھنؤ جسے کہتے ہیں وہ اصل میں اس کا چوک ہے، جو اپنی پتلی پتلی گلیوں، دو رویہ بڑی بڑی عمارتوں اور گنجان آبادی کے سبب سے آج بھی لکھنؤ کی نمائندگی کر رہا ہے۔

لکھنؤ میں کنگ جارج میڈیکل کالج اور نواب آصف الدولہ کے امام باڑہ کا پاس پاس ہونا بھی ایک عجیب لطیفہ ہے۔ کالج اگر انگریزی تسلط کی داستان ہے تو امام باڑہ اپنے سابق اولوالعزم فرمانروا کی شاندار روایات کا ترجمان!!

ہندوستان میں، مشرقی تمدن کے آخری نمونے "لکھنؤ" کی مذہبی سیاسی اخلاقی اور معاشرتی خصوصیات اب بھی دوسرے مقامات کی بہ نسبت آسانی سے تمیز کی جا سکتی ہیں۔

ہندوستان بھر میں اسلامی علوم کے مرکز بدل کے ادھر سے اُدھر ہوگئے لیکن "فرنگی محل" اب تک بدستور اپنی جگہ پر قائم ہے۔

اُردو کی وہ شاعری جو بادشاہوں کے سائے میں پرورش پا رہی تھی سلطنت کے ساتھ ختم ہوگئی۔ لیکن لکھنؤ میں اب بھی "انیس کا خاندان" بدستور شاعری کا کوس لمن الملکی بجا رہا ہے۔

طب یونانی نے طب اسلامی کا چولا بدل کے ترقی کے عجیب عجیب کرشمے دکھلائے اور پھر ٹھیٹ ہندوستانی بن کے اپنے تنزل کی داستان بھی دنیا کو سنائی مگر "جھوائی ٹولہ" میں اس کا طوطی اب بھی ہمیشہ کی طرح داد خوش الحانی دے رہا ہے۔

لکھنؤ کی وضع قطع اور اس کی تراش و خراش آج بھی وہی خصوصی اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے جس کی بنا پر لکھنؤ کو بجا طور سے ہندوستان کا پیرس کہا گیا ہے۔

اور تو اور لکھنؤ کا خربزہ بھی لکھنؤ کی نہاری کی طرح لکھنؤ ہی کے لئے قدرت کی طرف سے اب تک مخصوص ہے۔

لکھنؤ کی مٹی کی یہ جدت آفرین تاثیر پھر بھلا زبان پر کہاں تک نہ اثر انداز ہوتی چنانچہ ہوئی اور جی بھر کے ہوئی۔

دہلی کی گلیوں میں پنجابی کی آمیزش سے، اُردو کی جو خاک اُڑ رہی ہے وہ اس بات کا گویا ایک اور ثبوت ہے کہ لکھنؤ اس گئی گذری حالت میں بھی چند در چند خصوصیات کا مالک ہے لکھنؤ میں آج بھی بیگماتی زبان آمیزش سے پاک اور مستند ہے۔

لکھنؤ کی زبان! ماشاء اللہ! یہاں کے خوانچے والے تک اپنے فصیح و شیریں لہجے کے لیے مشہور ہیں۔ دہلی اسکول اگر اپنی صاف سادہ اور جذباتی زبان کی خصوصیت پہ نازاں ہے تو لکھنؤ کو یہ فخر ہے کہ اس نے دہلی کی اس خصوصیت میں شوخی اور رنگینی کے اضافے سے دہلی اسکول میں چار چاند لگا کے اُردو کے ایک نئے اسکول "لکھنؤ اسکول" کی بنیاد ڈالی ..... وہ پائدار بنیاد کہ تاریخ ادب اُردو لکھنے والا، اُردو زبان کی ترقی و ارتقا کے مدارج و منازل سے گذرتا ہوا، تاریخ اُردو کے مرقع میں اُردو کی آج کل کی کھینچی ہوئی تصویر رکھے گا تو وہ لکھنؤ اسکول کی اس خصوصیت کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ لکھنؤ اسکول نے زمانے کے اتار چڑھاؤ کے باوجود اپنی شوخی و رنگینی کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیا۔

چونک، آصف الدولہ کے امام باڑے، فرنگی محل، جھوائی ٹولے، خاندان انیس اور خربزے کی طرح اُردو کے لکھنؤ اسکول کی ذہانت و فراست اور شوخی و رنگینی کا ایک خصوصی اور مجسم نمائندہ، لکھنؤ کا "اودھ پنچ" بھی ہے۔ جو شروع سے اب تک باد مخالف کے نرم و گرم، تیز و سخت جھونکے سہتا ہوا اپنی جگہ پر پتھر کی چٹان کی طرح قائم ہے۔

تہذیب الاخلاق، تیرھویں صدی، آگرہ اخبار، ریاض الاخبار، فتنہ، نقاد اور صلائے عام سب پیدا ہوئے، بڑھے، پھلے، پھولے اور مٹ گئے لیکن اودھ پنچ (خدا اسے نظر بد سے بچائے) آج تک اپنی جگہ پر اُسی شان اور اُسی آن بان سے قائم ہے۔

متذکرہ رسالوں اور اخباروں کے علاوہ پنچ کی حیثیت سے بھی اودھ پنچ کی تقلید میں لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ سے بلکہ ہندوستان بھر میں بہت سے اور بھی اخبار نکلے لیکن کسی کو زندگی کی بہار پانچ روز سے زیادہ نصیب نہ ہوئی۔

"سرپنچ" زندہ رہا مگر لکھنؤ اسکول کے اعلیٰ معیار کی ترجمانی کا حق اودھ پنچ ہی کے دست راست ... ابھی لکھنؤ کی سرزمین شوخ و رنگین سے متعدد اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں لیکن لوکل کلر کے اعتبار

(سید جالب مرحوم کے ہمدم کے سوا) اگر دیکھا جائے تو اودھ پنچ کے مقابلے میں وہ گویا ایک سادہ ورق ہیں۔

نقاد، کو اگر یہ فخر ہے کہ اس نے ایم مہدی حسن اور خالد بنگالی جیسے ادیب پیدا کیے۔

ہمایوں، اگر اس پر نازاں ہے کہ اس نے عطاء الرحمن، میاں عبدالعزیز فلک پیما اور ضیاء الدین شمس کے قلم کی بے پناہ طاقت سے دنیا کو آگاہ کیا۔

اور اردو (حیدرآباد) اگر مرزا فرحت اللہ بیگ کی خوابیدہ قابلیت کی نمائش گاہ ثابت ہوا تو اودھ پنچ کی یہ خصوصیت بھی یادگار رہے کہ اس کی آغوش میں وہ لوگ پرورش پا چکے ہیں، جو بعد کو آل انڈیا پوزیشن کے مالک ہوئے۔

مرزا مچھو بیگ ستم ظریف۔ اپنے کمال کے باوجود اب تک گمنام ہیں لیکن اکبر الہ آبادی اور جوالا پرشاد برق سے کون ہندوستانی ناواقف ہے۔

بلکہ میں تو شرر اور سرشار کے کارناموں کو بھی بالواسطہ اودھ پنچ ہی کا رہین منت سمجھتا ہوں۔

یہ تو تھا قدیم اودھ پنچ جس کا سہرا منشی سجاد حسین مرحوم کے سر ہے۔ اب رہا جدید اودھ پنچ سو اس کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ آج اردو میں مشرقی اور اسلامی تہذیب کا مٹا ہوا رنگ، تمام ہندوستان میں اگر کہیں نکھرا ہوا نظر آتا ہے تو وہ صرف اودھ پنچ کے اوراق ہیں!

کاش! شیخ ممتاز حسین عثمانی، شہرت پسند ہوتے۔ یا اگر نہیں تھا تو کاش وہ کم سے کم عزلت پسند نہ ہوتے۔ تو آج دنیا دیکھتی کہ یہ وجود مشخص جسے دنیا شیخ ممتاز حسین عثمانی کہتی ہے ایک شخص نہیں بلکہ تاریخ ہے، "علامہ"، نہیں، بحرالعلوم ہے۔

اودھ پنچ زبان کا تو بادشاہ تھا ہی اور ہے ہی، سیاست میں بھی اول دن سے اسکی رائے کو مجتہدانہ دعوت حاصل رہی ہے۔ سیاست کے خارزار میں ظرافت کی کلیاں بکھیرتا ہوا، جس خوبصورتی سے اودھ پنچ کا اڈیٹر پاک وصاف نکل جاتا تھا وہ سچ تو یہ ہے کہ اسی کا حصہ تھا۔

اودھ پنچ کے کارٹون آج بھی تاریخ سیاست کی ایک سربمہر داستان ہیں۔ کون ہے جو مہر کھولے اور یہ داستان پڑھے۔

اڈیٹر صاحب اودھ پنچ نے "الناظر" کے اس نئے دور میں مرزا رسوا پر ایک مضمون لکھا تھا انھوں نے مرزا کے متعلق جن زریں خیالات کا اپنے بحر در کوزہ مضمون میں اظہار کیا تھا وہ آج حرف بحرف خود انھیں پر صادق آرہے ہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ مرزا رسوا اور علامہ طباطبائی کا فراق شیخ ممتاز حسین کی موجودگی میں برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن شیخ ممتاز حسین عثمانی کی جدائی ناقابل برداشت ہے

کیونکہ اُن کا جواب یہ موجود رہتے لیکن اِن کا واقعی کوئی ثانی نہیں سہ

داغ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

شیخ ممتاز حسین کا مرنا، ایک شخص کا مرنا نہیں ہے یہ اودھ پنچ کا مرنا ہے جو بڑی بڑی تاریخی روایات کا حامل تھا، نہیں بلکہ بجائے خود ایک مکمل تاریخ تھا بلکہ یہ لکھنؤ کے اُردو اسکول کا مرنا ہے کیونکہ اب لکھنؤ میں خالص لکھنوی انداز کا ایسا بے بدل "ماسٹر" اور کوئی نہیں۔

شیخ صاحب مرحوم اگرچہ لکھنؤ اسکول کے متبع تھے مگر ان کا لٹریچر کلاسیکل لٹریچر تھا۔ ابوالکلام، محمد حسین آزاد، نصیر حسین خیال اور مولانا سبط حسن کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ ان کے رنگ کا چربہ نہیں اُڑایا جا سکتا مگر ممتاز حسین کے متعلق تو قسم کھائی جا سکتی ہے کہ آج ہندوستان میں ان کے تتبع میں انھیں کی طرح جامعیت، سادگی اور ظرافت کی ہلکی چاشنی کے ساتھ صحیح طور سے دو سطریں بھی لکھنا کسی کے بس میں نہیں۔

حکیم آشفتہ صاحب کی اس نظم نے جو شیخ صاحب کے متعلق اس الناظر میں شائع ہوئی ہے میرے جذبات کو بہت اپیل کیا۔ یہ نظم نہیں بلکہ اڈیٹر صاحب اودھ پنچ کی ایک چھوٹی سی خوبصورت تصویر ہے۔

میں انھیں جذبات کے ماتحت جو آشفتہ صاحب کے دل میں بھی شیخ ممتاز حسین صاحب کی نسبت موجزن ہیں آشفتہ صاحب سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ شیخ ممتاز حسین کو مرنے نہ دیں جس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اودھ پنچ کو زندہ رکھا جائے جیسا کہ اس کے آثار، لکھنؤ کے مشہور ادیب جناب ظریف کے عنانِ ادارت سنبھالنے سے پیدا ہو گئے ہیں۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ آشفتہ صاحب، شیخ صاحب مرحوم کے صاحبزادے کی معیت میں، پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی، مرزا محمد عسکری بی۔ اے، حکیم عبدالقوی صاحب لکھنوی، وصل صاحب بلگرامی اور اڈیٹر صاحب الناظر کا ایک بورڈ بنا کے، الگ الگ عنوانوں کے ماتحت اودھ پنچ کے انتخابات شائع فرمائیں۔ یہ تو خیر ایک بڑا کام ہے فی الحال ممتاز میموریل بورڈ اگر صرف مضامین ممتاز ہی کی ترتیب و تہذیب اور انتخاب و اشاعت کی خدمت اپنے ذمے لے لے تو بھی قدر دانانِ ممتاز حسین صاحب ہی پر نہیں بلکہ اردو پر ان حضرات کا یہ گویا ایک بہت بڑا احسان ہوگا۔

انتخاب میں فی الحال اور چیزوں کو نظرانداز کر دیا جائے مگر ان "خاصہ کی چیزوں" کو ضرور ملحوظ رکھا جائے۔

اول شیخ صاحب مرحوم کے وہ خطوط جو انھوں نے دوسرے اخباروں اور رسالوں کی مضمون طلبی

کی فرمائش کے جواب میں اُن رسالوں اور اخباروں کو لکھے ہیں خواہ وہ اودھ پنچ میں شائع ہوئے ہوں یا نہ ہوئے ہوں۔

دوسرے اڈیٹر صاحب اودھ پنچ کی نوٹ بُک کا وہ مثالی سلسلہ جو ہر حیثیت سے بے مثال ہے نیز لغات کے سلسلے میں جو کچھ اُنہوں نے یا اُن کے دوسرے نامہ نگاروں نے لکھا ہے معہ ان مباحثوں کے جو اس بحث میں ضمناً چھڑ گئے اور جن کا فیصلہ، قولِ فیصل کے طور پر اڈیٹر صاحب اودھ پنچ نے کیا ۔۔۔ وہ، اور بُوا منلق آرا و بیگم وغیرہ کے فرضی نام سے جو اصلاحی، سیاسی اور ادبی مضامین لکھے گئے ہیں وہ، یہ سب اگر ایک سلسلے میں خوبصورتی اور حسنِ انتخاب و ترتیب کے ساتھ شائع کر دیے جائیں تو یہ بھی ایک بہت بڑا کام ہوگا۔

یہ، شیخ ممتاز حسین مرحوم کی، اودھ پنچ کی، لکھنؤ کی، اُردو کی اور ہندی اور اسلامی ملی ہوئی مشرقی تہذیب کی ایک زندہ یادگار رہوگی۔

آخر میں، اتنا میں اور عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ یادگار اس عنوان سے اگر قائم ہوئی تو خیر، ورنہ

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی | یہ جو اک تھوڑی سی لذت ہے لا حاصل میں ہے

کلامِ اختر

(جناب نواب اختر یار جنگ بہادر اختر مینائی حیدرآباد دکن)

وہ جو آنکھیں جھکائے بیٹھے ہیں | دل کسی کا دُکھائے بیٹھے ہیں
اُس کے کوچے میں خاک پر لاکھوں | آسماں کے ستائے بیٹھے ہیں
جاں نثاری کی داد کیا دیں گے | ہم انھیں آزمائے بیٹھے ہیں
تیرے پہلو میں شکلِ نقشِ قدم | ہم بھی بستر جمائے بیٹھے ہیں
حال یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں سے | اپنے دل کو دبائے بیٹھے ہیں
شمع رو اُن کی بھی خبر کچھ ہے | تجھ سے جو لَو لگائے بیٹھے ہیں

جن کے تم منتظر ہو اے اختر
بزمِ دشمن میں ہائے بیٹھے ہیں

مخمس

بر غزل نواب فصاحت جنگ جناب جلیل جانشین امیر مینائی لکھنوی

(جناب الحاج مولانا سید ابو الاشرف صاحب مجددی مہاجر)

یہ سنتا ہوں کہ تجھ کو حسرت بیداد باقی ہے — مگر مجھ میں کہاں اب طاقت فریاد باقی ہے
یہی کیا کم ہے جو کچھ اے ستم ایجاد باقی ہے — غنیمت ہے جو پہلو میں دل ناشاد باقی ہے
ابھی اس میں خدا رکھے کسی کی یاد باقی ہے

اجل سے وقت آ گیا کیا کرو دل اب میں ستم اس کا — وہ کچھ کرنے نہ پایا تھا کہ آ پہونچا قدم اس کا
میں مرتا ہوں مگر کچھ بھی نہیں مجھ کو الم اس کا — غم اتنا اپنے مرنے کا نہیں جتنا ہے غم اس کا
کہ اس بیداد گر کو حسرت بیداد باقی ہے

[illegible] — [illegible] نہیں اثر اپنا
پڑے ہیں کچھ پھپھولے در ہم و داغ جگر اپنا — کبھی سرمایہ دار عشق ہم بھی تھے مگر اپنا
کچھ آنسو چشم تر میں اب یہ کچھ فریاد باقی ہے

میں خود پھنس جاؤں اس پھندے میں اگر دیکھوں تری مرضی — خود آ [illegible] میں ہو اگر تیری یہی مرضی
مگر انصاف کا طالب ہوں تو بھی لاج رکھ میری — تمہارا [illegible] آنکھوں پہ لیکن عرض ہے اتنی
بہار گل ابھی کچھ کچھ مرے صیاد باقی ہے

محبت سے کبھی کوئی کسی کے پاس ہو جائے — وہی ہوگا [illegible] جس کو ان کا پاس ہو جائے
ہماری نا امیدی امتحاں میں پاس ہو جائے — مٹے جھگڑا کہیں یہ بھی نصیب یاس ہو جائے
جو تھوڑی سی تمنائے دل ناشاد باقی ہے

کسی کو چہرۂ زیبا سے شیدا کر لیا تو نے — کسی کا [illegible] دل زلفوں میں الجھا کر لیا تو نے
اسیر خط و خال [illegible] کر لیا تو نے — [illegible] ہزاروں کو تو اپنا کر لیا تو نے
مری قسمت کا کوئی پھندا کوئی صیاد باقی ہے

جفائے عشق شیریں نے یہی ہے کوہسار نہیں — کہاں اور درد ہجراں کی کہی ہے کوہسار و نہیں
لہو کی ہر طرف ندی بہی ہے کوہسار نہیں — بہار لعل دلالہ کر رہی ہے کوہسار و نہیں
کہ اب تک گرمی خون سر فرہاد باقی ہے

ملا ہر ایک زندان اجل کے راہگیروں سے — چمن میں بس ہمیں پیچھے رہے سب ہمصفیروں سے
نکل جائے یہ ارماں بھی، اُڑا دے ہمکو تیروں سے — اُڑا کر بال و پر کیوں ہاتھ کھینچا ہم اسیروں سے
ابھی تو حسرت پرواز اے صیاد باقی ہے

جو دیکھی شکل یارانِ کہن کی خواب فرقت میں — ہوا یکبارگی پیدا تغیر اپنی حالت میں
ارادہ اور ہی کچھ کر لیا تھا جوشِ ہمت میں — مسلکر رکھدیا مایوسیوں نے دل کو غربت میں
کہیں مُنہ سے یہ نکلا تھا وطن کی یاد باقی ہے

مرض صحت کے آنے کیلیے کب راہ دیتا ہے — بڑی تکلیف دردِ ہجر بھی واللہ دیتا ہے
وصالِ یار کی مجھ کو خبر کون آہ دیتا ہے — تپ غم سے شفا کب دیکھیے اللہ دیتا ہے
مسیحا کر چکے میری دوا جلاد باقی ہے

نہ نکلا دشت وحشت میں کوئی ایسا بہت دیکھے — یہ مانا وہ نہیں تو تھے مگر ڈٹ کے بچے کسکے
شرف کو بھولکر حضرت یہ دعویٰ آپ کر بیٹھے — جنوں آباد الفت میں ہزاروں قیس و وامق تھے
اب اُن سب میں جلیلؔ اک خانماں برباد باقی ہے

نوائے تسنیم

(جناب مولوی اسمٰعیل احمد مینائی صاحب تسنیم بی اے ایل ایل بی وکیل)

یہ دو نشانیاں ہیں میرے نشانہ گر میں — اک موجِ رنگ رُخ پر اک برق سی نظر میں
ملتا ہے ہر جگہ وہ لیکن خصوصیت سے — ٹوٹے ہوئے دلوں میں، غمدیدہ چشم تر میں
آیا تھا یہ سمجھ کر یاں کچھ اماں ملے گی — گذری مگر قیامت مجھ پر تمھارے گھر میں
اللہ رے اُسکی چشم دیوانہ گر کی مستی — ہر ذرہ جھومتا ہے ظالم کی رہ گذر میں
وہ تابِ جذب دل سے شاید نہیں ہیں واقف — جا ہوں تو تشنۂ اثر ہوں اک آہ بے اثر میں
اے یاسِ جاودانی ہرگز کمی نہ کرنا — دھبا نہ لگنے پائے اُمید منتظر میں
پہلے نگاہ خود میں اوروں کو جانچتا تھا — اب دیکھتا ہوں کیا ہوں خود اور کی نظر میں
تو صورت تجلی میں معنئ تماشا — اپنی نظر سے بڑھ کر تو ہے مری نظر میں

تسنیمؔ گو بظاہر ملنا ہے اُس کا مشکل
کس چیز کی کمی ہے لیکن خدا کے گھر میں

نظرے خوش گذرے

عامۃ الناس کے متعلق مشہور ہے کہ اُن کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے خواص بھی اس بارہ میں عوام ہی کی سطح پر ہیں۔ جب ترکی حکومت نے خلیفۃ المسلمین کو ملک بدر کر کے الغائے خلافت کا فیصلہ کیا تو ہندوستان میں یہ سوال اُٹھا تھا کہ اب خلافت کمیٹی کی بھی ضرورت نہیں رہی اسلیے اُس کے نظام کو توڑ دینا چاہیے۔ اُس وقت خلافت کمیٹی کو قائم رکھنے کی ایک ضرورت تو یہ ظاہر کی گئی کہ ترکوں کا یہ فیصلہ صرف ایک قوم کا فیصلہ ہے۔ ساری دنیائے اسلام کا فیصلہ نہیں ہے اور مسلمانانِ ہند کو کوشش کرنا چاہیے کہ دنیائے اسلام کے مشورہ سے منصب خلافت کو از سر نو قائم کریں اور دوسری ضرورت یہ بتائی گئی کہ مسلمانانِ ہندوستان اور دوسرے حصص عالم اسلامی کے درمیان رابطہ قائم رکھنے اور بوقت حاجت اُن سے مشورہ کرنے اور اُن کو امداد دینے کے لیے اس ملک میں کوئی ادارہ ہونا چاہیے اور خلافت کمیٹی کو جو شہرت اور ہر دلعزیزی دنیائے اسلام میں حاصل ہے اُس کے لحاظ سے یہی ادارہ اس کے لیے موزوں ہے دونوں وجوہ اپنی اپنی جگہ کافی وزن رکھتے تھے اور اگرچہ اول الذکر کے لیے حالات کا جلد سازگار ہونا متوقع نہ تھا پھر بھی ثانی الذکر ضرورت بجائے خود اتنی اہم تھی کہ مجلس خلافت کا قائم رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ مگر ہمیں یہ دیکھکر افسوس بھی ہوا اور تعجب بھی کہ باوجودیکہ خلافت کمیٹی قائم ہے۔ بمبئی میں اُسکا باقاعدہ دفتر ہے، اُسکا ذاتی مطبع اور اخبار ہے لیکن ابھی حال میں جب فلسطین کے معاملہ میں مسلمانانِ ہند کو توجہ کرنا پڑی، تو بجائے اسکے کہ اس تحریک کی علمبردار اور منتظم خلافت کمیٹی ہوتی الہ آباد میں فلسطین کمیٹی کے نام سے ایک نئی مجلس کی تاسیس عمل میں آئی اور مختلف مقامات پر اُسکی ماتحت مجالس بھی قائم ہیں مصیبت زدگان فلسطین کیلئے کچھ چندہ بھی بعض مقامات پر جمع ہو رہا ہے اور انجمن شبان المسلمین بمبئی کی جانب سے اہل ملک کو دعوت دی جا رہی ہے کہ چندہ اُسکے ذریعہ سے بھیجا جائے۔ گویا جہاں تک مسئلہ فلسطین کا تعلق ہے مجلس خلافت کا عدم وجود برابر ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ۱۹۲۶ء میں مجلس خلافت کے اغراض و مقاصد کی توسیع کر کے ہندوستان کے اندرونی مسائل بھی اسکے دائرہ عمل میں داخل کر دیے گئے تھے۔ لیکن اسکا یہ مطلب تو غالباً نہ تھا کہ جب کبھی کسی اسلامی ملک پر کوئی مصیبت نازل ہو تو اُس وقت خلافت کمیٹی کو معطل کر کے اُسکی امداد کے لیے ایک نئی مجلس بنائی جائے گی۔ اس وقت فلسطین کا مسئلہ درپیش ہے۔ کل کو فرض کیجیے کہ مصر یا شام یا عراق یا حجاز پر

کوئی مصیبت نازل ہو تو کیا ہر ہر ملک کی امداد کے لیے علیحدہ مجالس قائم کی جائیں گی۔ آخر پھر خلافت کمیٹی کس مرض کی دوا ہے۔ کیا وہ صرف انتخابات لڑانے اور مکاتیب شبانہ قائم کرنے ہی کے لیے رہ گئی ہے۔
مسئلہ فلسطین کی طرف جب مسلمانان ہند کی توجہ مبذول ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ احتجاجی جلسے دوسرے مقامات پر تو پہلے ہوئے مگر خلافت کمیٹی کے مرکز بمبئی میں بعد کو۔ آل انڈیا فلسطین ڈے منایا گیا تو اسکی تحریک بھی مسلم لیگ کی جانب سے ہوئی۔
بے شبہ مجلس خلافت کو اب اگلی سی مقبولیت اور رسوخ حاصل نہیں۔ لیکن کسی دوسری مجلس کی تنظیم کون سا آسان کام ہے۔ اور ایسی صورت میں کہ فلسطین کے حالات فوری توجہ کے محتاج ہیں اور بہت ممکن ہے کہ جدید تاسیس کی تنظیم کو مکمل و مؤثر بنانے سے پہلے پہلے فلسطین کے عرب اپنی موجودہ جدوجہد سے دست بردار ہو جانے پر مجبور ہو جائیں تو اس نئی تاسیس کے لیے مسلمانان ہند کی ساری کوشش رائگاں جائے گی اور جو اُس کا مقصد اصلی ہے یعنے اہل فلسطین کی امداد و خدمت کرنا فوت ہو جائے گا۔

مسٹر جناح نے جو پارلمنٹری بورڈ بنایا ہے اُس کی صوبہ داری تنظیم کے لیے گذشتہ ماہ میں ایک جلسہ لکھنؤ میں منعقد کیا گیا تھا۔ مسٹر جناح نے یہاں اور اُسکے بعد کلکتہ میں جاکر مسلم لیگ پارلمنٹری بورڈ کی تائید میں تقریریں کیں۔ اور دونوں جگہ نہایت بلند آہنگی سے اس امر کا اعلان کیا کہ اب مسلم لیگ سے رجعت پسند خطاب خواہ اور عہدہ طلب عناصر کو نکال دینا چاہیے۔ یہ الفاظ ہیں تو بظاہر بہت خوش آئند لیکن جب عمل کو قول سے مطابقت دینے کی کوشش کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ بس الفاظ ہی الفاظ ہیں۔ ان کے اندر معنی و مفہوم کچھ نہیں۔
صوبہ متحدہ کے پارلمنٹری بورڈ کے صدر راجہ صاحب سلیم پور ہیں تو خازن راجہ صاحب محمود آباد۔ اور یہ دونوں صاحب اپنی سندوں کی رو سے حکومت کی وفاداری پر مجبور ہیں اور اپنی خاندانی روایات کے لحاظ سے خطابات و سرافرازی کے مستحق و متمنی۔ بنگال میں صدارت کے لیے نواب صاحب ڈھاکہ کا انتخاب عمل میں آیا ہے اور وہاں کی آزاد خیال جماعت یعنے پرجا پارٹی نے بورڈ میں شرکت محض اسلیے گوارا نہیں کی کہ اُسکے اصول و مقاصد نواب صاحب ڈھاکہ کی جماعت کے لیے قابل قبول نہیں۔
پنجاب میں مجلس احرار نے بھی لیگ کے بورڈ سے علحدگی اختیار کر لی ہے۔ معلوم نہیں اُسکی صوبہ متحدہ کی شاخ کے کیا ارادے ہیں۔ لے دیکے صرف جمعیۃ العلمائے ہند (قدیم) کی آزادی خواہ جماعت بورڈ کے ساتھ ہے۔ اور چونکہ اُسکے اپنے نمائندے انتخابات میں شریک ہونے والے بہت کم ہوں گے

اسلیے ممکن ہے کہ اُسکا ساتھ آخر تک اس جماعت کے ساتھ نبھ جائے۔ مسلم لیگ بورڈ کے قیام کا محرک صرف ایک جذبہ معلوم ہوتا ہے۔ جدید آئین کی رو سے جب وفاق ہند قایم ہوگا تو مرکزی مجالس کا انتخاب موجودہ دستور کے مطابق نہوگا بلکہ اُسکے اراکین صوبجاتی مجالس سے منتخب ہوکر آئیں گے۔

جناح صاحب کو مسلم لیگ کی تنظیم یا مسلمانوں کی سیاسی تعلیم کی توچنداں پروا نہیں۔ ایسا ہوتا تو وہ ۱۰ سال سے مسلم لیگ کے صدر ہیں (حالانکہ خود مسلم لیگ کے دستور اساسی کی رو سے چھ سال سے زائد کوئی شخص مسلسل عہدہ دار نہیں رہ سکتا مگر قاعدہ قانون کی پابندی کرنا تو مسلمانوں پر حرام ہے) اس طولانی مدت میں ان کو اسکا کافی موقع تھا کہ وہ مسلم لیگ کو منظم کرتے اور مسلمانوں کی رائے عامہ کی تربیت فرماتے۔ کانگریس کو اسی مدت میں مہاتما گاندھی کے مساعی نے کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے۔ لیکن جناح کو ساری فکر یہ ہے کہ صوبجات میں ایسے لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں منتخب ہوں جو وفاقی مجالس کے لیے ایسے نمائندے منتخب کریں جن کی قیادت و رہنمائی مسٹر جناح کر سکیں۔ صوبوں کے وزرا منتخب شدہ اراکین ہی میں سے ہوں گے اس لیے جتنے لوگ بھی اپنا انتخاب کرانا چاہتے ہیں انھیں وزارت کی ترتیب میں حصہ لینے کا موقع ملے گا۔ اگر کسی صوبہ میں مسٹر جناح کی پارٹی کو کافی نمایندگی حاصل ہو گئی تو مسلمان وزرا انھیں کی جماعت میں سے لیے جائیں گے۔ ایسی صورت میں ایک جماعت کے مقابلہ میں دوسری جماعت کے لوگوں کو عہدوں اور خطابات کا خواہاں ظاہر کرنا محض ابلہ فریبی ہے حقیقت کے لحاظ سے عہدوں کے حصول کی جدوجہد میں ان تمام طبقات کے لوگوں کو حصہ لینا ہے جو انتخابات میں شریک ہونے والے ہیں۔ کانگریس کے نمایندے ممکن ہے کہ عہدوں اور خطابات کو ٹھکرا دیں مگر مسلمانوں میں تو گنتی کے چند ہی ایسے اصحاب نظر آتے ہیں جو سرکار کی عنایتوں اور سرفرازیوں کو رد کر سکیں۔ کم سے کم صوبہ متحدہ میں جو حضرات مسلم لیگ پارلمنٹری بورڈ کے نمائندے بنکر انتخابات میں حصہ لینے کے لیے تیار ہیں اُن میں تو کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو موقع ملنے پر کسی عہدہ یا خطاب سے انکار کر دے۔ موقع نہ ملے تو انگور کھٹے کہنے کیلیے ہر شخص تیار ہو جائے گا۔

جس دن اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ سید عبدالرؤف صاحب بیرسٹر الہ آباد (جو مسلم لیگ کے ایک ممتاز رکن تھے) پنجاب چیف کورٹ کے جج مقرر ہوئے اُسی دن ایک کمیٹی کے سلسلہ میں راقم الحروف مسلم لیگ کے دفتر میں تھا۔ اور دوسرے اراکین کے انتظار میں سید وزیر حسن کے ساتھ برآمدہ میں ٹہل ٹہل کر باتیں ہو رہی تھیں سید صاحب نے اس تقرر کا ذکر جس تحقیر کے ساتھ کیا اور جس قدر سید عبدالرؤف صاحب کا مضحکہ اڑایا وہ ہمیں آج بھی یاد ہے۔ یہ ۱۹۳۴ء کا واقعہ ہے مگر دو ہی سال کے بعد جب سید صاحب کو لکھنؤ کی جوڈیشل

میں ایک جگہ ملی تو وہ اپنی ساری آزاد خیالی بھول گئے۔ یہی حال مہاراجہ صاحب محمود آباد کا ہوا۔ جب تک وہ صوبہ متحدہ کے ہوم ممبر نہیں ہوئے اُن سے بڑھ کر کون آزاد خیال تھا۔ ایک دفعہ کانگریس کی صدارت تک کے وہ امیدوار ہوئے تھے۔ مگر ہوم ممبری کے بعد ؟۔

مسٹر جناح اپنی ذات سے واقعی بڑے آزاد خیال ہیں اور یقین ہے کہ وہ آخر تک حکومت سے بے نیاز رہیں گے۔ مگر جس جماعت کی قیادت وہ آجکل فرما رہے ہیں اُن میں سے جمعیۃ العلماے ہند کے مقدسین کے سوا کون ہے جو اس باب میں اُنکا ساتھ دیگا۔ اور ان میں بھی صرف چند ہی بزرگ ایسے ہیں جن کی آزاد خیالی اور بے نیازی پر کامل اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

---

۱۰ ستمبر کو مولف نور اللغات، مولوی نور الحسن صاحب نیر کاکوروی کا چند سال کی شدید علالت کے بعد اپنے وطن میں انتقال ہوا اور ہمارے جد اعلےٰ حضرت مخدوم نظام الدین قاری عرف شیخ بھیکھ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پُر انوار سے قریب دفن کیے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کی وفات سے یوں تو بحیثیت عزیز قریب ہونے کے ایڈیٹر الناظر کا متاثر ہونا لازمی تھا مگر نور اللغات کی تالیف کے ذریعہ جو خدمت اردو زبان کی اُنھوں نے انجام دی ہے اُس کی بنا پر اُن کے انتقال سے حقیقت میں کل دنیائے اردو کو نقصان پہونچا۔ شاعری اور ادب کا ذوق اُنھیں اپنے پدر نامدار حضرت محسن کاکوروی سے وراثۃً ملا تھا۔ انگریزی کی اعلےٰ تعلیم نے اپنی زبان اور قوم و ملک کی خدمت کا ولولہ پیدا کیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سالہا سال تک وکالت کی مصروفیتوں کے ساتھ لغت کی تدوین میں مصروف رہنے کے بعد جب اُنھوں نے محسوس کیا کہ پیشہ میں انہماک کی وجہ سے لغت کی تکمیل ہونا دشوار ہے تو کمال ایثار سے اپنی وسیع آمدنی پر لات ماری اور رہی دوئی چھوڑ کر وطن چلے آئے اور پوری یکسوئی کے ساتھ اس ادبی کام میں مصروف ہوگئے اور برسوں کی لگاتار محنت کے بعد لغت چار جلدوں میں مکمل کر کے شائع کرا دیا۔ ضعیف الجثہ پہلے ہی سے تھے مسلسل شدید دماغی محنت نے اعصاب کو سخت نقصان پہونچایا اور گذشتہ چند سالوں میں یکے بعد دیگرے مختلف عوارض اعصابی کے حملے ہوئے جن کی وجہ سے اب تقریبًا دو سال سے صاحب فراش تھے۔ اسپر بھی ہمت و حوصلہ یہ تھا کہ برابر کچھ نہ کچھ دماغی کام کرتے رہتے اور اُس سے بڑھ کر یہ کہ پیرانہ سالی اور علالت کے باوجود ہمیشہ کسی نہ کسی علمی و ادبی کام کا عزم کرتے رہتے۔ اردو کی خدمت کے علاوہ قانونی تالیفات کا بھی شغل تھا اور اب آخر زمانہ میں خاص طور پر اسکی فکر تھی کہ نور اللغات کا ایک مختصر اور ارزاں ایڈیشن طلبہ کے لیے شائع کرائیں۔

اپنے والد مرحوم کا کلیات نعت عرصہ ہوا مرتب کرکے نامی پریس میں بڑے اہتمام سے چھپوایا تھا۔ دوسری بار کاکوری کی انجمن اخوان الصفا نے اُسے شائع کیا اور اب چند سال ہوئے تیسرا ایڈیشن مرحوم نے ببی پیمانہ پر شائع کرایا۔

۷۳ سال کی عمر پائی اور چار صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں یادگار چھوڑی ہیں اور ہمیں امید ہے کہ اُن کے صاحبزادگان اپنے والد کا مجموعہ کلام اور دیگر غیر مطبوعہ مسودات کو شائع کرنے کی سعادت حاصل کرینگے نیز نوراللغات کے متعلق جو اُن کا منصوبہ تھا اُس کی تکمیل پر بھی توجہ کریں گے۔

انشاء اللہ اُن کے بھانجے برادر مکرم جناب منشی امیر احمد علوی صاحب آئندہ نمبر میں مفصل حالات ناظرین الناظر کے ملاحظہ کے لیے تحریر فرمائیں گے۔

پنڈت کشن پرشاد کول صاحب کا جو مضمون اگست نمبر میں شائع کیا گیا تھا، اُس پر مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اُردو کے تازہ پرچے میں تبصرہ فرمایا ہے، جس کے ضروری حصص آئندہ نمبر میں پیش کیے جا سکیں گے۔

مولوی صاحب نے کول صاحب کی اس تجویز سے اتفاق ظاہر فرمایا ہے کہ (یو۔ پی کے) مدارس میں شروع سے ہندی و اُردو دونوں کی تعلیم لازمی ہونی چاہیے۔ کول صاحب کے اس قول کو درست قرار دیکر کہ ہندو مسلمانوں کو اس طریقہ سے ایک دوسرے کی زبان، لٹریچر، روایات، حسیات و جذبات سے واقفیت ہو سکیگی مولوی صاحب نے ایک ادبی پہلو اس کی تائید میں یہ پیدا کیا ہے کہ:

"دونوں (ہندی و اُردو) کے پڑھنے سے دونوں کو تقویت ہوگی۔ اچھی اُردو کے لیے ہندی جاننا ضروری ہے اور اسی طرح اچھی ہندی لکھنے کے لیے اُردو کا جاننا لازمی ہے"

گذشتہ نمبر میں بیان کیا جا چکا ہے کہ یو۔ پی کے مدارس میں ہندی اور اردو کی تعلیم چند سال ہوئے کہ لازم قرار پا چکی ہے اور اس تجربہ کے نتائج آئندہ پچیس تیس سال کے بعد ظہور پذیر ہوں گے، اُس وقت رائے قائم کرنے کا موقع ملے گا کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے کی غرض اس ذریعے سے کس حد تک حاصل ہوئی۔ خود ہماری رائے میں اس تجربہ کا وہ نتیجہ نہیں نکلے گا جس کے کول صاحب متوقع ہیں۔ اور اس کے وجوہ بھی ظاہر کیے جا چکے ہیں۔

مولوی صاحب کی رائے خادمان اُردو کے لیے ایسی ہے جیسی قانون دانوں کے لیے پریوی کونسل کی نظیر کہ مولوی صاحب سے زیادہ اُردو کا درد رکھنے والا اور اردو زبان و ادب کی ضروریات کا جاننے والا اس وقت کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ بایں ہمہ ہندی اور اُردو کی لازمی تعلیم جس نہج پر جاری ہے اُس کے

لحاظ سے ہمیں اُس فائدہ کی امید نہیں جس کی مولوی صاحب کو آس ہے۔

مدارس میں جو تعلیم دی جاری ہے اُس کے بدولت ہندی طلبہ کو معمولی اُردو پڑھنا لکھنا اور اُردو کے طلبہ کو معمولی ہندی پڑھنا لکھنا آجاتا ہے جو ادبیات کی تعلیم کے لیے قطعاً ناکافی ہے کیونکہ اردو ادب میں مہارت حاصل کرنے کے لیے فارسی اور عربی کی واقفیت ضروری ہے تو ہندی ادب میں درک پیدا کرنے کیلیے سنسکرت سے بہرہ مند ہونا لازمی۔ پھر جس قدر مضامین کا بار طالب علموں پر ہے اُسکے لحاظ سے یہ بھی کتنا دشوار کہ وہ مختلف علوم وفنون کے ساتھ متعدد زبانوں کے ادبیات کی تحصیل کریں۔ صرف چند ہی طلبا ایسے ہوتے ہیں جن کو ادب کا خاص ذوق ہوتا ہے اور جو اُسکی تکمیل کر سکتے ہیں۔ اُن چند کی خاطر طلبہ پر یہ بارگراں عام طور پر اُن کے ذہنی نشو ونما کو جو نقصان پہونچائے گا اس پر بھی تو لحاظ کرنا چاہیے۔

البتہ جو مقصد مولوی صاحب کے پیش نظر ہے وہ اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ جو مخصوص طلبا اُردو یا ہندی ادب کا مطالعہ کرنا یا ان دونوں زبانوں میں سے کسی میں فضیلت کی سند لینا چاہیں اُن کے لیے دوسری زبان و ادب کی کافی واقفیت لازم کر دی جائے۔ پنجاب اور صوبہ متحدہ دونوں میں اردو کے خاص امتحان ہوتے ہیں۔ اب تک ان امتحانات میں ہندی ادب کی تعلیم شامل نہیں ہے۔ پنجاب والے تو شاید اسے بآسانی نہ مانیں مگر صوبہ متحدہ کے شعبۂ السنہ مشرقیہ کے منتظمین ہندی ادب کے ایک دو پرچے اضافہ کر دیں تو غالباً چنداں دشواری نہ ہوگی۔

خود ہماری رائے عرصہ سے یہ ہے کہ اُردو ادب کی تعلیم محض سرکاری مدارس اور محکمہ جات کے رحم وکرم پر نہ چھوڑ دی جائے بلکہ انجمن ترقی اردو یا کسی ایسی ہی غیر سرکاری مجلس کو اپنے زیر اہتمام ادبی امتحانات قائم کرنا چاہیے جیسا کہ ہندی کے باب میں ہندی ساہتیہ سمیلن نے کیا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں جب لکھنؤ میں انجمن اُردو قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا تو انجمن کے زیر انتظام ایک ادبی درسگاہ قائم کرنے کا بھی ارادہ کیا گیا اور اسکا خاکہ بھی تیار ہوا تھا۔ مگر لکھنؤ کے حالات اس قسم کے کاموں کے لیے چنداں سازگار نہیں۔ مشرقی تمدن کے اس آخری گہوارہ میں ردعمل کی قدرتی کارفرمائیوں کے بدولت حد درجہ جمود وسکون اور انتہا درجہ کی نفسانیت و خودغرضی کا دور دورہ ہے۔ مگر جو کام لکھنؤ میں نہیں ہو سکا، دہلی، علیگڈھ یا لاہور میں انجام پانا ممکن ہے۔ اور انجمن ترقی اُردو اسکا بیڑا اُٹھائے تو یقین ہے کہ آسانی سے اچھا انتظام ہو جائے گا۔ اور جب تک کوئی علحدہ اور مخصوص درسگاہ نہ بن سکے صرف امتحانات ہی قائم کیے جا سکتے ہیں۔

———— ()☆() ————

مسلم یونیورسٹی کے طلبہ نے گذشتہ ماہ میں ہڑتال کر دی تھی اور اندیشہ تھا کہ معاملات کی صورت زیادہ

بگڑ جائے اسلیے یونیورسٹی میں چھ ہفتہ کی تعطیل کر دی گئی۔ اور ۵ ار ستمبر سے شروع ہونے والی تعطیل کا اسے بدل قرار دیا۔ ہڑتال کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی پروفیسر صاحب کے ساتھ رہنے والے ایک طالبعلم سے بعض لڑکوں نے مذاق میں کچھ زیادتی کی اور جب پروفیسر صاحب کی جانب سے اُسپر سرزنش ہوئی تو کسی طالبعلم نے پروفیسر صاحب کے روبرو نہیں بلکہ پیٹھ پیچھے اپنے ساتھیوں میں بیٹھ کر اُنکو کچھ سخت سُست کہا جس کی پاداش میں وہ طالبعلم خارج کیا گیا اور اُسکے اخراج سے مشتعل ہو کر طلبہ نے کھانا اور پڑھنا چھوڑ دیا۔

اگر واقعات یہی ہیں تو نہایت افسوسناک بات ہے کہ اتنی سی بات پر مسلم یونیورسٹی جیسے عظیم قومی ادارے میں اتنا ہنگامہ ہو گیا اور بجائے اسکے کہ حالات کی اصلاح کی جاسکتی یونیورسٹی بند کر دینا پڑی جس سے سب طالبعلموں کی تعلیم میں ہرج واقع ہوا لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ جو واقعات ظاہر ہوئے اُنکے پس پردہ کچھ اور اسباب کام کر رہے تھے جنھوں نے اختلافات کی آگ کو ہوا دی اور صورت حال کو سنگین بنا دیا۔

زیادہ تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یونیورسٹی کو ایسے سخت حادثہ سے دوچار ہونا پڑا اور اُسکی مجلس اعلےٰ یعنی کورٹ کی جانب سے کسی قسم کی دلچسپی اور سرگرمی عمل میں نہیں آئی۔ حالانکہ چھ ہفتہ کی مدت اسکے لیے کافی سے زائد تھی کہ کورٹ کا اجلاس طلب کیا جاتا اور اُسکی جانب سے کامل تحقیقات کے بعد مناسب تدارک عمل میں آتا۔

محض یونیورسٹی میں تعطیل کر دینا، اصلاح حال کی کوئی مناسب صورت نہیں ضرورت اسکی ہے کہ یونیورسٹی کے اندر جو مفسدے پھیلے ہوئے ہیں اور جنکی وجہ سے دراصل یہ سارا ہنگامہ ہوا ہی اُنکے دفعیہ پر توجہ کی جائے۔ ہمیں امید ہے کہ قوم کے منتخب نمائندے اپنی ذمہ داری پر نظر کر کے جلد سے جلد اس کشمکش کو ختم کرنے کی سعی فرمائیں گے۔

سنتے ہیں کہ سرسید کے زمانہ سے جو کتابوں کی دکان اور مطبع علیگڈھ میں قائم تھا مسلم یونیورسٹی اب اُسکے انتظام و اہتمام سے قاصر ہے اور اب دونوں اداروں کو ٹھیکے پر دینے کی کوشش ہو رہی ہے۔ ایک قوم وہ تھی جسنے تجارت کی راہ سے کل ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ ایک ہم اُسکے شاگرد ہیں کہ اپنے پچاس سال کے قائم شدہ تجارتی اداروں کو بھی نہیں چلا سکتے اور اسپر ہمت یہ ہے کہ سارے ہندوستان کی نجات دینی و دنیاوی کے اجارہ دار بنے ہوئے ہیں۔

تصحیح

اگست نمبر کے صفحہ ۶۴ پر مکرمی جناب حکیم آشفتہ صاحب کا جو قطعہ تاریخ ہے اُس کی طباعت میں حسب ذیل غلطیاں رہ گئی ہیں ناظرین درست فرمالیں۔

شعر (۱۳) "تری ایک نغاں میں" کی جگہ "مری ایک نغاں میں" چاہیے۔

" (۱۴) "تری راہگذر میں" " "تری راہگذر تھا" چاہیے۔

ادھر میں راوٹی کے اندر مصیبت قید کی جھیل رہا تھا اُدھر حامی میری اور میرے گھر کے لوگوں کی رہائی کی کوشش میں براہ نمک حلالی دل و جان سے مصروف تھا۔ اثنا ایک مسلمان فقیر سے (جو کیمپ کے ساتھ برابر رہ کر گذر اپنا مسلمان سپاہیان کی روٹیوں سے بذریعہ بھیک مانگنے کے کیا کرتا تھا) ملاقات حامی مذکور کی ہوگئی اور اُس کے ذریعے سے پتہ اُس کو اُن سپاہیان کا لگا تو پھر وہاں پہونچکر حامی مذکور کو ہر طرح کی کامیابی اپنی کوشش میں ہوئی۔ قریب اُن راوٹیوں کے جن میں میں اپنے پناہ دہندگان کے ساتھ رہتا تھا امام الدین وردی میجر کا خیمہ تھا جو اپنے اوصاف حمیدہ میں نہایت شریف النفس و منصف مزاج و زندہ دل نظر آتا معلوم ہوتا تھا اُس کی ملاقات سے ہر ایک کا دل از حد خوش اور اُس کی طرف مائل ہوجاتا تھا۔ میں بھی اُس سے اکثر ملا کرتا تھا۔ جب بے تکلفی ہوگئی تو ادھر اُدھر کی باتوں میں کبھی کبھی ذکر غدر کا بھی آجاتا تھا وہ بالکل خلاف اسکے تھا۔ وہ شرکت اپنی بخوف ہندوؤں کے جن کی مخالفت سے بوجہ کثرت اُن کی کے اندیشہ جان کا تھا اس افسوسناک بغاوت میں ظاہر کرتا تھا اور دیگر مسلمانان کی نسبت بھی ایسا ہی خیال اُسکا تھا کہ وہ ہندوؤں کی ترغیب و کثرت اور اپنی قلت و جہالت سے لوٹ مار کی طمع پر شریک اُن کے ہوگئے۔ مگر میری رائے میں نیک و بد ہر فرقہ میں ہوتے ہیں تخصیص کے ساتھ کسی ایک فریق پر الزام رکھنا بیجا ہے۔ بہر حال جو کچھ ہو میرا اصل مقصد وردی میجر مذکور سے اپنی ملاقات کو بے تکلفی کے ساتھ بڑھانے اور اس طور پر رسوخ اپنا پیدا کرنے سے یہ تھا کہ وہ کسی وقت میرے دوستوں کی تدبیر رہائی میں کام آوے۔ چنانچہ چند بار میں نے ڈرتے ڈرتے اُن کی نسبت یہ کہنے کی جرأت بھی کی کہ وہ سب دل سے مسلمان ہوگئے ہیں اور شبانہ روز وقت اپنا سچے مومنوں کی طرح نماز و ظیفہ میں بسر کرتے ہیں پس بمقتضائے اخوت اسلامی بہتر ہوگا کہ یہ سب چھوڑ دیے جائیں ورنہ اگر خدانخواستہ وہ نانا ملعون کے پنجۂ غضب میں آکر مع زن و بچے کے قتل ہوئے تو اسکا وبال سب مسلمانوں پر پڑیگا۔ وہ بیچارے تو درجہ شہادت پاکر خلد نشیں ہوں گے اور مشیر کنندگان کا حشر دوزخ کے ساتھ ہوگا۔ اس پر اُس نے بعد کسی قدر غور کے یہ کہا کہ میں خوب جانتا ہوں اور کبھی خود بھی دیکھا و سُنا ہے کہ فی الحقیقت وہ مسلمان ہوگئے اور مشاغل اُن کے نماہدانہ ہیں مگر حکم رہائی کا براہ راست میں نہیں دے سکتا کیونکہ یہاں کسی افسر و یا حاکم کی کچھ حکومت نہیں ہے کل سپاہ خود سر و سرکش ہے وہ اپنا رسوخ و ناموری اُن کو نانا کی حوالگی میں سمجھتے ہیں۔ ایک آدمی ہو تو اُس کو کوئی سمجھاوے ہزارہا کا اتفاق کیسے ٹوٹ سکتا ہے ہاں اگر کوئی معقول تدبیر آپ کے ذہن میں ہو تو میں اندر اختیار اپنے کے بالائی مدد دینے پر موجود ہوں میں اُس وقت وہاں سے اُٹھکر اپنے پناہ دہندگان کی صلاح مشورہ لینے کو چلا آیا اُدھر سپاہ نانا صاحب

بھی مع مقلدین اپنے کے سرگرم عبادت مصنوعی اپنے کے تھے ۔ آخرش بعد کد وکاوش تمام اور پند و نصائح
بلیغ کے جو مذہبی پہلو اور انسانی ہمدردی پر عمل میں آئے تھے یہ مشورہ قرار پایا کہ وردی میجر صاحب بہیر
کی حفاظت پر (جو کوچ کے وقت فوج کے پیچھے ہوتی ہے اور جس میں قیدیاں وغیرہ بھی شامل ہوتے
ہیں) نوکری طرفداران میرے کی جو اس کام کے لیے موزوں اور لائق بھروسہ کے ہوں بدل دیویں اور
وہ راستہ میں ان قیدیان کے ساتھ ایسا پیش آویں کہ اُن کو بآسانی تمام بھاگ جانے کا موقع ملجاوے ۔
سو خدا کا شکر ہے کہ انجام ان تمام کارروائیوں کا بحق اُن بیچارگان کے ایسا خوش اسلوبی اور کامیابی کے
ساتھ ہوا کہ وہ سب ایسی جگہ پر اثنا راہ کانپور میں رہا ہوگئے جہاں سے وہ سب بلا خوف وخطر بھاگ کر
ایک محفوظ نہ پوشیدہ مقام میں اپنے دوستوں کی زیر حمایت رہے جب تک کہ صورت امن پیدا نہ ہوئی ۔
سُنا تھا کہ وہ سب رانی عگبن پور کے محلوں کے ایک مخفی تہ خانہ میں جا کر چھپے تھے جنکے خاندان کا برتاؤ
دوستانہ طریق پر مسٹر لیابنا صاحب سے ایک مدت دراز سے تھا ۔ شاید بعض نوجوانان میرے احباب کے
اس عارضی روش یعنے اسلامی وضع اختیار کرنے پر قہقہہ اُڑا دیں ۔ مگر اُنھیں چاہیے کہ وہ ایسے لوگوں سے
سبق حاصل کریں جو بہ زمانہ غدر مثل اُن بیچاروں کے مبتلائے مصیبت ہوئے ہوں ۔ باقی جن کی پیدائش
اُس سے ایک مدت کے بعد ہوئی ہے اور جن کو ہوا تک اُس زمانہ کی نہیں لگی ہے وہ کیا جانیں اُنکے
نزدیک تو اُس وقت کی باتیں ایک قصہ کہانی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں ۔ علاوہ اسکے یہ کوئی
نئی بات نہیں ہے اُس ہولناک زمانہ میں اور جگہ بھی شاید ایسے اتفاقات پیش آئے ہوں ۔ مجھ کو نہایت
افسوس ہے کہ وہ خوشی جو مجھے اپنے دوستوں کی رہائی میں ہوئی تھی فوراً ہی مبدل بہ آہ وزاری ہوکر
اس سے بدتر حالت میری مصیبت کی ہوگئی جو قبل اُس کے راؤنڈ میں تھی ۔ یعنے بعد رہائی قیدیان
مذکورہ کے جو سپاہیان پناہ دہندگان میرے کیمپ جدید میں پہونچ کر اپنے اپنے ڈیروں کی درستی میں
مصروف ہوئے اور بہیر میں جو سامان وغیرہ اُن کے سپرد تھا مع ملازمان شاگرد پیشہ وغیرہ وغیرہ کے اپنے
اپنے موقع پر باستثنا قیدیان رہا شدہ کے پہونچ گئے اور تمام کیمپ میں یہ خبر پھیل گئی کہ قیدیان کی
راؤنڈ نہیں لگی اور نہ وہ موجود ہیں تو اس پر بے شمار سپاہیان سرکش کا ایک مجمع کثیر یکجا ہوکر وہ ہنگامہ
برپا ہوا کہ میرے دوستوں کے ہوش اُڑ گئے اور امام الدین خاں وردی میجر کے بھی حواس بجا نہ رہے
اور اس جوش وخروش ولعن وطعن کے ساتھ بازپرس رہائی قیدیان کا ہو ملنان میرے سے ہوا
اور وہ وہ تخویف اُن کو بہ پاداش اس جرم سنگین کے نا ہنا ملعون کے ظالمانہ برتاؤ سے دی گئی کہ
پناہ بخدا ۔ قریب تھا کہ گرفتاری اُن کی عمل میں آوے کہ وہ بیچارے وردیاں اپنی اپنی چھوڑ کر مع ہتھیار

اپنے کے بھاگ گئے۔ اور امام الدین خاں وردی میجر نے خیریت اپنی کمپ میں نہ دیکھ کر ساتھ اُن مفرور دل کا دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ جگہ اُن بہادران وفاشعار سے جن کی خدا ترسی و ہمت مردانہ سے اُن بچارے قیدیان کی جاں بری ہوئی تھی بالکل خالی ہو کر میں یکہ و تنہا مع بیوی و چند ملازمین اپنے کے اُن خونخوار بے شمار اژدہوں کے بس میں آگیا جن میں سے اکثر ۵۳ رجمنٹ کے سپاہی و نیز وہ تھے جنھوں نے مجھ کو قلعہ میں بحالت غیظ و غضب اپنے کے گرفتار کیا تھا۔ قبل اس کے میں لکھ چکا ہوں کہ کمپ اُن کا کثرت فوج اور سامان حرب وغیرہ سے دور تک پھیلا ہوا تھا۔ سوا سو جب کے میرے طرفداران کے پیدا ہونے اور راڈلی قیدیان سے چھوڑا کر اپنے ڈیروں میں رکھنے اور رہائی قیدیان کی کوشش میں پیروی کرنے میرے کی اطلاع میرے دشمنوں کو اُس وقت تک نہیں ہوئی تھی جب تک کہ میرے دوست بفضلہ تعالے رہا نہیں ہو گئے تھے۔ اور چونکہ احتیاط اس کارروائی میں بلیغ کی گئی تھی اس وجہ سے وہ اور بھی بے خبر رہے۔ کاش اگر میں تنہا ہوتا تو اپنے طرفداران کے ساتھ میں بھی غائب ہو جاتا مگر افسوس کہ میرے پیروں میں بیڑیاں تعلقات خانگی یعنے ہمراہی بیوی اپنی کی ایسی سخت پڑی ہوئی تھیں کہ ایک دم کے لیے بھی اُن کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ آخرش انھوں نے تمام غصہ اپنا مجھ پر اُتارا اور اُن سب کی عوض میں جو میرے حسن تدبیر سے جانبر ہوئے تھے مجھ ہی اکیلے کو دھر لیا میں نے بھی یہ سمجھ کر صبر اختیار کیا کہ پندرہ بیس بے گناہان کے سلطف زندگی قائم رکھنے کے لیے صرف مجھ ایک متنفس کا بدل دیا جانا خالی از مصلحت الٰہی نہیں ہے۔ ہاں اگر کچھ اضطراب تھا تو اپنی زوجہ کی نازک حالت پر کہ اُن کو چھ مہینہ کا حمل تھا اور شدت لو و دھوپ سے نہایت مضمحل و ناتواں ہو گئی تھیں قبل اس کے کہ میں جالون چھوڑوں بہتر ہوگا کہ یہاں کے حالات یہیں ختم کر دوں۔ واضح ہو کہ باغیان افواج جھانسی نے ادھر تو مجھ کو نہایت سختی کے ساتھ قلعہ میں (جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے) گرفتار کر کے بشمول دیگر قیدیان اپنے کے راؤلی مذکورہ بالا میں مقید کیا۔ اُدھر وہ کوشش ایصال زر میں مصروف ہو کر نہ معلوم کن تدابیر کو عمل میں لائے کہ قریب قریب تین لاکھ روپیہ کے اُن کو وصول ہو کر اشک شوئی اُن کی بمقابلہ اُس ناکامی کے ہو گئی جو سرکاری خزانجات کے نہ لوٹ سکنے کی وجہ سے اُن کو ہوئی تھی۔ قبل اس کے میں لکھ چکا ہوں کہ تاتیا پسر کیشو راؤ راجہ گورسرائے اس ریاست (جالون) کے غصب کرنے اور اُسکو اپنی ریاست موروثی (گورسرائے) میں شامل کرنے پر بہمہ تن مصروف تھا۔ اور وہ اُس پر باستثنا قلعہ دخل قبضہ حاصل کرنے سے قریب قریب کامیابی کی حد تک پہونچ چکا تھا۔ اور نیز یہ بھی میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ تائی بائی صاحبہ جو اصلی رئیسہ اس قلعہ کی تھیں وہ بھی فکر و تدبیر

بازیافت اپنی ریاست سے غافل نہ تھیں اور اُن کو یہ مداخلت راجہ گورسرائے کی ازحد ناگوار تھی وہ اُس کی اس غاصبانہ کارروائی کو نہایت حسد و بغض کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ الغرض جیسا کہ میں نے گرفتاری اپنی سے چند روز بعد سُنا تھا کہ باغیان جھانسی سے رئیسہ مذکورہ نے سازش کرکے اس بات پر اُن کو آمادہ کیا کہ وہ ایک رقم کثیر تین لاکھ روپیہ کی لے کر بعوض اُس کے اول تو غارتگری قصبہ سے باز رہیں دوسرے تانتیا پسر راجہ گورسرائے کو نکال کر رئیسہ کو اپنی مسند ریاست پر کہ وہ حقدار اُس کی تھی بٹھال دیں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا یعنے منجملہ تین لاکھ روپیہ کے ایک لاکھ کا بندوبست رئیسہ مذکورہ نے اپنی ذاتی جائداد منقولہ سے کرکے اور باقی دو لاکھ روپیہ مہاجنان وغیرہ اشخاص متمول سے حسب حیثیت ان کے چندہ کرکے وصول کیا جنھوں نے بامید حفظ جان و مال اپنے کے بلا عذر و حجت دیدیا اور یہ کل رقم تین لاکھ روپیہ کی فوج باغیان کے حوالہ کیا۔ اس رقم کو لے کر فوج باغیان مذکورہ نے تانتیا مردود پر یہ الزام رکھ کر (کہ اُس نے براہ غصب دوسرے کی ریاست پر مداخلت بیجا کی) گرفتار کرکے دونوں توپیں اُسکی چھین لیں اور بعد لوٹنے کل مال و اسباب اُسکے اور اُسکے سپاہیان کے اسقدر مارپیٹ کی کہ وہ نہایت ذلت کے ساتھ بھاگ کے اپنی ریاست کو مع ہمراہیان اپنے کے چلا گیا جس کی خوشی مجھ کو ازحد ہوئی کہ اسی جہان میں منتقم حقیقی نے انتقام میرا اُس سے لے لیا و نیز اُس کی نمک حرامی کی سزا قرار واقعی اُس کو مل گئی جو بمقابلہ گورنمنٹ انگریزی کے اُس نے کی تھی۔ یعنے گورنمنٹ موصوف نے خیرخواہ اپنا سمجھ کر واسطے حصول مدد کے اُس کو بُلایا تھا اور اُسکے برخلاف اُس نے بجائے مدد کے علم بغاوت بلند کیا۔ دوسرا حال اُن باغیان فوج جھانسی کا یہ بھی لائق اطلاع کے ہے کہ ان ملعونوں کا دریائے قہار بیرحمی کا صرف یورپین ہی کی ہلاکت پر موجزن نہیں تھا بلکہ ہندوستانی بھی اُس کے تباہ کن تموج سے محفوظ نہ رہ سکے۔ مجھ کو خوب یاد ہے کہ اُن ایام میں جبکہ میری نشست امام الدین خاں وردی میجر کے یہاں بغرض حصول امداد رہائی قیدیان کے (جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے) وقتاً فوقتاً رہا کرتی تھی ایک دن اُنھوں نے دو تین سپاہیان کو مع کچھ شئے کے اپنے اپنے دوپٹوں میں باندھ لاتے ہوئے اپنے خیمہ کی طرف دیکھ کر مجھ سے کہا کہ ان ظالموں نے شاید آج کسی قصاب کی دوکان لوٹی ہے کہ خون کے قطرے اُن کے ہر ایک بقچہ سے ٹپک رہے ہیں۔ اتنے میں اُن سپاہیوں نے روبروے افسر مذکور کے آکر اپنا اپنا بقچہ کھول کر اُن کے سامنے پھیلا دیا اور فخر کے ساتھ اکڑ کر یہ کہا کہ دیکھیے وردی میجر صاحب یہ ہماری آج کی کارگذاری ہے۔ افسر مذکور نے سر جھکا کر دیکھا تو اُس میں دو اڑھائی سو کان اور سو سوا سو ناکیں مع طلائی بالیاں اور نتھ اور بلاق تھا سے جڑے اڑ

وغیرہ جڑاؤ کے جھڑے سے کٹی ہوئی تھیں جن کو امام الدین خاں نے نہایت افسوس کے ساتھ دیکھ کر سخت لعنت ملامت اُن کو کیا کہ اے ظالمو تم کو ان زیورات کا لوٹنا ہی منظور تھا تو سہولیت کے ساتھ اُن کے ناک کانوں سے اُتار لیتے نہ یہ کہ اُن بے بس و بیچاری عورتوں کو ہمیشہ کے لیے نکٹی و بوچی کر دیا جن کی زندگی نہ صرف اُن کے خاندان میں تلخ ہو گئی بلکہ اُن خوفناک صورتوں سے جو تمہارے وحشیانہ ظلم سے اُن بے گناہوں کی ہو گئی ہیں وہ سب کی سب نفرت انگیز خلائق ہو گئیں بہتر تھا کہ اُن کو قتل کر ڈالتے کہ اس زندگی سے موت بھلی تھی۔ اس تنبیہ افسر مذکور پر بجائے اس کے کہ وہ نادم ہو کر اپنی حرکات وحشیانہ پر افسوس کرتے ایک قہقہہ لگا کر کہنے لگے کہ جب تک ہم ایک ایک بالی اور نتھ اُن کی ناکوں اور کانوں سے اُتارنے کی زحمت اُٹھاتے تب تک بیس پچیس ناک کان کیوں نہ کاٹ کر سو ڈیڑھ سو بالیاں و نتھ و بلاق ایکدم میں حاصل کرتے۔ بہرحال اُن ظالموں نے اگلے کوچ میں مجھ کو ایک چھکڑے پر (جو شاید رسد کے ہونگے) لٹا کر رسیوں سے جکڑ دیا اور ایسے ہی ایک دوسرے چھکڑے پر کسی قدر کربی (یعنے خشک ترنکڑیاں جوار کی مع پتوں کے جو مویشیان کی خوراک کے لیے جمع تھیں) بچھا کر میری بیوی کو جو چادر اوڑھے تھیں بغیر کسی سایہ کے مع اُن کی خادمہ اور حاجی دولت کے بٹھال دیا۔ اور ایک ڈبل پہرہ سپاہیان چیدہ کا جن پر انھیں اعتبار تھا دونوں چھکڑوں پر مقرر کر دیا اس بندش و نیز لوہ و دھوپ کی شدت سے (جو بندیلکھنڈ میں حسب تحریر بالا مشہور ہے) میری حالت مثل ماہی بے آب کے جو تڑپ بھی نہ سکے ہو گئی اور میری بیوی کو بھی تیزی بخار سے سرسام ہو گیا اور ہوش و حواس باقی نہ رہے اور ایک حالت نزع کی سی پیدا ہو گئی۔ یہ حالت دیکھ کر حاجی دولت نے اُن ظالموں کے افسر اعلیٰ سے کہ وہ بھی اظلم تھا کل کیفیت بیان کی۔ وہ دیر تک سوچا کیا اور پھر جب تحقیق ہوا کہ حاجی سچ کہتا ہے مغرورانہ یہ حکم دیا کہ زنانی سواری کو باہر کیمپ کے لے جا کر جہاں جی چاہے چھوڑ دو اس بلا کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ حاجی نے اس اجازت کو غنیمت سمجھ کر اُس چھکڑے کو باہر کیمپ کے لے جا کر چھوڑ دیا اور ایک کرایہ کی پردہ دار بہلی اپنے حسن تدبیر سے بہم پہونچا کر اور زنانی سواریوں کو اُس میں بٹھا کر ریاست گوڑہ کی طرف جہاں کے نواب سے میری ملاقات تھی روانہ ہو گیا۔ گو اس کارروائی سے میرا دل کسی قدر ہلکا ہو گیا مگر یہ خیال مفارقت دائمی کے جو بمقتضائے حالت ہم دونوں کے یقینی تھی سخت بیقراری ہوئی حتی کہ بعد چلے جانے اُنکے کے میں دیر تک بچوں کی طرح چلا کر رویا کیا اور پھر آج تک وہ زندہ دلی مجھ کو نصیب نہ ہوئی جو اُن کی حیات میں تھی۔ گو قدرت نے اپنے مبدا فیاض سے خیر اسوں اسباب اس اثنا میں کہ نصف صدی سے زیادہ گذر گئے عیش و دلبستگی وغیرہ کے وقتاً فوقتاً ایک سے ایک بڑھ کر مہیا کیے اور بفضلہ اولاد بھی

بہ کثرت ہوئی مگر وہ خوشی و تازگی روح کی کبھی حاصل نہ ہوئی۔ اکثر اُس وقت کا درد ناک سین پیش نظر
ہو کر باعث سوہان روح ہوا کرتا ہے۔ یہاں سے کانپور شاید دو یا تین منزل ہوگا۔ پہلی منزل میں
جب میری حالت اس وحشیانہ تکلیف دہی و ضرر رسانی سے قریب المرگ ہوگئی تو آئندہ کوچ میں اُنھوں
نے چھکڑے پر بندش ہاتھ پیروں کی موقوف کر دی اور بجائے اُس کے مشکیں کس کر چھکڑے مذکور پہ
بٹھال دیا اور دونوں سرے رسّی کے اُس سے مضبوط باندھ دیے تاکہ نیچے کود کر بھاگ نہ سکوں
حالانکہ اس کمزوری میں کہ پوست و استخواں باقی تھی یہ خیال اُن کا محض بے جا اور غیر ممکن الوقوع
تھا۔ بہرحال وہ اسی طرح مجھ کو کانپور لے گئے۔ میرا چھکڑا ہمیر کے ساتھ کل سپاہیان و سواران
صف بستہ و نشان و توپ خانجات وغیرہ لوازم حرب کے بہت فاصلہ پر پیچھے تھا۔ نہ معلوم آگے
بڑھ کر اُنھوں نے تانتیا ملعون اور نانا نامرد دو سے حاضری اپنی دیتے وقت میری نسبت کیا حکم حاصل
کیا کہ بروقت پہنچنے ہمیر اور کل ہمراہیان اُسکے کے ایک خالی چھاؤنی کی گول کوٹھری میں (جہاں متھیار
وغیرہ سپاہیان کے رہا کرتے تھے) لے جا کر مشکیں میری کھول دیں اور ایک بھاری قفل دروازہ میں
لگا کر ڈبل پہرہ سپاہیان معتبرین اپنے کا بہ کمال تاکید حفاظت کے مقرر کر دیا۔ وہ کوٹھری اُس گورے
یا کال کوٹھری سے بھی بدتر تھی جو مجرمان سزائے موت کے لیے جیلخانجات میں مخصوص ہوتی ہے
اُس میں بھی ہوا کے نفاذ کے لیے دو تین کھڑکیاں جنگلہ دار بنی ہوتی ہیں مگر اس میں تو سوائے اُس
ایک دروازہ کے جو تختوں کے کواڑ سے بند و مقفل کر دیا گیا تھا کوئی روشندان تک۔ نہ تھا۔ اور
اُس پر لداؤ کی چھت پختہ رات کے وقت موسم گرما میں احتباس ہوا اور شدت گرمی کو اور بھی دوبالا و
ناقابل برداشت کرتی تھی۔ بہرحال قہر درویش بر جان درویش کا مضمون صادق تھا کیونکہ مجھ پر بخیال مفارقت
دائمی زوجہ اپنی کے جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے زندگی وبال تھی۔ مرنے پر تُلا ہوا بیٹھا تھا۔ اگلے روز
دو بجے دن کو ایک ڈبل گارد سپاہیان کا آیا اور وہاں سے نکال کر مجھے سنگینوں کے حلقہ میں گھاٹ
کنارے کشاں کشاں پیدل لے گئے۔ وہاں کشتیاں انگریزوں اور اُن کی میموں اور بچوں سے بھری
ہوئی لب دریا پندرہ بیس قدم کے فاصلہ پر گہرے پانی میں جمع تھیں اور اُن میں پھوس کی جھونپڑیاں
سایہ دار بنی ہوئی تھیں جن میں سے ایک کشتی پر مجھ کو بھی بٹھال کر چلے گئے۔ اُسکے بعد جو انگریز آتے
گئے وہ مثل میرے کشتیوں پر بیٹھتے گئے۔ آخرش تمام کشتیاں جب بھر گئیں دیا جبکہ بیٹھنے والے
بیٹھ چکے۔ تو بجائے اس کے کہ ملاحان رسیاں اُن کی کھول کر چھوڑ دیں وہ بھی ہوئی تھیں آگے
کھیویں سو برعکس اس کے اُنھوں نے ایک دم سے تمام جھونپڑیوں میں آگ لگا دی اور خود نہایت

تیزی کے ساتھ دریا کے کنارے پہونچ کر کچھ ایسا اشارہ کیا کہ بیشمار توپوں کے گولوں نے اپنی تباہ کن
ضربات سے تمام بھری ہوئی کشتیوں کو تہ و بالا کر دیا اور قریب قریب کل کشتیاں مع اپنے اپنے بدنصیب
راکبوں کے چور چور ہو کر غرق آب ہو گئیں۔ مگر میرا پیمانہ حیات اس طوفان عظیم میں بھی لبریز نہ ہوا
اور کچھ شکستہ تختوں پر جو باہم ملصق تھے بہ کر لوگوں کی زد اور پانی کے تھپیڑوں سے جو بلیوں اُچھل
رہا تھا بچکر ایک ناہموار کنارہ دریا سے جو مقام گھاٹ سے بہت دور تھا آلگا۔ وہاں سے میں درختوں
کی جڑ اور گھاس وغیرہ جو ٹیکروں پر جابجا جمی ہوئی تھی پکڑتا ہوا بمشکل تمام اُس پار پہونچا۔ یہاں
سے تخمیناً سو قدم کے فاصلہ پر ایک گنجی گھاس خشک کی بلندی پر لگی تھی۔ جس طرح ممکن ہوا وہاں
تک اپنے تئیں پہونچا کر گنجی مذکور میں ایک شبانہ روز پوشیدہ رکھا۔ دوسرے روز تھوڑی گھاس
ہٹا کر دیکھا تو چاروں طرف سناٹا نظر آیا۔ باہر نکل کر گو ہوا خوری سے تازگی روح کی کسی قدر ہوئی
مگر تین روز کے فاقہ اور گذشتہ مصیبت کی ماندگی نے ایسا مضمحل و بیکار کر دیا تھا کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا
تھا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ پیشتر کبھی میں کانپور یا اُس کے ضلع میں نہیں
رہا تھا نہ اُس سرزمین کو دیکھا تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ میں یہاں کہاں اور کس موقع پر ہوں۔ آخرش
شتر بے مہار کی طرح چل کھڑا ہوا۔ اپنے خیال میں پورب کی جانب آبادی سے بچتا ہوا جا رہا تھا۔ راستہ
میں ایک جنگل نظر آیا اندر اُس کے گیا تو بیروں سے فاقہ شکنی اپنی کی اور ایک نالہ پر منہ ہاتھ دھو کر
اور کچھ پانی پی کر شکر خدا بجا لایا اور اپنا صافہ سر سے اُتار کر مٹی سے اُسکو رنگا اور بقدر ایک لنگوٹ
اور تہمد کے پھاڑ کر ستر پوشی اپنی فقیرانہ وضع پر کی اور جو کچھ صافہ میں سے بچا اُس میں سے بقدر
ایک انگوچھے کے پھاڑ کر ما بقی سر پر باندھ لیا اور باقی کل کپڑے اپنے اُتار کر وہیں چھوڑ دیے
اور آگے بڑھا۔ تخمیناً ڈیڑھ کوس پر ایک میدان میں کچھ جھونپڑیاں کسی گاؤں کے مزرعہ کی نظر آئیں
اُن میں سے ایک بڑھیا کو اپنے جھونپڑے کے آگے بیٹھا ہوا دیکھ کر قریب اُس کے گیا تو اُس نے
سادھو فقیر سمجھ کر کچھ دودھ اور باجرہ یا جو کی روٹیاں مجھ کو دیں میں نے کھا کر خدا کا شکر ادا کیا اور
فقیرانہ لب و لہجہ میں دعائیں اُس کو دیں۔ اور چونکہ قبل غدر امتحان زباندانی اور نوشت و خواند ہندی
جو میرے عہدہ کے لیے لازمی تھا عمدہ طور پر دے چکا تھا اور بہت بڑا حصہ میری ملازمت کا
بندوبست کے کام میں دورہ پر گذرا تھا اور دیہات میں ہر قسم کے مرد و زن سے نوبت گفتگو کی رہا
کرتی تھی اور اُن کے مکانوں میں جا کر ہر فرقہ کی تمدنی حالت و طریقہ معاشرت اور رسم و رواج خانگی
اور اُن کی بول چال اور لب و لہجہ پر جو جس موقع پر ادا کیے جاتے ہیں اچھی طرح پر توجہ کے ساتھ

ذہن نشین کرکے مزاولت اُن کی ایسی حاصل کرلی تھی گویا وہ اپنی ہی زبان ہے۔ اس لیے وہ نقلی
بھیس میرا اصلی معلوم ہوتا تھا جس کے سبب سے خدا کا شکر ہے کہ راستہ میں مجھ کو کسی نے شناخت نہیں کیا
ورنہ دوبارہ گرفتاری کا سخت اندیشہ تھا۔ الغرض ایسا ہی میں اپنے کو بچاتا ہوا دس بارہ روز میں بمقام
کدورہ پہونچا جہاں حاجی دولت حسب تحریر بالا میری بیمار بی بی کو باغیان کے کمپ سے لے گئے تھے۔
وہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ مریضہ کی حالت زیادہ خراب دیکھ کر حاجی مذکور اُن کو قبل اسکے باندہ لے گیا
جہاں میرے والدین موجود تھے پھر میں فوراً باندہ گیا یہاں اپنی بی بی کو مرض الموت یعنے تپ دق
میں مبتلا پایا تیسرے درجہ پر نوبت اُس کی پہونچ کر لاعلاج ہوگیا تھا صرف پوست و استخواں باقی تھی۔
قوت نشست و برخاست کی بالکل نہ تھی۔ ڈاکٹر و حکیموں نے بہت کوشش کی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔
نبی بخش خاں بھائی اُن کا الہ آباد سے آگیا تھا۔ مریضہ کو اُس اخیر وقت میں اپنی ماں کو ایک نظر دیکھنے
کی از حد تمنا تھی گو راستہ بہت مخدوش تھا مگر بھائی اُن کا ڈولی پر بٹھا کر غیر معمولی راستہ سے بحکمت عملی
نکال لے گیا اور راج پور کے گھاٹ سے عبور کرکے الہ آباد پہونچ گیا جہاں اُن کا شدت مرض و تکان راہ سے
بعد وضع حمل کے جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اپنی ماں کے آغوش میں ہزاروں حسرت و ارمان کے ساتھ
انتقال ہوگیا اور خاندانی قبرستان میں دفن ہوکر خلد نشین ہوئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ گو یہ سب حال
مجھ کو ایک عرصہ کے بعد الہ آباد پہونچ کر معلوم ہوا مگر مایوسانہ حالت روانگی اور باہمی تعلقات دلی نے
اپنا اثر میرے قلب پر ویسا ہی یہاں باندہ میں بھی ڈال رکھا تھا جیسا کہ الہ آباد کی موجودگی میں پڑا۔
یعنے بعد جانے اُنکے کے میں باندہ میں بھی نہایت غمگین و پژمردہ رہا علاوہ اُس کے سمجھ میں نہیں آتا تھا
کہ اب کیا کروں اور کہاں جاؤں کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ چاروں طرف وہ بدہ لوٹ مار ہو رہی تھی الہ آباد
کانپور وغیرہ میں عملداری سرکاری ہو چکی تھی اور باندہ میں ہر چہار جانب ناکہ بندی کے علاوہ باغیوں
نے گھاٹ چلہ تارہ کو جو باندہ سے بارہ کوس کے فاصلہ پر واقع ہے اور جدھر سے ہوکر عام راستہ
ہر جگہ کے جانے کا ہے بالکل بند کر دیا تھا اور سخت انتظام تھا کہ پرندہ پر نہ مار سکے میں اگر تنہا ہوتا
تو شاید کسی حکمت سے نکل جاتا مگر قبل اس کے شروع غدر میں الہ آباد سے جہاں میرا مکان ہے تمام
گھر کے لوگ جن میں حسب تفصیل ذیل قریبی رشتہ دار میرے شامل تھے یعنے میری حقیقی والدہ و
دادی میری ولایت حسین خاں بھائی میرا مع زوجہ خورد حقیقی ہمشیرہ میری مع سید لیاقت حسین شوہر
اور سید نثار حسین دو پسر خورد کے۔ مولوی لیاقت علی کی سختی و دھمکی کے خوف سے جس نے علم بغاوت کا
جہاد کے حیلہ سے بمقابلہ سرکار انگریزی بلند کرکے نہایت شورش کے ساتھ ایک ہنگامہ قیامت خیز

امیر مینائی مرحوم

- امیر اللغات (نامکمل) عہ
- صنم خانۂ عشق عا ر
- مراۃ الغیب عہ
- محامد خاتم النبیین ۶ر
- مکاتیب امیر مینائی ۱۲ر

جلال لکھنوی مرحوم

- سرمایۂ زبان اردو ۱۲ر
- رسالہ تذکیر و تانیث ۶ر
- قواعد المنتخب ۴ر

مرزا محمد عباس ہوش

- فسانۂ نادر جہاں ۱۲ر
- پیاری سہیلی ۱۲ر

مرزا رسوا مرحوم

- اختری بیگم ۶ر
- ذات شریف ۷ر
- شریف زادہ عہ

ریاض خیرآبادی

- حرم سرا ۲ حصے سے
- ناشاد ۸ر

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد کامل صہ
- خدائی فوجدار عا ر
- جام سرشار ۱۲ر
- الف لیلہ بطرز ناول للعہ

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین ۴ر
- حاجی بغلول ۴ر
- پیاری دنیا ۴ر
- کایا پلٹ ۴ر
- میٹھی چھری ۴ر
- طرحدار لونڈی ۸ر
- فانوس خیال ۱۲ر

منشی جوالا پرشاد برق

- مرنالنی ۸ر
- مار آستین ۸ر
- بنگالی دولھن ۱۲ر
- پرتاب ۱۰ر

سید شوق حسین عاشق

- تارا ۲ حصے عہ
- شادی غم ۱۲ر

مولانا عبد الحلیم شرر

- ثانی اثنین ۶ر
- ذی النورین ۱۰ر
- ابو الحسنین ۸ر
- خواجہ معین الدین چشتی ۶ر
- حسن بن صباح ۶ر
- عصر قدیم ۱۲ر
- تاریخ یہود ۱۲ر
- مسیح اور مسیحیت ۱۲ر
- عرب قبل از اسلام عہ
- سقلیہ میں اسلام ۱۲ر
- آغا صادق کی شادی ۱۰ر
- دربار حرام پور کے اسرار ۱۲ر
- الفانسو ۱۲ر
- مفتوح فاتح ۱۲ر
- فلپانا ۱۲ر
- زوال بغداد ۱۲ر
- لعبت چین عہ
- نیکی کا پھل عہ
- بابک خرمی ۱۲ر
- طاہرہ ۱۲ر
- مینا بازار ۱۲ر
- فردوس بریں ۸ر
- فلورا فلورنڈا ۱۲ر

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق ۱۲ر
- قاسم و زہرہ ۸ر
- عالم خیال ۸ر
- دیوان شوق عا ر

منشی محمد احسن وحشتی

- نغمۂ حرم ۱۲ر
- اشک حسرت ۱۲ر
- معشوقۂ عرب عہ
- محبوس کنشت عہ

خواجہ عبد الرؤف عشرت

- تذکرۂ آب بقا عا ر
- زبان داغ ۶ر
- اصلاح زبان اردو ۶ر
- قواعد میر ۶ر
- اصول اردو ۶ر
- جان اردو ۶ر
- شاعری کی چار کتابیں عا ر
- لغات اردو سے
- ہندو شعرا سے
- مضمون نویسی ۸ر
- انجولی ۲ جلد ۱۲ر

مولانا اسلم جیراجپوری

- سیرۃ الرسول ۱۲ر
- خلافت راشدہ عا ر
- خلافت بنو امیہ ۱۲ر
- خلافت بنی عباس عا ر
- عباسیہ مصر عا ر
- عباسیہ بغداد عا ر
- خلافت آل عثمان عہ

قاضی سلیمان منصور پوری

- رحمۃ للعالمین ۳ جلد للعہ
- سفرنامۂ حجاز عا ر

مولانا نجم الغنی رامپوری

- بحر الفصاحت صہ
- تاریخ اودھ ۵ جلد عــہ
- تاریخ حیدرآباد دکن صہ
- تاریخ راجگان ہند سے
- تعلیم الایمان عہ
- مذاہب اسلام للعہ

مولانا حکیم عبد الحی مرحوم

- تاریخ گجرات ۱۲ر
- گل رعنا صہ

منشی احمد علی بی اے

- تاریخ تمدن ۲ جلد سے
- شباب لکھنؤ ۸ر

مولانا حسرت موہانی

- شرح دیوان غالب عہ
- کمل دیوان حسرت سے
- نکات سخن ۳ حصے ۸ر

سید سجاد حیدر بی اے

- خیالستان ۸ر
- حکایات و احتسابات ۸ر
- پرانا خواب اور دو افسانے ۸ر
- ثالث بالخیر ۸ر
- زہرا ۸ر
- جلال الدین خوارزم شاہ ۱۲ر
- جنگ و جدال ۱۲ر
- مغلوب حسینان ۱۲ر

جلیل قدوائی ایم اے

- سیر گل ۸ر
- اصنام خیالی ۶ر
- مونا و دانا عہ
- نقش و نگار عہ

مرزا محمد عسکری بی اے

- ادبی خطوط غالب ۶ر
- تاریخ ادب اردو لعہ
- نوادر عہ

منشی امیر احمد علوی بی اے

- تاریخ اودھ ۱۲ر
- روزنامچہ حج ۸ر
- شاہان مالوہ عہ
- طرۂ امیر ۸ر
- گوتم بدھ ۸ر
- بہادر شاہ ظفر ۸ر
- مثنویات ۱۲ر
- تاریخ زوال ۸ر
- یادگار انیس ۶ر

مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے

- تاریخ امریکہ ۶ر
- سیر المصنفین ۲ جلد ۸ر
- تاریخ مغربی یورپ ۶ر
- خیالات اور رنگ ۸ر

سید مسعود حسن رضوی ایم اے

- ہماری شاعری ۶ر
- امتحان وفا ۶ر

مولوی سید سلیمان ندوی

- ارض القرآن للعہ
- سیرت عائشہؓ ہے
- حیات امام مالکؒ عہ
- خیام ہے

مولوی عبدالسلام ندوی

- اسوۂ صحابہ ۲ جلد سے
- سیرۃ عمر بن عبدالعزیز ۸ر
- انقلاب الامم ۶ر
- شعر الہند ۲ جلد سے

مولوی سعید انصاری

- سیر الانصار ۲ جلد سے
- سیر الصحابیات ۸ر

حاجی معین الدین ندوی

- خلفائے راشدین ہے
- مہاجرین حصہ اول للعہ

شاہ معین الدین ندوی

- مہاجرین حصہ دوم ہے
- سیر الصحابہ جلد ششم سے
- سیر الصحابہ جلد ہفتم سے

خواجہ حسن نظامی دہلوی

- میلاد نامہ عہ
- ذکر غوث پاک ۱۲ر
- کرشن جیون عہ
- سیپارۂ دل ۶ر
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۲ر
- اتالیق خطوط نویسی ۱۲ر
- میاں بیوی کی تعلیم ۸ر
- میاں بیوی کی تربیت عہ
- اولاد کی شادی عہ
- جگ بیتی کہانیاں ۱۰ر
- بچوں کی کہانیاں ۱۲ر
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ ۶ر
- غدر دہلی کے افسانے ۲ جلد ۸ر

سید ظہور احمد وحشی

- اسلامی زندگی سے
- تصویر معاشرت عہ
- درس عبرت عہ
- زندگی کی صبح و شام عہ
- طوفان زندگی عہ
- عروج زندگی عہ
- مالی پریشانیوں کا علاج عہ
- وسائل معاش ۶ر

مولانا راشد الخیری

- امت کی مائیں عہ
- آمنہ کا لال عہ
- سیدہ کا لال ۱۲ر
- صبح زندگی ۸ر
- شام زندگی ۸ر
- شب زندگی ۲ جلد ۶ر
- نوحۂ زندگی ۱۲ر
- درشہوار ۱۰ر
- منازل السائرہ ۶ر
- جوہر قدامت ۸ر
- عروس کربلا ۸ر
- یاسمین شام ۸ر
- تیغ کمال ۸ر
- محبوبۂ خداوند ۱۲ر
- نانی عشو ۱۰ر
- وداع ظفر ۸ر

نیاز فتح پوری

- جذبات بھاشا ۶ر
- گیتانجلی ۶ر
- شہاب کی سرگذشت ۶ر
- نگارستان ۶ر
- جمالستان للعہ

بنام خداوند جان آفریں

جا بیست جہاں نما سے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجرائے الناظر) ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر:۔ ظفر الملک علوی

نمبر ۴ و ۵ | اکتوبر و نومبر ۱۹۳۶ء | جلد ۳۲

فہرست

قیمت:- فی پرچہ ۱۰ / اردو ۴ ر

بنام خداوند جان آفرین

نمبر ۵ و ۶ جلد ۴۲ .... اکتوبر و نومبر ۱۹۳۶ء

مرزا دبیر کی ایک رُباعی اور میر انیس کا ایک شعر

ایک تقابلی مُطالعہ

(جناب پروفیسر سید مسعود حسن رضوی صاحب ادیب ایم اے صدر شعبۂ فارسی و اُردو لکھنؤ یونیورسٹی)

[راقم حروف نے اپنی تصنیف ہماری شاعری میں اختصار کلام کی مثال میں ایک رباعی اور اُس کا تقریبًا ہم مضمون ایک شعر پیش کرکے شعر کو رباعی سے بہتر قرار دیا ہے۔ حضرت نجم دموہانی نے اپنے مختصر رسالے جوہر آئینہ میں میری اس رائے کے خلاف بحث کی ہے۔ اس مضمون میں اُسی بحث پر ایک تنقیدی نظر ڈالی جاتی ہے۔ (ادیب)]

اصل بحث شروع کرنے سے پہلے ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جو رباعی اس وقت زیر بحث ہے اُس میں مصنف کا تخلص دبیر موجود ہے۔ مگر شعر کے مصنف کا نام نہیں بتایا گیا ہے۔ بعض لوگوں کو شاید یہ شبہ ہے کہ رباعی کو مختصر کرکے شعر کی شکل میں پیش کرنے کا ذمہ دار میں ہوں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے۔ اس شعر کا مصنف وہی بے نیازی کا مجسمہ ہے جو اودھ کی شاہی کے زمانہ میں، ہزاروں آدمیوں کی مجلسوں میں، ارکان خاندان شاہی، صاحبان منصب و جاگیر، عمائد سلطنت، رؤسائے ملت کے منہ پر کہا کرتا تھا۔

جز خدا جھکتے نہیں ہم بادشا کے سامنے
ہاتھ پھیلائے تونگر کیا گدا کے سامنے

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے | سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں
دولت کا ہمیں خیال آتا ہی نہیں | یہ نشہ فقر ہے کہ حیا تا ہی نہیں
معمور ہیں یہ دولت استغنا سے | آنکھوں میں کوئی غنی سماتا ہی نہیں

میں نے شاعر کا نام اس سبب سے ظاہر نہیں کیا تھا کہ جس راوی سے یہ شعر مجھ تک پہونچا وہ ہے تو نہایت معتبر مگر اس کے اعتبار کا ثبوت ایک طولانی بیان چاہتا تھا۔ اور چونکہ شاعر کا نام بتانے کی کوئی ضرورت نہ تھی اس لیے بیکار کے طول سے اجتناب کیا گیا تھا۔ مگر اب ضرورت سے مجبور ہو کر وہ داستان سنائی جاتی ہے۔

کوئی دس بارہ برس کی بات ہے کہ میرے ایک بزرگ جو میر انیس مرحوم سے ذاتی واقفیت رکھتے ہیں، میرے استفسار پر اس شاعر اعظم کے حالات بیان کر رہے تھے۔ سلسلۂ گفتگو میں انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ میر انیس اور مرزا دبیر ایک دوسرے کا جواب کہا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر انھوں نے مرزا صاحب کی وہ رباعی پڑھی جو ہماری شاعری میں نقل کی گئی ہے۔ اور کہا کہ مرزا صاحب نے جس مضمون کو چار مصرعوں میں ادا کیا ہے اسی کو میر صاحب نے کس حسن سے دو مصرعوں میں ادا کر دیا ہے۔ اس موقع پر انھوں نے وہ شعر پڑھا جس کے مصنف کی شخصیت اس وقت زیر بحث ہے۔

اب میں اپنے اُن بزرگ کا مختصر حال لکھے دیتا ہوں کہ اُن کے بیان کو مستند سمجھنے کی وجہ معلوم ہو سکے میری والدۂ مرحومہ کے حقیقی ماموں مولوی عبد العلی صاحب لکھنؤ کے محلہ مفتی گنج کے رہنے والے ہیں، مگر مدت دراز سے اُناؤ میں مقیم ہیں۔ اُن کی پیدائش ۱۸۴۳ء کی ہے۔ لہذا شمسی سال کے حساب سے اُن کی عمر اب ۹۳ برس کی اور قمری سال کے حساب سے ۹۶ برس کی ہے۔ ان کے والد میر سلامت علی صاحب مرثیہ خوانی میں میر انیس کے شاگرد رشید تھے۔ میر صاحب کے شاگردوں میں آغا میر کے سوا ان سے بہتر مرثیہ پڑھنے والا کوئی نہ تھا۔ میر صاحب ان کو بہت عزیز رکھتے تھے، اور اکثر اپنی پیش خوانی میں پڑھواتے تھے۔ اُن کے پاس باہر سے فرمائشیں آتی رہتی تھیں کہ اپنے کسی شاگرد کو مرثیہ خوانی کے لیے بھیج دیجیے۔ تو وہ سلامت علی صاحب کو ہی اپنا شاگرد رشید کہہ کر بھیجتے تھے۔

میر سلامت علی کو مرثیے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ گھر میں کھانے کی تنگی ہو تو بھی وہ مرثیہ ضرور خرید لیتے تھے۔ اور معاوضہ دے دیکر نقل کرنے کے لیے مرثیے حاصل کرتے رہتے تھے۔ اُن کے جمع کیے ہوئے کثیر التعداد مراثی میں سے دو ڈھائی سو مرثیوں کی زیارت راقم حروف نے بھی اپنے بچپن میں کی تھی۔ اکثر مرثیوں پر میر سلامت علی کے دستخط اور مہر ثبت اور تحریر کی تاریخ درج تھی۔ ان میں سے بھی

بہت سے مرثیے تلف ہو گئے۔ جو باقی ہیں وہ مولوی عبدالعلی صاحب کے پاس موجود ہیں۔ میر انیس کا تو تقریباً کل کلام انھوں نے فراہم کر لیا تھا۔ غالباً یہی میر سلامت علی ہیں جن کے متعلق مصنف واقعات انیس نے لکھا ہے:-

"میر سلامت علی صاحب لکھنؤ میں ایک بزرگ تھے جن کو میر انیس مرحوم کا کلیات جمع کرنے کا شوق تھا اور انھوں نے اپنی تلاش سے میر انیس کا اکثر ایسا کلام بہم پہونچایا تھا جو خود میر انیس کے پاس نہ تھا۔"

مولوی عبدالعلی صاحب بچپن میں میر انیس کے گھر میں جایا کرتے تھے۔ اُن کی بیوی بیٹیاں ان کے سامنے ہوتی تھیں۔ میر انیس کے انتقال کے وقت ان کا سن تیس بتیس سال کا تھا۔ اس وقت اناؤ میں موجود ہیں۔ بصارت اور سماعت سے محروم اور نشست و برخاست سے معذور ہو گئے ہیں۔ مگر حواس ابھی اتنے ہیں کہ میرے اس بیان کی تصدیق اُن سے کی جا سکتی ہے۔

یہ حالات خود مولوی عبدالعلی صاحب کے بیان کیے ہوئے ہیں۔ اور اُن کو میں ایک مضمون کے سلسلے میں شائع بھی کر چکا ہوں۔ یہ مضمون "میر انیس کے کچھ چشم دید حالات" کے عنوان سے رسالہ "ادب" لکھنؤ بابت نومبر ۱۹۳۱ء میں چھپا تھا۔

اب مرزا دبیر کی وہ رباعی اور میر انیس کا وہ شعر جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:-

ناداں کہوں دل کو کہ خردمند کہوں　　یا سلسلۂ وضع کا پابند کہوں
اک روز خدا کو منھ دکھانا ہے دبیر　　کس منھ سے میں بندوں کو خداوند کہوں

دل کو ناداں کہوں یا وضع کا پابند کہوں　　مجھ سے ہوتا نہیں بندوں کو خداوند کہوں

اس رباعی اور اس شعر کے متعلق "ہماری شاعری" میں لکھا گیا ہے:-

"اس شعر کے پہلے مصرع میں رباعی کے پہلے دو مصرعوں کا پورا مضمون سما گیا ہے۔ اور مجموعی حیثیت سے یہ شعر خوبصورتی، روانی اور اثر میں اس رباعی سے کس قدر بڑھ گیا ہے۔ یہ زیادہ تر اختصار کلام ہی کا نتیجہ ہے۔"

معترض کہتا ہے:-

"جناب دبیر کی رباعی ایک مسلسل داستان ہے اور خیال کی سیر کا ایک دلکش مرقع۔ اور مولف کا پیش کردہ شعر اُس کا ایک جزو ناقص نظر آتا ہے۔" (صفحہ ۱۵)

اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے پہلے شعر کی توضیح کی گئی ہے پھر رباعی کی۔ شعر کی توضیح:-

"اگرچہ دنیا والوں کی دیکھا دیکھی میرا بھی جی چاہتا ہے کہ بندوں کو خداوند کہوں۔ اُن کی خوشنودی حاصل کروں۔ نفع اُٹھاؤں، اپنی عزت بڑھاؤں، مگر کیا کروں اپنے دل سے مجبور ہوں۔ مجھ سے تو

بندوں کو خداوند نہیں کہا جاتا۔ اب چاہے اسے میرے دل کی حماقت سمجھو۔ چاہے وضع کی پابندی کہہ لو۔
ہے یوں کہ میں اپنی نطرت سے مجبور رہوں۔ اس کا بدلنا میرے بس کی بات نہیں" (ص۱۵)

اس شرح کے دو جملے قابل توجہ ہیں۔

(۱) "میرا بھی جی چاہتا ہے کہ بندوں کو خداوند کہوں"

(۲) "مگر کیا کروں اپنے دل سے مجبور ہوں مجھ سے تو بندوں کو خداوند نہیں کہا جاتا"

جی بندوں کو خداوند کہنے کے لیے بےچین ہے۔ مگر دل کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے تماشے دیکھے تھے مگر یہ جی اور دل کی لڑائی آج سُنی۔ شاعر نے تو اپنے جی کا حال بتایا نہ تھا۔ معترض نے شعر کی شان گھٹانے کے لیے شاعر کے بیان پر یہ حاشیہ چڑھا دیا ہے:۔

"اگرچہ دنیا والوں کی دیکھا دیکھی میرا بھی جی چاہتا ہے کہ بندوں کو خداوند کہوں۔ ان کی خوشنودی حاصل کروں۔ نفع اُٹھاؤں اپنی عزت بڑھاؤں۔ مگر کیا کروں اپنے دل سے مجبور ہوں"

شعر کی توضیح کے سلسلے میں 'مجھ سے ہوتا نہیں' کی شرح یوں کی گئی ہے:۔

"میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔ اس کا بدلنا میرے بس کی بات نہیں"

شاعر کے اس قول کے سامنے معترض کے اُس حاشیے کی کیا وقعت رہ جاتی ہے؟۔ ناممکن ہے کہ جو بات کسی کی فطرت کے خلاف ہو اُس کے لیے اُس کا جی چاہے۔

شعر کا مرتبہ پست کر دینے کی غرض سے اس کی شرح اس انداز سے کی گئی ہے کہ شعر کے تیور ہی بدل گئے۔ مثلاً شاعر نے نادانی کا ذکر کیا تھا۔ شارح نے اُس کی جگہ 'حماقت' کا لفظ رکھ دیا۔ اس طرح کی رکیک تدبیروں سے، خاص کر اُس حاشیے سے جو معترض نے اپنی طرف سے چڑھا دیا ہے' شعر کے اثر کو بدل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعر میں استغنا اور تفاخر کی شان تھی' شرح میں نیازمندی اور عذرخواہی کی کیفیت نظر آنے لگی۔

شاعر کے کلام پر جو حاشیہ چڑھا دیا گیا ہے اس کو حذف کر دینے اور لفظ 'حماقت' کو 'نادانی' سے بدل دینے کے بعد شعر کا مطلب معترض کے الفاظ میں یہ ہوا:۔

"مجھ سے تو بندوں کو خداوند نہیں کہا جاتا۔ اب چاہے اسے میرے دل کی نادانی سمجھو۔ چاہے وضع کی پابندی کہہ لو۔ ہے یوں کہ میں اپنی فطرت سے مجبور رہوں۔ اس کا بدلنا میرے بس کی بات نہیں"

اس مطلب میں اصل شعر کی شان، خوبصورتی اور تاثیر تو نہیں ہے مگر شاعر کے خیال کی فی الجملہ ترجمانی ہو گئی ہے۔ اس لیے ہم اس کو سردست تسلیم کیے لیتے ہیں۔ اب رباعی کی جو توضیح کی گئی ہے وہ ملاحظہ ہو:۔

"ایک شخص ہے کہ بندوں کے لیے سرکار اور خداوند کے الفاظ اس کی زبان سے نہیں نکلتے اور اس کے دنیوی مفاد میں خلل پڑتا ہے اس لیے کہ خوشامد پسندی اکثر صاحبان جاہ کی خو بلکہ سرشت ہوجایا کرتی ہے۔ وہ حیران ہے اور سوچ رہا ہے کہ آخر حقیقت کیا ہے، میرا دل نادان ہے یا عقلمند۔ یعنی ایسا کرنے میں حق بجانب ہے یا غلط کار۔ اب سلسلۂ خیال آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے ممکن ہے کہ میرے دل کے اس فعل کا تعلق نہ دانائی سے ہو، نہ نادانی سے، بلکہ زنجیر وضع میں جکڑے ہونے کے سبب سے ہو۔ مگر تسکین قلب نہیں ہوتی۔ خیال کچھ اور آگے بڑھتا ہے۔ اور سوچتے سوچتے حقیقت پردہ فگن ہوتی ہے اور اصل راز اس کی سمجھ میں آتا ہے۔ اور وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے اچھا اب میں سمجھا۔ میرے دل کا یہ فعل وحدانیات صحیح کی بنا پر ہے۔ اور اس کی شرح یہ ہے۔ کہ ایک دن (روز قیامت) خدا کا سامنا کرنا ہے جس کے سوا نہ کوئی خداوند ہے نہ اس جلیل القدر نام سے پکارے جانے کے قابل ہے۔ میں بندوں کو خداوند کہنے کی جرأت کہاں سے لاؤں۔" (صہ ۱۵-۱۶)

اس تفصیلی شرح کا خلاصہ یوں کیا گیا ہے:—

"مختصر یہ کہ اس شعر میں اتنے عالموں کا ذکر ہے۔ عالم حیرت، سوال کا پیدا ہونا۔ خیال کا غیر واقعی اسباب کو اسباب حقیقی سمجھنا۔ کبھی اپنے اس فعل کو نادانی کی کار فرمائی جاننا، کبھی دانائی کی کرشمہ سازی گردانتا، پھر وضع داری کی طرف خیال کا جانا۔ پھر دلیل کا قائم ہونا۔ اور اس کے بعد اصل حقیقت کا ذہن میں آنا۔ جس پر انشراح خاطر ہونا ضروری ہے۔ آخر میں دلیل کے اس فعل کو وحدانیات کی معجزہ آرائی کا نتیجہ پانا یعنے یہ سمجھنا کہ دل کا اس امر سے ابا کرنا بمقتضائے فطرت عالیہ ہے۔" (صہ ۱۶)

تفصیلی شرح ہو چکی۔ اس کا خلاصہ بھی ہو چکا۔ اب خلاصے کا خلاصہ یوں کیا جاتا ہے:—

مصرع اول: "شاعر کا خیال اس وقت عالم حیرت کی سیر کر رہا ہے۔"

مصرع دوم: "اب اسی عالم کی دوسری منزل کا تماشائی ہے۔"

مصرع سوم: "اب دلیل قائم ہوتی ہے اور اصلی راز منکشف ہوتا ہے۔"

مصرع چہارم: "اب آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ اور شاعر اپنے فعل کو محمود سمجھتا ہے۔" (صہ ۱۷)

اب ہم اس توضیح کے بعض اجزا پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں۔

(۱) "ایک شخص ہے کہ بندوں کے لیے سرکار اور خداوند کے الفاظ اس کی زبان سے نہیں نکلتے۔"

معترض نے 'خداوند' کے ساتھ 'سرکار' کا لفظ شامل کر کے سخت بے امتیازی کا ثبوت دیا ہے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ مرکز خیال کو بدل کر رباعی کے مفہوم کو کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ شاعر کا بیان تمام تعظیمی الفاظ سے

متعلق نہیں ہے۔ بلکہ صرف لفظ 'خداوند' سے ہے۔ اس لیے کہ وہ اس لفظ کو خدا سے مخصوص سمجھتا ہے۔ اور اس بنا پر بندوں کے لیے اس کا استعمال ناجائز جانتا ہے۔ سرکار، جناب، حضور وغیرہ کی یہ حالت نہیں ہے۔

۲۔ "ممکن ہے کہ میرے دل کے اس فعل کا تعلق نہ دانائی سے ہو، نہ نادانی سے۔"

معترض کہتا ہے کہ یہ ممکن ہے۔ عقل کہتی ہے کہ یہ محال ہے۔ دانائی اور نادانی ایک دوسرے کی نقیض ہیں اور جس طرح اجتماع نقیضین محال ہے۔ اسی طرح ارتفاع نقیضین بھی محال ہے۔ پس کسی ایسے فعل کا امکان ہی کہاں ہے جو نہ دانائی ہو نہ نادانی۔ ملحوظ رہے کہ یہاں صحیح العقل لوگوں کے افعال سے بحث ہے، مجنونوں کا ذکر نہیں ہے۔

۳۔ "بلکہ زنجیر وضع میں جکڑے ہونے کے سبب سے ہو۔"

یہاں وضعداری ایک ایسی چیز ٹھہرتی ہے جو نہ دانائی ہو نہ نادانی۔ اس سے بھی ارتفاع نقیضین لازم آتا ہے۔ اور چونکہ یہ ممکن نہیں لہٰذا وضعداری کو دانائی ماننا پڑے گا یا نادانی۔ اور اس صورت میں یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ فلاں فعل دانائی ہے، یا نادانی ہے، یا وضعداری ہے۔ ان تین شقوں میں سے ایک کا ترک ضروری ہے۔ اگر دانائی اور نادانی کو باقی رکھنا ہو تو وضعداری کو حذف کیجیے۔ اگر وضعداری کو باقی رکھنا ہو تو دانائی اور نادانی میں سے ایک کو ترک کیجیے۔ یعنی اگر وضعداری دانائی ہے تو لفظ 'دانائی' کو اور اگر نادانی ہے تو لفظ 'نادانی' کو حذف کرنا پڑے گا۔

۴۔ رباعی کی شرح میں یہ عبارت ملتی ہے۔

"وہ حیران ہے اور سوچ رہا ہے کہ آخر حقیقت کیا ہے۔"

شرح کے خلاصے میں جن عالموں کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں پہلا 'عالم حیرت' ہے۔ خلاصے کے خلاصے میں یہ جملہ نظر آتا ہے۔

"خیال اس وقت عالم حیرت کی سیر کر رہا ہے۔"

معترض نے ہر جگہ شاعر کو متحیر دکھایا ہے۔ حیرت دو طرح کی ہوتی ہے، محمودہ اور مذمومہ۔ حیرت محمودہ نتیجہ ہوتی ہے کمال علم و عرفان کا، اور حیرت مذمومہ علم و معرفت کے نقدان کا۔ رباعی کی جو توضیح کی گئی ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اسی حیرت مذمومہ میں گرفتار ہے۔ وہ عقل و فہم سے اس قدر بے بہرہ ہے کہ خود اپنے ایک فعل کا سبب دریافت کرنے میں حیران و سرگراں ہے۔ کبھی کوئی سبب تجویز کرتا ہے کبھی کوئی۔ اور خدا سے اس قدر غافل ہے کہ لفظ 'خداوند' مرکز توجہ بنا ہوا ہے، پھر بھی خدا کو

مُنھ دکھانے کا خیال بڑی مشکل سے آتا ہے۔ اس رباعی کی توضیح کرکے معترض اپنے ساتھ مصنفِ رباعی کو بھی "فِی کُلِّ وَادٍ یَّہِیمُوْنَ" کا مصداق بنائے دیتا ہے۔

مرزا دبیر اعلے اللہ مقامہ کا پایۂ شاعری معرضِ اختلاف میں رہا کیا ہے۔ مگر اُن کے علم و فضل، ذہن و ذکا، زہد و اتقا، مذہبیت و مومنیت سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن اس رباعی کی جو شرح کی گئی ہے وہ اُنکو علم و معرفت سے بیگانہ، ذہانت و ذکاوت سے محروم، اور موت و معاد سے غافل، دکھا کر اُن کی شان کو بہت پست کیے دیتی ہے۔ سچ ہے نادان دوست سے دانا دشمن اچھا۔

معترض نے رباعی کی جو توضیح کی ہے اُس کے متعلق مجھے اس وقت صرف اتنا ہی کہنا تھا۔ اس توضیح کے ضمن میں معترض کے بعض اور اقوال بھی قابلِ غور ہیں اُن پر بھی ایک نظر کرتے چلیے۔

۱۔ "جو شخص اوزانِ رباعی سے واقف ہے وہ اس رباعی میں جناب مولف کے پیش کردہ شعر سے کہیں زیادہ خوبصورتی، روانی، برجستگی، لطفِ زبان، حُسنِ محاورہ، چُستیٔ بندش، تاثیر اور خدا جانے کیا کیا پاتا ہے۔" (ص۱۴)

کسی رباعی میں 'خوبصورتی' اور 'روانی' محسوس کرنے کے لیے اوزانِ رباعی سے واقف ہونے کی شرط لگانا ہی کوئی معمولی جدت نہ تھی اُس پر طرہ یہ کہ لطفِ زبان، حسنِ محاورہ، چستیٔ بندش اور تاثیر کے احساس کو بھی اوزانِ رباعی کے علم پر منحصر کر دیا ہے۔ معترض نے یہاں پردے پردے میں اپنی عروض دانی کا سکہ بٹھانے کی کوشش کی ہے۔ مگر واقفانِ حال پر اس کوشش کا کیا اثر ہوگا۔

۲۔ "اس میں شک نہیں کہ 'مجھ سے ہوتا نہیں' کا ٹکڑا بہت ہی خوبصورت ہے۔ مگر دبیر کی رباعی میں 'کس مُنھ سے' کا ٹکڑا اس کا بدل موجود ہے۔" (ص۱۵)

'مجھ سے ہوتا نہیں' کا ٹکڑا صرف "بہت ہی خوبصورت" نہیں ہے، بلکہ نہایت ہی پر معنی بھی ہے۔ اور 'کس مُنھ سے' کا ٹکڑا نہ خوبصورتی میں اس کا بدل ہے نہ معنویت میں۔ خوبصورتی اور معنویت کا کیا ذکر، اس کا محل استعمال ہی محلِ نظر ہے۔ شاعر کہتا ہے "مجھ سے ہوتا نہیں بندوں کو خداوند کہوں"۔ کیوں نہیں ہوتا؟ اس لیے کہ ایک دن خدا کو مُنھ دکھانا ہے۔ اسلیے کہ وہ اس وقت بھی حاضر و ناظر ہے۔ اس لیے کہ خوشامد میری شان کے خلاف ہے۔ اسلیے کہ تملق انسانیت کی توہین ہے۔ اس لیے کہ میں حریصِ جاہ و مال نہیں۔ اس لیے کہ مجھ کو منافعِ دنیوی کی حاجت نہیں۔ اسی طرح غیر محدود اسباب اس فقرے میں مضمر ہیں۔ یہ تو ہوئی اس فقرے کی معنوی وسعت۔ اسکے صوری حسن کا یہ عالم ہے کہ معترض بھی اسکے 'بہت ہی خوبصورت' ہونے کا قائل ہے۔ اب ذرا 'کس مُنھ سے' پر نظر کیجیے۔ یہ فقرہ ہمیشہ اس شرم و ندامت کا اظہار کرتا ہے جو کسی گذشتہ فعل یا واقعے کا نتیجہ ہو۔ مثلاً یہ کہنا صحیح ہوگا کہ

اگر میں بندوں کو خداوند کہوں تو خدا کے سامنے کس مُنہ سے جاؤں گا۔ مگر یہ کہنا درست نہیں کہ مجھے ایک دن خدا کو منہ دکھانا ہے، میں بندوں کو خداوند کس مُنہ سے کہوں۔ خیر یہ تو ذرا باریک نکتہ ہے۔ مگر اتنا تو ہر شخص سمجھ لیگا کہ معترض نے رباعی کے مصرع چہارم (بندوں کو میں کس مُنہ سے خداوند کہوں) کا جو مطلب بتایا ہے یعنی "میں بندوں کو خداوند کہنے کی جراُت کہاں سے لاؤں" یہ بالکل غلط ہے 'کس مُنہ سے کہوں' کے یہ معنی ہرگز نہیں ہوسکتے کہ 'کہنے کی جراُت کہاں سے لاؤں'۔

۳۔ "معنوی خوبیاں مختصراً بیان کی جاچکیں۔ اب لفظی خوبیاں مجملاً دکھائی جاتی ہیں: 'نادان و خردمند' میں صنعت تضاد ہے 'سلسلہ و پابند' میں مراعاۃ النظیر ہے۔" (صہ۱)

تضاد اور مراعاۃ النظیر دونوں معنوی صنعتیں ہیں۔ اُن کو لفظی خوبیاں کہنا کہاں تک درست ہے؟۔ اگر کہا جائے کہ یہ صنعتیں لفظوں ہی سے پیدا ہوتی ہیں، لہٰذا ان کو 'لفظی خوبیاں' کہہ سکتے ہیں۔ تو میں عرض کروں گا کہ معترض نے جن کو 'معنوی خوبیاں' کہا ہے وہ بھی لفظوں ہی سے پیدا ہوتی ہیں، لہٰذا وہ بھی لفظی خوبیاں ہوئیں۔ تو کیا کلام کی معنوی خوبیوں کا وجود ہی نہیں ہے؟ اس مسئلے میں ہم فاضل معترض کا فیصلہ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اپنی رائے فی الحال محفوظ رکھتے ہیں۔

۴۔ "دوسرے شاعر نے "خردمند" کا ٹکڑا اُڑا دیا اور یہ نہ سمجھا کہ اس میں اتنے معنی پوشیدہ تھے کہ ابھی تک متکلم نہ اپنے فعل کو نادانی سمجھ سکا ہے نہ دانائی۔ اور عالم حیرت کے نظاروں میں سے یہ نظارہ حذف ہوگیا۔" (صہ۱)

"ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبے است۔" دوسرے شاعر نے لفظ 'خردمند' کو ترک کرکے اپنے کلام کو مذکورہ بالا منطقی غلطی سے بچا لیا، اور عالم حیرت میں بھٹکتے پھرنے کا سماں دکھانے کی جگہ سرپر یقین پر متمکن ہونے کا منظر پیش نظر کردیا۔ کہاں مشککین اور کہاں اہل یقین! اس شعر میں شاعر شک و تذبذب کی حالت نہیں دکھاتا بلکہ پُرزور الفاظ میں کہتا ہے کہ لوگ اسکو نادانی سمجھیں یا وضعداری مگر میں نے بندوں کو خداوند نہ کہا ہے نہ کہہ سکتا ہوں۔ معترض نے بھی شعر کا مطلب یہی بتایا ہے کہ

"مجھ سے تو بندوں کو خداوند نہیں کہا جاتا۔ اب اسے چاہے میرے دل کی حماقت (نادانی) سمجھو چاہے پابندیٔ وضع کہہ لو۔" (صہ۱)

شعر اور رباعی کے متعلق معترض کی توضیح اور اُس توضیح کی تشریح آپ سُن چکے۔ اب اس توضیح و تشریح کی روشنی میں ان دونوں کا موازنہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ رباعی کے ابتدائی دو مصرعوں میں ارتفاع نقیضین لازم آتا ہے۔ اس عیب کو چھوڑ کر ان

دونوں مصرعوں میں جو کچھ ہے وہ سب شعر کے پہلے مصرع میں موجود ہے۔

۲۔ رباعی میں 'کس منھ سے' کا فقرہ بے محل ہے۔ شعر میں 'مجھ سے ہوتا نہیں' کا ٹکڑا "بہت ہی خوبصورت ہے"۔

۳۔ رباعی میں 'نادان و خردمند' میں صنعت تضاد ہے، سلسلہ و پابند میں مراعات النظیر ہے"۔ اس کے علاوہ 'منھ دکھانا ہے' اور 'کس منھ سے کہوں' ایسے دو محاورے لائے گئے ہیں جن میں 'منھ' کا لفظ مشترک ہے۔ ان چیزوں سے کلام میں آورد اور تصنع پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے برخلاف شعر میں انتہا کی آمد اور حد کی بیساختگی ہے۔

۴۔ رباعی میں متکلم ایک ایسا شخص ٹھہرتا ہے جو اپنے طرز عمل کو خود نہیں سمجھ سکتا اور بہت غور و فکر کے بعد بہزار دقت یہ معلوم کر سکا ہے کہ اس کے ایک فعل بلکہ ترک فعل کا محرک اصلی کیا ہے۔ اب ذرا شعر کے تیور ملاحظہ ہوں۔ کلام کا اختصار اور بے ساختگی، لہجے کی متانت اور استواری بتا رہی ہے کہ قائل کو اپنے اصول کی صحت اور عمل کی درستی میں کوئی شبہ نہیں۔ اور اس کامل یقین نے اس میں وہ اخلاقی جرأت پیدا کر دی ہے جو متشککین و متحیرین کے حصے میں نہیں آتی۔

۵۔ رباعی میں بندوں کو خدا نہ کہنے کا سبب صرف یہ ہے کہ "ایک دن (روز قیامت) خدا کا سامنا کرنا ہے ..... میں بندوں کو خدا نہ کہنے کی جرأت کہاں سے لاؤں"۔ اور شعر میں اس طرز عمل کا سبب یہ ہے کہ "میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔ اس کا بدلنا میرے بس کی بات نہیں"۔ کہاں نتائج و عواقب کے خوف سے کسی فعل مذموم سے اجتناب کرنا، کہاں فطرت کی بلندی سے کسی فعل قبیح کے ارتکاب کا امکان نہ ہونا۔ کہاں مصلحت اندیشی، کہاں سعادت کیشی۔ کہاں خوف کی پژمردگی، کہاں جرأت کی شگفتگی۔

یہ موازنہ معترض ہی کے توضیحات پر مبنی ہے مگر اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ خیال، اظہار، اثر، ہر اعتبار سے شعر رباعی سے بہتر ہے اور معترض کے اس دعوے کی رد ہوتی ہے کہ شعر رباعی کا ایک جزو ناقص ہے۔

اس موازنے کے سلسلے میں بعض خرابیاں رباعی میں ایسی دکھائی گئی ہیں جو حقیقۃً اس میں موجود نہیں ہیں، مگر معترض کی توضیح سے پیدا ہو گئی ہیں۔ رباعی کی جو شرح کی گئی ہے اس سے مجھ کو اتفاق نہیں ہے۔ شارح نے عالم حیرت کی مختلف منزلوں کی سیر دکھا کر رباعی کو ایک تماشا بنا دیا ہے۔ میں شاعر کو حیران و سرگردان یا منازل حیرت کا تماشائی نہیں مانتا۔ سوال یہ ہے کہ یہ رباعی کن حالات

میں تصنیف کی گئی ؛ معترض نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے :-

"ایک شخص ہے کہ بندوں کے لیے 'سرکار' اور 'خداوند' کے الفاظ اس کی زبان سے نہیں نکلتے اور اس کے دنیوی مفاد میں خلل پڑتا ہے۔ اس لیے کہ خوشامد پسندی اکثر صاحبان جاہ کی خو بلکہ سرشت ہو جایا کرتی ہے۔ وہ حیران ہے اور سوچ رہا ہے کہ آخر حقیقت کیا ہے" (ص۱۵)

مگر اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ ایک شخص ہے جو اُن صاحبان ثروت و جاہ کو 'خداوند' نہیں کہتا جن کو اور سب لوگ اسی لفظ سے خطاب کرتے ہیں۔ اُسکا یہ فعل گستاخانہ اور قابل اعتراض سمجھا جاتا ہے۔ اور وہ اس اعتراض کا جواب دیتا ہے۔ معترض نے شاعر کی تخئیل کا رُخ ہی غلط کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چلے تھے کعبہ پہونچ گئے ترکستان۔ شعر کا پہلا مصرع اور رباعی کے ابتدائی دو مصرعے پڑھیے اور دیکھیے کہ دونوں جگہ انداز کلام بالکل یکساں ہے۔ معلوم نہیں کہ معترض نے جس طرح شعر کے پہلے مصرع کا مفہوم یہ بتایا تھا۔

"چاہے اسے میرے دل کی حماقت سمجھو۔ چاہے وضع کی پابندی کہہ لو" (ص۱۵)

اُسی طرح رباعی کے ابتدائی دو مصرعوں کا بھی یہ مطلب کیوں نہ لکھا :-

"چاہے اسے میرے دل کی حماقت سمجھو۔ چاہے عقلمندی خیال کر لو۔ چاہے وضع کی پابندی کہہ لو"

معترض نے تو ان مصرعوں کا مطلب ہی بدل دیا اور اس طرح رباعی کو شعر سے بڑھانے اور ایک صحیح فیصلے کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ مگر نتیجہ برعکس ہوا۔

رباعی میں شاعر کا مطلب یہ ہے کہ بندے خواہ کتنے ہی اختیار و اقتدار، ریاست و امارت، خدم و حشم کے مالک کیوں نہ ہو جائیں، رہیں گے بندے ہی۔ میں اُن کو 'خداوند' کہہ کر کسی حیثیت سے بھی اُنھیں خدا کا ہمسر نہیں بنا سکتا۔ ایسا کروں تو خدا کو کیا منھ دکھاؤں گا۔ لوگ میرے اس فعل کو چاہے نادانی سمجھیں، چاہے دانائی خیال کریں، چاہے پابندئ وضع قرار دیں۔

اس مطلب سے مصنف رباعی نہ منافع دنیوی کا حریص ٹھہرتا ہے، نہ اپنے طرز عمل کے سمجھنے میں حیران و سرگردان نظر آتا ہے، نہ موت و معاد سے غافل قرار پاتا ہے، نہ اُس کے کلام میں کوئی منطقی غلطی نکلتی ہے

یہ رباعی جن حالات میں تصنیف کی گئی ہے اُنھیں حالات میں وہ شعر بھی کہا گیا ہے۔ اور شاعر کا مطلب یہ ہے کہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی 'خداوند' کہہ کر میں بندوں کو خدائی کا درجہ نہیں دے سکتا۔ ایسی چاپلوسی کی باتیں کرنا میری فطرت کے خلاف ہے۔ لوگ میرے اس طرز عمل کو چاہے نادانی کہیں چاہے پابندی وضع سمجھیں۔

رباعی اور شعر کا جو مطلب اوپر بیان کیا گیا ہے اب اُسکی روشنی میں ان دونوں کا موازنہ کیا جاتا ہے۔

اہناوانی اور پابندی وضع کا ذکر دونوں شاعروں نے کیا ہے۔ لیکن رباعی میں 'خردمند' کا لفظ موجود ہے اور شعر میں نہیں ہے۔ مگر اس سے معنی میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ دونوں شاعر اپنے طرز عمل کو مستحسن اور عاقلانہ سمجھتے ہیں۔ ایک نے لفظ 'خردمند' لاکر اپنے اس خیال کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ دوسرے کے اسلوب بیان اور لب ولہجہ میں یہی خیال مضمر ہے۔ شعر کے پہلے مصرعے کو دوسرے مصرعے سے جو تعلق ہے اس کی مدد سے یہ ایک مصرع ان تمام خیالات وجذبات کو ظاہر کر رہا ہے جو رباعی کے پہلے دو مصرعوں میں ظاہر کیے گئے ہیں۔

۲۔ رباعی میں لفظ 'سلسلہ' مع اضافت محض مصرع کا وزن پورا کرنے کے لیے لایا گیا ہے اور 'کس منہ سے' کا فقرہ بے محل صرف ہوا ہے۔ شعر میں نہ کوئی لفظ نکالا جا سکتا ہے نہ بدلا جا سکتا ہے۔

۳۔ رباعی میں ایک فعل مذموم سے اجتناب عاقبت اندیشی کا نتیجہ ہے، اور شعر میں علوئے فطرت کا۔ انجام کے خیال سے کسی فعل قبیح سے بچنا بھی ایک اچھی خصلت ہے، لیکن اخلاق کی بلندی واستواری سے افعال قبیحہ کے ارتکاب کا امکان باقی نہ رہنا خوش خصالی کی معراج ہے۔

۴۔ رباعی میں صاحبان جاہ وثروت کو خداوند نہ کہنے کی معذرت نیازمندانہ انداز میں کی گئی ہے۔ اس معذرت سے متکلم کے دامن سے گستاخی کا دھبا تو چھوٹ گیا مگر سامعین کے دلوں پر کوئی اثر نہ پڑا۔ شعر میں متکلم کی شان استغنا دیکھیے کہ جس طرز عمل سے دولت وثروت کے ابرووں میں گرہ اور اختیار واقتدار کی جبین پر شکن ہے اُسکے لیے کوئی معذرت نہیں کرتا، کوئی سبب نہیں بتاتا۔ صرف ایک مختصر مختتم اور لاجواب بات کہہ دیتا ہے کہ "مجھ سے ہوتا نہیں بندوں کو خداوند کہوں"۔ اگر کوئی سبب بتاتا تو اختلاف کی گنجائش ہوتی اور بحث کا موقع نکلتا۔ مگر اُسکو دماغ بحث وسرکار زار کہاں۔ یہ پرزور طرز کلام سامعین کو بے نیازی کی طرف مائل کرتا ہے اور اُن میں اخلاقی جرأت پیدا کرتا ہے۔

۵۔ رباعی میں شاعر کا بیان سیدھا سادھا اظہار حقیقت ہے۔ اور شعر میں بیان کے ساتھ شاعر کے جذبات شریک غالب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنے جوش یا سوز یا تڑپ جو شاعرانہ بیان کی جان ہے شعر میں موجود اور رباعی میں مفقود ہے۔

۶۔ رباعی میں طول ہے اور شعر میں اختصار۔ کلام جتنا مختصر ہوگا اتنی ہی قوت کے ساتھ پوری توجہ کو اپنی طرف کھینچے گا اور اثر کا نشتر جتنا باریک ہوگا اُتنی ہی آسانی سے دل میں اُتر جائے گا۔

انھیں سب باتوں پر نظر کر کے ہماری شاعری میں یہ لکھا گیا تھا:-

"شعر کے پہلے مصرعے میں رباعی کے پہلے دو مصرعوں کا پورا مضمون سما گیا ہے۔ اور مجموعی حیثیت سے

"یہ شعر خوبصورتی، روانی اور اثر میں اس رباعی سے کس قدر بڑھ گیا ہے۔ یہ زیادہ تر اختصار کلام ہی کا نتیجہ ہے"

معترض کی زبان تو نہیں کہتی مگر دل محسوس کرتا ہے کہ رباعی میں طول ہے اور شعر میں اختصار۔ مندرجہ ذیل عبارت معترض کے دل کا حال کھولے دیتی ہے:-

"مثال میں ایک تو رباعی ہے جس میں چار مصرعوں کا پُر کرنا ضروری ہے۔ اور وہاں صرف ایک شعر ہے اور وہ بھی جس بحر میں ہے وہ پکارتی ہے کہ اُس میں اتنے ہی کم لفظ سما سکتے ہیں" (صہ)

اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ معترض کے نزدیک مصنف کا دعوے صحیح تو ہے مگر اسکے دو سبب ہیں۔ ایک تو رباعی میں چار مصرعے اور شعر میں دو مصرعے ہونا۔ دوسرے شعر کی بحر کا مختصر ہونا۔ مصنف کہتا ہے کہ اسباب کچھ بھی ہوں مگر اس حقیقت کا انکار تو ممکن نہیں کہ رباعی میں طول اور شعر میں اختصار ہے۔

جہان آرزو

(جناب منشی سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی)

اے جذب محبت تو ہی بتا کیونکر نہ اثر ہو دل ہی تو ہے
سیدھی بھی چھری ٹیڑھی بھی چھری دلدوز نظر قاتل ہی تو ہے

جب ہوک اُٹھے گی تڑپے گا انصاف نہ چھوڑو دل ہی تو ہے
تا چند تحمل کا صبر و سکوں بسمل آخر بسمل ہی تو ہے

ناخوش ہے تو کیا اب خوش ہی تو کیا جیسا بھی سہی ہے تو اپنا
یہ ساتھ نہیں چھٹنے والا بیکس کا سہارا دل ہی تو ہے

طوفان بلا کی موجوں میں کیں بند آنکھیں اور چھپا نہ پڑے
کشتی نے جہاں ٹکر کھائی دل بول اُٹھا ساحل ہی تو ہے

ہے ظرف یہاں کس کا کتنا دل ہے بس اسی کا پیمانا
رونا بھی مرا ہنسنا بھی مرا جو بات ہے وہ مشکل ہی تو ہے

ہیں موت کے اس جینے میں مزے غم جس کو نہ ہو وہ کیا سمجھے
جب ثابت کرتے بن نہ پڑے جو دعوے ہے باطل ہی تو ہے

دکھ دے کے اُلٹے دینا کیا فریاد نتیجہ ہے ستم کا
جب ٹھیس لگی شیشہ ٹھنکا پتھر نہ سمجھیے دل ہی تو ہے

غم جھیلتے ہیں دکھ بھرتے ہیں اور ہونٹ ہلاتے ڈرتے ہیں
یوں کانوں پہ ہاتھ نہ دھرتے ہیں جیسے یہ بہت مشکل ہی تو ہے

تھی خضر طریق افتادیاں اور سنگ نہ دشت سنگ نشاں
حد راہ طلب کی آگہی ملی جاتا ہے کہاں منزل ہی تو ہے

آپ آرزو اب خاموش رہیں کچھ اچھی بری کھلکر نہ کہیں
ہیں جتنے منھ اُتنی باتیں محفل آخر محفل ہی تو ہے

چکبست

(جناب مولوی محمد یحیےٰ صاحب تنہا بی۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی وکیل)

آپ کا نام پنڈت برج نراین چکبست ہے۔ آپ نے دیگر شعراء کی طرح کوئی تخلص اختیار نہیں کیا۔ ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے اور چند سال بعد لکھنؤ چلے آئے۔ یہیں تعلیم و تربیت پائی ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان پاس کر کے وکالت شروع کر دی۔ کہتے ہیں کہ اس پیشہ میں آپ کو کامیابی حاصل ہوئی اور آپ کا شمار لکھنؤ کے ممتاز وکلاء میں ہو گیا۔ ۱۲ر فروری ۱۹۲۶ء کو ایک مقدمہ کی پیروی کے لیے رسلے بریلی تشریف لے گئے تھے۔ لکھنؤ واپس جانے کے لیے سہ پہر کو اسٹیشن پر آئے۔ ریل میں بیٹھے تھے کہ دماغ پر فالج گرا اور زبان بند ہو گئی۔ ہمراہیوں نے یہ حالت دیکھ کر ریل سے اُتارا اور ویٹنگ روم میں لٹا دیا۔ ڈاکٹر آئے علاج ہوا مگر سب بے سود ثابت ہوا۔ سات بجے شام کو اسٹیشن ہی پر انتقال کیا۔ آپ کے بڑے بھائی راے صاحب پنڈت مہاراج نراین چکبست ایگزیکٹو آفیسر لکھنؤ میونسپلٹی گیارہ بجے رات کو آپ کی لاش موٹر میں رکھ کر لکھنؤ لے گئے۔ محشرؔ لکھنوی نے آپ ہی کے مصرع سے تاریخ نکالی۔

ان کے ہی مصرع سے تاریخ ہے ہمراہ عزا   موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا ۱۳۴۴ھ

آپ کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ شاید پہلی غزل نو برس کی عمر میں کہی تھی۔ اُس زمانہ سے آپ برابر شعر کہتے رہے۔ آتشؔ، غالبؔ اور انیسؔ کے کلام کے شیدا تھے۔ عمر نے وفا نہ کی ورنہ اس فن میں آپ کے جوہر اور نمایاں ہوتے اور کیا عجب ہے کہ آگے چل کر بالغ نظر شعراء میں شمار کیے جاتے۔

کلام پر تبصرہ

جس زمانہ میں آپ نے شعر کہنا شروع کیا اُس وقت لکھنؤ کی فضا مانع تھی کہ آپ ایسی شاعری اختیار کرتے جو آپ کے کلام سے ہویدا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت بشن نرائن در متخلص بہ ابر کے فیض صحبت سے یہ رجحان طبیعت پیدا ہوا۔ اگرچہ خود ابر بھی لکھنؤ کی قدیم شاعری کے دلدادہ تھے لیکن انگریزی کی اعلےٰ تعلیم نے اُن کے دماغ کو مغربی خیالات سے بھر دیا تھا اور وہ نیک و بد میں تمیز کر سکتے تھے۔ اُسی زمانہ میں مولانا حالی کا مقدمہ اردو شعر و شاعری پر شائع ہو چکا تھا۔ اگرچہ لکھنؤ میں اُس کا خیر مقدم بشکل احتجاج کیا گیا مگر اودھ پنچ اور اُسکے رفقائے کار نے بہت سے دسے کی اور اپنے مضامین تنقیدی کا یہ عنوان

قائم کیا کہ:۔ ؎

ابتر ہمارے حملے سے حالی کا حال ہے   میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

لیکن سچ میں وہ حیرت انگیز اثر ہوتا ہے کہ آخر کار ان ہی نقادانِ فن نے زبان سے مقدمۂ حالی کی تائید کی۔ اسی فضا کا یہ اثر تھا کہ چکبست حالی کے کلام کو پسند نہ کرتے۔ نسیم پر جو ضمناً اعتراضات اُردو مثنوی کے متعلق لکھتے ہوئے اپنے مقدمہ میں مولانا حالی نے کیے تھے اُن کے جوابات چکبست نے حتے المقدور دینے کی کوشش کی۔ مگر اپنی شاعری کو اُسی سانچے میں ڈھال دیا جو مقدمۂ حالی میں پیش کیا گیا ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں:۔

نیا مسلک نیا رنگ سخن ایجاد کرتے ہیں   عروسِ شعر کو ہم قید سے آزاد کرتے ہیں

آپ نے صنائع و بدائع مثنوی گلزارِ نسیم سے اخذ کیے۔ سلاست و روانی، تشبیہات و استعارات میر انیس کے مرثیوں کو بار بار پڑھ کر حاصل کیے۔ آتش کے تغزل نے آپ کی طبیعت میں گرمی پیدا کی۔ غالب کے کلام نے رفعت تخئیل کا سبق دیا۔ الغرض ان سب باتوں نے مل کر چکبست کے کلام کو مقبول و پسند عام بنا دیا اور آپ نے آزاد کی مندرجہ ذیل نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کی لیکن آپ صرف بزرگوں کے ترکہ سے متمتع ہونے اور کسی قدر اظہار اصلیت کو پیش نظر رکھنے پر کامیاب ہو سکے۔ نیز اُن بے موقع احاطوں میں بھی محبوس نہ رہے جن سے ہمارے بزرگوں کو کبھی آزادی نہ ملی۔

آزاد فرماتے ہیں:۔ "عبارت کا زور، مضمون کا جوش و خروش اور لطائف و صنائع کے سامان تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئی ہے ..... ہمیں چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں، سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں ..... ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے۔ طرح طرح کے۔ ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے۔"

آپ نے سیاسی، اخلاقی، مذہبی و اصلاحی مضامین اور قدرتی مناظر سب پر نظمیں لکھی ہیں اور داد سخنوری دی ہے لیکن بعض نقائص آپ کے کلام میں ایسے پائے جاتے ہیں جس سے شبہ ہوتا ہے کہ آپ حقیقی شاعری سے کافی طور پر آگاہ نہ تھے۔ جو کچھ لکھتے تھے تقلیداً لکھتے تھے۔ طبیعت میں اپچ نہ تھی۔ حالی اور آزاد کی

نظمیں پڑھکر ... شوق پیدا ہوگیا کہ اُن مضامین پر نظمیں لکھنے لگے جو وقتی ضرورت کے لحاظ سے اہم تھے
...لف وصنائع کے پھول بھی بنانے لگے مگر حقائق و واقعات یا سیدھی اور سچی باتوں کو اس
طرح بیان کرنے سے قاصر رہے کہ سامعین اثر پذیر ہوتے۔ واہ واہ سب کہتے ہیں مگر آہ کسی کے دل سے
نہیں نکلتی۔ وہ اگر مرثیہ لکھتے ہیں تو مرنے والے کے اوصاف ایک ایک کرکے نہیں شمار کراتے بلکہ عام طور پر
دلکش الفاظ جمع کرتے چلے جاتے ہیں جن سے ہرگز یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کس کا نوحہ یا مرثیہ ہے اور اگر کوئی
سیاسی نظم لکھتے ہیں تو کچھ واقعات ضرور بیان کرجاتے ہیں لیکن اس طرح نہیں لکھتے کہ پڑھنے والا مست و
بیخود ہو جائے اور اُن کا ہم زبان بن جائے۔

نذرانۂ روح یا مرشد کی محبت کے عنوان سے آپ نے پنڈت بشن نرائن در کے انتقال کے بعد ایک
نظم لکھی ہے جو آپ کے مجموعۂ کلام کا سرنامہ ہے۔ پہلا ہی بند یہ ہے۔

دلِ پُردرد کے ٹکڑے جو کیے ہیں یکجا　　　تیرے قدموں کے لیے تھا یہی میرا تحفا
مگر افسوس کہ یہ دَین ادا ہو نہ سکا　　　اب سرِلوح پہ ہے نقش یہ پیغامِ وفا

میرے سودائے طبیعت کا جو افسانہ ہے
مرنے والے یہ تری روح کا نذرانہ ہے

شاید ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ تیرے فراق میں جو دلِ پُردرد شکستہ ہوگیا تھا اُسکے ٹکڑے اسلیے
جمع کیے ہیں کہ تیرے قدموں پر نثار کردوں کیونکہ میں یہی تحفہ پیش کرسکتا تھا لیکن افسوس ہے کہ میں اس قرض
کو ادا نہیں کرسکا اور اب میری جبین پر یہ پیغامِ وفا نقش ہے یعنے میری طبیعت میں جو سودا سما گیا اور جس کا
چرچا ہو رہا ہے وہ ہی تیری روح کا نذرانہ ہے۔

یہ مطلب ہم نے ان اشعار سے نہایت غور کے بعد نکالا ہے ورنہ سیدھی طرح سے یہ مطلب نہیں نکلتا
کیونکہ دوسرے مصرع میں پہلے مصرع کے دلِ پُردرد کے ٹکڑوں کو تحفہ کہا گیا ہے اور تیسرے مصرع میں
تحفہ دَین یعنے قرض بن گیا ہے جس سے بے ربطی کلام ظاہر ہوتی ہے۔ چوتھے مصرع میں سرِلوح سے
لوحِ مزار مُراد ہے یا اپنی جبین اور پیغامِ وفا معلوم نہیں مرنے والے کا پیغامِ وفا ہے یا شاعر کا پیغامِ وفا
اپنی قوم کے لیے ہے یا مرنے والے کے لیے جو اُس کی جبین پر نقش ہے اور وہ پیغامِ وفا کیا ہے؟
سودائے طبیعت ہے۔ اس کو اظہارِ وفا کہیں یا شاعر کی زبان میں پیغامِ وفا۔ الغرض عجیب الفاظ میں یہ
نذرانۂ روح پیش کیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں کچھ مضامین جوش زن ہیں لیکن
اُن کو خوبی کے ساتھ ادا نہیں کرسکتا۔

اسی نظم میں ایک ٹیپ کا شعر ہے جس کو "صبح وطن" کا دیباچہ نگار بھی پسند کرتا ہے۔

آبرو کیا ہے تمنائے وفا میں مرنا دین کیا ہے کس کامل کی پرستش کرنا

خیر ہم کو شاعر کے عقائد سے تو بحث نہیں کہ وہ کسی کامل کی پرستش کو دین قرار دیتا ہے نزدیک تو ماسوا اللہ کی پرستش کفر ہے۔ لیکن تمنائے وفا میں مرنے سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر جس کامل کی پرستش کو اپنا دین قرار دیتا ہے وہ کامل معشوق کی طرح بے وفا ہے اور یہ بات اُس کے رتبہ سے فروتر ہے کہ وہ بیوفا ہو۔

اور اگر شاعر نے تمنائے وفا سے مراد خود اپنی وفاداری لی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ وفاداری کی تمنا میں مرنا کیا آبرو کا کام ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

آپ نے بعض بعض جگہ غلط الفاظ بھی استعمال کیے ہیں مثلاً (صبح وطن کا صفحہ ۳۸)

رہا ہے رات کی صحبت میں کیا مزا باقی نگاہِ شوق کو ہے دورِ نو کی مشتاقی

لفظ مشتاقی اُردو میں استعمال نہیں ہوتا اسلیے غلط ہے۔ ع

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے

گماں کو شک کے معنی میں استعمال کیا ہے جو اس موقع پر ہمارے روزمرہ کے خلاف ہے۔ ہم یہاں شبہ یا شک ضرور استعمال کرینگے لیکن گمان ہرگز استعمال نہ کریں گے۔

بشن نرائن در کے نوحہ میں ایک مصرع ہے "آدمی کے لیے معراج ہے انساں ہونا" انسان ہونا آدمی کی معراج ہے ہونا چاہیے جیسا کہ جگر مرادآبادی کا مصرع ہے "یہی انساں کی ہے معراج کہ انساں ہوجائے"۔ اسی نظم میں عیاں کا قافیہ چھاں باندھا ہے۔ حالانکہ لفظ چھاؤں ہے چھاں نہیں ہے۔

"وطن کا راگ"، اس نظم میں ایک مصرع ہے "خوشی سے قید کے گوشہ کو ہم بسائیں گے" قید کا گوشہ بے معنی ہے۔ قید خانہ کا گوشہ ہونا چاہیے۔

دردِ دل کے پہلے بند کی ٹیپ ہے۔

کیا کہوں کون ہوا سر میں بھری رہتی ہے بے پیے آٹھ پہر بے خبری رہتی ہے

اس موقع پر کون ہوا غیر فصیح ہے۔ کیا ہوا ہونا چاہیے تھا۔

جلوۂ صبح کا پہلا مصرع ہے "جب رنگ شب آئینۂ ہستی سے ہوا دور" ہستی کے بجائے عالم ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہستی کے معنے زندگی کے ہیں اور آپ کی مراد یہاں دنیا سے ہے۔

نظم نالۂ یاس کے آخر میں حسب ذیل شعر ہے ؎

یاس کہتی ہے کہ جینے کا نہیں رنگ چمن　　　آرزو کہتی ہے اگلا سلسلہ ٹوٹے نہیں

یہاں سلسلہ ٹوٹے نہیں کے بجائے سلسلہ نہ ٹوٹے ہونا چاہیے لیکن شاعر ردیف سے مجبور ہو گیا اور اُسے روزمرہ کے خلاف چلنا پڑا۔ یہ نظم ۱۹۱۰ء میں لکھی گئی تھی لہذا رنگ نہیں جینے کا کی بجائے رنگ نہیں جینے کا لکھنا چاہیے تھا کیونکہ اُس وقت رنگ نہیں جینے کا متروک ہو چکا تھا۔ شاید نظم لکھنے میں ایسی دقتیں حائل ہوتی رہتی ہیں اور اس کو ضرورت شعری سمجھنا چاہیے۔

کرشن کنھیا والی نظم میں "دل میں پیوست ہوئی جاتی ہے موروں کی نوا" نوا کا دل میں پیوست ہونا نہ کوئی محاورہ ہے اور نہ روزمرہ ہے۔ لہذا یہ کہنا غلط ہے کہ موروں کی نوا دل میں پیوست ہوئی جاتی ہے۔

نظم متعلق ہندو یونیورسٹی صفحہ ۸۲ پر آپ نے تحریر کیا ہے "ہے علوم کی گنگا، ہیں غریب و امیر" اس مصرع سے یہ مفہوم تشنہ رہ جاتا ہے کہ غریب و امیر کیا ہیں۔

اسی نظم کے ایک بند میں آپ فرماتے ہیں ؎

تمہاری قوم سے دولت ہوئی ہے یوں معدوم　　　کہ اب ترستے ہیں پڑھنے کو سیکڑوں معصوم

آگے چلکر آپ کا ارشاد ہے ؎

یہ کار خیر میں کوشش یہ قوم کا در بار　　　لگا دو آج تو چاندی کے ہر طرف انبار

اسکے بعد آپ یوں نغمہ سرا ہیں ؎

جو اس طرح ہوا دنیا میں آبرو کا زوال　　　تو کام آئے گا عقبےٰ میں کیا یہ دولت و مال

جس قوم سے دولت معدوم ہو گئی ہو اُس سے یہ کہنا کہ "لگا دو آج تو چاندی کے ہر طرف انبار" کس قدر متضاد خیال ہے، اور مفلس قوم کس طرح چاندی کے انبار لگا سکتی ہے؟ شاعر کو اس موقع پر تو اپنی قوم کو دولتمند کہنا چاہیے تھا تاکہ وہ ہر طرف چاندی کے انبار لگا دیتی۔ اس کے علاوہ جب وہ قوم مفلس ہے تو یہ کہنا کہاں تک درست ہو سکتا ہے کہ "تو کام آئے گا عقبےٰ میں کیا یہ دولت و مال" الغرض اس قسم کی متضاد خیالی شاعر کے دماغ کی بے ترتیبی ظاہر کرتی ہے۔

سیر دیرہ دون میں آپ کا ایک شعر ہے ؎

لباس پہنے ہیں کل خشت و سنگ سبزہ کا　　　بجائے خاک کے اڑتا ہے رنگ سبزہ کا

چونکہ آپ گلزار نسیم کے بڑے مداح ہیں اسلیے آپ کے کلام میں بھی وہی رنگ نمایاں ہے۔ یہ کہنا تو نسیم کی طرح آسان تھا کہ خاک کی بجائے سبزہ کا رنگ اڑتا ہے لیکن اس بات پر غور نہیں کیا کہ سبزہ کا

رنگ اُڑنے سے سبزہ خشک گھاس ہو جائے گا اور آپ کا مقصد جو دہرہ دون کی تر و تازگی بیان کرتا ہے فوت ہو جائے گا۔

ایک یا دو نوحوں کو چھوڑ کر آپ نے جس قدر نوحے محبان وطن کے لکھے ہیں شعر کے اندر اُن کا نام نہیں آیا۔ اگر عنوان نہ لکھا جاتا تو یہ پتہ نہ چلتا کہ آپ نے کس کا نوحہ کہا ہے۔ اُن کے صفات عام طریقہ سے بیان کیے ہیں جو دوسروں میں بھی پائے جاتے ہیں اور اُن سے کوئی خصوصیت نہیں رکھتے۔ اگر کہیں کچھ خصوصیت پیدا کی ہے تو وہ بھی عمومیت میں داخل ہو گئی ہے۔ مثلاً بال گنگا دھر تلک کے نوحہ کی ایک ٹیپ ہے ؎

تھی سمائی ہوئی پونا کی بہار آنکھوں میں آخری دور کا باقی تھا خمار آنکھوں میں

یا ایک بند کا پہلا شعر ہے ؎

موت مہاراشٹ کی تھی یا ترے مرنے کی خبر مُردنی چھا گئی انسان تو کیا پتھر پر

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ راناڈے یا گوکھلے کا نوحہ نہیں ہے؟ البتہ ایک بند میں تلک کے قید ہونے کی طرف اشارہ ہے اور یہ اُس کی خاص صفت ہے کیونکہ گوکھلے اور راناڈے کو حب الوطنی کے باعث قید ہونا نہیں پڑا۔ راناڈے کے نوحہ کا بھی یہی حال ہے کہ ان تینوں مرہٹوں پر منطبق ہو سکتا ہے۔ اور گوکھلے کا نوحہ تو ایسا ہے کہ اُس کے مرہٹہ ہونے کا بھی اظہار نہیں کرتا۔ جس محب وطن کے لیے چاہو پڑھ لو۔

مرثیہ میں اگر اظہار خصوصیت نہ ہو اور مرنے والے کے خاص صفات نہ بیان کیے جائیں تو دلوں پر ایسے اشعار کچھ اثر نہیں کرتے اور جب اثر نہ ہوا تو ایسا مرثیہ کہنے سے کیا حاصل؟

میر انیس کے کلام کو بار بار پڑھ کر آپ میں یہ بات تو پیدا ہو گئی کہ تشبیہات اور استعارات سلیقہ سے باندھ دیے اور الفاظ بھی اپنی اپنی جگہ پر نگینہ کی طرح جڑ دیے لیکن جو خاص جوہر کلام تھا اُسکو نظر انداز کر دیا۔ میر انیس کا خاص جوہر جس کی وجہ سے وہ درحقیقت شاعر کے معزز خطاب سے مخاطب کیے جاتے ہیں یہ ہے کہ اُنھوں نے ہر ایک شہید کربلا کا پورا نقشہ کھینچا ہے اور اُس کی خصوصیات کو قائم رکھا ہے۔ عام صفات بیان کر کے ایک کو دوسرے مین مدغم نہیں کیا۔ ممکن نہیں کہ جو مرثیہ عون و محمد کے نام سے ہے وہ حضرت قاسم کے مرثیہ پر منطبق ہو سکے اور جو مرثیہ حضرت عباس کے نام سے ہے وہ حضرت امام حسین کے لیے موزوں ہو سکے۔ لکھنؤ کی فضا صنائع و بدائع کی عینک لگا دیتی ہے اور دیگر حقائق شاعری کی طرف سے آنکھ بند کر دیتی ہے۔ چنانچہ چکبست بھی اپنے ہم وطنوں کی طرح محض صنائع و بدائع کو شاعری جانتے تھے اور حقیقت شعر سے بہرہ وافی نہ رکھتے تھے جیسا کہ اُن کے مضامین سے بھی ظاہر ہے لہذا اسکا پر تو آپ کے کلام پر پڑنا

ضروری تھا اور پڑا۔

غزلوں میں آپ نے سیاسی واخلاقی واصلاحی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگرچہ غزل کے تمام اصطلاحی الفاظ پائے جاتے ہیں لیکن معانی کے لحاظ سے وہ قدیم شاعری سے بالکل علیحدہ ہیں۔ بعض اشعار نہایت خوب ہیں لیکن بعض اشعار میں غلطیاں بھی موجود ہیں۔ مثلاً امتحان لینے کی بجائے امتحان کرنا لکھتے ہیں ؎

مرے احباب پیش آتے ہیں مجھ سے بیوفائی سے　　وفاداری میں شاید کر رہے ہیں امتحاں میرا

علاوہ ازیں پہلے مصرع میں سے کی تکرار بری معلوم ہوتی ہے۔ یا مر گئے کی بجائے مر چکے باندھا ہے ؎

اس کو نا قدری عالم کا صلہ کہتے ہیں　　مر چکے ہم تو زمانہ نے بہت یاد کیا

ذیل میں آپ کا منتخب کلام ہدیۂ ناظرین ہے۔

(خاک ہند)

اس خاک دلنشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری　　چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری　　چشم و چراغ عالم تھی سرزمیں ہماری

شمع ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہر دانش اس وادیٔ کہن میں

(آوازۂ قوم)

ہے آجکل کی ہوا میں وفا کی بربادی　　مٹنے جو کوئی تو سارا چمن ہے فریادی
قفس میں بند ہیں جو آشیاں کے تھے عادی　　اُڑا ہے باغ سے بو ہو کے رنگ آزادی

ہوائے شوق میں غنچے بکس نہیں سکتے
ہمارے پھول بھی چاہیں تو ہنس نہیں سکتے

(قوم کا پیام وفا)

حکم حاکم کا ہے فریاد زبانی رُک جائے　　دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رُک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رُک جائے　　پر یہ ممکن نہیں اب جوش جوانی رُک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشا یہ نہیں قوم نے کروٹ لی ہے

اس بند کی ٹیپ میں دونوں مصرعوں میں ہے کو دُھرایا گیا ہے اگر آخری مصرع یوں ہوتا "کچھ تماشا نہیں اب قوم نے کروٹ لی ہے" تو کم از کم ایک ہی شعر میں ہے دوبارہ استعمال نہ ہوتا۔

(فریادِ قوم)

نصیب چین نہیں بھوک پیاس کے مارے ہیں کس عذاب میں ہندوستان کے پیارے
تمہیں تو عیش کے سامان جمع ہیں سارے وہاں بدن سے رواں ہیں لہو کے فوارے

جو چپ رہیں تو ہوا قوم کی بگڑتی ہے
جو سر اٹھائیں تو کوڑوں کی مار پڑتی ہے

وطن سے دور بھی ہیں اور خانہ ویراں بھی اسیر یاس بھی ہیں اور اسیر زنداں بھی
تباہ حال ہیں ہندو بھی اور مسلماں بھی ہوئے ہیں نذر مصیبت کے دین وایماں بھی

پڑھی نماز تو اُجڑے گھروں کے صحرا میں
اگر نہائے تو اپنے لہو کی گنگا میں

دکھا دو جوہر اسلام اے مسلمانو! وقار قوم گیا قوم کے نگہبانو!
ستون ملک کے ہو قدرِ قومیت جانو جفا وطن پہ ہے فرض وفا کو پہچانو

نبی کے خُلق و مروت کے ورثہ دار ہو تم
عرب کی شانِ حمیت کے یادگار ہو تم

کرو خیال کچھ اسلاف کی حمیت کا دیا تھا دشمن قاتل کو جام شربت کا
معاملہ ہے یہاں بھائیوں کی عزت کا یہ فرض عین ہے سودا نہیں مروت کا

اگر نہ اب بھی ہوا اسلام کا جگر پانی
ہزار خندۂ کفر است بر مسلمانی

(گائے)

دیکھے جنگل میں کوئی شام کو تیری رفتار بے پیے جیسے کسی کو ہو جوانی کا خمار
مست کر دیتی ہے شاید تجھے قدرت کی بہار وہ اُترتی ہوئی دھوپ اور وہ سبزے کا نکھار

ایک ایک گام پہ شوخی سے مچلنا تیرا
کھا کے جنگل کی ہوا جھوم کے چلنا تیرا

(سیر دیرہ دون)

کیا نہیں اسے غارت بشر کی صنعت نے یہ سبزہ زار سجایا ہے دست قدرت نے
بھرا ابھر کے ہے انتظام پانی کا ہوائے سرد کو ہے حکم باغبانی کا

تمام شہر ہے گرد و غبار سے خالی — جدھر نگاہ اُٹھے اُس طرف ہے ہریالی
فضائے کوہ میں ایسی ہوا سماتی ہے — بشر کی روح کو راحت کی نیند آتی ہے
اثر دکھاتا ہے قدرت کا نغمۂ دلگیر — شجر حجر سے ٹپکتی ہے راگ کی تاثیر

(آصف الدولہ کا امام باڑہ)

درو دیوار نظر آتے ہیں کیا صاف و سُبک — سحر کرتی ہے نگاہوں پہ ضیائے مہتاب
جگمگاتا ہے شعاعوں میں یہ ایوان بلند — جس کی صنعت کا ہے دنیا میں نرالا انداز
پارۂ چوب کے احساں کی ضرورت نہ رہی — خاک اور خشت نے مل کر یہ دکھایا اعجاز
اس کی تعمیر کو آئے نہیں معمار فرنگ — ہے یہ تہذیبِ اودھ کے لیے سرمایۂ ناز

(گنگا پرشاد ورما)

یوں تو دنیا میں ہمیشہ سے ہے مرنے کا چلن — اپنے بچوں کو نگلتی ہے زمیں کی ناگن
داغ دیتا ہے مگر جب کوئی دل سوزِ وطن — اس کے صدمے سے لرزتا ہے یہ ایوانِ کہن

چاندنی رات میں جس وقت ہوا آتی ہے
قوم کے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

(غزلیات)

رہے گی آب و ہوا میں خیال کی بجلی — یہ مشتِ خاک ہے فانی رہے رہے نہ رہے
خوشنوائی کا سبق میں نے قفس میں سیکھا — کیا کہوں اور، سلامت مرا صیاد رہے

باغباں دل سے وطن کو یہ دعا دیتا ہے — میں رہوں یا نہ رہوں یہ چمن آباد رہے
جو تو کہے، تو شکایت کا ذکر کم کر دیں — مگر یقیں ترے وعدوں پہ لا نہیں سکتے

وہی ہوا وہی کوئل وہی پپیہا ہے — وہی چمن ہے پہ وہ باغباں چمن میں نہیں
پڑی ہیں تیر بن بن کر نگاہیں پارساؤں کی — غزالانِ حرم بھولے ہوئے ہیں شوخیاں اپنی
شفق ہے آسماں پر لالہ و گل باغ و صحرا میں — دکھاتا ہے شہیدوں کا لہو رنگینیاں اپنی

صدا دیتا ہے یہ میر اگریباں چاک ہونے پر — ہزاروں پیرہن پیدا کریں گی دھجیاں اپنی
دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے — جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

اذاں سے نعرۂ ناقوس پیدا ہو نہیں سکتا — ابھی کچھ روز تک کعبہ کلیسا ہو نہیں سکتا
زباں سے جوشِ قومی دل میں پیدا ہو نہیں سکتا — اُبلنے سے کنواں وسعت میں دریا ہو نہیں سکتا

درِ تدبیر پہ سر پھوڑنا شیوہ رہا اپنا
وسیلے ہاتھ ہی آئے نہ قسمت آزمائی کے

اگر دردِ محبت سے نہ انساں آشنا ہوتا
نہ کچھ مرنے کا غم ہوتا نہ جینے کا مزا ہوتا

یہ مانا بے حجابانہ نگاہیں قہر کرتی ہیں
مگر حسنِ حیا پرور کا عالم دوسرا ہوتا

نفاقِ گبر و مسلماں کا یوں مٹا آخر
یہ بُت کو بھول گئے وہ خدا کو بھول گئے

فنا کا ہوش آنا زندگی کا دردِ سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھلتے ہیں
مبارک بزدلوں کو گردشِ قسمت سے ڈر جانا

ہوائے تازہ دل کو خود بخود بے چین کرتی ہے
قفس میں کہہ گیا کوئی بہار آئی ہے گلشن میں

پُرانی کاوشیں دیر و حرم کی مٹتی جاتی ہیں
نئی تہذیب کے جھگڑے ہیں اب شیخ و برہمن میں

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہمکو اُنس باقی ہے
مزا دامانِ مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

بہار آئی، ترقی پر ہے سودا دم بدم میرا
بڑھا جاتا ہے خود زنجیر کی جانب قدم میرا

درِ زنداں پہ لکھا ہے کسی دیوانے نے
وہی آزاد ہے جس نے اسے آباد کیا

راحت سے بھی عزیز ہے راحت کی آرزو
دل ڈھونڈتا ہے سلسلۂ انتظار کو

ہیں[1] باغباں کے بھیس میں گلچیں فرنگ کے
نکلے ہیں لوٹنے چمنِ روزگار کو

فرشتہ حسن کا بیدار کرنے ان کو آیا ہے
جوانی کی اُمنگیں سو رہی تھیں بے خبر ہو کر

زندگی تلخیِ ایام کا افسانہ ہے
زہر بھرنے کے لیے عمر کا پیمانہ ہے

غنچے عدم سے آئے ہیں پہنے ہوئے کفن
انجام ہے نظر میں دو روزہ بہار کا

دردِ الفت زندگی کے واسطے اکسیر ہے
خاک کے پُتلے اسی جوہر سے انساں ہو گئے

دار سونی ہے، فقط نعرہ زنی باقی ہے
مست و مجذوب ہیں لاکھوں کوئی منصور نہیں

خود پرستی مٹ گئی قدرِ محبت بڑھ گئی
ماتمِ احباب ہے، تعلیم روحانی مجھے

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

یہ دل کی تازگی ہے وہ دل کی فسردگی
اس گلشنِ جہاں کی خزاں کیا بہار کیا

قوم کی شیرازہ بندی کا گِلہ بیکار ہے
طرزِ ہندو دیکھ کر رنگِ مسلماں دیکھ کر

ذرہ ذرہ ہے مرے کشمیر کا مہماں نواز
راہ میں پتھر کے ٹکڑوں نے دیا پانی مجھے

زندگی نام تھا جس کا اُسے کھو بیٹھے ہم
اب امیدوں کی فقط جلوہ گری باقی ہے

کیا دیکھتے ہی دیکھتے دنیا بدل گئی
واللہ وہ زمیں نہیں وہ آسماں نہیں

---

[1] ایک صاحب کی رائے میں ہیں کی بجائے یہ ہوتا تو بہتر تھا اور تنافرِ لفظی بھی دور ہو جاتا ۱۲

میر انیس اور اُن کی شاعری

(جناب علی سردار جعفری صاحب متعلم مسلم یونیورسٹی۔)

(بسلسلہ ماہ گذشتہ)

حقیقتاً انیس ایک افسانہ نگار ہے۔ دنیا کے جتنے بڑے بڑے شاعر ہوئے ہیں وہ سب افسانہ نگاری کے فن سے واقف تھے۔ انیس بھی اس میں کمال رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کس جذبہ کی نفسیاتی تحلیل کس طرح کی جاتی ہے اسے معلوم ہے کہ کونسا واقعہ کس مقام پر زیادہ پا اثر ہے۔ بقول نظم طباطبائی کے "کہانی تو سب ہی کہہ لیتے ہیں۔ آسمان سے تارے توڑ لانا ہر شخص کا کام نہیں"

افسانہ نگار ہونے کے علاوہ انیس ایک مورخ بھی ہے۔ بعض مقامات پر وہ تاریخی واقعات کو بغیر کسی قسم کی شاعری کے انتہائی بے پروائی کے ساتھ بیان کر جاتا ہے۔ مثلاً ابن سعد کا لڑائی کی ابتدا کرنا۔ اسکو انیس نے اس طرح ادا کیا ہے ؎

لشکر سے تب بڑھا پسر سعد چند گام — چلے میں رکھ کے تیر یہ سب سے کیا کلام
شاہد رہیں تمام دلیران فوج شام — میں پہلے پھینکتا ہوں یہ ناوک سوئے امام
ہے شاق مجھ کو خلق میں جینا حسین کا
کیا شاد ہوں ہدف ہو جو سینہ حسین کا

ابن سعد کے یہ الفاظ آج بھی تاریخ کے صفحات پر موجود ہیں۔

مگر انیس زیادہ تر شاعرانہ واقعہ نگاری سے کام لیتا ہے۔ کربلا کے جتنے واقعات ہم تک پہونچے ہیں ان میں سے اکثر ایسے بھی ہیں جو کامل وثوق کے ساتھ مستند نہیں کہے جا سکتے۔ جب انیس انھیں نظم کرتا ہے تو اپنی دماغی تخلیق سے کام لیتا ہے اور انھیں اس خوبی کے ساتھ ربط دیتا ہے کہ تمام واقعات یکے بعد دیگرے خود بخود ظہور پذیر ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

انیس نے اپنی رزمیہ شاعری میں واقعہ نگاری کی بہترین مثال پیش کی ہے اکثر مقامات پر فوج اسلام کے سپاہیوں کی آمادگی جنگ کی ایسی تصویر کھینچی ہے گویا انیس ان واقعات کو کھڑا ہوا خود دیکھ رہا تھا ؎

تنتا ہوا بڑھا کوئی قبضے کو چوم کے — بھالا کسی نے رکھ لیا کاندھے پہ جھوم کے

دوسری جگہ اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے ؎

چتون کسی کی شور دہل سے بگڑ گئی　　منھ سُرخ ہوگیا شکن ابرو پہ پڑ گئی

تیسری جگہ بھی یہی خیال ہے مگر یوں ادا ہوتا ہے ؎

نکلا کوئی سمند کو زانو میں داب کے　　غصّہ سے رہ گیا کوئی ہونٹوں کو چاب کے

چوتھی جگہ پھر وہی چیز ہے جو اس طرح پیش کی جاتی ہے ؎

پاس ادب سے شاہ کے صف بڑھ کے تھم گئی　　بیڑی ہر اک سوار کے گھوڑے پہ جم گئی

امام حسین کا جنگ کے لیے تلوار نکالنا اس کا نقشہ انیس نے ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

نکلی جو رن میں تیغ حسینی غلاف سے　　اٹھنے لگے شرر دم خارا شگاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشت مصاف سے　　صاف آئی الاماں کی صدا کوہ قاف سے

طبقے فلک کے صورت گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے بل گئے

تھا فوج قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر　　تھیں موج کی طرح سب اُدھر کی صفیں اِدھر
چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور　　پانی میں تھے نہنگ ابھرتے نہ تھے مگر

فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منھ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارے کو چھوڑ کے

بعض لوگوں کا یہ اعتراض ہے کہ رزم میں انیس نے اتنے مبالغے سے کام لیا ہے کہ وہ فطری نہیں رہگئی ہے۔ اس میں انیس کا کچھ قصور نہیں ہے بلکہ معترضین کی فہم کا قصور ہے۔ حقیقتاً انیس اس مقام پر مجبور ہے۔ اسکی مشکلات کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے جب ہم پہلے یہ دیکھ لیں کہ وہ کس چیز کو نظم کر رہا ہے۔ انیس کے سامنے کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا ہے صرف تاریخ نے جو واقعات امانت داری سے اس تک پہونچائے ہیں انھیں سے کام لینا ہے۔ واقعات ہیں ناتکمل اس لیے انیس انھیں پورا کرتا ہے اور اپنے تخیل کی زبردست قوت سے ان میں ربط پیدا کرتا ہے۔ اسکے علاوہ صاحب واقعہ ایسی ہستی ہے جسے انیس عام انسانوں سے کہیں بلند سمجھتا ہے۔ اسکے بازوؤں میں خدائی قوت ہے اسکا تعلق اُن محترم سے ہے جو لولاک لما خلقت الافلاک کے مصداق ہیں۔ اسلیے جب انیس انکی جنگ کی تصویر کھینچتا ہے تو اُسے مجبوراً یہ دکھانا پڑتا ہے کہ ساری کائنات اس سے متاثر ہو رہی ہے۔ مگر ہر جگہ انیس نے ایسا نہیں کیا ہے۔ اسکے یہاں کچھ ایسے مقامات بھی ہیں جنھیں پڑھ کر مجاہدین کربلا کی بشریت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اُسوقت نہ آسمان کانپتا ہے نہ زمین لرزتی ہے بلکہ فضائیں ساکن ہوتی ہیں اور لڑنے والا تھکا ہوا کھڑا ہوتا ہے۔ اس مقام پر انیس نے جناب علی اکبر کی

تصویر اس طرح کھینچی ہے سہ

مصروف تھا دعا میں ادھر فاطمہ کا لال ڈوبا ہوا تھا فوج عدو میں وہ نونہال
بڑھ کر دغا کرے یہ کسی کی نہ تھی مجال لاکھوں سے معرکہ تھا ہزاروں سے تھی جدال
سوکھے تھے ہونٹ رنگ بھی فاقوں سے زرد تھا
بازو تھکا ہوا تھا کلائی میں درد تھا

یہ دیر سے لڑے ہوئے وہ فوج تازہ دم فاقوں کا ضعف پیاس کا صدمہ پدر کا غم
ہاتھوں کا زور کم ہوا جاتا تھا دمبدم پرہمت میں جمے ہوئے تھے شیر کے قدم
آنکھیں تو سُرخ غیض سے تیوری چڑھی ہوئی
طاقت گھٹی ہوئی تھی پہ ہمت بڑھی ہوئی

گویا اس طرح انیس بشریت اور فوق البشریت کو ایک جگہ جمع کر کے مجاہدین کربلا کو ہم سے قریب تر کر دیتا ہے۔
انیس کو جذبات نگاری میں وہ کمال حاصل ہے جس میں اُردو تو اُردو کسی دوسری زبان کا بھی کوئی شاعر مشکل سے مقابلہ پر ٹھہرے گا۔ وہ مختلف جذبات کو مختلف طریقوں سے ادا کرتا ہے اور اُن کے لیے ایسا طرز بیان اختیار کرتا ہے جو اُن کے لیے موقع اور محل کی مناسبت سے موزوں ہو۔ یعنی انیس نے انسانی جذبات کی ترجمانی اس طرح کی ہے گویا وہ ان کا بہترین نباض تھا۔

عرب میں پہلے یہ دستور تھا کہ جب کوئی جنگ میں مارا جاتا تھا تو اُسکے عزیزوں کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ لاش میدان ہی میں پڑی رہے۔ وہ اس میں انتہائی سبکی محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ حسین بھی ہر شہید کی لاش میدان سے خیمہ گاہ تک لائے اور پھر وہیں لٹا آئے۔ جب تمام اصحاب قتل ہو چکتے ہیں اور امام نرغۂ اعدا میں یکہ و تنہا کھڑے رہ جاتے ہیں اُس وقت جناب صغریٰ کا قاصد کربلا میں وارد ہوتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ رسول کا نواسہ ایک مجاہد کی شان سے ڈھلتے ہوئے آفتاب کی ترچھی کرنوں کے سایہ میں اکیلا کھڑا ہوا ہے اور اصحاب اور اعزا کی لاشیں جلتی ہوئی ریت پر پڑی ہوئی ہیں۔ قاصد کو یہ نہیں معلوم کہ حسین لاشوں کو خیموں تک لیجا کر پھر واپس لے آئے ہیں اور اپنی خاندانی حمیت اور غیرت کا تقاضا پورا کر چکے ہیں۔ حسین اس بات کو محسوس کر لیتے ہیں اسلیے قاصد سے آنکھ نہیں ملا سکتے۔ انیس نے دو مصرعوں میں حسین کو حسین ہی کی زبان سے قاصد سے روشناس کرایا ہے سہ

حضرت نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں یہ تو نہ کہہ سکے کہ شہ مشرقین ہوں

یہاں شاعر نہ محض حسین کے جذبات کا ترجمان ہے بلکہ اُن کے ساتھ اپنے جذبات کی بھی ترجمانی کر رہا ہے۔

پہلا مصرع اس پر شاہد ہے کہ انیس حسین کو شہ مشرقین سمجھتا ہے اور دوسرا مصرع یہ بتا رہا ہے کہ حسین اپنے شہ مشرقین ہونے کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اس لیے "حضرت نے سر جھکا کے کہا میں حسین ہوں"

میدان کارزار گرم ہے۔ جناب زینب کے دونوں پسر لڑنے میں مشغول ہیں۔ فوج کے ہجوم میں دونوں بھائیوں کا ساتھ چھوٹ جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے متعلق نہ معلوم کیا کیا خیال کرتے ہیں کہ یکایک ایک طرف سے ایک بھائی نمودار ہوتا ہے اور دوسری طرف سے دوسرا۔ ظاہر ہے کہ ایسے موقع پر دونوں کے دلوں کو کتنی تقویت ہو گئی ہوگی۔ انھیں کتنی خوشی ہوئی ہوگی اسکا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ ہاں انیس نے اس کو سمجھا اور کہدیا ع

جان آگئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا۔

ایک جگہ پر تو انیس نے کمال ہی کر دیا ہے۔ ایک ماں کے تمام جذبات اور ایک چھ ماہ کے بچے کی پوری فطرت کو ایک مصرع میں رکھ دیا ہے۔ ع

اصغر مری آواز کو پہچان گئے تم

امام حسین کا دوسری محرم کو کربلا میں داخل ہونا۔ جناب عباس کا زینب کبریٰ سے ساحل فرات پر خیمہ برپا کرنے کی اجازت لینا۔ ان باتوں کو بیان کر کے انیس نے جناب زینب کے جواب میں ایک عورت اور خصوصاً بہن کے سارے جذبات کو جمع کر کے صفحۂ کاغذ پر رکھ دیا ہے ؎

بولی یہ سُن کے دختر خاتون روزگار　　اس امر میں بھلا مجھے کیا دخل میں نثار
خشکی ہو یا ترائی چمن ہو کہ سبزہ زار　　ہر جا مسافروں کا نگہباں ہے کردگار
مختار کائنات کے تم نور عین ہو
اترو وہاں جہاں مرے بھائی کو چین ہو

عاقل ہو تم تو نام خدا اے علی کے لال　　مجھ سے زیادہ بھائی کی راحت کا ہے خیال
دریافت کر لو پہلے کسی سے یہاں کا حال　　داری کسی طرح کا نہ آقا کو ہو ملال
گوشہ ملے ہیں نہ فضا ہو نہ سیر ہو
اب تو یہی پڑی ہے کہ جانوں کی خیر ہو

آج اس زمین پر ہمیں لایا ہے آسماں　　اب دیکھیے دکھاتی ہے تقدیر کیا یہاں
آقا کی خیریت کی دعا مانگو بھائی جاں　　یارب مسافروں کو مبارک ہو یہ مکاں
دشمن بہت ہیں بادشہِ خوش خصال کے

بھائی بہن نثار ذرا دیکھ بھال کے

اس کے بعد فرماتی ہیں ؎

ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو بھیا مجھے یہ ڈر ہے کہ ردو بدل نہ ہو

ایک مقام پر انیس نے اس چیز کو دکھایا ہے کہ جناب زینب اپنے بیٹوں سے ناراض ہیں کہ وہ ابھی تک میدان جنگ میں کیوں نہیں گئے۔ ماں بجائے اسکے کہ ان سے سوال کرے کچھ ایسے طعنے دیتی ہے کہ دل ہل جاتا ہے ؎

فرزند حسن مرنے کو جالیں تو یہ جائیں عباس علی خوں میں نہالیں تو یہ جائیں
ہمشکل نبی برچھیاں کھالیں تو یہ جائیں لاشے ابھی شہزادوں کے آلیں تو یہ جائیں
کھلتا نہیں کچھ جوش شجاعت انھیں کیوں ہے
حضرت تو سلامت ہیں یہ عجلت انھیں کیوں ہے

جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ انیس نے سیرت نگاری کا بھی فرض ادا کیا ہے۔ یہ سیرتیں بیحد بلند ہیں۔ یہ بہترین نمونۂ تقلید ہیں اور اعلےٰ درجہ کا اسوۂ حسنہ۔ مگر انیس انھیں کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ تمام خصوصیات باقی رہتی ہیں مگر پھر بھی ہم اجنبیت محسوس نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے انیس کے کلام میں ایک اخلاقی لہر دوڑ گئی ہے۔ انیس نے جن اخلاق کے نمونے جن طریقوں سے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں اُن کی مثال ملنا دشوار ہے۔ اس مقام پر انیس تنہا کھڑا ہوا کائنات کی وسعتوں میں مسکرا رہا ہے۔

انسان میں مختلف قسم کے جذبات فطرتاً موجود ہوتے ہیں جو اُس وقت تک ہیجان میں نہیں آسکتے جب تک کوئی محرک ایسا نہ ہو جو اُن میں حرکت پیدا کر کے اُنھیں وجدان کے حدود سے باہر بھلائے جہاں وہ اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس لیے ایک شاعر کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اُسکی زبان کا نکلا ہوا ہر لفظ جذبات انسانی کو حرکت میں لانے کے لیے محرک کا کام کرے۔ چونکہ جذبات پست اور اعلےٰ دونوں قسم کے ہوتے ہیں اس لیے جیسے جذبات میں ہیجان پیدا ہوگا اُن کا محرک ویسا ہی ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس شاعر کا کلام جس قدر اعلےٰ جذبات کو حرکت میں لائے وہ شاعر اُسی قدر اعلےٰ قرار پائے گا۔

اس سلسلہ میں انیس کے کلام کا ایک درخشاں پہلو دکھانا چاہتا ہوں۔ یہ رجائیت ہے۔ رجائیت کے صحیح مفہوم کو ادا کرنے کے لیے اگر ایک طرف یہ ضروری ہے کہ وہ فرحت وانبساط بخشے تو دوسری طرف اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ ہماری بلند فطرت اور روشن جذبات میں بھی ٹھیس لگائے اور ہم میں بلند خیالات پیدا کرکے ہمیں عمدہ کاموں کی طرف راغب کرے۔

ملٹن۔ ورڈزورتھ۔ بائرن۔ شبلی۔ حالی۔ اکبر اور اقبال کے کلام کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اپنے آپ میں ایک قسم کی کمی محسوس کرتے ہیں اور ان کی شاعرانہ تخلیقوں میں کچھ ایسی چیزیں پاتے ہیں جنھیں اپنے آپ میں سراسر معدوم سمجھتے ہیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا کلام رجائی ہے۔

مرثیہ ایک ایسی چیز ہے جس کو رجائیت سے دور کا بھی تعلق نہیں مگر انیس نے جہاں رزم اور بزم شامل کر کے اپنے مرثیوں کو عرش کی بلندیوں پر پہونچا دیا ہے اور اُن کی خصوصیات کو بھی قائم رکھا ہے کہ ہم اسے سن کر آنسو بہانے لگیں اور شہدائے کربلا کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ ہم میں پیدا ہو وہیں خارجی شاعری کو شامل کر کے یہ بات بھی پیدا کر دی ہے کہ ہم اپنی فطرتوں کو اُبھرتا ہوا محسوس کریں۔

انیس کا تقریباً نصف بلکہ نصف سے بھی زیادہ کلام رجائیت میں ڈوبا ہوا ہے۔ خصوصاً وہ مقامات جہاں شاعر اپنی فصاحت اور بلاغت کی خود تعریف کرتا ہے۔ اسکو پڑھنے کے بعد خود بخود جی یہ چاہتا ہے کہ یہ چیزیں ہم میں بھی موجود ہوتیں۔

میر صاحب ایک مرثیہ کی ابتدا یوں کرتے ہیں۔

نمک کان تکلم ہے فصاحت میری ناطقے بند ہیں سُن سُن کے بلاغت میری
رنگ اُڑتے ہیں وہ رنگیں ہے عبارت میری شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں بحر مواج فصاحت کا تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں ذرے کو انجم کر دوں گنگ کو ماہر انداز تکلم کر دوں

درد سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

اسی مرثیے میں آگے چلکر فرماتے ہیں ؎

ہے کجی عیب مگر حُسن ہے ابرو کے لیے سُرما زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے زیب ہے خال سیہ چہرۂ گلرو کے لیے

داند آنکس کہ فصاحت بکلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

ان بندوں کے پڑھنے کے بعد ہر آدمی ایک کیف سا محسوس کرتا ہے۔ اسکی طبیعت میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے

قلزم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ　　　　شمع تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ　　　　خوں برستا نظر آئے جو دکھا دوں صف جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

ایک مرثیہ کی ابتدا انیس نے مناجات سے کی ہے۔ دیکھیے اس میں رجائیت کے کتنے سمندر موجیں مار رہے ہیں۔ ؎

یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر　　　　اے ابر کرم خشک زراعت پہ کرم کر
توفیض کا مبدا ہے توجہ کوئی دم کر　　　　گمنام کو اعجاز بیانوں میں رقم کر
جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے
اقلیم سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

اس باغ میں چشمے ہیں ترے فیض کے جاری　　　　بلبل کی زباں پر ہے تری شکر گذاری
ہر نخل برومند ہے یا حضرت باری　　　　پھل ہم کو بھی مل جائے ریاضت کا ہماری
وہ گل ہوں عنایت چمن طبع نکو کو
بلبل نے بھی سونگھا نہ ہو جن پھولوں کی بو کو

تعریف میں چشمے کو سمندر سے ملا دوں　　　　قطرے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں
ذرے کی چمک مہر منور سے ملا دوں　　　　خاروں کو نزاکت میں گل تر سے ملا دوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

گر بزم کی جانب ہو توجہ دم تحریر　　　　کھنچ جائے ابھی گلشن فردوس کی تصویر
دیکھے نہ کبھی صحبت انجم فلک پیر　　　　ہو جائے ہوا بزم سلیماں کی بھی توقیر
یوں تخت حسینان معانی اتر آئے
ہر چشم کو پریوں کا اکھاڑا نظر آئے

منظر نگاری میں انیس کو انتہائی کمال حاصل ہے۔ وہ ایک ایسا مصور ہے جو اپنے قلم کی صرف ایک جنبش سے فطرت کے سارے مناظر کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر سکتا ہے۔ جب وہ کسی منظر کی تصویر کشی کرتا ہے تو اسکو اصل سے بھی زیادہ خوبصورت بنا دیتا ہے مگر لطف یہ ہے کہ فطرت کے حدود سے تجاوز نہیں کرتا بس ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے فطرت کی ساری رنگینیاں شاعر کے سامنے بکھری پڑی ہیں جن سے وہ کھیل رہا ہے یا اسرار و

رموز کے پردے شاعر کی نگاہوں سے اُٹھ گئے ہیں اور وہ جس منظر کو جس زاویۂ نگاہ سے چاہتا ہے دیکھتا ہے۔ اور ان کی تصویر ہمارے سامنے پیش کر کے ہمیں بھی ان بلندیوں پر لے جاتا ہے جہاں وہ خود کھڑا ہوا ہے۔ یہاں انیس کا رجائی پہلو اس درجہ موجود ہے کہ ہم بالکل سرشار ہو جاتے ہیں۔

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیاباں وہ سحر
دمبدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرش زمرد پہ بچھائے تھے گہر
لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزہ پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف کلیوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور
یادِ خدا میں زمزمہ پردازیِ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور
خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انساں زمیں پہ محو ملک آسمان پر
جاری تھا ذکر قدرت حق ہر زبان پر

وہ سُرخیِ شفق کی اِدھر چرخ پر بہار
وہ بارور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار
پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

ایک مرثیہ کی ابتدا انیس نے مناظر قدرت کے بیان سے کی ہے ؎

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح
گلزارِ شب خزاں ہوا آئی بہارِ صبح
کرنے لگا فلک زرِ انجم نثارِ صبح
سرگرم ذکرِ حق ہوئے طاعت گزارِ صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دمبدم
مُرغانِ باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر وہ موجوں کا پیچ و خم
سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

وہ نورِ صبح اور وہ صحرا وہ سبزہ زار
تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار

چلنا نسیم صبح کا رہ رہ کے بار بار کوکو وہ قمریوں کی وہ طاؤس کی پکار
وا تھے دریچے باغ بہشت نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

انیس مناظر قدرت کی تصویر کشی ہی پر قانع نہیں رہتا ہے۔ بعض مرتبہ وہ ایک قدم اور آگے بڑھ جاتا ہے اور اُن گہرائیوں میں گھس جاتا ہے جہاں اُس کے کلام پر الہام کا دھوکا ہونے لگتا ہے اُس وقت اُس کی زبان کا نکلا ہوا مصرعہ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی علم الحیوانات کے ماہر کے الفاظ ہیں جو جانوروں کی فطرت بیان کر رہا ہے ؎

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

ایک جگہ دھوپ کی تیزی کا بیان اس طرح کیا ہے ؎

وہ دھوپ جس میں کہ ہرن ہوتے ہیں کالے اور ہانپتے ہیں شیر زبانوں کو نکالے

رجائیت کا ایک پہلو اُس مقام پر بھی موجود ہے جہاں انیس نے حسین اور اصحاب حسین کا سراپا بیان کیا ہے۔ ہماری نگاہوں میں کچھ ایسے شجاع اور بہادر پھر جاتے ہیں کہ خود ہماری رگوں میں گرم خون دوڑنے لگتا ہے ؎

صف باندھے بھائی بند کھڑے تھے جھکائے سر کوئی تو رشک مہر کوئی غیرت قمر
تن پر سجے سلاح۔ کسے جنگ پر کمر گیسوئے پیچدار لٹکتے تھے دوش پر
مُنہ پھیر پھیر کر جو وہ میداں کو تکتے تھے
جن کے پسر تھے اُن کے کلیجے دھڑکتے تھے

اکبر کی شان دیکھ کے بانوئے نامدار خوش ہوتی تھی کبھی کبھی روتی تھی زار زار
لے کر بلائیں دور سے کہتی تھی بار بار صدقے میں تیرے اور تری شان کے نثار
شان آخری شباب کی ماں کو دکھاتے ہو
دولہا بنے جوانی میں مرنے کو جاتے ہو

سب سے جدا تھی شوکت عباس نوجواں قبضے میں تیغ بر میں زرہ دوش پر کماں
حمزہ کا رعب شوکت جعفر علی کی شاں رہ رہ کے دیکھتے تھے شہنشاہ دو جہاں
شان و شکوہ ختم تھی اس خوش نہاد پر
گویا کمر علی نے کسی تھی جہاد پر

ایک مقام پر اصحاب حسین کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

وہ گورے گورے جسم قبائیں وہ تنگ تنگ جن کی صفا کو دیکھ کے آئینہ بھی ہو دنگ
زیور کی طرح جسم پہ زیبا سلاح جنگ جرأت کا تھا یہ جوش کہ چہرے تھے لالہ رنگ
کہتے تھے سب چڑھائے ہوئے آستین کو
آقا ابھی کہیں تو اُلٹ دیں زمین کو

رجائیت کا اس سے بھی زیادہ مہتم بالشان مظاہرہ وہاں ہوا ہے جہاں انیس نے حسین اور اصحاب حسین کی آمد کا ذکر کیا ہے۔ یہاں وہ شکوہ وہ تجمل وہ شان نظر آتی ہے جس سے صرف دل ہی لطف اُٹھا سکتا ہے۔ الفاظ میں اس کا بیان کرنا صرف انیس کے قلم کا کام ہے۔ یہ اتنے باوقار مناظر ہیں جن کا رعب پڑھنے والے کے دل پر پڑتا ہے۔ یہ اتنی باحشم ہستیوں کے مرقعے ہیں جن کی ہیبت سے انسان پیچھے ہٹ جاتا ہے

آمد ہے کربلا کے نیستاں میں شیر کی ڈیوڑھی سے چل چکی ہے سواری دلیر کی
جاسوس کہہ رہے ہیں نہیں راہ پھیر کی غش آگیا ہے شمر کو یہ ہے وجہ دیر کی
خوشبو ہے دشت باد بہاری قریب ہے
ہشیار غافلو کہ سواری قریب ہے

ہاں نور چشم فاتح خیبر قریب ہے لو وارث کشندۂ عنتر قریب ہے
لخت دل درندۂ اژدر قریب ہے جو تیغ کا دھنی ہے وہ صفدر قریب ہے
جوہر کبھی چھپے نہیں تیغ اصیل کے
کاٹے انھیں کی تیغ نے پر جبرئیل کے

اللہ ری آمد آمد عباس صف شکن لرزاں تھے کوہ ہلتے تھے دل کانپتا تھا تن
جنگل کے شیر بن گئے تھے خوف سے ہرن اک شور تھا کہ آج پڑے گا غضب کا رن
یہ شیر کم نہیں اسد قلعہ گیر سے
گویا مقابلہ ہے جناب امیر سے

ان بندوں کو پڑھنے کے بعد دل میں ایک قسم کا جوش اور ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ حُر کی آمد کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے دست فولاد دبا جاتا تھا دستانوں سے
برچھیوں اُڑتا تھا دب کے فرس رانوں سے آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

امام حسین کی آمد کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے ؎

دشت وغا میں نور خدا کا ظہور ہے ذرّوں میں روشنیٔ تجلیٔ طور ہے
اک آفتاب رُخ کی ضیا دُور دُور ہے کوسوں زمین عکس سے دریائے نُور ہے
اللہ رے حُسن طبقۂ عنبر سرشت کا
میدان کربلا ہے نمونہ بہشت کا

اس بند میں انیس نے اس چیز کو پیش کیا ہے کہ حسین کا استقبال کائنات کسقدر شاندار طریقے سے کر رہی ہے۔ ایک اور مہتم بالشان تصویر ملاحظہ ہو ؎

جب کربلا میں داخلہ شاہِ دیں ہوا دشت بلا نمونۂ خلد بریں ہوا
سر جُھک گیا فلک کا یہ اوج زمیں ہوا خورشید محو حُسنِ حُسین حسیں ہوا
پایا فروغ نیّر دیں کے ظہور سے
جنگل کو چاند لگ گئے چہرے کے نور سے

زہرا کے اختروں سے زمیں آسماں ہوئی غازی جہاں چلے وہ زمیں کہکشاں ہوئی
سب ارض پاک غیرت باغ جناں ہوئی ایسا مکیں ملا کہ رفیع المکاں ہوئی
دامن جو پاک صاف تھا دشت مصاف کا
احرام باندھا کعبہ نے اس کے طواف کا

اس سے بھی زیادہ اثر کرنے والی وہ تصویریں ہیں جن میں انیس نے سب کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور پھر ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ تعریف کی ہے۔ اس وقت ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود کھڑے ہوئے اس فلک شکوہ منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ جیتے جاگتے مرقعے جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہوتے ہیں تھوڑی دیر کے لیے ہمیں تاریکیوں سے نکال کر اُن روشنیوں میں لے آتے ہیں جہاں ہم اپنی تاریک فطرتوں کا خیال کر کے کانپ جاتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حقیقتاً انیس نے سحر سے کام لیا ہے ؎

جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج کمر یں دغا پہ باندھے ہے مشکلکشا کی فوج
صف بستہ آگے پیچھے ہے سب پیشوا کی فوج جنت کا رُخ کیے ہے شہِ کربلا کی فوج
ڈیوڑھی پہ جن و انس و ملک کا ہجوم ہے
خیمے سے اب علم کے نکلنے کی دھوم ہے

حاضر ہیں صبح سے در دولت پہ جاں نثار اک سو ٹہل رہے ہیں رفیقان ذی وقار

پیدل کمر کسے ہیں سامنے باندھے ہوئے قطار بیٹھے ہیں زین پوش بچھائے ہوئے سوار
شوق زیارت علم فوج شاہ ہے
اک اک کی جانب در دولت نگاہ ہے
رُخ ہے کسی کا جوش شجاعت سے لالہ رنگ کوئی سنوارتا ہے بدن پر سلاح جنگ
جھک جھک کے چُست کرتا ہے کوئی فرس کا تنگ چلّہ سے جوڑتا ہے کوئی فاقہ کش خدنگ
بھالا سنبھالتا ہے کوئی جھوم جھوم کے
تکتا ہے کوئی تیغ کے قبضے کو چوم کے

یہ بہتر بیکسوں کی کتنی پُر وقار تصویر ہے۔

انیس کا قلم یہیں نہیں رک جاتا ہے۔ وہ اور آگے بڑھتا ہے۔ وہ مقامات جہاں انیس نے شہدائے کربلا کے رجز لکھے ہیں ایسے ہیں کہ دل پھڑک اُٹھتے ہیں۔ وہ غیرت۔ محبت اور خودداری کے ایسے ابواب ہیں جن سے قومیں بن سکتی ہیں۔ اس مقام پر میں صرف امام حسین کا رجز پیش کرتا ہوں مگر یہ خیال رہے کہ یہ کسی معمولی سپاہی کا رجز نہیں ہے یہ امام کا رجز ہے۔ اسے صرف اتمام محبت کرنا ہے ؎

میں ہوں سردار شباب چمن خلد بریں میں ہوں انگشتر پیغمبر خاتم کا نگیں
میں ہوں خالق کی قسم دوش محمدؐ کا مکیں مجھ سے روشن ہے فلک مجھ سے منور ہے زمیں
ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے
محفل عالم امکاں میں اندھیرا ہو جائے
یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ یہ کس کی دستار یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جو میں سینہ فگار
ہر میں کس کا ہے یہ چار آئینۂ جوہر دار کس کا رہوار ہے یہ آج میں جس پر ہوں سوار
کس کا یہ خود ہے یہ تیغ دو سر کس کی ہے
کس جری کی یہ کماں ہے یہ سپر کس کی ہے

چونکہ انیس ایک مکمل آرٹسٹ ہے اس لیے اسے رجز میں زور اور شجاعت کا بھی اظہار کرنا ہے۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر امام کے رجز کو اس طرح لکھا ہے ؎

بخشا ہے مجھ کو حق نے شہ لافتا کا زور اس دست مرتعش میں ہے دست خدا کا زور
ہے انگلیوں کے بند میں خیبر کشا کا زور پانی ہے میرے زور کے آگے ہوا کا زور
اُلٹوں فلک کو یوں جو ہو قصد انقلاب کا

جس طرح ٹوٹ جاتا ہے ساغر حباب کا

آگے بڑھوں جو تیر کو چلّے میں جوڑ کے
بھاگیں خطا شعار کمانوں کو چھوڑ کے
بیکار کر دوں شیر کا پنجہ مروڑ کے
پٹکوں زمین پر در خیبر کو توڑ کے
اُلٹوں طبق زمین کے یوں جھٹک کے زین سے
جس طرح جھاڑ دیتے ہیں گرد آستین سے

دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کر دوں
آئے غضب خدا کا اُدھر رُخ جدھر کروں
بے جبرئیل کار قضا و قدر کروں
اُنگلی کے اک اشارے میں شق القمر کروں
طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی
رکھ دوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

انیس نے اس رجز میں بھی باوجود اظہار قوت و شجاعت کے شان امامت کو باقی رکھا ہے۔

رجز کے بعد جنگ کی باری ہے۔ جب انیس ہمارے سامنے جنگ کا نقشہ کھینچتا ہے تو تخیل کی بلندی اور بیان کی نزاکت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ باوجود اسکے کہ ہم جانتے ہیں کہ جنگ کا انجام کیا ہونے والا ہے پھر بھی ہم تھوڑی دیر کے لیے اسے بھول کر جوش نشاط میں ڈوب جاتے ہیں۔ ہم مجاہدان کربلا کی بیکسی اور بیچارگی نہیں ہمت اور شجاعت کو یاد کرنے لگتے ہیں۔

"فردوسی کا یہ سب سے بڑا کمال خیال کیا جاتا ہے کہ وہ لڑائی کے تمام جزئیات۔ داؤں پیچ اور فنون جنگ کا نقشہ کھینچتا ہے لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ سرسری اور معمولی باتوں کے سوا لڑائی کے ہر قسم کے تمام کرتب نہیں دکھاتا۔ لیکن میر انیس نے لڑائی کے ہر قسم کے کرتب اور ہنر اس تفصیل سے بیان کیے کہ عربی و فارسی میں اسکی نظیر نہیں مل سکتی" (شبلی)

جناب قاسم کی جنگ کی تصویر ملاحظہ ہو ۔

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی تکاں
چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
اک بندھ باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں
ڈانڈ آئی ڈانڈ پر تو سناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

جُھنجھلا کے جب نیزہ کو لایا وہ فرق پر
قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پہ مارا بچا کے سر
دو اُنگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر
جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر

نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

ایک دوسری جگہ جناب علی اکبر کی جنگ کو یوں بیان کیا ہے ؎

نیزے ہلے وہ چل گئیں چوٹیں کہ الاماں ہر طعن قہر کی تھی قیامت کی ہر تکان
چنگاریاں اڑیں جوسناں سے لڑی سناں دو اژدہے گتھے تھے نکالے ہوئے زباں

پہلے شرر پرندوں کی جانیں ہوا ہوئیں
شمعوں کی تھیں لویں کہ ملیں اور جدا ہوئیں

جہاں انیس نے تلوار کی تعریف کی ہے وہاں بھی حقیقتاً جنگ کی تصویر کھینچی ہے جو تلوار کی تعریف کے پردے میں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔

بعض مقام پر تلوار۔ گھوڑے اور لڑائی کے بیان میں انیس نے ایسے دلکش الفاظ استعمال کیے ہیں جنکی شگفتگی اور تازگی سے دل کو مسرت اور سرور حاصل ہوتا ہے۔ اکثر حضرات کا خیال یہ ہے کہ یہ چیز معیار فصاحت سے گری ہوئی ہے۔ لیکن حقیقتاً یہ انیس کا کمال ہے۔ رزم میں غزل کے الفاظ اس طرح استعمال کرنا کہ اس کا اثر زائل نہ ہو صرف انیس کا حصہ ہے۔

انیس کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد میں آخر میں اتنا اور کہوں گا کہ انیس کے مراثی جن کی بنیادیں غم پر رکھی گئیں اور آرائش مسرت اور بہجت سے کی گئی ایسے ہیں جنھیں پڑھ کر قومیں ترقی کی راہوں میں گامزن ہو سکتی ہیں۔

اس زمانے میں جبکہ ہندوستان آزادی کے خونیں آستانے پر اپنی پیشانی نیاز جھکا دینے پر آمادہ ہے انہیں کے مرثیوں سے ہماری مائیں عبرت حاصل کر سکتی ہیں۔ ہمارے بچے شجاعت کے سبق لے سکتے ہیں۔ ہمارے نوجوان ایثار کرنا سیکھ سکتے ہیں اور ہمارے بزرگ جو جذبات اور عواطف کے حدود سے آگے نکل گئے ہیں اپنی سرد رگوں میں گرم خون دوڑا سکتے ہیں۔

اس لیے انیس کے مرثیے صرف مذہبی حیثیت ہی نہیں رکھتے بلکہ وہ ادب اور اخلاق کے جواہر پارے ہیں ہماری شاعری کا شاہکار ہیں اور آئندہ نسلوں کے لیے ایک سرمایۂ حیات !!

چونکہ کارلائل کے الفاظ میں واقعہ کربلا کسی ایک قوم کسی ایک ملک کی ملکیت نہیں بلکہ انسانیت کی مشفقہ میراث ہے اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ انیس کا کلام بھی انسانیت کی میراث ہے تو کچھ تعجب نہیں۔

سرُودِ زندگی

(جناب منشی سید اظہر علی صاحب آزاد ایم، آر، اے، ایس)

بسلسلہ ماہ جولائی ۱۹۳۶ء

صفحہ ۴۱۔ مےُ بے رنگ کا سو رنگ میں رسوا ہونا　　کبھی میکش۔ کبھی ساقی۔ کبھی مینا ہونا

مصنف صاحب نے "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ" کا اعادہ فرمانا چاہا ہے "مےُ بے رنگ" فارسی ترکیب ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اساتذہ عجم کے یہاں "بے رنگ" کیا معنی رکھتا ہے۔ وحید قزوینی فرماتے ہیں۔

بے تو مجلس بود ہمچوں گلشنِ بے آب و رنگ　　رنگ و آب بردۂ کار ما آوردہ

لہذا بے رنگ کے معنی ہوئے۔ بے کیف۔ بے لطف۔ بے رونق۔

فقیر کے نزدیک اگر بجائے بے رنگ کے یکرنگ فرمایا ہوتا تو شاید اُن کا مفہوم اچھی طرح ادا ہو سکتا تھا یعنی یکرنگ تجلی ذات اور صد رنگ تجلی صفات۔

صفحہ ۴۲۔ ایک ایسی بھی تجلی آج میخانے میں ہے　　لطف پینے میں نہیں ہے بلکہ کھو جانے میں ہے

بظاہر مصرعۂ اولیٰ کا مصرعۂ ثانی سے کوئی ربط نظر نہیں آتا "تجلی" بالکل ہوا میں معلق نظر آرہی ہے۔ "تجلی" کا کام دیدہ و دل منور کر دینا ہو تو ممکن ہے۔ کھو دینا تجلی کا کام نہیں "ایک ایسی بھی" مبتدا ہے۔ جسکی خبر غائب ہے۔ یہ نہیں ارشاد ہوا کہ کیسی تجلی۔ مصرعۂ ثانی اگر نثر کی عبارت میں داخل ہوتا تو مضائقہ نہ تھا۔ فقیر کے نزدیک شعر کی تبدیل شدہ صورت اگر یہ ہوتی تو شاید کچھ بہتر ہوتی۔

خود فراموشی یہ کیسی آج میخانے میں ہے　　کس کا پینا۔ کیا پلانا۔ لطف کھو جانے میں ہے

صفحہ ۴۴۔ معنیِ آدم کجا و صورتِ آدم کجا　　یہ نہاں خانے میں تھا۔ ابتک نہاں خانے میں ہے

سمجھ میں نہ آیا کہ "یہ" چہ معنی دارد؟ چونکہ فعل "تھا" بصیغہ واحد آیا ہے اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ شاعر کا مقصود "آدم" تھا۔ حالانکہ مصرعۂ اولیٰ صاف الفاظ میں صرف دو باتیں دریافت طلب قرار دے رہا ہے (۱) معنیِ آدم (۲) صورتِ آدم یعنی "آدم" سے کوئی بحث نہیں رکھتا۔ اگر "تھا" سے مراد "معنیِ آدم" ہوتے تو فعل "تھا" نہ ہوتا بلکہ "تھے" ہوتا۔ اور "صورتِ آدم" مقصود ہوتا تو فعل "تھی" ہوتا۔ ہو نہو شاعر صاحب نے معنی اور صورت دونوں کو علیحدہ چھوڑ کر محض لفظ "آدم" لے لیا ہے۔ مگر یہاں مشکل یہ پیش آتی ہے "آدم" ازل سے لے کر آج تک نہ کبھی نہاں خانے میں تھا اور نہ آج سے ابد تک کبھی نہاں خانے میں بند کر کے رکھا

جا سکتا ہے۔ علیٰ ہذا نہ معنی آدم نہاں خانے میں ہے اور نہ صورتِ آدم۔ صورتِ آدم معنی صورتِ آدم زاد سے بچہ بچہ واقف ہے۔ معنی آدم کا جہاں تک لغوی معانی سے سروکار ہے لغات میں وضاحت کے ساتھ موجود ہیں۔ انسانیت۔ شرافت۔ تحمل۔ جرأت۔ ایثار۔ انکسار وغیرہ وغیرہ جو کچھ ہے وہ بھی نہاں خانے میں نہیں ہے۔ پھر آخر وہ کونسی شے ہو سکتی ہے جو نہاں خانے میں تھی اور ہمیشہ رہے گی۔ خود شاعر صاحب ہی ارشاد فرمائیں تو شاید کچھ سمجھ میں آئے، تو آئے۔

صفحہ ۴۴۔ خرمن بلبل تو پھونکا عشق آتش رنگ نے رنگ کو شعلہ بنا کر کون پروانے میں ہے

پروانہ کوئی رنگ دار کیڑا نہیں ہے۔ خاکی رنگ اگرچہ رنگ ہے۔ نثر میں فرمائیے تو مان لینے کی بات ہے۔ لیکن شعر جس شے کو رنگ کہہ سکتا ہے وہ رنگ شاید پروانے میں نہیں ہے۔ "عشق آتش رنگ" محتاج سند ہے۔ اگر فارسی شعر ہوتا تو شاید "رنگ" بے معنی نہ ٹھہرتا۔ دونوں مصرعوں میں بظاہر ربط نظر نہیں آتا۔

صفحہ ۴۴۔ رند خالی ہاتھ بیٹھے ہیں اُڑا کر جزو کُل اب نہ کچھ شیشے میں باقی ہے نہ پیمانے میں ہے

جزو کل اُڑا بیٹھنا نہ کوئی محاورہ ہے نہ جہاں تک فقیر کو علم ہے آج تک کسی شاعر نے نظم فرمایا ہے غالباً طبع زاد ہے۔ پسند ہو تو یوں ترمیم فرما لیجئے۔ "رند خالی ہاتھ بیٹھے ہیں اُلٹ کر جام مے"۔

صفحہ ۴۴۔ میرے ساقی نے عنایت کی مے بے دُرد و صاف رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے میں ہے

شعر رندانہ نہیں بلکہ صوفیانہ رنگ میں فرمایا گیا ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ وہی معیار پیش نظر رکھا جائے ساقی سے مراد ہوتی ہے مرشد۔ یا رسول کریم۔ یا ساقی کوثر جناب حضرت علی یا کبھی کبھی خود اللہ پاک۔ شراب کے معنی ہوتے ہیں اللہ و رسول کی محبت۔ ایمان۔ عشق حقیقی۔ درد۔ کیف۔ سرور جو اُسی مے سے پیدا ہو۔ پیمانہ۔ شیشہ۔ ساغر۔ پیالہ۔ جام سے مطلب ہوتا ہے دل۔ اب اس روشنی میں شاعر صاحب کا شعر ملاحظہ فرمائیے مصرعۂ اولیٰ۔ اللہ پاک نے آپ کو عشق یا ایمان کی دولت عطا فرمائی جو ہر طرح صاف اور بے آلائش تھی۔ مصرعۂ ثانی۔ کہتا ہے کہ رنگ (جس سے آپ کا مطلب آلائش ہے اور تقصیر معاف غلط نظر آتا ہے) جو کچھ نظر آرہا ہے وہ اس وجہ سے کہ دل کے پیمانے میں صفائی نہ تھی۔ لہٰذا وہ شراب رنگ دار یعنی گدلی اور میلی ہوگئی۔ اوپر آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ رنگ کا لفظ غالباً اس معانی پر حاوی نہیں ہے۔ بہرحال گھوم پھر کر شعر یہ معنی ظاہر کر رہا ہے کہ دل میں کافی صفائی نہ تھی اس وجہ سے ایمان کی شراب دل میں پہونچ کر مکدر ہو گئی۔ قارئین کرام کے نزدیک ایسا شعر غالباً مرغوب اور دل پسند نہ ہو۔ ترمیم پیش کروں گا اگر پسند ہو۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مجھے گلرنگ مے رنگ کی موجوں کا طوفاں میرے پیمانے میں ہے

صفحہ ۴۵۔ دیکھنے والے نشہ فروغ رخ زیبا دیکھیں پردۂ حسن پہ خود حسن کا پردہ دیکھیں

حسن پر حسن کا پردہ فقیر کی فہم ناقص میں المعنی فی بطن الشاعر ہے۔ جب حسن خود پردہ (پردۂ حسن) بنایا جا چکا ہے تو پھر "خود حسن کا پردہ" چہ معنی دارد؟ اور فروغ رُخ زیبا کیونکر دیکھیں۔ القصہ شعر پہیلی یا چیستان بنکر رہ گیا۔ عقل پر عقل کا پردہ۔ ذہن پر ذہن کا پردہ۔ کیا معنی پیدا کر سکتا ہے!

صفحہ ۴۴۔ اشک پیہم کو سمجھ لیتے ہیں ارباب نظر　　حسن تیرا مرے چہرے سے جھلکتا دیکھیں

مصرعۂ اولیٰ کا مطلب سمجھ لینا فقیر کے سے موٹی سمجھ کے آدمی کے لیے سخت دشوار ہے۔ اسی کے ساتھ یہ سمجھنا بھی اتنا ہی دشوار ہے کہ پہلے مصرعہ کا دوسرے مصرعہ سے کیا تعلق ہے؟ اگر فقیر اپنے الفاظ میں ادا کرتا یوں کہتا ؎

لے اُڑا رنگ مرا عکس جمال عارض　　حسن تیرا مرے چہرے سے جھلکتا دیکھیں

صفحہ ۴۵۔ حسن ساقی کا تو مستوں کو ذرا ہوش نہیں　　کچھ جھلک اس کی سر پردۂ مینا دیکھیں

مصرعۂ اولیٰ میں "ذرا ہوش نہیں" کے الفاظ بلا شک و شبہ مستوں کی بیہوشی پر مہر صداقت ثبت کر رہے ہیں۔ اُن کا بیہوش ہونا تو مسلم ہو چکا ہے۔ پھر مصرعۂ ثانی میں جھلک کون دیکھ رہا ہے اور کیونکر۔ بیہوش کے لیے جس طرح حسن دیکھنا ناممکن ہے۔ بعینہٖ اُسی طرح حسن کی جھلک دیکھ لینا بھی قطعی ناممکن ہے۔ وہ کوئی چیز دیکھ ہی کب سکتا ہے۔ وہ تو بیہوش ہے! اگر پسند آئے تو شعر اس صورت میں تبدیل فرمایئے۔

تھا کسے ہوش کہ دے داد ادائے ساقی　　عکس اس حسن کا جام و سبو و مینا دیکھیں

صفحہ ۴۶۔ مرے نغموں سے صہبائے کہن بھی ہوگئی پانی　　تعجب کر رہے ہیں رنگ محفل دیکھنے والے

آپ کا کلام صوفیانہ انداز اختیار کر چکا ہے۔ اسی معیار سے ملاحظہ فرمائیے۔ اس رنگ میں "صہبائے کہن" کے معنی اسلام ہیں۔ مصرعۂ ثانی خالص نثر کا فقرہ ہے اور فقیر کے نزدیک بے رنگ ہے۔ وہ نغمے جو مے اسلام کو پانی بنا دیں۔ ایسے نغموں کی داد دینا ناممکن ہے۔ بہرحال ترمیم مجوزہ حاضر ہے۔ ملاحظہ ہو۔

مرے نغمے ہیں صہبائے کہن کی آتش افشانی　　ہوئے آتش بداماں رنگ محفل دیکھنے والے

صفحہ ۵۰۔ راز کہیے یہ کسی اہل وفا کے سامنے　　آشنا گم ہو گیا اک آشنا کے سامنے

طرز ادا قابل غور ہے۔ اہل وفا کا اطلاق شخص واحد پر نہیں دیکھا گیا ہے۔ فقیر کی رائے ناقص میں مصرعہ قابل ترمیم ہے۔ مثلاً　بات کہنے کی نہیں ما و شما کے سامنے۔

صفحہ ۵۱۔ حشر ہے زاہد۔ یہاں ہر چیز کا ہے فیصلہ　　لا کوئی حسن عمل میری خطا کے سامنے

حشر کا دن ہے۔ اپنے اپنے اعمال ہیں۔ نفسی نفسی کا عالم ہے۔ وہاں آپ کو زاہد سے مکالمہ کا کونسا موقع پیش آ سکتا ہے؟ اُسے کیا پڑی ہے کہ آپ کا نامۂ اعمال سرتاپا پڑھے۔ اور آپ اُس سے کون سی۔

کب کی اور کہاں کی ایسی تخصیص ہے کہ آپ کی خطائیں مستر د کرانے کے لیئے کوئی "حسن عمل" کہیں سے تلاش کرکے لائے فقیر کے نزدیک یہ شعر دیوان سے خارج کر دینے کے قابل ہے۔ "ہر چیز کا ہے فیصلہ" بالخصوص سمع خراش اور لایعنی سا نظر آتا ہے۔

صفحہ ۵۱۔ رشک صدا یاں ہے اصغر میرا طرز کافری — میں خدا کے سامنے ہوں، تب خدا کے سامنے

"میرا طرز کافری" کو اگر پسند آئے۔ "میری رسم کافری" سے بدل دیجئے۔

صفحہ ۵۲۔ نمود جلوۂ بے رنگ سے ہوش اس قدر گم ہیں — کہ پہچانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

"بے رنگ" کے معنی بے رونق ہیں جو ذات باری تعالیٰ کی شان مبارک میں کوئی شخص استعمال نہیں کر سکتا اگر جلوۂ صد رنگ کہا جائے تو تجلیات اسماء صفات کے معنی پیدا ہو سکتے ہیں۔

صفحہ ۵۳۔ چمن میں چھیڑتی ہے کس مزے سے غنچہ و گل کو — مگر موج قبا کی پاک دامانی نہیں جاتی

فقیر کی ترمیم اگر پسند آئے حاضر ہے ؎

صبا کی چھیڑ سے گو لالہ و گل چاک داماں ہیں — شمیم گل کی لیکن پاکدامانی نہیں جاتی

صفحہ ۵۳۔ اُڑا دیتا ہوں اب بھی تار تارِ ہست و بود اصغر — لباس زہد و تمکیں پر بھی عریانی نہیں جاتی

بظاہر دونوں مصرعے بے ربط نظر آتے ہیں۔ شاید فقیر ہی کی فہم کا قصور ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ "اب بھی" مبتدا کی خبر کہاں ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہی معنی کے دو الفاظ یکجا کر دینا آج کل اُردو اور فارسی اور انگریزی میں داخل عیب سمجھا جاتا ہے۔ "ہست و بود" دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ پھر زہد و تمکین کے اظہار کا کونسا موقع شعر میں موجود تھا؟ ان باتوں کے بعد یہ امر قابل گذارش ہے کہ پہلے مصرعہ نے ہستی موہوم کا تار تار علیحدہ کرکے اُسے بالکل ہی فنا کر دیا تھا۔ مصرعۂ ثانی اب کسے لباس زہد و تمکیں پہنا رہا ہے؟ فقیر کے نزدیک یہ شعر بالکل بدل دیے جانے کے قابل ہے۔

صفحہ ۵۵۔ جلوہ ترا اب تک ہے نہاں چشم بشر سے — ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

پہلا مصرعہ صاف صاف کہہ رہا ہے کہ تیرا جلوہ چشم بشر سے نہاں ہے۔ دوسرا مصرعہ بجائے اس دعوے کی دلیل پیش کرنے کے اُلٹے اُس دعوے کی تکذیب کر رہا ہے۔ اور کہہ رہا ہے کہ نہیں ہر ایک بشر نے تجھے اپنی نظر سے دیکھا ہے۔ یہاں کوئی مجھ سا کم عقل پوچھ سکتا ہے کہ اپنی نظر سے نہیں تو کیا کسی اور کی نظر مانگ لاتا۔ "اپنی نظر" کے الفاظ فقیر کے نزدیک شاعر کا مفہوم ادا کرنے پر حاوی نظر نہیں آتے۔ "اب تک" فقیر کی رائے ناقص میں حشو ہے۔ اگر اب تک نہاں تھا تو کیا اس وقت کے بعد سے نہاں نہ رہیگا؟

صفحہ ۵۶۔ مے دافع آلام ہے۔ تریاق ہے۔ لیکن — کچھ اور ہی ہو جاتی ہے ساقی کی نظر سے

شاعر نے مے کے دو اوصاف یعنی دافعِ آلام اور تریاق ہونا تسلیم کر لینے کے بعد بتایا ہے کہ ساقی کی نظر پڑ جانے پر یہ کوئی اور ہی شے بن جاتی ہے۔ یہ طرزِ ادا فقیر کے نزدیک زیادہ موثر نہیں۔ ترمیم مجوزہ حاضر ہے۔ اگر پسند ہو سہ

مے فتنۂ خوابیدہ ہے۔ آتش ہے و لیکن — کچھ اور ہی بن جاتی ہے ساقی کی نظر سے

صفحہ ۵۶۔ جہاں کی خیر ہو۔ جانِ حزیں کی خیر ہو یا رب — کہ لَو اونچی ہوئی جاتی ہے اب سوزِ محبت کی

مصرعۂ ثانی میں سوز کی لَو دکھائی گئی ہے۔ سوز کے معنی جلن کے ہیں۔ جلنے کا فعل بغیر لَو کی کارفرمائی کے بھی ظہور میں آنا ممکن ہے۔ سوز کے لیے لَو کا وجود لازمی نہیں ہے۔ فقیر کے نزدیک بجائے "سوز" کے اگر شمع ہوتا تو بہتر ہوتا۔ کہ لَو اونچی ہوئی جاتی ہے اب شمعِ محبت کی۔

صفحہ ۶۰۔ یہ سب ناآشنائے لذت پرواز ہیں شاید — اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیاد ہوتا ہے

صیاد قفس میں بند کر کے رکھتا ہے۔ قفس ایسا نہیں ہوتا کہ اسیرانِ قفس اُسے توڑ کر اُڑ جائیں۔ صیاد اتنا احمق نہیں ہو سکتا۔ اسیرانِ قفس کے پر پروازِ بندِ قفس سے بیکار کر رکھے ہیں۔ ناآشنائے پرواز اگر ہوتے تو صیاد کے دام میں کیونکر پھنسے ہوتے۔ آخر اُڑ کر آئے تھے یا ہوائی جہاز کے ذریعے لا کر دامِ صیاد میں پھنسا دیے گئے تھے؟ القصہ "ناآشنائے لذت پرواز" کا ٹکڑا آسانی سے سمجھ میں آجانا بظاہر دشوار ہے۔ فقیر کی ترمیم محض ایک لفظ کی ہے۔ یعنی بیداد بجائے "پرواز"۔ یہ سب ناآشنائے لذت بیداد ہیں شاید۔

صفحہ ۶۳۔ ہوا کو موجِ شراب کر دے۔ فضا کو مست خراب کر دے — یہ زندگی کو شباب کر دے۔ نظر تمہاری نظر نہیں ہے

مست و خراب کے ایک ہی معنی ہیں۔ فضا کو رندِ خراب کر دے۔

صفحہ ۶۶۔ دونوں عالم تیری نیرنگ ادائی کے نثار — اب کوئی چیز یہاں جیبِ محبت میں نہیں

نثر ملاحظہ ہو۔ تیری نیرنگ ادائی کے دونوں عالم نثار (ہیں) اب کوئی چیز یہاں جیبِ محبت میں (باقی) نہیں (رہی) آپ دونوں عالم نیرنگ ادائی پر نثار کر چکے ہیں۔ آپ اور آپ کی جیبِ محبت دونوں عالم سے باہر نہیں لہٰذا دوسرا مصرعہ خدانخواستہ مہمل ہوا جاتا ہے۔ لفظ نیرنگ کے معنی بہارِ عجم میں مکر و حیلہ و سحر و افسوں درج ہیں۔ اساتذہ عجم کے اسناد جہاں تک فقیر کی نظر سے گذرے ہیں۔ نیرنگ انداختن۔ داشتن۔ ریختن۔ ساختن گسستن کے جواز میں ہیں۔ فقیر کے نزدیک نیرنگ ادائی کی ترکیب غلط ہے۔ اگر شاعر صاحب اسے جائز خیال فرماتے ہیں تو سند پیش فرمائیں۔ ادا کے متحد المعانی الفاظ ناز۔ غمزہ۔ عشوہ۔ کرشمہ ہیں۔ کیا آپ نیرنگ نازی۔ نیرنگ غمزی۔ نیرنگ عشوی۔ نیرنگ کرشمی کی ترکیبیں بھی اختراع فرمائیں گے؟ نیرنگی ادا شے دیگر ہے۔ نیرنگ ادائی عجیب و غریب اختراع ہے۔ کیا فقیر کا یہ شبہ غلط ہے؟

صفحہ ۶۵۔ نجد کی سمت سے یہ شور اُٹھا لیلیٰ کیوں شوخیِ حُسن اگر پردۂ وحشت میں نہیں

لیلیٰ نجد کی رہنے والی تھی۔ نجد سے شور اٹھا لیلیٰ اُٹھنا ممکن ہے۔ اگرچہ "یہ" اور "کیوں" طرزِ ادا کی غرابت کے شاہد ہیں۔ لیکن نہ حُسن کا پردۂ وحشت سمجھ میں آنے والی بات ہے نہ پُورے مصرعۂ ثانی کا مطلب۔ حسن اور شوخی کا اگرچہ چولی دامن کا ساتھ ہے مگر وحشت کو حُسن سے کیا علاقہ ہے۔ یہ تو عاشق کی صفت ہے؛ شعر کی نثر یہ ہوئی۔ نجد کی سمت سے یہ شور اٹھا لیلیٰ کیوں (اُٹھ رہا ہے) اگر شوخیِ حسن پردۂ وحشت میں نہیں (رہے) زیادہ وقت خراب کرنے سے بہتر یہی نظر آتا ہے کہ اس شعر کی مہملیت تسلیم کر لی جائے۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو حضرت مصنف شعر کا مطلب ارشاد فرمائیں۔

صفحہ ۶۶۔ اُٹھ رہی ہے مٹ رہی ہے موجِ دریائے وجود اور کچھ ذوقِ طلب میں ہے نہ کچھ منزل میں ہے

مصرعۂ اولیٰ بتا رہا ہے کہ وجودِ فانی کی موجیں اُٹھ اُٹھ کر دریا میں فنا ہو رہی ہیں۔ یہاں تک تو بالکل صحیح ہے لیکن مصرعۂ ثانی قیامت ڈھا رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذوقِ طلب عبث ہے کیونکہ منزل پر پہونچ کر بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہاں پہونچنا ہی لاحاصل ہے۔ ہستیِ فانی کے لیے ذوقِ طلب حصولِ وصالِ شاہدِ حقیقی ہے یعنی اس بود نابود کو اُس ذاتِ واحد میں فنا کر دینا۔ ذوقِ طلبِ صادق کے آثار کیا ہیں؟۔ اُسے دنیاوی آلائشات مثلاً حرص۔ نفرت۔ کینہ۔ غصہ۔ گناہ سے پاک و صاف رکھنا کہ اُس بے عیب ذاتِ پاک میں جذب ہو جانے کی صلاحیت رکھ سکے یہ تو ہوا "ذوقِ طلب" اور "منزل" کیا ٹھہری؟ منزل ہے وہی ذاتِ پاک جس میں فنا ہو جانا مقصود ہے۔ اس کے بعد سوال یہ ہے کہ آخر شاعر صاحب کیا تعلیم دینا چاہتے ہیں؟ شعر کا مطلب خود ہی ارشاد فرمائیں تو بہتر ہو۔

صفحہ ۷۰۔ کوئی ایسا نہیں یا رب کہ جو اس درد کو سمجھے نہیں معلوم کیوں خاموش ہے دیوانہ برسوں سے

مصرعۂ ثانی رواں ہے اور بہت اچھا ہے۔ مصرعۂ اولیٰ نثر ہے جو نظم کی رعنائی۔ شگفتگی اور دلکشی سے بالکل خالی ہے۔ "کہ جو اس درد کو سمجھے" بالخصوص سمع خراش ہے اور ایک ہی جھٹکے میں شاعری کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔

صفحہ ۷۰۔ ترے قربان ساقی اب وہ موجِ زندگی کیسی نہیں دیکھی ادائے لغزشِ مستانہ برسوں سے

"موجِ زندگی کیسی" بھی علیٰ ہذا عجیب و غریب طرزِ ادا ہے۔ اسے بھی براہِ کرم بدل دیجئے۔

صفحہ ۷۰۔ لباسِ زہد ہو پھر کاش نذرِ آتشِ صہبا کہاں کھوئی ہوئی ہے جرأتِ رندانہ برسوں سے

"کاش" کا لفظ "ہوتا" مانگ رہا ہے۔ لباسِ زہد ہوتا کاش نذرِ آتشِ صہبا۔ "پھر" کا لفظ بتا رہا ہے کہ لباسِ زہد اس سے پہلے کئی مرتبہ اور "نذرِ آتشِ صہبا" ہو چکا ہے۔ کیا آپ لباسِ زہد اسی نیت کے

ساتھ اختیار فرمانے کے عادی ہیں کہ اُسے "نذر آتش صہبا" کر دیا کریں؟ قرینہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔ پھر لباس زہد کی کیا وقعت باقی رہ گئی۔ اور شعر نے کیا لطف پیدا کیا؟

صفحہ ۱۔ دکھا جلوہ۔ وہی غارت کن جان حزیں جلوہ　　ترے جلوہ کے آگے جان کو ہم کیا سمجھتے ہیں

شعر میں تین بار جلوہ کا لفظ وارد ہوا ہے۔ جو غالباً فصاحت میں داخل نہیں ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ غارت کردن محاورۂ عجم ہے۔ لسان الغیب حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

بیا کہ ترک فلک خوان روزہ غارت کرد　　ہلال عید بدور قدح اشارت کرد

لیکن غارت کن دین و ایمان یا ہوش و خرد وغیرہ اسی ترکیب کے ساتھ فقیر کے نزدیک خلاف محاورہ عجم ہے اہل زبان ایسے موقع پر غارتگر استعمال فرماتے ہیں۔

صفحہ ۱۔ نظر بھی آشنا ہو نشۂ بے نقش و صورت سے　　ہم اہل راز سب رنگینیٔ مینا سمجھتے ہیں

سب سے پہلے یہ امر قابل استفسار ہے کہ "نشۂ بے نقش و صورت" کے کیا معنی ہیں؟ نشہ ایک کیف کا نام ہے ایک خاص حالت ہے جو نشی اشیاء کے استعمال سے عموماً پیدا ہو جاتی ہے اور جس کا حد معینہ سے متجاوز ہو جانا جنون کی حالت سے مشابہ کہا جا سکتا ہے۔ اس بیخودی۔ اس مستی و سرشاری کا کسی خاص صورت میں شکل ہو جانا ایک ایسی بات ہے جو بالکل خلاف فطرت۔ خلاف قیاس اور غیر ممکن ہے۔ ہر نشہ خواہ وہ شراب۔ افیون۔ دھتورا یا کسی اور شے کے استعمال سے پیدا کیا گیا ہو یا قلبی وجدانیہ کیف و سرور ہو جسے شاعر نے نشہ کے نام سے موسوم کر دیا ہو۔ ہر حال میں نشہ تو ہمیشہ سے بے نقش و صورت تھا اور ہمیشہ رہیگا۔ پھر آخر یہ کونسا نشہ بے نقش و صورت ہے جس کی شاعر کو تمنا ہے! کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ دوسرا مصرعہ اور بھی قیامت برپا کر رہا ہے! شاعر صاحب ابتدا ہی سے عارفانہ رنگ اختیار فرما چکے ہیں۔ اُسی انداز پر قیاس کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "نشہ بے نقش و صورت" سے نشۂ عشق ذات پاک باری تعالیٰ کا اظہار مقصود ہے جس کی واقعی کوئی شکل و صورت نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کے الفاظ اس معانی کے ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ ایسے موقع پر مینا یا صراحی مرشد کے معنی دیگی۔ پیمانہ اگر لایا گیا ہوتا تو مرید کا دل ہوتا جسے صراحی بادۂ توحید سے لبریز کر دیتی ہے۔ "اہل راز" کے معنی عارف باللہ ہوتے۔ مگر آپ تو یہ ارشاد فرما رہے ہیں کہ مینا سے جو رنگ ظاہر ہو رہا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ شراب بذاتہ بے رنگ ہے۔ رنگین محض اس وجہ سے نظر آتی ہے کہ رنگین مینا میں بھری ہوئی ہے۔ اور مینا کی رنگینی شراب کی رنگینی کا دھوکا دے رہی ہے۔ شراب تھی اللہ و رسول کے عشق و محبت کی شراب آپ اُسی کو بے رنگ یعنی بے کیف اور ناقص ٹھہرا رہے ہیں اور مرشد صاحب کو مکار قرار دے رہے ہیں۔ پھر آپ ہی "اہل راز" یعنے اہل دل۔ صاحب باطن اور اہل اللہ نہ ہونگے

تو اور کون ہو سکتا ہے!

اگر کہا جائے کہ مصرعۂ ثانی استفہامیہ نہیں ہے بلکہ حقیقت حال اور نفس امر بیان کر رہا ہے یعنی مینا سے جو رنگ نظر آرہا ہے ہم اُس رنگ کے ماہر ہیں۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ (۱) یا تو مینا کا رنگ اصلی رنگ ہے یا (۲) شراب کا رنگ مینا سے جھلک رہا ہے تو مصرعۂ اولیٰ کے کیا معنی ہونگے جو اس امر کی تمنا ظاہر کر رہا ہے کہ ہمیں ایسا نشہ عطا ہو جس میں نہ نقش ہو نہ صورت؟ اور مصرعۂ اولیٰ کا مصرعۂ ثانی سے کیا ربط قائم ہوگا؟

تقصیر معاف۔ فقیر کے نزدیک تو یہ شعر مہمل ہے۔ اگر یہ رائے غلط ہے تو شوق سے تردید فرمائی جائے۔

صفحہ ۶۔ جمال یار کی صورت بڑھا دی رنگ و صورت نے قیامت ہے قیامت میرا پابندِ نظر ہونا

نثر ملاحظہ ہو۔ جمال یار کی صورت رنگ و صورت نے بڑھا دی۔ میرا پابند نظر ہونا (ہی) قیامت ہے، صورت نے صورت بڑھا دی۔ عجیب بات ہے! قلم نے قلم بڑھا دیا۔ دوات نے دوات بڑھا دی۔ حقہ نے حقہ بڑھا دیا۔ چلم نے چلم بڑھا دی۔ نیچہ نے نیچہ بڑھا دیا۔ اس شعر کی سند پر لکھا اور کیا جا سکے گا۔ اب آپ بھی عارفانہ عینک سے شعر ملاحظہ فرمائیے۔

"جمال یار" کے معنی ہونگے اللہ پاک کا جمال۔ آپ فرماتے ہیں کہ اس جمال پاک کی زینت "رنگ و صورت" نے بڑھا دی۔ صورت تو وہاں سرے سے غائب ہے۔ رہا "رنگ"، اسکے معنی حضرت مصنف نے عجیب و غریب ظاہر فرمائے ہیں۔ نہیں معلوم یہاں "رنگ" کس معنی میں استعمال فرمایا گیا ہے۔ اللہ پاک کا جمال گھٹنے بڑھنے والی شے نہیں ہے۔

اگر کہا جائے کہ معمولی ایشیائی شاعری ہے۔ تصوف نہیں ہے۔ تو بھی المعنی فی بطن الشاعر ہے کسی معشوق کا جمال ہی کیا جمال ہو سکتا ہے جس میں نہ رنگت ہو نہ صورت۔ کیونکہ شعر کہہ رہا ہے کہ "رنگ اور صورت" نے جمال کی صورت بڑھا دی۔ جمال کا وجود رنگ و صورت سے پہلے بھی مسلم ہے۔ رنگ اور صورت نے جمال کی زینت بڑھا دی ہے نہ کہ پیدا کیا ہے۔ اور مہمل تو یوں ہے کہ "رنگ و صورت نے صورت بڑھا دی" ہے۔ یہ ایسی گتھی ہے جو سلجھائے سلجھنے والی نظر نہیں آتی۔ اس پر مصرعۂ ثانی سونے میں سہاگہ ہے۔ یہ بات سمجھنا آسان نہیں ہے کہ اگر آپ پابند نظر نہ ہوتے تو کیا قیامت برپا فرماتے! اگر آپ پابند نظر نہ ہوتے یعنے دیکھ نہ سکتے تو کیا حشر ہوتا؟ معاف فرمائیے۔ شاید نابینا ہوتے۔ مشکل تو یہی ہے کہ یہ شعر بھی مہمل نظر آرہا ہے!۔

صفحہ ۷۔ ابھی یہ طرز مستی مجھ سے سیکھیں میکدے والے نظر کو چند موجوں پر جما کر بے خبر ہونا

اس شعر کے ذریعہ سے جو دقیق مسئلہ حل فرمایا گیا ہے وہ بھی سمجھ سے باہر ہے۔ صرف اتنی بات سمجھ میں آتی ہے کہ آپ چند موجوں پر نظر جما کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں اور بس۔ مگر آخر اس سے دنیا

وآخرت کی کوئی بات نکلتی ہے جو سمجھ میں آسکے یا کارآمد ثابت ہو۔ ہاں ایک نتیجہ البتہ مترشح ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام کی مصطلحات میں "میکدہ" کے معنی اسلام کے ہیں۔ آپ اسلام کو درس دے رہے ہیں۔ اور وہ کیا؟ صرف یہی کہ چند موجوں پر نظر جما کر دنیا و عقبےٰ سب کچھ فراموش کر دیجیے! خدا کرے یہ شعر مہمل نہ ہو۔ مگر ایسی دعائیں قبول ہوتی بھی ہیں؟

صفحہ ۷۷۔ یہاں میں ہوں نہ ساقی ہے نہ ساغر ہے نہ صہبا ہے — یہ میخانہ ہے اس میں معصیت ہے باخبر ہونا

سب سے پہلا سوال تو یہی ہے کہ جب یہاں نہ ساقی ہے نہ ساغر ہے نہ صہبا ہے تو میخانہ کہاں سے آگیا اور کیونکر بن گیا! تصوف کی اصطلاحات میں لیجیے گا یا ایشیائی عشقیہ شاعری میں؟ عارفانہ کلام ہے۔ ساقی رسول کریم ہیں۔ صہبا اللہ و رسول کے عشق کی شراب یا شرابِ معرفت۔ ساغر بندۂ مومن کا دل۔ یہاں سرے سے سب کو ایک ہی سانس میں برطرفی کا حکم سنایا جا رہا ہے۔ اور کیوں؟ اس وجہ سے کہ آپ کا میخانہ وہ میخانہ ہے جس میں باخبر رہنا گناہ ہے۔ اللہ سے واسطہ نہ رسول سے سروکار! اللہ جانے یہ میخانہ ہے یا تقصیر معاف بھوت خانہ! جب یہ عالم ہے تو یہاں سے بھاگنا ہی بہتر ہے!

صفحہ ۷۹۔ وہ سامنے ہیں نظامِ حواس برہم ہے — نہ آرزو میں سکت ہے نہ عشق میں دم ہے

صفحہ ۷۸۔ کہاں زمان و مکاں۔ پھر کہاں یہ ارض و سما — جہاں تم آئے یہ ساری بساط برہم ہے

پہلے شعر میں "عشق" میں دم باقی نہیں چھوڑا گیا ہے۔ عاشق صادق کا عشق لافانی شے ہے۔ اُس کا قالب خاکی اُس کا وجود بیشک فانی ہے۔ لیکن عشق نہ فانی ہے نہ کم ہو جانے والی شے ہے۔ اگر زوال پذیر ہے تو عشق ہی نہیں ہے۔ اسی طرح عاشق کی آرزو بھی زوال پذیر شے نہیں ہے۔ جو اشعار ایسے خلاف فطرت اور دور از کار جذبات ظاہر کریں ان پر شعر کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔

دوسرے شعر میں نقیر کے نزدیک الفاظ "پھر" اور "یہ" مصرعۂ اولیٰ میں حشو ہیں۔ مصرعۂ ثانی میں "یہ" بھی ایسا ہی لفظ ہے۔

صفحہ ۸۰۔ بس اک سکوت سا طاری حرم نشینوں پر — صنم کدے میں تجلی ہے اور پیہم سے ہے

شعر کی نثر کیا ہوئی؟ حرم نشینوں پر بس اک سکوت طاری ہے۔ صنم کدے میں تجلی ہے اور پیہم تجلی ہے۔ معلوم ہوا کہ تجلی محض صنم کدے میں ہے۔ حرم میں نہیں ہے۔ حرم میں سکوت کا عالم ہے۔ دوسرے الفاظ میں صنم کدے میں سکوت کا عالم نہیں ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تجلی شور و غوغا مچاتی ہوئی آتی ہے؟ کیا تجلی کے ساتھ بجلی کی سی کڑک اور بادل کی سی گرج بھی لازمی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو جو سکوت کا عالم حرم میں ہے وہی صنم کدے میں بھی ہونا چاہیے۔ کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ جو تجلی صنم کدے میں ہے وہ

حرم میں معدوم ہے۔ مگر شعر یہ نہیں کہہ رہا ہے۔ یا یہ کہا جا سکتا تھا کہ اہل حرم دم بخود ہیں۔ وہ دیکھ رہے ہیں کہ جو آثارِ حیات صنم کدے میں ہیں اُن کا حرم میں کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے۔ شعر یہ بھی نہیں کہتا۔ حرم نشینوں پر اگر سکوت کا عالم طاری ہے تو آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ شعر اس جانب بھی کوئی اشارہ نہیں کرتا۔ القصہ بجائے اسکے کہ شعر پڑھ کر کوئی لطف حاصل ہو ایک ناحق کی اُلجھن پیدا ہوتی ہے۔ شاید وجہ خود میری ہی سمجھ کی کمی ہو۔ حضرت مصنف مطلب ارشاد فرما کر تسلی بخشیں۔

صفحہ ۸۰۔ نوائے شعلہ طراز و ادائے حُسنِ بتاں کوئی مٹے تو تری یہ ادا بھی کیا کم ہے

مصرعۂ ثانی میں "یہ ادا" کے معنی کونسی ادا سمجھے جائیں گے۔ شاعر نے خود کچھ نہیں بتایا ہے کہ کس ادا کا اظہار مقصود ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ کوئی سے مقصد ہے نوائے شعلہ طراز یا ادائے حسنِ بتاں تو ایسے موقع پر "کوئی" کا لفظ بے جان اشیاء کے لیے نہیں لایا جاتا۔ بفرضِ محال اگر یہی لکھنا مقصود تھا کہ انھیں دونوں میں سے کوئی ایک تو بجائے واو عطف کے لفظ "یا" "نوا" اور "ادا" کے درمیان میں لایا جاتا۔ کوئی مٹے در اصل اگر کوئی مٹے کے معنی میں آیا ہے۔ اور یہ ٹکڑا شرطیہ ہے۔ یعنے اگر کوئی نہ مٹے تو پھر ادا کی کوئی رعنائی یا دلکشی باقی نہیں رہتی۔ فقیر کی رائے ناقص میں "یہ" صاف حشو ہے۔ نوائے شعلہ طراز کس چیز کی۔ کس شے کی۔ کس کی۔ کیسی؟ اس نوا کا ادائے حسنِ بتاں سے کیا علاقہ ہے؟ دونوں کا تال میل دال روٹی پوسٹ کارڈ کا مضمون ہو یا پھول باغ تیل کا ہمسایہ۔ شعر کا مطلب نہ سمجھ میں آنا تھا نہ آیا۔ کیا یہ شعر بھی مہمل ہے؟

مجھے اعتراف ہے کہ میں نے محض سرسری نظر سے ایک مرتبہ سرودِ زندگی کی ورق گردانی کی ہے غور سے مطالعہ کرنے کا تصور مجھ سے ابھی تک سرزد نہیں ہوا ہے۔ سُرخ پنسل سے نشانات بناتا گیا تھا جن کی مدد سے پہلی مرتبہ ادیر کا حصہ لکھ کر جولائی کی اشاعت کے لیے دے دیا تھا۔ بقیہ حصہ آج ایک ہی نشست میں ختم کر کے سر کا بوجھ ہلکا کر رہا ہوں۔ حضرت کا فارسی کلام نہ میں نے دیکھا نہ اُردو کلام دیکھ جانے کے بعد اُس کے پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔

آخر میں حضرت مصنف کی خدمت میں گذارش ہے کہ براہ کرم میرے شبہات کا بوجہ احسن ازالہ فرمائیں تاکہ مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع ملے۔

جہاں تک میں خیال کرتا ہوں مجھے یہی عرض کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ صوفیانہ نہیں بلکہ عارفانہ شاعری شروع کرنے سے پہلے مصطلحاتِ صوفیائے کرام کا عمیق مطالعہ فرما لینے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ایسی ناقابلِ معافی لغزشیں جو شعر کا شعر سرتا پا مہمل بنا دیں آئندہ نہ ہوں۔

دوسرا امر قابلِ گذارش یہ ہے کہ شعر لکھتے وقت بعض حضرات مطلق خیال نہیں فرماتے۔ کہ آخر الفاظ

شعر کا کچھ مطلب بھی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ملک میں بڑے بڑے نکتہ رس اور معنی آفریں سخن فہم موجود ہیں۔ کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ کچھ نہ کچھ معنی پنہاں ہی دے گا۔ وہ لفظ پر لفظ رکھتے جاتے ہیں اور محض اتنا ہی دیکھ لیتے ہیں کہ سرسری نظر سے دیکھنے والا اور بے سمجھے داد دینے والا واہ واہ کہہ اُٹھے گا یا نہیں۔ اگر اس طرح شعر نہ لکھے گئے ہوتے تو بہت سے اشعار جو اسی روش کی زد میں آگئے ہیں مہمل نہ بن جاتے۔

اگر شبہات معروضہ بالا واقعی صحیح ثابت ہوں تو شدید ضرورت اس امر کی ہے کہ اشاعت سے پہلے مشاہیر لکھنؤ میں سے کسی بزرگ سے مشورہ لے لیا جایا کرے۔ فضل الٰہی سے یہاں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں ہے۔ حضرت صفیؔ۔ جناب حکیم آشفتہ۔ جناب آرزو (کلکتہ)۔ جناب اثر۔ جناب ثاقب۔ ان میں سے جس بزرگ سے رجوع فرمانا مناسب خیال فرمائیں بخندہ پیشانی اپنا بیش بہا وقت صرف کرنے میں دریغ نہ فرمائیں گے ورنہ سوا تحسین ناشناس کے اور کچھ حاصل ہونے کی امید نہیں۔ مستقل عزت اور شہرت کی یہی ایک راہ ہے۔ آئندہ اختیار بدست مختار۔

شعلۂ ایمانی

(جناب مولوی سید سراج الحسن صاحب ترمذی وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد دکن)

عالم کو منور کر اے شعلۂ ایمانی — پھر سوز دروں سے کر پیدا شرر افشانی
ہاں جادۂ ملت سے لغزش نہ قدم کھائے — دے دل کو ثبات ایسا اے قوت ایمانی
جو پھونک دے سینہ کو اور دل کو جلا ڈالے — وہ سوز عنایت کر اے آتشِ پنہانی
فاران کے شعلہ کو بھڑکا دے جہاں بھر میں — پھر برق تجلی بن اے جلوۂ روحانی
پھر شمع رسالت سے عالم میں اُجالا کر — پھر خاطر مسلم سے کر دور پریشانی
مشہور زمانہ تھی کل تک تری آزادی — اے باد صبا تا کے ویرانہ میں زندانی
سطوت کی زلیخائی ہے والہ و شیدائی — اب چاہ سے باہر آ اے یوسف کنعانی
تو سایۂ دولت ہے گم کیوں تری عزت ہے — اے بال ہما کب تک ہر خس کی نگہبانی
سوکھی ہوئی کھیتی کو پھر نشو و نما دیکر — اک بار ہرا کر دے اے رحمت یزدانی

کیا حال کہوں اپنا اے ترمذی محزوں
اس کشمکش غم سے ہوتا ہے لہو پانی

چار دن کی زندگی

(جناب حکیم سید افتخار علی صاحب جگر صدیقی وارثی)

سو رہے ہیں آج قبروں میں جو بے تاج و کلاہ — صاحب طبل و علم کل تک یہی تھے بادشاہ
اک جہاں پابند تھا احکام کی زنجیر میں — برق کا انداز تھا جوہر بھری شمشیر میں
دیکھ لیتے تھے مدھر یہ چشم قہر انگیز سے — خون کے دریا بہا دیتے تھے تیغ تیز سے
منتظر ہیں روز محشر کے جسے کچھ دیر ہے — خاک کا تودہ بنے ہیں خاک کا اک ڈھیر ہے

شاعران خوش نوا کے کچھ شکستہ ہیں مزار
موت نے لوٹی ہے ان کے باغ ہستی کی بہار

گور میں وہ طبع رنگیں کی روانی اب کہاں — گلفشانی اب کہاں جادو بیانی اب کہاں
جانفزا نغمے نکلتے تھے جو دل کے ساز سے — حشر برپا کرتے تھے جادو بھری آواز سے
سر پہ میلا سا کفن ہے جس میں اب روپوش ہیں — صورت شمع لحد سب گور میں خاموش ہیں

سامنے قبریں ہیں کس کی سب ہیں اہل علم کی
جہل کی ظلمت مٹی جس سے وہ انکی ذات تھی

اُن کی تحریروں پہ صدقے ہوتے تھے اہل نظر — اُن کی تقریروں کا ہوتا تھا زمانے پر اثر
تازگی اس گلشن پر لطف کی شبنم سے تھی — علم کی دنیا کی آبادی انھیں کے دم سے تھی
وہ طبیعت ہی رہی باقی نہ وہ دل ہی رہے — بحث علمی ہے نہ وہ علمی مشاغل ہی رہے
بڑھ گئی ہے ایسی مدہوشی فنا کے جام سے — سو رہے ہیں خاک کے بستر پہ اب آرام سے
دل میں کیوں حسرت ہے عیش دار فانی کے لیے — لاکھ جھگڑے چار دن کی زندگانی کے لیے
موت لے جائے گی پھر تم کو لحد کے غار میں — ہر چند سیر کو آئے ہیں اس گلزار میں
دیکھنا خوش ہو کے حسن رنگ نسرین و سمن — اہل عالم ہوں مبارک تم کو یہ گل یہ چمن

روح اپنی ہنس رہی ہو گی جگر افلاک پہ
آنے والے رو رہے ہونگے ہماری خاک پہ

(جناب الحاج منشی امیر احمد علوی صاحب بی اے پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

نمبر (۱)

توقع کے مطابق برادر مکرم جناب منشی امیر احمد علوی صاحب نے مولوی نور الحسن نیر مرحوم مؤلف نور اللغات کے مفصل حالات تحریر فرمائے ہیں مگر "حکایت لذیذ" تھی اسلیے قدرتاً "دراز تر" ہوگئی۔ پہلی قسط حاضر ہے۔ بقیہ انشاء اللہ سلسلہ وار شائع ہوتی رہے گی۔ ایڈیٹر

سب کہتے ہیں کہ فضل و کمال میں میراث نہیں ہوتی۔ عالموں کی اولاد بیشتر جاہل، کاملوں کی ناقص، دانشمندوں کی بےعقل اور فاضلوں کی بےہنر ہوتی ہے۔ کہ اندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست۔ خاندان میں اقبالمند ایک ہی ہوتا ہے۔ دوسرے اُس کے فیوض و برکات سے ذلہ ربائی کرتے ہیں۔ گھرانے کی افتخار سلالت ایک ہی ہستی ہوتی ہے۔ دوسرے اُس کی عزت و شہرت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ خانوادے میں صاحب ریاضات و مجاہدات ایک ہی ذات ہوتی ہے دوسرے اُسکے رسوم و عادات کی تقلید کرتے اور اُس کی بیاضوں کی ورق گردانی سے نام و نمود پیدا کرتے ہیں ؎

قیس سا پھر ہوا پیدا نہ بنی عامر میں   فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص[1]

لیکن قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے ایک ریاضت کیش بزرگ کی اولاد اس قاعدہ مستمرہ سے مستثنیٰ نظر آتی ہے۔ اس صاحب اقبال کا اسم گرامی شاہ محمد کاشف[2] سبز پوش چشتی تھا ؎

خوش آغاز و خوش اوقات و خوش انجام   خوش اعمال و محمد کاشفش نام
دلش در سینہ اش جویائے اسرار   زبانش با کلام اللہ گفتار

وہ سید علوی تھے۔ اولاد حضرت محمد بن حنفیہ خلف جناب امیر علیہ السلام سے اور اُنکا سلسلۂ نسب ۳۰ واسطوں سے جناب ابو تراب تک پہونچتا تھا۔

---

[1] از مثنوی باغ و بہار والد منشی فیض بخش کاکوروی مورخ مشہور صاحب تاریخ فیض آباد۔ [2] شاہ محمد کاشف بن حافظ خلیل الرحمٰن شہید بن شیخ عبدالرحمٰن بن حافظ غلام محمد بن شیخ سیف الدین بن ضیاء اللہ بن مخدوم عبدالکریم بن حافظ شہاب الدین بن مخدوم نظام الدین قاری المعروف بہ شیخ بھیکہ بن قاری امیر سیف الدین بن قاری حبیب اللہ نظام الدین بن قاری نصیر الدین بن قاری محمد صدیق المعروف بہ ابو محمد خانی بن قاری عبداللہ بن قاری عبدالصمد بن قاری شمس الدین بن قاری عبدالمجید بن حاجی سلطان حسین بن قاری امیر ابراہیم بن قاری عبداللطیف بن قاری عبداللہ خانی بن شمس الدین صابر بن قاری حمید الدین بن قاری سلیمان بن مولانا وجیہ الدین احمد بن قاری محمد بن قاری احمد بن علی بن محمد بن حنفیہ بن اسد اللہ الغالب حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ۔

وہ عابد و پرہیزگار وجیہ و شجاع تھے۔ ایک مدت تک فوج میں ملازم رہے۔ بعد ازاں عزلت و گوشہ نشینی اختیار کی۔ جس زمانہ میں شاہ عالم ثانی بادشاہ دہلی الہ آباد کو دارالسرور بنائے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سایۂ عاطفت میں داد عیش و نشاط دے رہے تھے اور فرماتے تھے کہ ؎

صبح اُٹھ جام سے گذرتی ہے شب دل آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے اب تو آرام سے گذرتی ہے

شاہ محمد کاشف بھی گنگا جمنا کے سنگم پر چلہ کش تھے۔ ان کے توکل و سیف بانی کا شہرہ سنکر بادشاہ ملاقات کے مشتاق ہوئے قطب ولایت نے خلوت سے جنبش نہ کی۔ بادشاہ خود حاضر ہوئے دیر تک دروازہ پر کھڑے رہے۔ باریابی کی اجازت نہ ملی۔ ارشاد ہوا کہ "بادشاہ میری ملاقات کو کیوں آئے۔ میں سپاہی ہوں فقیر نہیں۔ میرے پاس ہتھیار رکھے ہیں مجھ کو فقر و درویشی سے کیا واسطہ" شاہ عالم مایوس ہو کر واپس گئے اور یہ بھی بستر اُٹھا کر کاکوری چلے آئے اور بقیہ عمر یہیں یاد حق میں بسر کی۔ ۲ ذیقعدہ سنہ ۱۲۰۱ھ کو دنیا سے رخصت ہوئے۔

ان کے خصائل پسندیدہ اور اوصاف حمیدہ کی تفصیل کی اس مختصر میں گنجائش نہیں لیکن ان کی سب سے بڑی کرامت یہ تھی کہ ایسی فخر اسلاف اولاد پائی جو زیور علم و فضل سے آراستہ اور دولت لازوال الفقر فخری سے ممتاز ہوئی۔ کسی کی خاک قدم کو بینا دلوں نے طوطیائے چشم بنایا اور کسی کی سحر طرازی شیریں مقالی پر روشن ضمیر دل نے ہوش و خرد صدقے جان و دل قربان کیا۔ آج اُن کی وفات کو ڈیڑھ سو برس سے زیادہ مدت گذر چکی ہے۔ لیکن اس وقت تک اُن کی ہر پشت میں ایسی فاضل و کامل ہستیاں عالم وجود میں آتی رہی ہیں کہ ان میں سے بیشتر کی بابت منصب افضلیت طے کرنا دشوار ہے۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے پوتے باپ دادا سے زیادہ قابل تھے یا پرپوتے اسلاف سے گوئے سبقت لے گئے ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۔

اسی بلند اقبال گرامی منزلت کے دو نور نظر حضرت شاہ محمد کاظم قلندر اور حضرت شاہ میر محمد قلندر تھے جو زہد و عبادت۔ رشد و ہدایت۔ معرفت و خدا شناسی کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بنکر چمکے اور اپنے والد بزرگوار سے بہت زیادہ مشہور و نامور ہوئے۔ شاہ محمد کاظم المتوفی سنہ ۱۲۲۱ھ کے خلف اکبر حضرت شاہ تراب علی قلندر نے اپنے بزرگوں سے زیادہ شہرت پائی۔ وہ علم تصوف کے ماہر کامل تھے اور شعر و سخن میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے اور سخن سنجوں سے خراج تحسین وصول کرتے تھے۔ اُن کا دیوان فارسی ہنوز رائج ہے۔ اور اُردو کا ضخیم کلیات اس وقت تک متصوفین کے مطالعہ میں ہے۔ حق یہ ہے کہ صوفیانہ شاعری میں شاہ نیاز احمد بریلوی کے سوا تیرھویں صدی میں تمام شمالی ہند کوئی مماثل و مقابل شاہ تراب کا پیدا نہیں کر سکا۔ اُنھوں نے ۵ جمادی الاول سنہ ۱۲۷۵ھ کو دو گرامی مرتبت فرزند حضرت شاہ حیدر علی

اور شاہ تقی علی یادگار چھوڑکر باغ فردوس کی راہ لی۔ صاحبزادوں نے پدر عالی قدر کی شہرت کو برقرار رکھا بلکہ شاہ تقی علی قلندر نے تبحر علمی۔ استعداد منطقی اور کسب فضائل میں اپنے نامور والد سے بڑھکر نام پایا۔ شاہ حیدر علی کے پوتے اور شاہ تقی علی کے شاگرد رشید حافظ شاہ علی انور قلندر کو اپنے اساتذہ اور اسلاف سے زیادہ مرجعیت عام نصیب ہوئی۔ اور علم تصوف۔ سیر و تاریخ میں ان کی تالیفات متقدمین کی تصنیفات سے ہم پلہ ثابت ہوئیں۔ شاہ علی انور کے خلف و شاگرد مولانا حبیب حیدر قلندر المتوفی ۷ ربیع الاول ۱۳۵۴ھ نے وضع آبائی کو اس حسن و خوبی سے نباہا کہ حاشیہ نشین ان کے ذی مرتبت والد کو بھول گئے۔ اور فضل و کمال میں شاہ حبیب حیدر کو "چشم و چراغ خاندان" کا لقب دینے لگے۔ غرض شاہ محمد کاظم قلندر کی اولاد میں سلسلہ رشد و ہدایت برابر قائم رہا اور اسوقت تک بحمد اللہ یہ کاروبار محبت بدستور جاری ہے۔

شاہ محمد کاشف کے دوسرے بیٹے حضرت شاہ میر محمد قلندر المتوفی ۱۲۴۴ھ کے خلف اکبر مولوی حسین بخش ادب عربی کے فاضل۔ علم الاعداد کے ماہر اور علم جفر میں کامل تھے۔ صنائع و بدائع کلام کی تفصیل میں ایک رسالہ "سفر دریات الادبا" لکھا جس میں اساتذۂ عرب کے اشعار بطور تمثیل پیش کیے "نفحۃ الیمن" کے طرز پر ایک فصیح و بلیغ کتاب "نفحۃ الہند" تصنیف کی "دستور الکمالات" نام ایک ضخیم کتاب فارسی انشا پردازی پر لکھی۔ ایک رسالہ "اختلاف البصریین والکوفیین" اُن اختلافات کی تشریح میں تصنیف کیا جو علمائے بصرہ و کوفہ کو مسائل نحو میں تھے "آثار باقیہ" کے نام سے ایک مجموعہ رسائل مرتب کیا جس میں علاوہ ادعیہ ماثورہ اعمال دعوت اسمائے حُسنیٰ۔ خواص آیات قرآنی وغیرہ وغیرہ کے علم جفر و تعویذات کے تمام اصول و فروع محققانہ طرز پر بیان کیے اور "شمس المعارف" وغیرہ قدیم کتب اعمال و نیر نجات کو گرد کر دیا۔ اولاً مسند ارشاد چھوڑکر تلاش معاش میں باہر نکلے۔ مال و متاع دنیوی کا ذخیرہ فراہم کیا مگر بیشتر وقت اذکار و اشغال میں صرف کرتے تھے۔ کتب علوم و فنون کے مطالعہ کا بے حد شوق تھا۔ اور کمیاب تصنیفات کا ایک بیش قیمت انبار جمع کیا تھا جس کی حفاظت کی تاکید میں اپنے صاحبزادے کو ایک خط میں لکھا تھا کہ "مردن آں برخوردار و گم شدن یکے ازیں کتابہا مرا برابر است"

مدت تک اٹاوہ میں منصف رہے لیکن جذبۂ شوق رہبر طریق ہوا تو ملازمت سے سبکدوش ہوئے اجازت و خلافت سلاسل سبعہ اپنے والد عالی منزلت سے پائی تھی۔ سلسلہ رشد و ہدایت جاری کیا۔ عمر عزیز کا گراں بہا حصہ جو علم الاعداد اور علم جفر کی خدمت میں صرف ہوا تھا اُس کو اوقات ضائع شدہ سے تعبیر کرنے لگے۔ اور ایک مکتوب میں تحریر فرمایا کہ علم جفر و رمل و نجوم علوم خبیثہ سے ہیں۔ ۱۹ رجمادی الاولیٰ ۱۳۰۵ھ کو بمقام رسول آباد

---

[۱] ان بزرگوں کے مفصل تذکرے "نفحات العنبریہ من انفاس القلندریہ" مولفہ حضرت شاہ تقی حیدر قلندر اور "مشاہیر کاکوری" مولفہ حضرت شاہ علی حیدر قلندر میں درج ہیں۔ اور یہ دونوں کتابیں مطبوعہ ہیں۔

ضلع اٹاوہ نماز پڑھتے ہوئے ایک ظالم کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ شاہ تراب علی قلندر نے تاریخ وفات لکھی ؎

سر دشمن بریدہ گفت تراب　　　سال رحلت شہید اکبر گشت

مولوی حسین بخش کے صاحبزادے مولوی حسن بخش اپنے والد سے بھی زیادہ نامور ہوئے۔ علاوہ دیگر تصانیف کے ایک مبسوط کتاب کئی ہزار ورق کی " تفریح الاذکیا فی احوال الانبیا " تالیف کی جس میں تمام پیغمبران علیہم السلام کے حالات بتفصیل بیان کیے ہیں۔ آیات قرآنی کی تفسیر ہے۔ اور اقوال علما و صوفیائے کرام سے توضیح معانی۔ یہ ضخیم کتاب منشی نولکشور کے مطبع سے کئی بار شائع ہوئی۔ اور تمام ہندوستان میں مشہور ہے اسقدر قبولیت عام اس محققانہ تالیف کو نصیب ہوئی کہ اس پر کسی تقریظ کی حاجت نہ رہی۔ اور اس کا فاضل مؤلف احتیاج توصیف و تحسین سے بے نیاز ہوگیا۔ مولوی حسن بخش کے علم و فضل کی وہ شہرت ہوئی جو ان کے اجداد کے حصہ میں نہ آئی تھی۔ مگر ان کے صاحبزادے مولوی محمد محسن " فخر اسلاف گرامی " ہوئے۔ اور خاندان کی عزت و توقیر میں چار چاند لگا دیے۔ وہ فن نعت گوئی کے پیغمبر آخر الزماں تھے۔ تمام ہندوستان میں اُن کے نعتیہ اشعار کی دھوم مچی۔ اُن کا مشہور قصیدہ

" سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل　　　برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل "

اس قدر مقبول ہوا کہ بعض نکتہ رس ہندو شعرا نے بھی اس نعتیہ قصیدے کی تضمین کی۔ اُن کا " سراپائے رسول اکرم " اہل دل کا وظیفہ بنا۔ اور اُن کی بلیغ مثنویاں " صبح تجلی " " چراغ کعبہ " اور " شفاعت و نجات " پنجاب۔ بنگال۔ بمبئی بلکہ مدینہ تک پہونچیں۔ جو سمجھے اُنھوں نے آفرین و ستائش کے پھول نثار کیے اور جو نہیں سمجھے وہ بھی " واہ واہ سبحان اللہ " کے نعرے لگاتے رہے۔ ؎

ہے سہل ممتنع وہ کلام ادق میرا　　　برسوں پڑھے تو یاد نہ ہوئے سبق میرا

وہ محفوظ مراتب۔ دینداری پرہیزگاری۔ سخاوت و عالی ہمتی۔ صلہ رحم و احباب نوازی میں لاجواب تھے۔ دنیوی عزت و وجاہت۔ فراغت ظاہری و باطنی حاصل تھی۔ حاضر جوابی۔ نازک خیالی اور موزونی طبع میں اُن کی مثال نہ تھی۔ نکتہ نواز رسول کریم کی مدح و توصیف کے طفیل میں حسان الہند کا لقب پایا۔ بقاء دوام قبولیت عام کے دربار میں جگہ ملی اور وہ عزت و عظمت شہرت و وجاہت نصیب ہوئی جو اُن کے آبا و اجداد نے خواب میں بھی نہ دیکھی تھی۔ ؎

طالع میں نہیں یہ شب کسی کے　　　اختر سوئے بار سو کے جاگے

ظاہر بیں کہتے تھے کہ شاہ محمد کاشف کی اولاد میں مولوی محمد محسن سے بڑھ کر تحسین و آفرین کا مستحق کوئی پیدا نہ ہوگا۔ لیکن کارکنان قضا و قدر کا ارشاد تھا کہ ادب و زبان کا حقیقی خدمت گذار ابھی آنے کو ہے۔

اور اسی خاندان میں جنم لے گا۔ ہنوز حسن جوانی یار راہ میں ہے۔ شیخ سعدی نے گلستاں میں لکھا ہے کہ ایک صاحبدل خانقاہ چھوڑ کر مدرسہ میں آیا۔ اس سے پوچھا گیا کہ عالم کو عابد پر کیا فضیلت تھی جو تم نے ناقادت سے ٹھٹا کر مدرسہ میں قدم رکھا۔ بزرگ نے جواب دیا کہ عابد اپنی کملی طوفان سے بچاتا ہے۔ لیکن عالم ڈوبتے کو اچھالنے کی کوشش کرتا ہے

گفت او گلیم خویش بدر می برد ز موج — ویں جہد می کند کہ برآرد غریق را

مولوی محمد محسن نے تمام عمر نعت رسول میں صرف کی۔ بارگاہ قدس میں عزت و حرمت پائی۔ اپنی زمزمہ سرائی اور دلفریب جنبش لب سے سخن فہموں کے قلوب کو مسخر کیا۔ لیکن خدمت زبان کے اعتبار سے مسند فضیلت کی مستحق وہ ہستی ہے جو غریق کو آفات سے بچانے کی سعی کرے۔ طالبان علم کو الفاظ کے معانی سمجھائے اور انشا پردازوں۔ ادیبوں۔ شاعروں کو اغلاط و اسقام کی خطرناک گھاٹیوں سے نکال کر شاہراہ فصاحت و بلاغت کی رہبری کرے۔

ولادت | مولوی محمد محسن مین پوری میں وکالت کرتے تھے۔ ۴۰ سال کی عمر ہو چکی تھی لیکن کوئی فرزند نہ تھا غدر کی سرگردانی میں کئی اولادیں ضائع ہو چکی تھیں۔ اہل خانہ کو بیٹے کی آرزو تھی۔ ۱۰ ر شعبان ۱۲۸۲ھ روز جمعہ مطابق ۲۹ ر دسمبر ۱۸۶۵ء کو تقریباً نو بجے شب کے اک مولود مسعود نے عالم وجود میں قدم رکھا۔ باپ دادا کی آنکھوں میں نور آیا۔ "ضیاء چشم حسن" تاریخ ولادت ہوئی۔ اور نور الحسن نام رکھا گیا۔ مولوی محمد محسن مین پوری میں ہر دلعزیز تھے۔ امراء و غرباء۔ عوام و خواص شیریں زبانی سے مسخر تھے۔ ہندو اور مسلمان دونوں برابر عزت کرتے تھے۔ مسلمانوں کے مقامی پیشوا حافظ محمد عارف چشتی دعا گوئے خاص تھے۔ اور پنڈت و برہمن آشیرباد کے لیے آیا کرتے تھے۔ تقریب ولادت کی مسرت میں شہر کے وضیعوں اور شریفوں کی دعوت ہوئی۔ فقرا کو خیرات تقسیم کی گئی کاکوری سے حجام مبارکباد کے لیے حاضر ہوئے اُن کو دوشالے اُڑھائے گئے۔ برہمنوں کو دان دیا گیا۔ ایک فاضل جوتشی نے حسب ذیل زائچہ[1] تیار کیا۔

۳ میزان (زحل در شرف)
۲ سنبلہ (راس)
۱ اسد
۱۲ سرطان
۱۱ جوزا
۱۰ ثور (قمر در شرف)
۴ عقرب
۵ قوس (عطارد زہرہ مریخ شمس)
۶ جدی
۷ دلو
۸ حوت (ذنب)
۹ حمل

[1] یہ زائچہ مولوی محمد محسن کے چھوٹے بھائی حکیم محب علی المتوفی ۱۳۲۲ھ کے قلم سے نقل کیا ہوا راقم الحروف کو اتفاقاً حکیم صاحب کے صاحبزادے نثار شکور علی سے دستیاب ہوا۔ بیاض کرم خوردہ تھی پڑھا نہیں جا سکا کہ "مشتری" کس برج میں ہے لہذا زائچہ اہل تنجیم کے قاعدہ سے نامکمل ہے۔

اور بشارت دی کہ مولود قابل و فاضل عالی دماغ اور نامور ہوگا۔ مال و متاع کی کمی نہ ہوگی۔ لیکن دولت جمع نہیں کرے گا۔ صاحب قوت و جبروت ہوگا مگر غصہ جلد آئے گا۔

طفولیت | ولادت کے بعد ہی جاں نثار ماں علیل ہوگئیں۔ رضاعت کے لیے بیش قرار تنخواہ پر شریف اور تندرست دائیاں مقرر کی گئیں۔ پہلے ایک میواتن نے یہ خدمت انجام دی بعدازاں ایک مصیبت زدہ شریف بیوہ نے جس کے شوہر کو ہاتھی نے مار ڈالا تھا اپنے خون جگر سے پرورش کی اور اقبال مند بچہ کے دام محبت میں ایسی اسیر ہوئی کہ تمام عمر اسی گھر میں گذار دی۔ وہ ختم رضاعت کے بعد مدتوں زندہ رہی۔ اپنے پروردہ دلبند کی شادی دیکھی اولاد دیکھی اور کاکوری کی خاک پاک کا پیوند ہوئی۔ اخیر عمر میں آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی۔ مگر لڑکے کی آواز سننے کی مشتاق رہتی تھی۔ راقم الحروف کو بھی اسکی آغوش شفقت یاد ہے۔ فجزاها الله خیر الجزاء

مولوی نورالحسن پندرہ مہینے کے تھے اور پاؤں چلنا شروع کیا تھا کہ آفرینندۂ ارض و سما نے انھیں ایک بھائی عنایت کیا۔ ۹ ذیقعدہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۶ مارچ ۱۸۶۷ء روز شنبہ کو مولوی محمد محسن کے دوسرے صاحبزادے مولوی انوارالحسن پیدا ہوئے۔ والدہ پھر بیمار ہوئیں۔ اور ان کی رضاعت کے لیے بھی دائیاں مقرر کی گئیں۔ دونوں بھائیوں کی پرورش و پرداخت ساتھ ساتھ ہونے لگی۔ جد امجد مولوی حسن بخش اپنے پوتوں کو دیکھ کر نہال ہوتے اور بار بار کہتے تھے کہ

نور و انوار دیدہا باشید   زندہ باشید ہر کجا باشید

مولوی انوارالحسن پانچ چھ مہینے کے تھے کہ ان کی والدہ اپنے دونوں لخت جگر ہمراہ لے کر مدت کے بعد وطن آئیں اور مکان موروثی واقع محلہ تیجیہ تلا میں قیام کیا۔

ایک جدید عالی شان محلسرا جس کی تاریخ تکمیل "غریب خانہ" ۱۲۸۴ھ ہے یہاں تعمیر ہو رہی تھی اس کا بتاریخ ۱۰ اکتوبر ۱۸۶۷ء مطابق ۱۱ جمادی الثانیہ ۱۲۸۴ھ افتتاح ہوا۔ تیرھویں صدی کی معاشرت دیکھیے کہ اس علم و ہنر کے گھرانے میں ہندوستان کے قدیم رسوم پر عملدرآمد کیا گیا۔ اعزہ و اقربا کی مستورات دو گھڑی رات رہے والدۂ مولوی نورالحسن کے ہمراہ تیجیہ تلا سے مکان نو تعمیر تک پاپیادہ آئیں۔ نئے مکان کی دہلیز پر دھان کا انبار جمع کیا گیا تھا۔ اس پر قدم رکھ کر محلسرا میں داخل ہوئیں۔ کھچڑی پکا کر برادری میں تقسیم کی گئی۔ بعد ازاں ہوم دھام سے دعوت ذکیرہ ہوئی۔ اور بزرگان وطن سے دعا کرائی گئی کہ ان دونوں نونہالوں کو اس محلسرا میں پھولنا پھلنا نصیب ہو۔

دعوت ذکیرہ کے چند روز بعد دونوں بھائی حضرت شاہ تقی علی قلندر کے سلسلۂ ارادت میں داخل کیے گئے۔ مولوی نورالحسن سات آٹھ برس کے تھے کہ ان کے مرشد نے

وفات پائی۔ جوانی کے وقت پیر کی صورت بھی یاد نہ تھی۔ لیکن ہمیشہ اپنے ہادی و مقتدا کی ثنا و صفت سے تر زباں رہتے تھے ؎

تا داغ غلامی تو داریم ہر جا کہ رویم بادشاہیم

پیرانہ سالی میں بیان فرماتے تھے کہ جب مولانا اشرف علی تھانوی کے زہد و اتقا، علم و فضل کا شہرہ ہوا اور برادر عزیز مولوی انوار الحسن انکے حلقہ بگوش ہوگئے تو مجھ کو بھی تجدید بیعت کا شوق ہوا۔ استخارہ کیا۔ رات کو کسی شخص نے خواب میں شاہ تراب علی قلندر کا یہ شعر سنایا ؎

سایۂ درگاہ کاظم ہم کو کیا کم ہے تراب در بدر ہم کیوں پھریں ظل ہما کے واسطے

صبح کو نیت بدل گئی اور بیعت قدیم پر استقامت کی توفیق ہوئی۔

غرض ایک سال کاکوری میں قیام کے بعد پھر مین پوری کا سفر ہوا اور وہیں چار برس چار مہینہ چار دن کی عمر میں ۱۴ ذی الحجہ ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۷ مارچ ۱۸۷۰ء روز پنجشنبہ کو رسم تقریب مکتب ادا کی گئی۔ مین پوری کے قطب ارشاد حافظ محمد عارف چشتی نے بسم اللہ پڑھائی اور شہر میں شیرینی تقسیم ہوئی۔ سات مہینے کے بعد ماہ رجب ۱۲۸۷ھ میں دونوں بھائیوں کا ختنہ ہوا۔ شادیانے بجے۔ عیش و نشاط کی محفلیں۔ شرفا ہنود و اہل اسلام کی دعوتیں ہوئیں۔ بڑے بڑے لڈوؤں کی ہانڈیاں تمام احباب و حکام اور اہل محلہ کو تقسیم کی گئیں۔

اسی زمانہ کا قصہ ہے کہ انھوں نے ایک بار اپنے والد کے ملازم خاص واحد خاں سے کچھ سخت کلامی کی اُس نے پدر بزرگوار سے شکایت کر دی۔ باہر تنبیہ ہوئی تو گھر میں کہتے پھرتے تھے کہ "چغلخور کے مُنھ کو ڈستے ہیں سانپ" اس وقت مین پوری میں اندر سبھا کا بڑا زور و شور تھا۔ رؤسا و کلا اور حکام کے دولت خانوں پر رہس کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ شاید ایسے ہی کسی تماشے میں یہ مصرعہ سنا ہوگا جو یاد ہوگیا اور غم و غصہ کے وقت زبان پر آیا۔

ابتدائی تعلیم و تربیت | قرآن شریف اور ابتدائی درسی رسالے پڑھ کر اپنے جد امجد مولوی حسن بخش سے صرف و نحو شروع کی۔ چند ماہ کے بعد مولوی انوار الحسن بھی درس میں شریک ہوئے۔ اگرچہ برادر بزرگ کے

سلہ تاریخ وفات از مولوی غلام امام شہید

پیر کامل تقی سلی دلی ؛ رہبر و رہنمائے اہل یقیں

رخت بربست ناگہاں زجہاں بھر گلگشت باغ علیین

گفت ہاتف کہ بے سرو پا شد کرم و فضل و ہم شریعت و دیں

سنہ ۱۲۶۹ھ

ہم سبق نہیں تھے۔ مولوی محمد محسن کے ماموں زاد بھائی شیخ اکرام علی بھی انھیں بھائیوں کے ساتھ پڑھتے تھے۔ تھوڑی ہی مدت میں مبادیات پر عبور ہوگیا۔ اور ان صاحبزادوں کو مولوی محمد محسن نے شافیہ اور کافیہ حفظ کرایا۔

تعلیم سے زیادہ تربیت کی طرف بزرگوں کی توجہ تھی۔ چھ سات برس کی عمر سے نماز پنجگانہ اور تلاوت کلام مجید کی تاکید کی گئی۔ دروغگوئی سے منع کیا گیا۔ غیبت و بدگوئی پر زجر و توبیخ ہوئی۔ مولوی حسن بخش کو اُن کے جد امجد شاہ میر محمد قلندر نے تعلیم کے لیے اپنے صاحبزادہ کے پاس اٹاوہ روانہ کیا تھا۔ تو پوتے کو ایک ہدایت نامہ لکھ کر دیا تھا۔ وہی صحیفہ نصائح ان لڑکوں کو پڑھایا گیا اور اس کے احکام بجالانے کی فہمائش کی گئی چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

"وصیت می کنم ترا اے پسر من بہ آنکہ در خواندن و نوشتن سرگرم باشی آن قدر کہ محتاج بہ نوشتہ و خواندن از دیگرے نہ باشی و نماز پنج وقتہ ادا کن و صحبت با عامیاں و جاہلاں مکن و قہقہہ بازی را شعار خود مساز و سخن بسیار مگو و در صحبت پدر و کلاں تر از خود با ادب باش و بر نوکران پدر حکومت مکن و سخن زشت مگو والا ذلیل خواہی شد از دست پدر یا برادر کلاں و۔ و برے ایشاں بندہ و بیچارہ دار باش۔ ہر چیز بدہند آنرا بگیر و آنچہ نہ دہند آنرا سوال مکن۔ و شیرینی و میوہ اگر اجازت دہند آنرا بگیر و در عقب و شان تصرف مکن۔ بے اجازت پدر ہیچ کار مکن و بہ ملاقات کسے مرو۔ پوشاک ہر قسم کہ دہند آنرا بپوش و رد مکن و ہر چہ فرمایند بگوش دل بشنو۔ سخن ایشاں از دیگرے مگو و غیبت ایشاں از دیگرے مشنو۔ و بر گویندہ رد کن۔ ہر چہ تقصیر کنی بگو کہ از ما تقصیر شد دیگر بار نہ خواہد شد۔ در عتاب ایشاں رحمت است بر و نا خوش مشو و رضا مندی ایشاں طلب کن کہ موجب فلاح دنیا و آخرت است والسلام۔"

اس موثر ہدایت نامہ کا فیض تھا کہ یہ بیش بہا نصیحتیں مولوی نور الحسن وانوار الحسن کے قلوب میں عالم طفلی سے راسخ ہوگئیں۔ اطاعت والدین فرض سمجھی۔ فحش کلامی بدگوئی سے نفرت رہی اور جاہلوں عامیوں کی صحبت میں بیٹھ کر بُری عادتیں نہیں سیکھیں۔ اصلاح اخلاق کے ساتھ ساتھ صحت جسمانی اور بقاے تندرستی کی طرف بھی توجہ مبذول تھی۔ اُس وقت کرکٹ اور فٹ بال کے نام سے کان آشنا نہ تھے۔ ڈنڑ اور مگدر وغیرہ قد ورزشوں کی مشق کرائی جاتی تھی اور دوڑ دھوپ کی عادت کے لیے پتنگ بازی کا شوق دلایا جاتا تھا

سلہ شیخ اکرام علی بن شیخ عاشق علی صدیقی بجنوری مولوی محمد محسن کے ماموں زاد بھائی اور اُن کے صاحبزادوں سے ہم عمر تھے۔ بڑے طباع اور ذہین تھے فارسی کی استعداد ان بھائیوں سے زیادہ رکھتے تھے۔ انٹرنس پاس کرنے کے بعد تعلیم قطع کر دی اور تلاش معاش میں لکھنؤ آئے تھے یہاں صیاد اجل کا شکار ہوئے اور عالم شباب میں بعارضہ ہیضہ انتقال کیا۔ ان کا سال وفات ۱۳۰۲ھ ہے۔

مولوی نورالحسن کے ماموں زاد بھائی منشی نعیم الدین اور حاجی ذکی الدین[1] مین پوری میں موجود تھے۔ بڑے بھائی منشی نعیم الدین[2] فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ اور چھوٹے بھائی ضلع اسکول میں انگریزی پڑھتے تھے دونوں کا عنفوانِ شباب تھا۔ نورالحسن کے نام سے ڈور پتنگ کی خریداری ہوتی تھی اور ماموں زاد بھائی انکو لڑایا کرتے تھے۔

منشی نعیم الدین کو شعر و سخن سے ذوق تھا۔ اشعار عاشقانہ خوب کہتے اور مولوی محمد محسن سے اصلاح لیتے تھے۔ اُنھوں نے برادران عزیز کو بیت بازی کی رغبت دلائی اور اُن کے فیض صحبت سے مولوی نورالحسن کو لڑکپن ہی میں اشعار یاد کرنے کا شوق ہوا۔ چھ سات برس کے تھے کہ حسب ذیل اشعار اکثر اُن کی زبان سے سُنے جاتے تھے۔

(۱) طفلی میں بھی شادی متوحش رہی ہم سے　　چھٹی نہ ملی جمعہ کو بھی سشنبہ کے غم سے
(۲) پھوسے شفق تو زرد ہو گالوں کے سامنے　　پانی بھرے گھٹا ترے بالوں کے سامنے

اندازِ شعر خوانی اُس وقت بھی دلفریب تھا۔ بزرگوں سے سُنا ہے کہ یہ شعر نہایت خوش اسلوبی سے پڑھتے تھے

اُس زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سُوجھی　　اندھے کو اندھیرے میں بہت دُور کی سوجھی

مولوی حسن بخش عیدگاہ مین پوری کے امام تھے۔ ایک مرتبہ عید کے دن خورد سال پوتے کو نعت خوانی کیلیے منبر پر کھڑا کر دیا اور اُنھوں نے چند شعر "سراپاے رسول اکرم" کے اس جوش و خروش سے پڑھے کہ حاضرین مسجد دنگ ہو گئے۔ محلہ کی شریف زادیوں نے والدہ نورالحسن کو ہونہار بیٹے کی شعر خوانی پر مبارکباد دی۔ وہ دل میں خوش ہوئیں مگر نظر کے خوف سے لڑکے کو محفلوں میں شعر پڑھنے سے منع کیا اور چشم زخم سے حفاظت

[1] حاجی ذکی الدین ولد حافظ رحیم الدین راقم سطور کے والد ماجد تھے۔ ۱۰ ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ کو پیدا ہوئے۔ مدت تک مین پوری ضلع اٹاوہ میں وکالت کرتے رہے۔ دو مرتبہ زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہوئے۔ ۲ ذی الحجہ ۱۳۲۹ھ روز جمعہ مطابق ۲۴ نومبر ۱۹۱۱ء کو بعارضہ اسہال بمقام کاکوری انتقال فرمایا۔

[2] منشی نعیم الدین مولوی نورالحسن کے حقیقی ماموں حافظ رحیم الدین کے بڑے بیٹے تھے۔ وہ شگفتہ مزاج اور ہردلعزیز تھے۔ مدت تک عدالت دیوانی میں ملازم رہے۔ ۷ جمادی الثانیہ ۱۳۰۳ھ مطابق ۲۴ مارچ ۱۸۸۶ء کو اس دار ناپائدار سے رحلت کر گئے۔ اُن کی غزلیات کا مجموعہ اُن کے صاحبزادے حکیم حکیم الدین کے پاس فرخ آباد میں موجود ہے لیکن زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوا۔ اُن کے تین شعر جو راقم الحروف کو یاد آ گئے درج کیے جاتے ہیں:-

(۱) تیرے کوچے میں نہ جانے کی جو کھاتا ہوں قسم　　دل خفا ہو کے یہ کہتا ہے کہ جی ہاں اچھا
(۲) میں چُنتا ہوں سارے چوڑیوں سے اُنکی جھڑتے ہیں　　وہ جب تالی بجاتے ہیں تو ہم جگنو پکڑتے ہیں
(۳) یہاں کفن کے ہیں قطع و برید کے ساماں　　[illegible] جوڑے رنگائے جاتے ہیں

کے لیے مساکین کو خیرات تقسیم کی۔ اس دوران میں کئی بار کاکوری کا سفر ہوا۔ ۱۲۸۹ھ میں عرصہ تک یہاں مقیم رہے اور اسی زمانہ میں ۲۷ رجب ۱۲۸۹ھ کو مولوی نورالحسن کی بڑی ہمشیرہ کا عقد ہوا۔ اسکے بعد ۱۲۹۲ھ میں دوبارہ وطن آنا ہوا اور اس موقع پر بتاریخ ۲۴ رمضان ۱۲۹۲ھ روز دوشنبہ مطابق ۲۵ اکتوبر ۱۸۷۵ء مولوی نورالحسن اور انوارالحسن کی تقریب روزہ کشائی ہوئی۔ اُن کی والدہ کو تقریبات میں بیدریغ صرف کرنے کا حوصلہ تھا۔ بڑی لڑکی کی شادی اولوالعزمی سے کر چکی تھیں۔ اب روزہ کشائی میں بھی تمام شرفائے قصبہ کی دعوت ہوئی اور عیش و مسرت کی رسمیں ادا کی گئیں۔ علم دوست اعزہ و احباب نے قطعات تاریخ لکھے۔ منشی محمد رضا صبر[1] کاکوروی کے قطعہ تاریخ کا آخری شعر یہ ہے:—

خوشی عید کی دن میں سو بار ہو　　　مبارک یہ تقریب افطار ہو

تعلیم متوسطات عربی و فارسی

اس مبارک تقریب سے فراغت کے بعد مین پوری پہونچے تو مولوی نورالحسن دس برس کے تھے اور تعلیم کی طرف زیادہ توجہ کی ضرورت تھی۔ بریلی کے ایک فاضل مولوی ہدایت علی نام بیش قرار تنخواہ پر صاحبزادوں کی تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے۔ شرح وقایہ .... جدامجد سے پڑھ چکے تھے۔ شرح ملا جامی نحو میں اور منطق میں صغرے کبرے سے شرح تہذیب اور قطبی کے ابتدائی ابواب تک مولوی ہدایت علی سے پڑھا اور اسی زمانہ میں مولوی محمد محسن کے ارشاد سے تہذیب حفظ کی۔ مولوی ہدایت علی علامہ فضل حق خیرآبادی کے شاگرد رشید تھے بڑے قابل اور صاحب استعداد مگر نازک مزاج اور بدزبان تھے۔ شاگردوں کو مطالعہ کے لیے تنبیہ کرتے اور انھیں سے عبارت پڑھوا کر معانی ملاتے تھے۔ مشکل الفاظ کے معنی لغت میں تلاش کرنے کی تاکید کرتے اور خود مطالب کی تشریح پر اکتفا کرتے تھے۔ اُن کا ایک فرزند بھی ساتھ تھا اور اُس کو کسی قسم کی کلفت پہونچنے کے روادار نہ تھے۔ دستور تھا کہ ماہ رمضان میں افطاری، رات کا کھانا اور سحری بڑی بڑی تابوں میں رکھ کر اذان مغرب سے پہلے اُن کے سامنے آجاتا۔ ... نہ خود روزہ افطار کریں گے اور نہ کسی دوسرے کو افطار کرنے دیں گے۔ فرماتے تھے کہ جب تک افطاری کا سامان میری نظر کے سامنے نہ آجائے افطار صوم کا وقت آ ہی نہیں سکتا۔ مولوی محمد محسن اُن کی ناز برداری کرتے تھے۔ اگر کسی دن مقررہ وقت پر اُن کا کھانا

[1] منشی محمد رضا صبر، شیخ غلام ہمدانی مصحفی کے شاگرد رشید عبداللہ خان شعور کے شاگرد تھے۔ ۹ رشعبان ۱۲۹۰ھ روز دوشنبہ کو بمقام سیتاپور انتقال کیا۔ اُنھوں نے تین ضخیم دیوان یادگار چھوڑے جن میں سے دو دیوان (۱) گلدستۂ نعت محمد اور (۲) رباعیات نعت احمد نعت میں ہیں۔ تیسرا دیوان عاشقانہ ہے۔ دو شعر تبرکاً یہاں نقل کیے جاتے ہیں:—

(۱) عہد شباب میں یہ تمہارا خرام ناز　　　ہے موسم بہار میں چلنا نسیم کا

(۲) بادہ خواری سے جو برسات میں چاہی توبہ　　　بادل اس زور سے گرجا کہ الٰہی توبہ

نہ پہونچتا اور پانچ منٹ کی بھی تاخیر ہوتی تو مولوی محمد محسن .... دیگچیاں اٹھا لاتے اور کھانا نکلوا کر مولوی صاحب کے لیے بھیجتے تھے۔ مزہ یا ہی کا یہ عالم تھا کہ بے تکلف اپنے آقا اور آقا کے احباب کو "خر"، کے خطاب سے سرفراز فرمایا کرتے تھے۔ لیکن مولوی محمد محسن لڑکوں کی تعلیم کی خاطر ہنس کر ٹالتے اور صرف یہ کہہ دیتے تھے کہ "چوں بار ہی بر د عزیز است"

ایک بار غصہ میں مولوی صاحب نے نور الحسن کو بے دردی سے مارا کہ ان کی پشت پر بدھیاں پڑ گئیں۔ ماں سے یہ سختی کیونکر دیکھی جاتی۔ مولوی صاحب کو ٹوکا وہ خفا ہو گئے اور ملازمت سے استعفا پیش کیا۔ مولوی محمد محسن کو اطلاع ہوئی تو اہل خانہ سے ناراض ہوئے اور مولوی صاحب سے معذرت کی۔ باوجود ان خاطر داریوں اور مہمان نوازیوں کے مولوی صاحب زیادہ مدت تک پردیس کا قیام نہ برداشت کر سکے اور ان کی جگہ پر منگلور ضلع سہارنپور کے ایک مقدس بزرگ مولوی رحم الٰہی مقرر کیے گئے۔ وہ بڑے فاضل محدث۔ عبادت گزار ..... ریاضت کیش اور علم کلام کی مشہور کتاب "تبشارات احمدیہ" کے مصنف تھے۔ [illegible]

اسی زمانہ میں مولوی محمد محسن سے چار عنصر مرزا بیدل۔ رقعات بیدل اور وقائع نعمت خان عالی کے اسباق پڑھے اور انشا پردازی فارسی کی مشق کی۔

منشی نعیم الدین ہنوز مین پوری میں ملازم تھے۔ ان کی رنگین صحبت میں شعر و سخن۔ زبان و محاورات کی دلچسپ بحثیں رہتی تھیں۔ سیکڑوں شعر فارسی اور اردو کے بر زبان تھے لیکن مولوی نور الحسن نے شعر گوئی کی طرف رغبت نہ کی البتہ ان کے برادر خورد مولوی انوار الحسن کو غزل گوئی کا شوق ہوا۔ اور انھوں نے منشی نعیم الدین کے مشورہ سے چند غزلیں لکھ کر اصلاح کے لیے والد بزرگوار کی خدمت میں پیش کیں۔ مولوی محمد محسن نے اشعار پر اصلاح دی لیکن عزیز بیٹے کو شاعری سے منع کیا اور مسودہ پر لکھ دیا

در شعر مپیچ و در فن او　　　که اکذب اوست احسن او

اس تنبیہ کے بعد مولوی انوار الحسن نے شاعری چھوڑ دی۔ ان کی غزلیں اب کہیں دستیاب نہیں ہو سکتیں راقم الحروف کو دو شعر ایک غزل کے یاد ہیں۔ وہ نقل کرتا ہوں :-

(۱) ٹھنڈی آہیں بھی گئیں گیسوؤں والوں کے ساتھ　　　اب نہ وہ پروائی کے جھونکے نہ وہ برسات کی رات

(۲) کاجل آنکھوں میں لگائے دم رخصت روئے　　　کجلی بن ہے کہ نظر آتی ہے برسات کی رات

دوسرے شعر کے الفاظ بول رہے ہیں کہ نو عمر اور نو مشق کی زبان ہے۔

اس زمانہ میں رامپور علم و ہنر کا معدن تھا۔ ہندوستان کے بہترین شاعر و ادیب، فاضل و دانشمند وہاں جمع تھے۔ امیر مینائی اور داغ دہلوی کی حریفانہ نکتہ سنجیوں کی دھوم تھی، منشی امیر احمد۔ مولوی محمد محسن سے

مخلص دوست تھے۔ ایام غدر میں مہینوں ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ رامپور مین پوری سے دور لیکن دل سے نزدیک تھا۔ سلسلہ خط و کتابت برابر جاری رہتا اور رامپور کی مجلسوں کی مفصل اطلاعیں مین پوری آیا کرتی تھیں۔
یہاں امیر و داغ کی ہم طرح غزلوں پر موازنہ ہوتا تھا۔ مولوی انوار الحسن داغ دہلوی کے مداح تھے مگر زبان و محاورات کا خادمت گذار اُسی وقت سے حضرت امیر مینائی کا طرفدار تھا۔ اپنی بیاض کے ایک ورق پر تحریر فرمایا تھا
"امیر دریا کی زبان و بلندی معنی و شوخی اشارت و کرسی نشینی ترکیب و بست قافیہ و نشست ردیف طراز یکتائی دارد۔ فرصتم نیست ورنہ از ہمہ کلام او انتخاب میزدم و بقلم میکشیدم"
یہ عبارت اُسی زمانہ کی لکھی ہوئی .... محفوظ ہے۔
بمبئی سے ایک گلدستہ بلقیس نام کسی خاتون نے جاری کیا تھا۔ جس کا شعر تھا ؎

فائدے دو ہیں مری لاش کے ٹھکرانے میں کہ میں جی اُٹھوں گی تم ہوگے مسیحا مشہور

اور گلدستہ کے سرورق پر حسب ذیل شعر ہوتا تھا ؎

نقد دل نقد سخن دے کے زیارت کر لیں ہیں کہاں ناز حسینوں کے اٹھانے والے

اس میں ہندوستان کے بہترین شعرا کا کلام چھپتا تھا۔ اور یہ ماہوار پرچہ مولوی محمد محسن کے نام آتا تھا۔ مولوی نور الحسن اس مجموعۂ غزلیات پر نکتہ چینی فرماتے اور اُس کے بہترین اشعار کا انتخاب کیا کرتے تھے۔ اُن کے ہم وطن دوست منشی سجاد حسین نے لکھنؤ سے اودھ پنچ جاری کیا۔ اودھ کے مشہور انشا پرداز اُس کے نامہ نگار ہوئے۔ طوطی ہند میرٹھ سے مقابلہ ہوا۔ دونوں اخباروں کے ارباب ادارت نے ایڑی چوٹی کے زور لگائے اور ایسے ایسے دلکش محاورات و مصطلحات مضامین میں استعمال کیے کہ اُن سے لطف اندوز ہونے کے لیے بڑی قابلیت اور زبان دانی کی ضرورت تھی۔ اودھ پنچ نے ایک پورا پرچہ بے نقط شائع کر دیا۔ طوطی ہند اس ادبی کا جواب نہ دے سکا اور مولوی نور الحسن اپنے دوست کی شاندار کامیابی پر خوش ہوئے۔ وہ اودھ پنچ کا ہر ایک پرچہ بڑے ذوق شوق سے پڑھتے اور اس کا سالانہ فائل بڑے اہتمام سے جمع کرتے تھے۔
مین پوری میں علم دوست حکام اور سخن فہم وکلا کا مجمع تھا۔ مولوی محمد محسن کے احباب لالہ جوگل کشور وکیل اور لالہ گنگا سہائے وکیل اپنے دولت خانوں پر مشاعرے کی محفلیں منعقد کیا کرتے تھے۔ مولوی محمد محسن عہد کر چکے تھے کہ

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی نہ مرا شعر نہ قطعہ نہ قصیدہ نہ غزل

مگر احباب کے شدید اصرار سے ان مشاعروں میں شریک ہوتے۔ اپنے مکان پر بھی کبھی کبھی مشاعرے قرار دیتے اور عاشقانہ غزلیں پڑھتے سناتے تھے۔ مولوی محمد محسن کی دلکش مثنوی "پیاری باتیں" انھیں

مشاعروں کی بدولت عالم وجود میں آئی اور ان کا مشہور شعر

تالیاں کس نے دم رقص بجائیں محسن — زہرہ چرخ گری فرش پہ جب گھنگھرو ہو کر

اسی عہد عیش و نشاط کی یادگار ہے۔

حسب ذیل غزل بھی انھیں مشاعروں کے طفیل میں ادب اردو کو نصیب ہوئی۔

اک آفت جاں تری ادا ہے — عاشق کو قضا کا سامنا ہے
صاحب غیروں سے جی خفا ہے — اور کیا مجھے آپ سے گلا ہے
فرہاد نہ پوچھ سختی ہجر — دن آج پہاڑ سا کٹا ہے
اک آن ہو جس میں وہ حسیں ہے — یوسف ہونے کی قید کیا ہے

حاصل زمین شعر یہ تھا

دامن سے وہ پونچھتا ہے آنسو — رونے کا کچھ آج ہی مزا ہے

مولوی نورالحسن ان شعر و سخن کی علم آموز صحبتوں میں شریک ہوتے اور اپنے دل و دماغ کو اس عظیم الشان خدمت کے لیے تیار کر رہے تھے۔ جس کے لیے کاتب ازل نے اُن کو نامزد کیا تھا۔

تعلیم انگریزی کا آغاز

مولوی محمد محسن زمانہ شناس تھے جانتے تھے کہ اب علوم و فنون کے بازار میں انگریزی سکہ چلتا ہے اور دنیوی عزت و وجاہت اولاد کو بغیر انگریزی پڑھے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اُس وقت تک مسلمان علما مغربی تعلیم کو نیچریت کا پیش خیمہ سمجھتے اور جو شخص اپنے بچوں کو انگریزی پڑھواتا اُس کی بابت کہتے تھے کہ عیسائیت اُس کے گھر کو تاک رہی ہے۔ مولوی حسن بخش اگلے وقتوں کے بزرگ اور خانوادۂ رشد و ہدایت کی یادگار تھے۔ وہ علوم فرنگ کے مخالف تھے مگر اُن کے چھوٹے بیٹے مولوی محمد احسن کے اصرار اور مولوی محمد محسن کی اجازت سے لڑکوں کو انگریزی پڑھانی شروع کرائی گئی۔ مشن اسکول کے ایک متوسل ہلاس بابو نام تعلیم کے لیے مقرر ہوئے۔ شیخ اکرام علی بھی شریک درس تھے۔ مکان مسکونہ سے الگ باغ کے ایک کمرہ میں انگریزی کا سبق ہوتا تھا۔ اور جب ماسٹر صاحب رخصت کر کے بڑے مکان پر آتے تو استغفار کی تسبیحیں رد کفر کے کلمات پڑھ کر بزرگوں کی مجلس میں بیٹھنے کے قابل سمجھے جاتے تھے۔ مزید احتیاط کی نظر سے جد امجد نے علم کلام کا مطالعہ کرایا۔ رد نصاریٰ کی خاص طور پر تعلیم دی اور اشغال و وظائف خاندانی کی مشق کرائی۔ صاحبزادوں کو انگریزی سیکھنے کا شوق اس قدر غالب تھا کہ باوجود تمام بندشوں کے حیرت انگیز ترقی کر رہے تھے۔ بہت تھوڑا وقت انگریزی پڑھنے کے لیے دیا جاتا تھا۔ اعزہ اقربا میں کوئی شخص وہاں ایسا موجود نہ تھا جس سے ایک لفظ کے بھی معنی معلوم ہو سکیں اُس سے انگریزی میں کوئی بات کی جا سکے۔ لیکن عربی نحو پر عبور تھا، ذہن تیز اور شوق راہبر،

زبان فرنگ کی ابتدائی درسی کتابیں چند روز میں نوک زبان ہوگئیں اور دو سال میں اس قدر مہارت انگریزی اور حساب میں پیدا کی کہ جولائی ۱۸۸۱ء میں ..... سرکاری مڈل اسکول کے درجہ دوم میں جو مڈل سے ایک درجہ نیچے اور زمانہ حال کے درجہ ہفتم کے برابر تھا داخل کر لیے گئے۔

شعر و سخن سے ذوق بدستور تھا۔ مشاعرے جاری تھے۔ مولوی نور الحسن کا انداز شعر خوانی مقبول عام تھا اور شہر میں جہاں کہیں مجالس میلاد شریف منعقد ہوتیں یہ نعت خوانی کے لیے منبر پر بٹھائے جاتے تھے۔ مولوی محمد محسن کی مثنوی صبح تجلی شائع ہو چکی تھی۔ سراپائے رسول اکرم اور مدیح خیر المرسلین کو بھی مقبولیت عام حاصل تھی لیکن وہ عام طور پر مجلسوں میں مثنوی صبح تجلی کا بیشتر حصہ اور چند بند سراپائے رسول اکرم کے پڑھا کرتے تھے ....

.... جد امجد نے اسی زمانہ میں ان کو تمام اعمال و اشغال خاندانی کی اجازت عنایت فرمائی اور ایک مجموعہ وظائف جو اپنے والد سے وراثتاً پایا تھا۔ عزیز پوتے کو عنایت کیا ......

.... علاوہ ان تفضلات کے ایک دعا زیادتی عمر کے لیے اپنے دست خاص سے ان کی بیاض پر تحریر کی اور لکھا کہ

"برخوردار نور الحسن طول عمرہ را اجازت دادہ شد۔ باید کہ ہمیشہ وہ بار خواندہ باشد و ترک نہ کند حضرت جد امجد پیر و مرشد برحق قطب زمان شاہ میر محمد قلندر مارا اجازت دادہ بودند و تاکید بلیغ فرمودہ بودند چنانچہ بعنایت الٰہی و دعائے حضرت پیر و مرشد تا ایں دم کہ عمر من بہ ہفتاد و پنج سال رسیدہ است میخوانم۔ بتاریخ بست یکم ربیع الاولی ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۲ر فروری ۱۸۸۱ء روز دوشنبہ نوشتہ شد و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین"

پہلی شادی مولوی نور الحسن کو مدرسہ میں داخل ہوئے چند ہی ماہ گذرے تھے کہ ان کی شادی قرار پائی۔ مدرسہ سے رخصت لے کر وطن آئے۔ اور ۷ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ مطابق ۲۰ر اکتوبر ۱۸۸۱ء کو ان کی ..... شادی اپنے حقیقی چچا مولوی محمد احسن کی بیٹی سے ہوئی۔ اسی مجلس میں ان کے چھوٹے بھائی مولوی انوار الحسن کا بھی عقد ہوا۔ جد امجد مولوی حسن بخش نے نکاح پڑھایا۔ دو روز کے بعد جشن مسرت شروع ہوا۔ تین دن تک ارباب برادری کی دعوت رہی اور عیش و نشاط کی محفلیں ہوئیں۔ مبارک سلامت ہوئی۔ سہرے پڑھے گئے۔ قطعات تاریخ لکھے گئے۔ مولوی محمد محسن کے قدیم رفیق منشی امیر احمد امیرؔ مینائی کی تاریخ لاجواب تھی۔

مخدوم و محب و محسن ما لازال کاسمہ مسماہ
از فطرت اوست قلب واقف وز سیرت او زمانہ آگاہ

ف۔ امیر مینائی نے ایک سہرا بھی کہا تھا اور اس کا ایک شعر ہنوز اہل وطن کی زبان پر ہے "تخت کی رات چھپر کھٹ پہ قدم رکھتے ہی ٭ کھا گیا جھوک تو پریوں نے سنبھالا سہرا"

امسال بطوئے ہر دو فرزند | نور و انوار بارک اللہ
بنو د علو شان ہمت | چندانکہ بیان اوست کوتاہ
آوازۂ دلنوازیش گشت | آویزۂ گوش انجم و ماہ
بنوشت امیر سال تاریخ | در برج شرف دو مہر دو ماہ

شادی و غم دنیا میں توام ہیں۔ جہاں بجتے ہیں نقارے وہاں ماتم بھی ہوتا ہے۔ جشن شادی سے فارغ ہو کر مہینہ پوری ہونے پائی تھی کہ جد امجد بیمار ہوئے اور ۱۹ ربیع الاول سنہ ۱۳۰۱ھ کو مولوی حسن بخش راہی باغ فردوس ہو گئے۔ ع

ہاتفے از بہر تاریخش نوشت | جائے پاکش باد الٰہی در بہشت
سنہ ۱۳۰۱ھ

ماہ صیام کا خیر مقدم

(حضرت ریاض مرحوم)

یہ رباعیاں بھی جناب شیخ ارشاد حسین صاحب ذائق خیرآبادی وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد سے ملی تھیں۔ اصل مسودہ خود مصنف کے قلم کا صاحب ممدوح کے پاس محفوظ ہے۔ ایڈیٹر

کان میں آئی ہلال رمضاں کی آواز | تیس دن کو گئی اب پیر مغاں کی آواز
کوئی نسبت ہی نہیں تلقل مینا کو ریاض | ہائے وہ رونے میں مغرب کی اذاں کی آواز

صوم میں لوٹتے رہتے ہیں تلاوت کے مزے | بڑھ کے نعمت سے ہیں اللہ کی رحمت کے مزے
شام ہوتے ہی پہونچ جاتے ہیں مسجد میں ریاض | گھر میں اللہ کے آجاتے ہیں دعوت کے مزے

رند ناکام کو کچھ نشہ سا ہو جاتا ہے | یوں ہی سا نام کو کچھ نشہ سا ہو جاتا ہے
صدقے اے لذت افطار پس توبہ بھی | بے پئے شام کو کچھ نشہ سا ہو جاتا ہے

مجذوب کی بڑ

(جناب خواجہ سید عزیز الحسن غوری صاحب مجذوب بی اے اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس)

چمکنے لگا سر بہ سر نور ہو کر | میں جل جانے والا نہیں طور ہو کر

تری یاد میں خود سے بھی دور ہو کر | میں بس رہ گیا نور ہی نور ہو کر

نہ پاس آؤ اتنے ملو دور ہو کر | میں کچھ اور کہہ دوں نہ منصور ہو کر

سرِ دار ہو کر سرِ طور ہو کر | ترے پاس آیا بڑی دور ہو کر

حدیں عشق کی کر رہے ہیں وہ قائم | کبھی پاس آ کر کبھی دور ہو کر

تصور سلامت تحیر سلامت | میں بیٹھا ہوں اپنی جگہ طور ہو کر

اب اتنی رعایت تو اے آسماں ہو | نئے غم ملیں پچھلے غم دور ہو کر

میں کس کے لیے جان دینے چلا ہوں | چلی آ رہی ہے قضا حور ہو کر

کوئی دل لگی ہے یہ اے شیخ رندی | بہت ہوش رکھنا ہے مخمور ہو کر

چھپانے کو ہم تو چھپاتے ہیں دونوں | رہے گا یہ افسانہ مشہور ہو کر

نظر کیا کروں اب سوئے جام و مینا | تری مست آنکھوں کا مخمور ہو کر

عجب رنگ لائی ہے اب میری مستی | تقدس کے جامے میں مستور ہو کر

دعائیں کرو شیخ جی دفع غم کی | کہیں پی نہ بیٹھوں میں مجبور ہو کر

وہ ناکام الفت ہے عاشق تمہارا | رہا وصل میں بھی جو مہجور ہو کر

چلا آ رہا ہے کھنچا اک زمانہ | کشش اسقدر اسقدر دور ہو کر

خوشامد درآمد تصنع تملق | سبھی کچھ کیا دل سے مجبور ہو کر

گھٹا ہے کہ اُمڈی چلی آ رہی ہے | دعا کس نے کی نشہ میں چور ہو کر

بدلنے لگے کروٹیں اہل مرقد | ذرا دور ہو کر۔ ذرا دور ہو کر

نہ چھونا کہ بس آگ ہی ہو گیا ہے | مبدل بہ مے آبِ انگور ہو کر

سبھی تیرے عشاق ہوتے ہیں واصل | کوئی پاس رہ کر کوئی دور ہو کر

میں مجذوب ہوں جذبِ الفت سلامت | بچو گے کہاں مجھ سے تم دور ہو کر

نظرے خوش گذرے

اکتوبر اور نومبر کا مشترکہ پرچہ پیش کیا جاتا ہے۔ اسکی نوبت یوں آئی کہ اکتوبر کے دوسرے ہفتہ سے ۱۵ر نومبر تک ایک ماہ سے زائد کا وقت ایسے حالات میں گذرا کہ الناظر پر توجہ کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ کاپیاں لکھی جاتی رہیں مگر اُن کی صحت و ترتیب اور پھر طباعت کی نگرانی کے لیے وقت نہ نکالا جا سکا۔

الناظر کے اس دور کے پہلے پرچہ میں ظاہر کیا گیا تھا کہ اب مجلسی و سیاسی خدمات کی اہلیت نہیں رہی اسلیے یکسوئی سے الناظر کی خدمت ہو سکے گی۔ ۱۹۳۲ء سے برابر اسی پر عمل تھا بلکہ میلاد شریف کی محفلوں یا دعوتی جلسوں کے سوا عام طور پر ہر قسم کی قومی و ملکی مجالس میں شرکت سے بھی احتراز کیا جاتا تھا مگر حیدرآباد سے واپسی کے تھوڑے ہی دنوں بعد بعض بزرگوں نے پہلے ایک تبلیغی جلسہ کے تعلق میں گرفتار کیا اور اُسکے بعد مدح صحابہ کمیٹی کا سکریٹری بنا دیا جس کے سلسلہ میں گذشتہ مئی سے کافی وقت صرف ہو رہا ہے اور نہیں معلوم ابھی کتنے دنوں تک اور مصروفیت رہے گی۔

اکتوبر کے اُن چھ دنوں کے سوا جو اُردو کا نفرنس کے سلسلہ میں بدایوں و علی گڈھ میں گذرے باقی تقریباً ایک ماہ کا پورا وقت اسی کمیٹی کی خدمت میں صرف ہوا۔

اب ماہ صیام کی برکت سے خانہ نشینی اور سکون خاطر حاصل ہے تو الناظر کا یہ مشترکہ پرچہ تیار کیا گیا۔ اسکے مجموعی حجم میں کمی کر دی گئی ہے تاکہ رمضان کے اندر ہی یہ پرچہ شائع ہو جائے اور عید کے بعد دسمبر نمبر کی طباعت کا کام شروع کیا جا سکے۔ انشاء اللہ آئندہ اس کمی کی تلافی کر دی جائے گی۔

۱۴ر نومبر کو مدح صحابہ کے سلسلہ میں جو وفد گورنر صوبہ متحدہ کے پاس گیا تھا اُس سے وعدہ کیا گیا ہے کہ ایک غیر جانبدار کمیٹی مقرر کی جائے گی جس کی رپورٹ کی بنا پر گورنمنٹ اپنا فیصلہ صادر کرے گی۔ اس کمیٹی کا تقرر جب ہوگا تو اُس کے روبرو تقریباً اسی طرح پیروی کرنا ہوگی جس طرح عدالت میں کوئی مقدمہ لڑا جاتا ہے۔ اور اگرچہ یہ سارا کام قانون داں اصحاب سے متعلق رہے گا۔ لیکن کمیٹی کے سکریٹری کو تحقیقات کے دوران میں بلکہ اُس سے کچھ روز قبل سے ہمہ تن اسی کام میں منہمک رہنا پڑے گا۔ اس کا ذکر اس لیے کرنا پڑا کہ ممکن ہے آئندہ بھی اس تحریک کے سلسلہ میں الناظر کی خدمت سے قاصر رہوں اور کسی پرچہ کی اشاعت میں تاخیر ہو۔

اکتوبر کے وسط میں دفعتہً اخباروں میں چھپا کہ "پریم چند" کا انتقال ہو گیا۔ ابھی اپریل میں کانگریس کے

اجلاس کے موقعہ پر وہ لکھنؤ آئے تھے تو اپنی عادت دیرینہ کے بموجب دفتر الناظر میں بھی تشریف لائے تھے اور خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے اور چھ مہینے کے اندر ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے اُن کی صحت میں بھی اُس وقت کوئی خاص خرابی نہ تھی۔ ۱۹۳۴ء میں وہ سینما کے لیے قصوں کی ترتیب کرنے بمبئی طلب کیے گئے اور وہاں چھ سات مہینے رہے۔ کہتے تھے کہ لڑکی کی شادی کے لیے روپیہ کی ضرورت تھی اس لیے میں نے یہ خدمت قبول کر لی اور تقریباً پانچ ہزار روپیہ مل گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی کی مرطوب آب و ہوا کے بدولت اُن کے پھیپھڑے متاثر ہو گئے تھے جو برسات شروع ہوتے ہی موجب آزار بن گئے۔ کیونکہ بعد کو اطلاع ملی کہ وفات سے قبل تین مہینے تک دق میں مبتلا رہے اور بالآخر اسی موذی مرض میں انتقال کیا۔

منشی ”پریم چند“ کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ اور وطن بنارس۔ پہلے کچھ دنوں ”نواب رائے“ کے فرضی نام سے افسانے لکھتے رہے اُس کے بعد ”پریم چند“ کا نام اختیار کیا۔ عرصہ تک معلمی کی خدمت انجام دی اور سرکاری محکمۂ تعلیم سے منسلک رہے۔ مگر تحریک ترک موالات کے زمانہ میں ملازمت سرکاری چھوڑ کر کانگریس میں شریک ہو گئے۔ اُس وقت سے آخر وقت تک کانگریس سے وابستہ رہے۔

۱۹۱۵ء میں راقم الحروف سے پہلی بار ملنے تشریف لائے۔ پابند وضع ایسے تھے کہ زندگی کے آخر سال تک یہی معمول رکھا کہ جب لکھنؤ آتے تو دفتر الناظر کو ضرور سرفراز کرتے۔ درمیان میں چند سال تک اُن کا قیام لکھنؤ ہی میں رہا تو اُس زمانہ میں زیادہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

مختصر افسانہ نویسی میں جو شہرت پریم چند کو حاصل ہوئی کسی دوسرے ادیب کو میسر نہ آئی۔ اگرچہ ترک ملازمت کے بعد سے افسانہ نویسی کو بطور پیشہ کے اختیار کر لینے کی بنا پر اُن کے اس دور کے افسانوں میں اگلی سی خوبی نہیں رہی تھی پھر بھی بیان کی سادگی اور ہندوستانی زندگی کی مصوری کے لحاظ سے اُن کے افسانے اپنی آپ نظیر ہیں۔

دس بارہ سال قبل تک وہ ہندی ادب سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے حتے کہ جب معاشی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ہندی لکھنا شروع کی تو اُن کا خود بیان تھا کہ پہلے وہ اُردو میں افسانہ لکھتے اُس کے بعد ہندی میں اُسے منتقل کرتے۔ رفتہ رفتہ ہندی لکھنے میں مشاق ہو گئے۔

اُن کو شکایت تھی کہ اردو داں طبقہ کتابوں کی خریداری میں ایسا فیاض نہیں ہے جیسا ہندی داں گروہ حالانکہ جہاں تک اُردو کتابوں کی اشاعت کا سوال ہے پریم چند کی کہانیاں، چند مشہور مصنفین کو چھوڑ کر سب سے زیادہ فروخت ہوتی ہیں۔

اگر پریم چند کی اُردو کتابیں اُسی کثرت سے فروخت ہوتیں جس قدر اُن کی ہندی کتابیں بکتی رہیں تو اُن کو ہندی کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ ایک بار ہندی کی طرف مائل ہو جانے اور اس کی خدمت کو ذریعہ معاش بنانے کے بعد تو وہ مجبور تھے کہ وقت کا بیشتر حصہ ہندی ہی کی خدمت میں صرف کریں۔ چنانچہ چند سال سے بنارس میں اُنھوں نے ایک ہندی پریس قائم کیا تھا اور لکھنؤ کے ہندی رسالہ مادھری سے جب تعلق نہ رہا تو وطن جا کر خود اپنا رسالہ ہنس جاری کیا۔ حال ہی میں اسی رسالہ ہنس کو بھارتیہ ساہتیہ پرشد نے اپنا مبلغ بنا لیا تھا۔

پریم چند کی وفات سے اردو اور ہندی ادب کو جو نقصان عظیم پہنچا ہے اُس کی تلافی ہونا مشکل ہے۔ اور اُن کے نیازمندوں کو تو زندگی بھر اُن کی خوش مزاجی، ملنساری، وضعداری اور محبت یاد آتی رہے گی۔ پریم چند کے غمزدہ پس ماندگان ہم سب کی دلی ہمدردی قبول کریں۔

---

۵۶ صفحے تک اس پرچہ کی طباعت ہو چکی تھی کہ روزانہ اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حضرت اصغر گونڈوی کا انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم پر کچھ عرصہ ہوا فالج کا اثر ہو گیا تھا مگر گذشتہ اپریل میں جب ایک وکیل دوست کے یہاں اتفاقیہ ملاقات ہوئی اور مزاج پُرسی کی گئی تو اطمینان دلایا تھا۔ دو ماہ ہوئے ایک گرامی نامہ بھی وصول ہوا تھا جس میں ناسازی طبع کا کچھ ذکر نہ تھا اس لیے خیال ہوا کہ اب بفضلہ تندرست ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ دفعتہً مرض دوبارہ عود کر آیا۔

اصغر صاحب سے راقم الحروف کے تعلقات نہ تو دیرینہ تھے اور نہ گہرے۔ گذشتہ دس بارہ سال کے اندر پانچ چھ بار سرسری ملاقات کی نوبت آئی مگر ایک عزیز سے جن کا افسوس ہے کہ گذشتہ سال انتقال ہو گیا اور جو گونڈہ میں بہت روز سے تھے اصغر صاحب کی دوستی تھی اور اُنھیں نے ہمیں ایک دوسرے سے ملایا تھا اس کا اثر یہ تھا کہ جب کبھی ملتے عزیزانہ محبت سے پیش آتے۔

اصغر صاحب کا مرتبۂ شاعری گذشتہ دس سال کے اندر بہت کچھ معرض بحث میں رہا۔ اور اس قدر موافق و مخالف تحریریں شاید ہی زمانہ حال کے کسی شاعر کے متعلق نکلی ہوں۔ یہ امر بجائے خود مرحوم کی شاعرانہ جلالت کی دلیل ہے اور اُن کے تازہ مجموعہ سرود زندگی میں مولانا ابوالکلام کے سے سخن سنج نے جس قدر داد اُن کے شاعرانہ کمالات کی دی ہے اُس کے بعد تو کچھ کہنے کی حاجت ہی نہیں رہتی۔

الناظر کے اسی نمبر میں ہمارے ہم وطن بزرگ منشی اظہر علی صاحب آزاد کے اعتراضات درج ہوئے ہیں اور اس مضمون کی وجہ سے جناب منشی نانک چند صاحب عشرت کے مضمون "نیاز صاحب کی جرأت بیجا" کی دوسری

قسط جو کافی طولانی ہے رُک گئی۔ عشرت صاحب نے کلام اصغر کا گہرا مطالعہ کیا ہے اس لیے یہ امید بیجا نہ ہوگی کہ اس سلسلۂ مضامین کے بعد وہ آزاد صاحب کے اعتراضات پر بھی توجہ فرمائیں گے تاکہ جن مقامات پر محض ابہام اور اشارات کی وجہ سے ناقد کو غلط فہمی پیدا ہوئی ہو اُن کی تصریح و توضیح ہو جائے۔

اصغر صاحب، ہندوستانی اکیڈمی کے "تماہی" رسالہ ہندستانی کی ادارت کے لیے غالباً ۱۹۲۹ء میں منتخب کیے گئے تھے اور اُس وقت سے اس خدمت کو انجام دے رہے تھے۔ ہمیں یہ رسالہ بالاستیعاب دیکھنے کا موقع نہیں ملا مگر ابتدائی بعض پرچوں میں اصغر صاحب کی تحریریں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ وہ . . . . . نثر بھی بہت عمدہ لکھتے تھے، حالانکہ عام طور پر شاعروں میں اس بات کی کمی پائی جاتی ہے۔

یہ سال دنیائے ادب کے لیے نہایت منحوس ثابت ہوا ہے۔ چھ مہینے سے کم میں منشی ممتاز حسین، مولوی نور الحسن، بابو دھنپت رائے (پریم چند) اور اصغر گونڈوی جیسے خادمان اُردو کا انتقال ہو گیا اور آخر الذکر دونوں حضرات کی عمر تو ساٹھ سال کی بھی نہیں ہوئی۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت نعیم عطا فرمائیں اور اُن کے پسماندگاں کو توفیق صبر۔

---

۲۴ اور ۲۵ اکتوبر کو علی گڈھ میں مولوی عبدالحق صاحب کے طلب کردہ محبان اردو کا ایک اجتماع اس غرض سے منعقد ہوا کہ انجمن ترقی اُردو کے کام کو وسعت دینے کے متعلق جو تجاویز مولوی صاحب نے مرتب کی تھیں اُن کے بارہ میں شوریٰ کیا جائے۔

اس اجتماع میں قدرتاً اکثریت علی گڈھ کے لوگوں اور صوبۂ متحدہ کے نمائندوں کی تھی پھر بھی حیدر آباد سے مولوی صاحب کے علاوہ نواب ممتاز یار الدولہ سکریٹری مدرسہ آصفیہ، نواب مہدی یار جنگ صدر المہام سیاسیات و تعلیمات، مولوی سید ہاشمی فرید آبادی اسسٹنٹ ہوم سکریٹری، مولوی محمد الیاس برنی ناظم دار الترجمہ، مولوی حمید احمد انصاری رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی، ڈاکٹر محی الدین قادری معلم اردو اور ڈاکٹر عبداللطیف معلم انگریزی۔ بھوپال سے انجمن ترقی اُردو کے صدر نواب مسعود جنگ معین المہام تعلیمات۔ پنجاب سے مسٹر عبداللہ یوسف علی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور میاں بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں۔ دہلی سے پنڈت امرناتھ ساحر، شمس العلما پروفیسر عبدالرحمن، پروفیسر ڈاکٹر سید اظہر علی، ڈاکٹر سلیم الزماں اور جامعہ ملیہ کے اصحاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، مسٹر محمد مجیب، حامد علی خاں نیجر مکتبہ اور عبداللطیف خاں منیجر جامعہ پریس۔ بہار سے آنریبل مسٹر عبدالعزیز وزیر تعلیم، ڈاکٹر سید محمود اور قاضی عبدالودود بیرسٹر ایڈیٹر معیار۔ کلکتہ سے پروفیسر ناصر علی شرقی اور مسٹر عبدالرحمن صدیقی اور صوبہ متوسط سے مسٹر اسرار احمد ایڈیٹر امید تشریف لائے تھے۔

صوبہ متحدہ کے اصحاب میں راجہ صاحب محمود آباد، سر شاہ محمد سلیمان، مولوی سید محفوظ علی، مولانا نظامی بدایونی، سید سجاد حیدر، مولانا سید سلیمان، مولوی عبدالماجد، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، پروفیسر سید مسعود حسن رضوی، مسٹر رام بابو سکسینہ پبلسٹی افسر، اور مولوی مہیش پرشاد معلم فارسی وارد و بنارس یونیورسٹی اور علی گڑھ کے حضرات میں یونیورسٹی کے اساتذہ اور ایجوکیشنل کانفرنس کے کارکنوں کے علاوہ ڈاکٹر ضیاء الدین، نواب صدر یار جنگ، خان بہادر شیخ عبداللہ خان بہادر عبدالرحمن خاں، خاں صاحب میر ولایت حسین، مسٹر سلطان حیدر جوش ڈپٹی کلکٹر شریک ہوئے۔

ایک جاپانی پروفیسر صاحب (جن کا نام غالباً سیگوسے ہے) نے بھی جو آجکل ہندوستان میں وارد ہیں اور اُردو زبان سے واقف ہیں کانفرنس کو اپنی شرکت سے سرفراز کیا۔

کانفرنس کا پیش نامہ (ایجنڈا) علی گڑھ جانے سے قبل ہی وصول ہو گیا تھا جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ ۲۴ر اکتوبر کو ۳ بجے سے ۵ بجے تک تحریک صدارت، خطبۂ صدارت، پیغامات، بیان سکریٹری انجمن، منشی پریم چند کی وفات پر اظہار افسوس کے بعد کانفرنس کی اجازت سے مفصلہ ذیل کمیٹیوں کا انتخاب ہوگا۔

(۱) صوبہ داری مرکزوں کی کمیٹی۔ (۲) اشاعت زبان کی کمیٹی۔ (۳) ہندوستانی اشاعت خانہ کی کمیٹی۔ (۴) اصلاح زبان کی کمیٹی۔

تاکہ وہ مجوزہ مسائل پر غور کرنے کے بعد دوسرے اجلاس میں اپنی تجاویز پیش کریں۔

۲۵ر اکتوبر کا دن ۱۰ بجے سے ایک بجے تک اور ضرورت ہوئی تو پھر ۳ بجے سے ۵ بجے تک کمیٹیوں کی تجاویز اور اُن پر بحث کے لیے رکھا گیا تھا۔

چنانچہ پہلے دن ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے جو باوجود علالت اور ڈاکٹری ممانعت کے تھوڑی دیر کیلیے جلسہ کا افتتاح فرمانے کی غرض سے تشریف لائے تھے، اسی عذر کی بنا پر شرکاء جلسہ کے خیر مقدم اور تحریک صدارت کی خدمت نواب صدر یار جنگ بہادر کے سپرد کی جنھوں نے اُن کا استقبالی خطبہ پڑھ کر سنایا اُس کے بعد راجہ صاحب محمود آباد کرسی صدارت پر رونق افروز ہوئے اور مولوی نور الحسن نیر، منشی پریم چند اور پنڈت شیو نرائن شمیم کی تعزیت کی تجویز منجانب صدارت پیش ہوئی اور حاضرین نے استادہ ہو کر منظور کی۔ پھر راجہ صاحب نے اپنا صدارتی خطبہ پڑھا اور سکریٹری صاحب نے انجمن کی کارگذاری کے متعلق مختصر سا بیان پڑھ کر مہاراجہ سرکشن پرشاد، سر اقبال، سر تیج بہادر سپرو اور پنڈت سندر لال وغیرہ کے پیغامات ہمدردی سنائے اور حسب ذیل کمیٹیوں کے بنائے جانے کی اجازت جلسہ سے چاہی۔ کمیٹی اصلاح زبان، ادبی کمیٹی، کمیٹی طبع و اشاعت اور یہ اعلان کیا کہ دوسرے دن ۸ ½ بجے سے ایک بجے تک ان کمیٹیوں کا جلسہ ہوگا۔

دوسرے دن اولڈ بوائز لاج میں جہاں مولوی عبدالحق صاحب اور بعض دیگر حضرات مقیم تھے۔ ان

کمیٹیوں کے اکثر اراکین یکجا ہوئے اور کئی گھنٹہ کی بحث و گفتگو کے بعد طے پایا کہ

۱۔ اصلاح زبان کی کمیٹی میں ۱۱ اراکین رکھے جائیں اور کمیٹی کو چار مزید نام اضافہ کرنے کا حق رہے۔ حسب ذیل اصحاب کمیٹی کے رکن تجویز ہوئے۔

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی (۲) مولوی رشید احمد صدیقی (۳) مولوی عبدالماجد دریا بادی (۴) ڈاکٹر عابد حسین (۵) قاضی عبدالودود (۶) پنڈت منوہر لال زتشی (۷) پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی (۸) سید مسعود حسن رضوی (۹) میاں بشیر احمد (۱۰) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (۱۱) ڈاکٹر محی الدین قادری۔

اصلاحی کمیٹی کا مقصد یہ قرار دیا گیا کہ وہ زبان کے اختلافی مسائل کے متعلق ملک کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں کی رائیں حاصل کرکے اُن رایوں کی بنا پر کوئی فیصلہ صادر کرے اور اُس فیصلہ کی ترویج و اشاعت کی کوشش کرے۔ نیز اُن تمام تجویزوں پر غور کرے اور اُن کے متعلق فیصلہ کرے جو اُردو رسم الخط سے تعلق رکھتی ہوں اور اُردو کے طریقہ طباعت پر بھی غور کرے یعنے رسم الخط کی اصلاح اور طباعت کی سہولت کے وسائل بہم پہونچائے۔

۲۔ ادبی کمیٹی کے لیے ۲۵ اراکین رکھے گئے اور ۱۰ ناموں کے اضافہ کی گنجائش رکھی گئی۔ حسب ذیل اصحاب رکن تجویز ہوئے:۔

(۱) مولانا سید سلیمان ندوی (۲) ڈاکٹر عابد حسین (۳) مولوی عبدالماجد دریا بادی (۴) سرتیج بہادر سپرو (۵) نواب صدر یار جنگ (۶) پنڈت منوہر لال زتشی (۷) سید مسعود حسن رضوی (۸) پنڈت کشن پرشاد کول (۹) ڈاکٹر تارا چند (۱۰) قاضی عبدالودود (۱۱) پنڈت دتاتریہ کیفی (۱۲) خواجہ غلام السیدین (۱۳) میاں بشیر احمد (۱۴) ڈاکٹر محی الدین قادری (۱۵) حافظ محمود شیرانی (۱۶) پروفیسر الیاس برنی (۱۷) ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۸) مولانا حسرت موہانی (۱۹) سید ہاشمی فرید آبادی (۲۰) خان بہادر رضا علی وحشت (۲۱) مولانا ظفر علی خاں (۲۲) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (۲۳) افضل العلما مولوی عبدالحق مدراسی (۲۴) نواب مہدی یار جنگ (۲۵) راجہ صاحب محمود آباد۔

ادبی کمیٹی کے مقاصد یہ قرار دیے گئے کہ

۱۔ ادبی و علمی کتابیں اور رسالے شائع کرنا۔

۲۔ مناسب کتابوں کے ترجمے یا تالیف و تصنیف کے لیے انتخاب اور اس کے لیے مولفین و مصنفین تجویز کرنا۔

۳۔ ضروری مسائل پر کتابیں اور رسالے لکھوانا۔

۴۔ اشاعت کے لیے کمیاب کتابیں منتخب کرنا۔

۳۔ اشاعت خانہ کی کمیٹی کے حسب ذیل اراکین تجویز ہوئے:۔

(۱) عبد اللطیف خاں صاحب منیجر جامعہ پریس (۲) مولوی مسعود علی ندوی منیجر دار المصنفین (۳) حامد علی خاں صاحب منیجر جامعہ ملیہ بکڈپو (۴) سید امتیاز علی صاحب تاج (۵) ڈاکٹر عبد الستار صدیقی (۶) پروفیسر الیاس برنی (۷) ظفر الملک (۸) مولوی نظامی صاحب ایڈیٹر ذوالقرنین (۹) مسٹر عبد الرحمن صدیقی۔

یہ کمیٹی انجمن کے اُردو اشاعت خانہ کے لیے اسکیم تیار کرے گی۔

۴۔ یہ طے پایا کہ انجمن ترقی اردو کا مرکز دہلی قرار دیا جائے اور جس قدر جلد ممکن ہو انجمن کے دفاتر وغیرہ دہلی منتقل کردیے جائیں اور وہاں اردو کتابوں کا ایک وسیع کتب خانہ اور اشاعت خانہ بھی قائم کیا جائے۔

۵۔ طے ہوا کہ انجمن کے صوبہ داری مرکز برطانوی شہروں اور دیسی ریاستوں میں قائم کیے جائیں اور تقریباً ۵۰ شہروں کے نام اس غرض کے لیے تجویز کیے گئے۔ صوبہ متحدہ میں علی گڈھ، الہ آباد اور لکھنؤ تین مرکز تجویز ہوئے ہیں۔ یہ مرکزی شاخیں انجمن کے مشورہ سے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اردو کی ترقی و اشاعت کے حسب ذیل کام انجام دیں گی۔

(۱) اردو کے مکاتیب قائم کرنا۔

(۲) بالغ العمر اور پیشہ ور لوگوں کے لیے مدارس شبینہ قائم کرنا۔

(۳) اردو کی توسیع و اشاعت کے لیے دورہ کرنا

(۴) ادبی جلسے منعقد کرنا۔

(۵) سرکاری مدارس اور عدالتوں میں اردو کے قائم رکھنے اور رواج دینے کیلیے کوشش کرنا۔

۲۵ر اکتوبر کو سہ پہر کے عام جلسہ میں جس کی صدارت نواب مہدی یار جنگ نے کی یہ تجاویز پیش ہو کر منظور ہوئیں۔ البتہ اتنی ترمیم کی گئی کہ اصلاحی کمیٹی اور ادبی کمیٹی کے ارکین کے لیے ۳ سال مدت قرار دی گئی۔

کانفرنس کی اس کارروائی کے علاوہ مجلس استقبالیہ کی جانب سے متعدد تقریبیں رکھی گئی تھیں۔ ۲۴ر کو افتتاح کانفرنس سے قبل ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کی جانب سے مہمانوں کا لنچ تھا اور کانفرنس کے خاتمہ پر مسلم یونیورسٹی کی انجمن اُردوئے معلٰے کی طرف سے سلطان جہاں منزل کے چمن میں پارٹی دی گئی جہاں شوقین حضرات کو یکجا کرکے تصویر بھی لی گئی۔

مغرب کے بعد یونین ہال میں طلبہ کی جانب سے مہمانوں کا استقبال کیا گیا۔ اس موقع پر پنڈت دتاتریہ کیفی صاحب نے ایک مقالہ "اُردو ہماری زبان" پڑھ کر سنایا جو مطبوعہ صورت میں بعد کو تقسیم بھی ہوا۔ اس کے بعد یونین کے وائس پریسیڈنٹ اور سکریٹری نے انگریزی زبان میں راجہ صاحب محمود آباد، نواب مہدی یار جنگ، آنریبل سید عبد العزیز، مسٹر عبد اللہ یوسف علی اور مہاپانی پروفیسر صاحب و دیگر مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور

ان صاحبوں نے اُردو میں شکریہ ادا کیا۔ جاپانی پروفیسر صاحب نے بھی شکریہ کے طور پر ایک اُردو تحریر پڑھ کر سنائی۔

رات کو اسٹریچی ہال میں ڈنر تھا جہاں پروفیسر حلیم صاحب پرو وائس چانسلر اور مسٹر نعمان زبیری نے انگریزی میں مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور مہمانوں کی جانب سے مسٹر عبداللہ یوسف علی نے انگریزی میں اور مولوی الیاس برنی صاحب نے اردو میں میزبانوں کا شکریہ ادا کیا۔

۲۵ کو کانفرنس سے پیشتر نواب صدر یار جنگ کے یہاں دعوت ہوئی اور کانفرنس کے بعد سومنگ باتھ کے چمن میں انجمن تاریخ اسلام (مسلم یونیورسٹی) کی جانب سے پارٹی تھی۔ مغرب کے بعد اس جدید انجمن کے افتتاحی جلسہ میں مہمانوں کی شرکت ہوئی جہاں مولانا سید سلیمان صاحب کا لکچر تھا اور صدر جلسہ نواب صدر یار جنگ اور ڈاکٹر امیر حسن معلم تاریخ اسلام وغیرہ نے تقریریں کیں۔

رات کو وقار الملک ہال میں ڈنر ہوا اور ڈنر کے بعد پروفیسر عبدالمجید قریشی صاحب اور ایک طالب علم صاحب نے میزبانوں کی طرف سے اور مولوی عبدالحق صاحب اور مولوی الیاس برنی صاحب نے مہمانوں کی طرف سے اُردو میں تقریریں کیں۔ ڈنر کے بعد شوقین حضرات کی دلچسپی کے لیے محفل سرود منعقد ہوئی۔

کانفرنس کے ضروری حالات اور کارروائی درج کردی گئی۔ وقت مساعد ہوتا تو اس پر تبصرہ بھی کیا جاتا۔ مگر حجم میں ذرا سا اضافہ کرتے سے بھی اندیشہ ہے کہ یہ پرچہ عید کے قبل تیار اور شائع نہ ہوسکے گا اس لیے جو کچھ عرض کرنا ہے انشاءاللہ آئندہ نمبر میں درج ہوگا۔

اسی رمضان میں شمس العلما نواب علی حسن خاں سابق ناظم ندوۃ العلما نے انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پیرانہ سالی اور مسلسل علالت کی وجہ سے کئی سال ہوئے جب ندوہ کی نظامت سے مستعفی ہوگئے تھے۔ مرحوم صرف عالم و فاضل ہی نہیں بلکہ ادیب شاعر بھی تھے۔ فارسی اور اُردو دونوں زبانوں پر یکساں عبور تھا۔ فارسی میں ایک تذکرۂ شعرا اور اردو میں اپنے والد نامدار نواب صدیق حسن خاں مرحوم و مغفور کی بسیط سوانحعمری سیرۃ والاجاہی ۴ جلدوں میں اور نظرۃ الاسلام اور المدنیۃ فی الاسلام جیسی قابل قدر تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ رسالہ معارف میں گاہے گاہے آپ کے منظومات درج ہوتے رہتے تھے۔ انشاءاللہ اس باکمال بزرگ ملت کے مفصل حالات آئندہ پیش کیے جائیں گے۔

۹ دسمبر ۱۹۳۶ء

عام شہر میں مچا رکھا تھا ایسے پریشان و بدحواس ہوئے کہ تمام گھر مع کل مال و اسباب کے چھوڑ کر ایسے بھاگے کہ
باندہ میں میرے والد کے پاس جو قبل غدر وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے آکر دم لیا۔ اور اب وہ سب مع میرے
والد کے میرے ہمراہ الہ آباد واپس آنے پر آمادہ ہوئے۔ ایسی حالت میں نہ تو میں اُن کو فطرتاً چھوڑ سکتا تھا
اور نہ ایسے بڑے قافلہ کو بلا مزاحمت باغیان بیرحم کے لے جا سکتا تھا۔ علاوہ اس کے یہ بھی ظاہر ہے کہ
اُس وقت تک میرے پاس نہ تو کوئی سارٹیفکٹ صفائی ایام غدر مقام جالون اور نہ بابت قیام مقام
باندہ کے موجود تھا اور بغیر اسکے مقام مفتوحہ برٹش گورنمنٹ میں بھی جانا از مد خطرناک تھا۔ چنانچہ
خود باندہ میں جب انگریزی فوج نے اُسکو فتح کیا تھا تو سب سے پہلے مرزا امداد علی بیگ ملازم نواب
باندہ کو بلا سماعت عذر کے جو باظہار خیر خواہی کیا گیا تھا پھانسی پر چڑھا دیا تھا اور پھر جب حال
خیر خواہی اُسکے کا پایہ ثبوت کو پہونچا تھا اور عرائض اُسکے جو وہ باطلاع حالات نقل و حرکت
فوج اور بغاوت نواب باندہ کے بھیجتا رہا تھا دفتر الہ آباد میں برآمد ہوئے تھے تو کل املاک منضبطہ
اُسکے وارثان کو نہایت افسوس کے ساتھ واپس کر دی تھی۔ پس بلحاظ انھیں دوراندیشیوں کے
اولاً میں نے قیام باندہ کی نسبت مسٹر کارن صاحب بہادر سٹی مجسٹریٹ باندہ کو درخواست تحقیقات
چال چلن اپنے کی دی۔ انھوں نے تحقیقات باضابطہ کامل طور پر کی اور واسطے مزید اطمینان اپنے کے
کل تحصیلداران ضلع اور معززین رؤسائے شہر سے تفتیش عمل میں لاکر نہایت عمدہ سارٹیفکٹ
انگریزی عطا فرمایا بعدہٗ میں فقیرانہ بھیس میں جیسا کہ باندہ آیا تھا مقام کانپور گیا وہاں سے بھی
اسناد صفائی بابت ایام غدر ضلع جالون کے جناب مسٹر پیانہا صاحب و گریفتھ صاحب سے
(جن کا ذکر اوپر آچکا ہے اور اب وہ کانپور میں ڈپٹی کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر تھے) حاصل کر کے
باندہ واپس آیا تاکہ اپنے والدین و دیگر اقربا اپنے کو لے کر الہ آباد جاؤں مگر اُس وقت میں بھی
تمام شہر باندہ و گھاٹ چلہ تارہ کا وہی حال تھا جیسا کہ اوپر لکھا گیا اور جب میں کدورہ سے اپنی
بیار بی بی کو دیکھنے کے لیے باندہ آیا تھا تو میرے والد محمد سردار خاں صاحب مرحوم مع میری سوتیلی
ماں و سوتیلے بھائی بہنوں میرے کے زیر نگرانی باغیان تھے پس اس صورت میں بمقتضائے
فطرت انسانی اور دلیرانہ طبیعت اپنی کی یہ فرض میرا تھا کہ اپنے والدین اور دیگر قریبی رشتہ داروں
اپنے کو ایسی مخدوش جگہ سے نکال کر گھر پہونچا دوں۔ آخر ش سوچتے سوچتے یہ رائے قرار پائی کہ
علاقہ باندہ کے کل راستے چھوڑ دیے جاویں اور کسی طرح اپنے تئیں کدورہ پہونچانا چاہیے اور وہاں
سے بمدد نواب ریاست کدورہ جن سے میری ملاقات تھی شیر گدھ کے گھاٹ سے جو قریب اٹاوہ کے ہے

اور جسکے ٹھیکہ دار ممتاز علی خاں سے میرے والد کی ملاقات تھی عبور کرکے الہ آباد چلے جاویں لیکن افسوس ہے کہ قسمت میں ہنوز مصیبت لکھی تھی یہ تدبیر بھی کچھ کارگر نہیں ہوئی یعنے باندہ سے چلکر جب ہم سب موضع اچھرونڈ میں پہونچے جو کہ تخمیناً باندہ سے دو تین کوس ہوگا تو عین راستہ پر ایک بہت بڑا شوالہ وہاں تھا اور اُس میں قریب پانچسو کے فوج مسلح ریاست اجیگڈھ کی ٹھہری ہوئی تھی جس نے ہم لوگوں کو دیکھ کر فوراً گرفتار کرلیا اور قلعہ بھورگڈھ کو جو ندی کین کے بلند کنارہ پر متصل باندہ کے واقع ہے لے گئے۔ اور وہاں پانچ چھ روز قید سخت میں رکھ کر تمام مال و اسباب مع جملہ زیورہائے طلائی و نقرئی عورتوں اور بچوں کے لوٹ لیا اور پھر نہ معلوم کس مصلحت سے ایک رسید یا صفائی نامہ مجھ سے یا میرے والد سے لکھوا لیا کہ کل مال و اسباب اپنا فوج ریاست اجیگڈھ سے واپس پایا اور یا آنکہ اُنھوں نے لوٹ مار نہیں کی اور کل اسباب ہمارا محفوظ رہا اور چونکہ ہم اُن کے قابو میں تھے عدول حکمی نہ کرسکے اور بلا عذر سند مطلوبہ لکھدی۔ اُسکے بعد اُنھوں نے دس بارہ ڈونگے ندی کین پر مع ملاحوں کے جمع کئے اور ہم سب کو بلا لحاظ اسکے کہ ڈوبیں گے یا کہ بچیں گے بٹھال کر اُس پار اُتار دیا اور کہا کہ اب باندہ سے باہر نہ نکلنا۔ رخصت ہوتے وقت اُنکے افسران میں سے ایک بوڑھے شخص نے جسکو سب لوگ دوا کہتے تھے دس یا بارہ روپیہ نقد ہم لوگوں کو دیے اور کہا کہ اسکا دودھ مول لے کر اپنے شیرخوار بچوں کو پلایا کرو۔ بہرحال قہر درویش برجان درویش ہم لوگ نہایت شکستہ حالی میں باندہ لوٹ کر اپنے جائے قیام میں دوبارہ ٹھہرے اور پھر سب طرف سے مایوس ہوکر باندہ سے نکلنے کی کوشش اُس وقت تک نہیں کی جب تک کہ فوج انگریزی نے قلعہ بھورگڈھ میں آکر گولہ باری نہیں کی اُس وقت تمام شہر باندہ میں ہلچل مچگئی اور نواب باندہ بھی مع اپنی عورتوں کے ہاتھیوں پر بیٹھ کر بھاگ گئے اور فوج باغیان میں بھی بھگیڑ مچگئی اور ہم لوگ بھی اُس ہلڑ میں باندہ سے نکلکر موضع سردلی کی طرف بھاگے جس میں مسلمانوں کی آبادی تھی اور پرورش علی نامی ایک قانون گو اُس میں رہا کرتا تھا وہاں چار بجے شام کو پہونچے اور ایک عجیب تماشہ دیکھنے میں آیا یعنے ایک فوج نواب باندہ کی مع تین توپخانوں و سامان گولہ بارود کے وہاں عین سڑک پر ٹھہری ہوئی تھی شاید طلبی اُن کی انگریزی فوج کی آمد کی خبر سُنکر ہوئی ہو اُن میں سے بہت سے سپاہی چاہ پختہ پر جو عین سڑک پر متصل موضع مذکور کے واقع تھا غسل کر رہے تھے اور کچھ وضو کرکے نماز عصر کے تحیہ میں تھے۔ چونکہ مجھ کو بھی نماز مذکور ادا کرنا فرض تھا لہذا میں بھی اپنی سواری سے اُتر کر وضو کرنے لگا اُسوقت آواز توپوں کی جو باندہ کی طرف سے انگریزی فوج کی (دھیمی دھیمی) آرہی تھی سُن کر سپاہیان مذکور کے کان کھڑے ہوئے

اور وہ میرے ہمراہیان سے یہ سنکر کہ انگریزی فوج باندہ میں آگئی ہے ایسے بدحواس ہوئے کہ
جب میں نماز سے فارغ ہوا تو بجز توپوں اور گولہ بارود وغیرہ و دیگر سامان جنگ اور وردیہا ے
سپاہیان کے اور کوئی متنفس نظر نہ آیا اتنے عرصہ قلیل ہی میں جو نماز پڑھنے میں گذرا سب کے سب
کل سامان جنگ ویسا ہی چھوڑکر اور وردیاں اپنے جسم سے اُتار کر نہ معلوم کدھر بھاگ گئے اُس
وقت وہ میدان جہاں مختلف رنگ کی وردیاں پھیلی ہوئی پڑی تھیں نہایت خوشنما سین نظر آتا
تھا میرے ہمراہی میں سے بھی کوئی اُسوقت نہیں تھا وہ سب اپنی سواریوں پر میرے والد کے ساتھ کہ
وہ پرورش علی قانون گو کا مکان جانتے تھے اور میرے والد کی اُن سے ملاقات تھی چلے گئے تھے۔
اس سیر و تماشہ میں نماز مغرب کا وقت بھی آگیا تھا میں اُس سے بھی فارغ ہوکر جھٹ پٹے وقت
تن تنہا اپنے ذاتی ہتھیاروں سے مسلح ہوکر بتلاش اپنے آدمیوں کے اندر گاؤں کے گھس گیا۔
تھوڑی دور گیا ہونگا کہ ایک جگہ پر الاؤ جلتا تھا اور گرد اُسکے دس پندرہ آدمی بیٹھے ہوئے نظر آئے
میں اس جگہ وہاں سے خفی رہا کیونکہ مجھ کو نہ تو پرورش علی قانون گو کا مکان اور نہ اُدھر جانے کا
راستہ معلوم تھا اور نہ یہ جانتا تھا کہ کدھر سے ہوکر گاڑیبان گئے ہیں میرا خیال تھا کہ اس الاؤ کے گرد
جو بیٹھے ہیں وہ بھی مسلمان ہیں اور مجھ کو مسلمان سمجھ کر اس مصیبت میں میری مدد کرینگے اور جو کچھ میں دریافت
کروں گا وہ براہ ہمدردی صاف طور پر صحیح صحیح بتلادیں گے۔ الغرض میں اُن کے پاس گیا اور اُن سے
پوچھا کہ پرورش علی قانون گو کا مکان کدھر ہے۔ وہ سب مجھے دیکھ کر کھڑے ہوگئے اور نہایت
تپاک و اخلاق کے ساتھ پیش آئے اور کہا کہ ہمارے ساتھ چلو ہم تم کو پرورش علی کے مکان پر لے چلیں
میں ایک سادہ دلی سے اُن کے ساتھ بے کھٹکے ہولیا۔ وہ سب مجھ کو ایک تنگ گلی کے پاس لے گئے
اور مجھ سے کہا کہ ادھر سے ہوکر چلو اُس وقت میرے دل پر کچھ شبہ گذرا اور نیز اُن سب کے ہمراہ
ہونے پر کسی قدر خوف دل میں سمایا کہ مبادا اس میں کچھ دغا ہو۔ پس میں نے اُس گلی کے اندر جانے
سے انکار کیا اور کہا کہ اُس کشادہ راستہ سے مجھ کو لے چلو جس میں سے ہوکر گاڑیبان جاتے ہیں
اُنھوں نے کہا کہ وہ راستہ چکر کھا کر گیا ہے گلی میں ہوکر سیدھے نکل چلو۔ اور اسقدر اصرار کیا کہ میرے
دلی خطرات بڑھتے گئے۔ آخر جب میں نے دیکھا کہ یہ اپنی ہٹ سے باز نہ آوینگے تو دل مضبوط کر کے
توکل بخدا اُن سب کے ہمراہ گلی کے اندر گھسا اور وہ گلی اسقدر تنگ تھی کہ ایک آدمی سے زیادہ باہم
ملکر شانہ بشانہ کوئی جا نہیں سکتا تھا۔ آخرش دس بارہ آدمی میرے آگے پیچھے اور میں اُن کے
بیچ میں امید و بیم کی حالت میں آہستہ آہستہ چلا۔ نصف راستہ گلی کا مشکل سے طے کیا ہوگا کہ دہنے

طرف ایک دروازہ مکان کا نظر آیا قریب اُسکے پہونچکر اُنکے مُنھ سے ایک آواز بلند کھکار کی نکلی اور
اندر سے ایک دوسری آواز اُسکے جواب میں آئی کہ کوئی اچھا شکار ہے یا نہیں اُنھوں نے باہر سے
کہا کہ ہاں ایک موٹا شکار لائے ہیں۔ یہ سُنکر مجھے یقین ہوگیا کہ ان ظالموں نے میرے ساتھ دغا کی
اور مجھ کو یہ سمجھ کر کہ یہ منجملہ اُن باغی سپاہیان نواب باندہ کے ہے جنھوں نے غارتگری سے ہمیانیں
اپنی اشرفیوں سے بھر کر کمر سے کس کر مارا بچا چھپتے پھرتے تھے موٹا شکار تصور کیا۔ بہرحال اُنھوں
نے دروازہ کے پاس جو کھلا ہوا تھا اور تین چار آدمی اندر کی طرف میرے پکڑنے کو کھڑے تھے
مجھے لے جاکر کہا کہ اندر چلو یہاں تمہاری آؤ بھگت قرار واقعی کی جاوے گی۔ اُس وقت یہ سمجھ کر
کہ یہ سب میرے قتل پر آمادہ ہیں مایوسی چھاگئی اور نہایت پھرتی کے ساتھ میں نے چھ نالا تپنچہ
اپنی کمر سے نکال کر کُل نالیں اُس کی دروازہ کی طرف یکبارگی سر کردیں اور دونالی بندوق کی
ایک نال دہنی طرف اور دوسری بائیں طرف گلی کے خالی کردی۔ اس کارروائی سے دو آدمی
جو دروازہ کے سامنے اندر کی طرف کھڑے تھے تپنچہ کی زد سے اور اسی قدر یا اس سے زیادہ
دونوں جانب گلی کے بندوق کی ضرب شدید سے زمین پر گر کر ہلاک ہوگئے باقی سب کے سب
اس مہلک نظارہ سے بدحواس ہوکر بھاگ گئے۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوا اور گلی کی نعشوں پر جو
میرے راستہ پر تھیں پیر دھرتا ہوا اطمینان کے ساتھ باہر نکل آیا۔ تھوڑی دور تک گیا تھا کہ
میرے والد جو کہ میری تلاش میں نکلے تھے ملے انھوں نے میرے پیچھے رہ جانے پر مجھ کو بہت
کچھ غصہ میں ملامت کی اور پھر جب میری مصیبت کے واقعات سُنے تو جانبری پر میری خدا کا شکر
بجالائے اور پرورش علی قانون گو کے مکان پر پہونچکر یہ سب حال اُن سے کہا۔ اُن کو بھی ان
ظالموں کے اس غدار اور دغا بازی پر بہت غصہ آیا اور میری پیٹھ ٹھونک کے شاباشی دی اور کہا
کہ بڑی بہادری کے ساتھ بچکر آئے۔ اور چند آدمی اپنے ساتھ لے کر موقع واردات پر آئے اور
نعشیں اُٹھواکر نہ معلوم کہاں ڈلوادیں کہ اس طوائف الملکی میں کسی نے بازپرس بھی نہ کی
رفت گذشت ہوگیا۔ پرورش علی کے مکان پر اس عرصہ میں موضع اودھا سے کچھ لوگ میرے
بہنوئی کے رشتہ دار آگئے تھے اور پرورش علی نے بھی کچھ آدمی اپنے ہمارے ساتھ کر دیے
تھے ان سب نے ملکر ہم لوگوں کو بحفاظت تمام راجہ پور کے گھاٹ سے مع زنانی سواریوں وغیرہ کے
اُتار کر الہ آباد کے راستہ پر پہونچا دیا۔ یہاں سے الہ آباد بہت دور نہ تھا تین چار روز میں ہم لوگ
الہ آباد پہونچ گئے۔ یہاں پر مکان میں قفل سرکاری لگا تھا ناچار محلہ نخاس کہنہ میں اپنے

رشتہ داروں کے مکان میں ٹھہر گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ مسٹر جارج ہملٹن فرلنگ صاحب بہادر سابق ڈپٹی کمشنر جالون جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ولایت سے یہاں آگئے ہیں چونکہ وہ میرے مُربی تھے میں اُن سے ملنے کو اگلے دن صبح ہی کو چلا گیا اور والد میرے گورنمنٹ ہاؤس کی طرف حاضری دینے کو روانہ ہوئے صاحب ممدوح مجھ کو اور میرے سرٹیفکٹہائے صفائی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور مجھ کو صلاح دی کہ میں فوراً الہ آباد سے روانہ ہو کر ڈپٹی کمشنر ضلع جالون کو اپنی حاضری سے مطلع کروں اور ایک چٹھی بھی مجھ کو علاوہ ایک عمدہ سرٹیفکٹ کے لکھدی اور کہا کہ یہ سب کاغذات ڈپٹی کمشنر جالون کو دکھانا۔ میں فوراً جہاں تک جلد ممکن ہو سکا الہ آباد سے روانہ ہو کر ضلع جالون کو چلا گیا۔ وہاں کا رنگ میں نے بالکل بدلا ہوا دیکھا نہ تو اُس وقت وہاں کپتان براون صاحب (جو غدر میں ڈپٹی کمشنر تھے اور جو میری خیر خواہی کے حال سے بخوبی واقف تھے) موجود تھے اور نہ کوئی اور خیر اندیش میرا بجز مخالفین کے وہاں تھا۔ ڈپٹی کمشنر کے عہدہ پر کرنل ٹرنر صاحب ایک فوجی افسر مقرر تھے جن سے کبھی کی شناسائی میری نہ تھی اور نہ وہ مجھ کو جانتے تھے۔ راجہ گورسرائے جنکے لڑکے مسمیٰ تانتیا سے میری مخالفت تھی خیر خواہی کے جامہ میں پیش پیش تھے اور تمام عمال اُن کو سرپرست اپنا خیال کرتے تھے۔ آخرش جب میں نو یا دس بجے دن کے بنگلہ پر صاحب ڈپٹی کمشنر کے پہونچا تو اردلی کے سپاہی سے معلوم ہوا کہ صاحب کو اس وقت فرصت نہیں ہے سرشتہ داروں کے کمرہ میں رپورٹ خوانی کر رہے ہیں۔ میں نے ایک کارڈ پر نام اور عہدہ اپنا انگریزی میں لکھ کر چپراسی کو دیا کہ صاحب کو دیدیوے اور خود برآمدے میں چوکی پر بیٹھ کر منتظر طلبی اپنے کا رہا اور سرٹیفکٹہائے مذکورہ مع چٹھی فرلنگ صاحب کے میری جیب میں رہے کہ بروقت حضوری صاحب ممدوح کے روبرو پیش کرونگا۔ تھوڑی دیر بعد چپراسی مذکور واپس آکر زیر برآمدہ کھڑا ہوا اور اشارہ سے بُلا کر مجھ سے کہا کہ پیچھے پیچھے میرے چلے آؤ میں سمجھا کہ شاید حاضری لکھانے کو ہیڈ کلارک کے پاس کچہری لیے جاتا ہے مگر افسوس ہے کہ وہ شہر کی طرف چلا اور ایک پختہ عالیشان مکان کے دروازہ پر کھڑے ہو کر پہرہ کے سپاہی سے کواڑ اُس کے کھلوائے اور مجھ کو اشارہ کیا کہ اندر جا کر اپنے ہم رُتبہ عہدہ داروں سے ملکر دل بہلاؤ۔ اُسوقت میں سمجھا کہ سرشتہ دار کی نیش زنی اور صاحب بہادر کی لاعلمی سے یہ سب کارروائی براہ غلط فہمی ہوئی۔ اندر جا کر دیکھا تو ایک دالان وسیع میں منشی شیو پرشاد تحصیلدار کونچ اور حمید الزماں تحصیلدار ایٹہ اپنی اپنی دریاں فرش پختہ دالان میں بچھائے ہوئے بیٹھے ہیں وہ دونوں مجھے دیکھ کر نہایت متعجب

اور افسردہ ہوگئے مگر میں مسکرا کر حمید الزماں کے پاس بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ اور اسی وقت ایک عرضداشت
بہ اطلاع حالات یہاں کے اور جو کچھ مجھ پہ گذرا تھا درج کر کے فوراً مسٹر فرلینگ صاحب کی خدمت میں ایک
معتبر ملازم کے ہاتھ بمقام ہمیر پور (جو وہاں سے تخمیناً چالیس میل کے فاصلہ پہ ہوگا اور جہاں صاحب ممدوح
کلکٹر و مجسٹریٹ مقرر ہو کر الہ آباد سے آئے تھے) روانہ کر دی۔ پختہ سڑک اُسوقت نہیں تھی ہفتہ عشرہ تک
مجھ کو جواب کا انتظار کرنا پڑا۔ اس اثنا میں داروغہ جیل خانہ نے (جس میں ہر قسم کے قیدی و حوالاتی بکثرت
بھرے تھے) صاحب ڈپٹی کمشنر کو رپورٹ کی کہ منجملہ حوالاتیان جیل خانہ کے دس پندرہ جوان عورتیں
ایسی ہیں کہ جن کی موجودگی سے اندیشہ پیدا ہونے ناجائز تعلقات کا قیدیان بدرویہ سے ہے۔
اس پر صاحب ممدوح نے حکم دیا کہ اس قسم کی کل عوراتیں اس بڑے محل میں بھیجدی جاویں جس میں
چند تحصیلدار زیر حوالات ہیں۔ میرے جانے سے تیسرے روز محل مذکور میں عورات مذکورہ کا غول داخل
ہوا اور اُن سب کو ایک دوسرے دالان میں جو ہمارے دالان سے کسی قدر چھوٹا محاذ میں واقع تھا
بٹھا دیا اور اُن عورتوں میں سے بعض بعض عالی خاندان قوم مرہٹہ پنڈتوں کی تھیں جنکے مرد بھی
غالباً صدر جیل خانہ میں بہ الزام بغاوت زیر حوالات ہوں مگر یہاں سب ایک دوسرے سے اجنبی
تھیں و نیز آوارہ منش و دلگی باز تھیں اور نہایت زندہ دلی کے ساتھ بسر اوقات اپنی کرتی تھیں۔
منجملہ ہر سہ تحصیلداران کے منشی شیو پرشاد تحصیلدار کونچ مُسن آدمی تھے اور میں اپنے صدمات کی
وجہ سے نہایت پژمردہ دل تھا۔ حمید الزماں ایک جوان اور با مذاق آدمی تھے اُن سے کبھی دور
ہی دور سے صاحب سلامت اُن کی ہو جاتی تھی بہرحال ہمارے محل میں جو ایک سناٹا تھا وہ ان
عورتوں کی چہل پہل سے رفع ہوگیا تھا اور وہ وحشت جو پہلے تھی کسی قدر کم ہوگئی تھی۔ لباس
اُن عورتوں کا نہایت چست اور خوشنما تھا اور صورت بھی اکثروں کی نہایت پاکیزہ و دلفریب
تھی۔ بہرحال ایک ہفتہ کامل مجھ کو اُس مکان میں گذر گیا۔ آخرش ایک سوار نے آکر مجھ کو لفافہ
فرلینگ صاحب کلکٹر ہمیر پور بجواب میری عرضداشت مذکورہ کے دیا۔ اور اُس نے یہ بھی کہا
کہ ایک دوسرا سوار بھی ہمارے ساتھ تھا وہ چٹھی انگریزی موسومہ صاحب ڈپٹی کمشنر جالون لیکر
صاحب موصوف کے بنگلہ پر گیا ہے۔ میں نے اپنے نام کا لفافہ کھول کر دیکھا تو اُس میں نہایت
دلجوئی اور تشفی کے ساتھ میری تحریر کا جواب دیکر نہایت افسوس ظاہر کیا تھا اور لکھا تھا کہ تم یقیناً
اپنی جگہ پر بحال ہو جاؤگے لیکن اگر تم میرے پاس آؤگے تو میں بھی تم کو تمہاری سابق کی جگہ دوں گا۔
اگلے روز آٹھ یا نو بجے صبح کو پہرے کا سپاہی مع ایک چپراسی اردلی صاحب ڈپٹی کمشنر کے میرے

پاس آیا چپراسی نے مجھ سے کہا کہ صاحب نے آپ کو سلام دیا ہے اور اپنا ٹمٹم سواری کے لیے بھیجا ہے
میں نہایت خوش ہو کر بہ سواری مذکور فوراً صاحب کے بنگلہ پر آیا چپراسی مذکور بغیر کسی اطلاع کے
صاحب کے پاس لے گیا۔ صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے ہاتھ ملایا اور اپنے پاس کرسی پر
بٹھال کر نہایت دلجوئی اور دلداری میری کی اور فرمایا کہ میری لاعلمی کے سبب سے جو کچھ تکلیف آپ کو
ہوئی معاف کیجیے اور فوراً جالون جا کر اسٹریٹ صاحب سے جن کے نام کی چٹھی میں اس وقت دیتا
ہوں چارج اپنے عہدہ کا لیجیے۔ میں نے نہایت ادب کے ساتھ کھڑے ہو کر اُن کا شکریہ ادا کیا اور
یہ عرض کیا کہ چونکہ اس ضلع میں مجھ کو بہ ایام غدر باغیوں کے ہاتھ سے نہایت تکلیف پہونچی ہے
اور اب بعد رفع غدر کے بھی کسی قدر آپ کی لاعلمی سے ذلیل ہوا تو اب اس صورت میں اس جگہ کو
میں پسند نہیں کرتا۔ اور فرلینگ صاحب کا بھی خط میں نے اُنکو دکھلایا کہ اگر آپ خوشی سے اجازت
دیویں تو میں فرلینگ صاحب کے پاس چلا جاؤں وہ فوراً مجھ کو میری اگلی جگہ دیں گے اور یہاں
اسٹریٹ صاحب بھی میری جگہ پر بدستور بحال رہیں گے۔ صاحب دیر تک سونچا کیے آخرش میرے
اصرار پر میری التجا اُنھوں نے قبول فرمائی اور کہا کہ تمھیں اختیار ہے چاہے یہاں رہو یا وہاں
چلے جاؤ میں دو دن بعد وہاں سے روانہ ہو کر ہمیر پور چلا آیا یہاں فرلینگ صاحب بہادر میری اس
کارروائی پر نہایت خوش ہوئے اور فوراً تحصیلداری مہوبہ کا چارج دلوا دیا۔ میں وہاں باطمینان دل
مستعدی تمام کام انجام دیتا رہا اور چونکہ اُسوقت تک پورا پورا تسلط قائم نہ تھا اور اُس پرگنہ میں
مواضعات گونڈی وغیرہ سے جن میں ٹھاکران شورہ پشت آباد تھے ہر وقت اندیشہ ڈاکہ زنی کا رہا کرتا
تھا۔ اور بعض مقامات میں غول باغیان کے بھی مخفی تھے چنانچہ حسب صلاح صاحب ممدوح کے
ایک تمن تین چار سو سپاہیوں کا بھرتی کر لیا اور ایک بڑے ذی رعب ٹھاکر کو اُسکا افسر بلقب
تمن دار مقرر کر کے اُس سے کہا کہ تو اپنے رشتہ داران کو جن پر بھروسہ کامل ہو تمن میں بھرتی کر لے
اور جا بجا دھاوا کر کے باغیان کو گرفتار کر لے۔ چنانچہ اس انتظام سے تھوڑے دنوں میں بہت
امن ہو گیا علاقہ میں رُعب ایسا چھا گیا کہ کوئی دم نہیں مار سکتا تھا۔ بقایا مالگذاری بھی سہولیت سے
وصول ہوتا جاتا تھا۔ الغرض اسی طرح پانچ چھ ماہ مجھ کو وہاں گذر گئے۔ اس اثنا میں ایک چٹھی
کپتان براؤن صاحب کی (جو بہ ایام غدر جالون میں ڈپٹی کمشنر تھے اور جن کی میم صاحبہ حسب
بیان اوپر کے جھانسی میں باغیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئی تھیں اور جن کا ذکر کرنیل الگزنڈر صاحب
نے اپنی رپورٹ میں کیا ہے اور وہ اب ولایت سے آ کر سشن جج ساگر مقرر ہوئے تھے) اور میری

خیرخواہی اور عمدہ کارروائی ایام غدر سے پوری طور پر واقف تھے) بنام مسٹر فرلینگ صاحب کلکٹر ہمیرپور کے آئی۔ اُنھوں نے چٹھی مذکورہ میں صاحب ممدوح کو لکھا تھا کہ میں نے ولایت سے واپس آکر عنایت حسین خاں کو جو جالون میں تحصیلدار تھا بہت تلاش کیا اور چند شخصوں سے اُسکے ڈھونڈھنے میں ملاقات بھی میں نے کی مگر افسوس ہے کہ وہ اب تک مجھ کو نہیں ملا۔ فی الحال سُنا ہے کہ وہ ہمیرپور میں پرگنہ مہوبہ کا تحصیلدار ہے اگر یہ صحیح ہو تو عنایت حسین خاں کو بہت جلد میرے پاس بھیجدو۔ اور اُسکو سمجھادو کہ اگر وہ وہی ہے جو غدر میں تحصیلدار جالون تھا تو میں اُسکے ساتھ ایسا سلوک کرونگا جو شاید کسی نے کسی اعلےٰ درجہ کے وفادار ایام غدر کے ساتھ کیا ہو۔ چنانچہ کلکٹر صاحب موصوف نے بُلاکر اس مژدہ سے مجھ کو آگاہ فرمایا میں نہایت خوش ہوکر طالب رخصت کا ہوا مگر چونکہ وہ زمانہ تحصیل مالگذاری کا تھا صاحب موصوف نے فرمایا کہ دو مہینہ کے بعد جانا۔ اور یہی مضمون بجواب چٹھی کپتان براؤن صاحب کے بھی لکھ دیا کہ بعد دو ماہ کے وہ تمھارے پاس حاضر ہوگا۔ آخرش بعد مدت مذکورہ کے ایک مہینہ کی صاحب کلکٹر موصوف نے مجھے رخصت دی اس زمانہ میں نہ تو سڑک پختہ ساگر جانے کی تھی اور نہ ریل کا ظہور تھا۔ ایک کرایہ کی بہلی پر میں سوار ہوکر جارہا تھا راستہ میں بمقام مونٹھ وہاں کے تحصیلدار کے پاس جنسے میری ملاقات تھی ٹھہر گیا اُنکی زبانی معلوم ہوا کہ عرصہ چار پانچ روز کا ہوا مہینہ کی بیماری میں جو اُسوقت ساگر وغیرہ میں بکثرت تھی صاحب نے انتقال فرمایا جسکے سُننے سے میرے ہوش جاتے رہے اور آئندہ کی تمام امیدیں منقطع ہوگئیں۔ نہایت مایوس ہوکر لوٹ آیا اور اپنی بدقسمتی پر سخت متاسف ہوکر اپنی حالت موجودہ پر قانع رہا۔ بعدہٗ چند سال کے بعد صاحب کلکٹر بہادر کا حکم میرے نام آیا کہ فلاں تاریخ کو جو مجھے یاد نہیں ہے اول رجمنٹ ہندوستانی رسالہ کا مہوبہ ہوکر چھاؤنی نوگاؤں کو جاوے گا رسد کا انتظام قرار واقعی کیا جاوے تاریخ مقررہ پر علے الصباح میں نے جمعدار تحصیل کو مع چند چپراسیان کے رسد رسانی پر تعینات کیا اور ہر طرح کا سامان فرودگاہ پر موجود کردیا۔ چار بجے شام کو جمعدار نے واپس آکر اطلاع دی کہ کل رجمنٹ کو خاطرخواہ رسد پہونچا دی اور مجھ کو صلاح دی کہ کمانڈنگ افسر صاحب اس رجمنٹ کے نہایت خلیق اور نیک مزاج ہیں آپ اُن سے ضرور ملاقات کیجیے۔ میں اُسی وقت گھوڑے پر سوار ہوکر فرودگاہ مذکورہ پر گیا اور کمان افسر صاحب کے خیمہ پر حاضر ہوکر اطلاع اپنی کرائی صاحب نے فوراً مجھ کو بُلا لیا قبل اسکے کہ میں بیٹھوں اور معمولی باتوں میں مصروف ہوں صاحب مذکور مجھ کو دیکھکر کھڑے ہوگئے اور چند منٹ غور سے مجھے دیکھا کئے اور پھر مجھ سے دریافت کیا کہ تم قبل اسکے شروع غدر میں کہاں تھے

امیر مینائی مرحوم

- امیر اللغات (نامکمل)
- منشورات عشق
- مرآۃ الغیب
- خاتم النبیین
- انتخاب امیر مینائی

جلال لکھنوی مرحوم

- سرمایۂ زبان اردو
- رسالۂ تذکیر و تانیث
- قواعد المنتخب

مرزا محمد عباس ہوش

- افسانۂ نادر جہاں
- پیاری سہیلی

مرزا رسوا مرحوم

- اختری بیگم
- خونی شہزادہ
- شریف زادہ

ساحر آبادی

- ۲ حصے

پنڈت رتن ناتھ سرشار

- فسانۂ آزاد کامل
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ بطرز ناول

منشی سجاد حسین مرحوم

- احمق الذین
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- طرحدار لونڈی
- میٹھی چھری
- فانوس خیال

منشی جوالا پرشاد برق

- مرنالنی
- مار آستین
- بنگالی دولہن
- پرتاب

سید عاشق حسین عاشق

- تارا ۲ حصے
- شادی و غم

مولانا عبدالحلیم شرر

- ثانی اثنین
- ذی النورین
- ابو الحسنین
- خواجہ معین الدین چشتی
- حسن بن صباح
- عصر قدیم
- تاریخ یہود
- مسیح اور مسیحیت
- عرب قبل از اسلام
- صقلیہ میں اسلام
- آغا صادق کی شادی
- دربار حرام پور کے اسرار
- الفانسو
- مفتوح فاتح
- فلپانا
- زوال بغداد
- لعبت چین
- نیکی کا پھل
- بابک خرمی
- طاہرہ
- مینا بازار
- فردوس بریں
- فلورا فلورنڈا

شوق قدوائی مرحوم

- ترانۂ شوق
- قاسم و زہرہ
- عالم خیال
- دیوان شوق

منشی محمد احسن وحشی

- نغمۂ حرم
- اشک حسرت
- معشوقۂ حرب
- محبوس کنشت

خواجہ عبدالرؤف عشرت

- تذکرۂ آب بقا
- زباں دانی
- اصلاح زبان اردو
- قواعد میر
- اصول اردو
- جان اردو
- شاعری کی چار کتابیں
- لغات اردو
- ہندو شعرا
- مضمون نویسی
- ہجولی ۲ جلد

مولانا اسلم جیراجپوری

- سیرۃ الرسول
- خلافت راشدہ
- خلافت بنو امیہ
- خلافت بنی عباس
- عباسیۂ مصر
- عباسیۂ بغداد
- خلافت آل عثمان

قاضی سلیمان منصورپوری

- رحمۃ للعالمین ۳ جلد
- سفرنامۂ حجاز

مولانا نجم الغنی رامپوری

- بحر الفصاحت
- تاریخ اودھ ۵ جلد
- تاریخ حیدرآباد دکن
- تاریخ راجگان ہند
- تعلیم الایمان
- مذاہب الاسلام

مولانا حکیم عبدالحی

- تاریخ گجرات
- گل رعنا

منشی احمد علی بی اے

- تاریخ تمدن ۲ جلد
- شباب لکھنؤ

مولانا حسرت موہانی

- شرح دیوان غالب
- مکمل دیوان حسرت
- نکات سخن ۴ حصے

سید سجاد حیدر بی اے

- خیالستان
- حکایات و احتسابات
- پرانا خواب و دردو افسانے
- ثالث بالخیر
- زہرا
- جلال الدین خوارزم شاہ ۱۲
- جنگ و جدال ۱۲
- مطلوب حسیناں ۱۲

جلیل قدوائی ایم اے

- سیر گل
- اصنام خیالی
- مونا دانا
- نقش و نگار

مرزا محمد عسکری بی اے

- ادبی خطوط غالب
- تاریخ ادب اردو
- نوادر

منشی امیر احمد علوی بی اے

- تاریخ اندور ۱۲
- روزنامچہ حج
- شاہان مالوہ
- طرۂ امیر
- گوتم بدھ ۴
- بہادر شاہ ظفر
- مثنویات ۱۲
- تاریخ زوال
- یادگار انیس

مولوی محمد یحییٰ تنہا بی اے

- تاریخ امریکہ
- سیر المصنفین ۲ جلد
- تاریخ مغربی یورپ
- خیالات اور تجربات ۸

سید مسعود حسن رضوی ایم اے

- ہماری شاعری
- امتحان وفا ۶

مولوی سید سلیمان ندوی

- ارض القرآن
- سیرۃ عائشہ رض
- حیات امام مالک رح
- خیام

مولوی عبد السلام ندوی

- اسوۂ صحابہ ۲ جلد
- سیرۃ عمر بن عبد العزیز
- انقلاب الامم
- شعر الہند ۲ جلد

مولوی سعید انصاری

- سیر الانصار ۲ جلد
- سیر الصحابیات

حاجی معین الدین ندوی

- خلفائے راشدین
- مہاجرین حصہ اول

شاہ معین الدین ندوی

- مہاجرین حصہ دوم
- سیر الصحابہ جلد ششم
- سیر الصحابہ جلد ہفتم

خواجہ حسن نظامی دہلوی

- میلاد نامہ
- ذکر غوث پاک ۱۲
- کرشن جیون
- سیپارۂ دل
- چٹکیاں اور گدگدیاں ۱۲
- اتالیق خطوط نویسی ۱۲
- بیوی کی تعلیم
- بیوی کی تربیت
- اولاد کی شادی
- جگ بیتی کہانیاں ۱۰
- بچوں کی کہانیاں ۱۲
- سفرنامہ ممالک اسلامیہ
- غدر دہلی کے افسانے ۱۲ جلد

سید ظہور احمد وحشی

- اسلامی زندگی
- تصویر معاشرت
- درس عبرت
- زندگی کی صبح و شام
- طوفان زندگی
- عروج زندگی
- مالی پریشانیوں کا علاج
- وسائل معاش

مولانا راشد الخیری

- امت کی مائیں
- آمنہ کا لال
- سیدہ کا لال
- صبح زندگی
- شام زندگی
- شب زندگی ۲ جلد
- نوحۂ زندگی ۱۲
- در شہوار ۱۰
- منازل السائرہ ۲ جلد
- حیرت قدامت
- عروس کربلا
- یاسمین شام
- تیغ کمال
- محبوبۂ خداوند ۱۲
- نانی عشو ۱۰
- وداع ظفر

نیاز فتح پوری

- جذبات بھاشا ۱۲
- گیتان جلی
- شہاب کی سرگذشت
- نگارستان
- جمالستان

بنام خداوند جہاں آفریں

جامیست جہاں نمائے ہر صفحہ دریں

(تاریخ اجراء الناظر) ۱۳۲۷ھ (خواجہ عزیز لکھنوی)

الناظر لکھنؤ

ایڈیٹر:- ظفر الملک علوی

نمبر ۶	دسمبر ۱۹۳۶ء	جلد ۴۲

فہرست مضامین

قیمت ۱۰ــ فی پرچہ ۵ / ۲ ر

کتب خانہ

یہ حسب ذیل اُردو کتابوں کی ضرورت ہو تو ہم سے طلب فرمائیے۔ ادبی کتابوں کا اتنا عمدہ اور بڑا ذخیرہ ہندوستان بھر میں کہیں یکجا نہیں کیا گیا۔ قدردانوں کی توجہ سے ذخیرہ کو اور ترقی ہوگی۔

تاریخ ادب

- تاریخ زبان اُردو
- تاریخ ادب اُردو
- تاریخ نظم و نثر اُردو
- تاریخ نثر اُردو (حصّہ اوّل)
- دکن میں اُردو
- اُردو کے اسالیب بیان
- شعر العجم ۵ حصے
- سیر المصنفین ۲ جلد
- مرحوم دہلی کالج
- خطباتِ گارسن دی تاسی
- سخندانِ فارس
- شعر الہند ۲ حصے
- تاریخ ادبیات ایران
- عربی ادب کی تاریخ

ادب و شاعری

- مقدمہ شعر و شاعری
- موازنہ انیس و دبیر
- نیرنگ خیال ۲ حصے
- ایشیائی شاعری
- مباحثہ چکبست و شرر
- ہماری شاعری
- جدید اردو شاعری
- نقد الادب
- روح تنقید
- مراۃ الشعر
- مثنویات
- دو میرزا
- شرح دیوان غالب طباطبائی
- ″ ″ حسرت موہانی
- ″ ″ نظامی بدایونی
- ″ ″ آسی
- ″ ″ بیخود دہلوی
- ″ ″ سہا
- غالب اور اُسکی شاعری
- محاسن کلام غالب
- اقبال
- بزم خیال
- حسن خیال
- مشاطۂ سخن ۲ حصے

شعرا و مصنفین

- حیات انیس
- یادگار انیس
- حیات دبیر ۲ جلد
- یادگار نسیم
- یادگار غالب
- بہادر شاہ ظفر
- طرہ امیر
- تذکرہ رند
- حیات حالی
- حیات داغ
- حیات النذیر
- سوانح مولانا روم
- حیات سعدی
- خیام
- حیات حافظ
- حیات جامی
- حیات خسرو
- تذکرہ حزیں
- البیرونی

تذکرے

- آب حیات
- ارباب نثر اردو
- تذکرہ آب بقا
- تذکرۃ الخواتین
- تذکرہ کاملان رامپور
- تذکرہ خندۂ گل
- تذکرہ مشاہیر کاکوری
- دربار حسین
- خمخانۂ جاوید جلد سوم
- ″ ″ جلد چہارم
- سخن شعرا
- گل رعنا
- نگارستان فارس
- ہندو شعرا
- تذکرہ اردو میر حسن (بزبان فارسی)
- نکات الشعرا (میر تقی)
- چمنستان شعرا (شفیق)
- گلشن بیخار (شیفتہ)
- مخزن نکات (قائم)
- مخزن شعرا
- تذکرہ گردیزی
- تذکرہ ہندی مصحفی
- ریاض الفصحا ″
- تذکرہ گلزار ابراہیم
- مجموعہ نغز (قاسم)

خطوط

- اردوے معلےٰ
- عود ہندی
- ادبی خطوط غالب
- مکاتیب امیر
- خطوط سر سید
- مکاتیب محسن الملک
- مجموعہ مکتوبات آزاد
- مکتوبات حالی ۲ حصے
- مکاتیب شبلی ۲ جلد
- خطوط اکبر
- اتالیق خطوط نویسی
- مرقع ادب ۲ جلد
- عورتوں کی انشا

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

بنام خداوند جان آفریں

نمبر ۶ جلد ۴۲ — دسمبر ۱۹۳۶ء

شطرنج بازی

(جناب مولوی مصطفےٰ حسن علوی صاحب فرہاد ایم اے۔ معلم لکھنؤ یونیورسٹی)

اگر معمورۂ عالم کا نقشہ سامنے رکھ کر تحقیق کریں تو شاید ہی کوئی خطہ یا گوشہ ایسا نکلے گا جہاں شطرنج نہ کھیلی جاتی ہو اور کچھ زمانہ موجودہ ہی پر موقوف نہیں ہے اگر صدیوں پہلے کی تاریخ دیکھی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ جس قدر اس کھیل سے دلچسپی لی جاتی رہی ہے کسی دوسرے کو وہ مرتبہ حاصل نہ تھا بعض دلچسپیاں اور مشاغل تو ایسے ہوتے ہیں کہ کسی ملک اور کسی خطہ میں اُن کو مقبولیت حاصل رہتی ہے اور کسی جگہ خال خال ہی اُن کا رواج ہوتا ہے لیکن شطرنج بازی نے کیا ایشیا اور کیا یورپ سب مقامات پر یکساں سامان تفریح بہم پہونچائے اور اب تو یہ حالت ہو گئی ہے کہ جس طرح اور چیزوں میں مقابلے اور امتحانات ہوتے ہیں اور ان میں تفوق اور امتیاز حاصل کرنے والے کو تمغہ جات اور انعامات ملتے ہیں شطرنج باز بھی یہ امتیاز حاصل کر کے دنیا میں نام آور بن جاتا ہے۔ پچھلے سالوں میں ایک ہندوستان کا ماہر شطرنج بازی میں یورپ کے اکثر ممالک کے شطرنج بازوں پر گوئے سبقت لے گیا اور اس کی رپوٹیں وقتاً فوقتاً اخبارات کے ذریعے سے ہم تک پہونچتی رہیں۔ اور چونکہ اس میں علاوہ گذران وقت کا ایک پہلو ہونے کے دماغی لگاؤ اور اُس کے نشو و ارتقا کی بھی ایک حیثیت ہے اس لیے یہ محض لڑکوں اور جوانوں ہی کے لیے موزوں اور مناسب مشغلہ نہ تھا بلکہ سنجیدہ اور مُسن لوگ بھی کھیلتے تھے اور اس کی وجہ سے

ملا صاحب قاموس نے شِطرنج بکسر شین لکھا ہے اور اکثر اہل لغت اسکے مؤید ہیں لیکن صاحب غیاث کی رائے ہے کہ بفتح شین بھی صحیح ہے۔

اُن کی سنجیدگی پر حرف نہ آتا تھا۔

قوموں اور ملکوں کے ادبیات اور لٹریچر میں اگرچہ مختلف بازیوں کا تذکرہ آیا ہے لیکن نرد بازی اور شطرنج بازی کو اس حیثیت سے بھی خاصی وسعت حاصل رہی زمانہ وسطےٰ کی شاعری میں ان کا ذکر ملتا ہے اور یوروپین ممالک کی زبانوں کی مخصوص کہاوتیں ان کا پتہ دیتی ہیں۔ عربی، فارسی، اُردو، سنسکرت کی کتابوں میں اُن کے واقعات ملتے ہیں۔ نظامی سمرقندی لکھتا ہے کہ ایک سال طغان شاہ ابن الپ ارسلان احمد بدیہی اپنے ایک ندیم کے ساتھ نرد بازی میں مشغول تھا ہزاری مہرہ نیچے چلا گیا تھا اور امیر کے دو مُہرے ششگاہ میں پڑے ہوئے تھے اور بدیہی کے دو مُہرے ایک ہی محفوظ خانے میں پڑے۔ تھے چال امیر کی تھی اس نے پانسے پھینکنے میں گو بڑی احتیاط سے کام لیا اور اس کا کام اس طرح بنتا تھا کہ دو چھکے پڑیں لیکن اتفاق سے بجائے دو چھکوں کے دو یکے پڑے اسے بڑا ہی طیش آیا اور جامے سے باہر ہوگیا اور واقعی موقعہ بھی ایسا ہی تھا چنانچہ اس کی جھلاہٹ اس درجہ تک پہونچ گئی کہ گھڑی گھڑی تلوار کے قبضہ پر ہاتھ لے جاتا ندیموں کا یہ حال تھا کہ بید کی طرح لرز رہے تھے اس لیے کہ ایک تو بادشاہ دوسرے نو عمر تیسرے بازی ہارا ہوا اس آشفتگی کی حالت میں ابوبکر ارزقی ندیم اُٹھ کر مطربوں اور گویوں کے پاس گئے اور یہ دو شعر پڑھے۔

گر شاہ دو شش خواست دو یک زخم افتاد   تا ظن نبری کہ کعبتین داد نہ داد

آں زخم کہ کرد رائے شاہنشہ یاد   در خدمت شاہ روئے بر خاک نہاد

یعنے اگر بادشاہ دو چھکے چاہتا تھا لیکن بجائے ان کے دو یکے پڑے تو تم کو یہ خیال نہ گذرے کہ پانسے نے داد نہیں دی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جب پانسے کو بادشاہ کی رائے یاد آئی تو وہ اُس کی خدمت میں مُنھ کے بل گر پڑا۔ آگے چل کے نظامی لکھتا ہے کہ ۵۰۹ھ میں ابو منصور یا یوسف کی اسی بادشاہ کے ایک اور ندیم سے جب ملاقات ہوئی تو اس نے بیان کیا کہ طغان شاہ ان دو شعروں سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے ارزقی کے آنکھوں کا بوسہ دیا اور اشرفیاں منگا کر مُنھ میں بھر دیں چنانچہ شمار کرنے کے بعد ایک کم پانچسو اشرفیاں تعداد میں نکلیں۔

اسی طرح علیؔ بن العباس بن جریج المعروف ابن الرومی نے شطرنج کی مدح میں طبع آزمائی کی اور اس کے اشعار یہ ہیں:۔

ارض مربعۃ حمراء من ادم   ما بین شخصین موصوفین بالکرم

تذکرا الحروب فاحتالا لھا شبھا   من غیر ان یعبثا فیھا بسفک دم

---

[۱] چہار مقالہ صفحہ ۲۶ مطبوعہ لاہور [۲] اس کا مفصل تذکرہ ابن خلکان میں بعض حرف علین درج ہے۔

هذا ایغیو علی هذا و ذاک علی هذا ایغیو و عین الحوب لم تنم
فانظر الی خیل حاشت بها همو من عسکرین بلا طبل و لا علم

(ترجمہ) دو شریف شخصوں کے سامنے سُرخ چمڑے کی بساط ہے دونوں نے لڑائی کا منظر سامنے رکھکر ایسے جیسے داؤ پیچ کیے لیکن جانبین میں سے کسی نے ایک دوسرے کا خون رائگاں نہیں کیا لڑائی زوروں پر ہے کبھی اس نے اُس پر حملہ کیا کبھی اُس نے اس پر گھوڑ دوڑ کی طرف دیکھو تو طبیعتوں میں جوش پیدا ہوتا ہے لشکر دونوں طرف ہیں لیکن جھنڈے اور طبل وغیرہ آلات موسیقی نہیں ہیں۔

جیسا کہ ہم نے سطور ما قبل میں لکھا ہے کہ نرد بازی و شطرنج بازی دونوں کو ادبیات اقوام میں ممتاز مرتبہ ملتا رہا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ شطرنج بازی نرد بازی سے بڑھی چڑھی رہی اور اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے سیاسی تعلیم اور حربی تربیت کو فروغ ملتا تھا نوجوان اور خورد سال کھلاڑی شاہزادہ کے مقابلہ میں اگر ایک ماہر شطرنج ہو تو اس سے اُسے چالیں چلنے منصوبے بنانے کاٹ پیچ کرنے کی تربیت حاصل ہوتی تھی اور اگر بادشاہ خود شطرنج کھیلے تو علاوہ تفریح خاطر کے نظم و نسق نظام و تربیت رد و بدل کی مشق اور تمرین مدنظر ہوتی تھی۔ جو اس مصنوعی جنگ کی قیادت میں کامیاب رہا وہ اکثر اور بیشتر واقعی اور اصلی محاذوں میں بھی کامیاب رہتا تھا اور جو یہاں ناکام رہے وہ وہاں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا اسلیے کہ جب فوجی اعتبار سے یہ اپنے مقابل سے کم نہیں ضروریات جنگی کے لحاظ سے اسکا پلہ برابر ہے تو بجز بلادت اور قوت دماغی کی کمی زیادتی کے اور کوئی چیز شکست و فتح کا سبب نہیں بن سکتی تھی۔

مامون الرشید خلیفہ کے واقعات میں لکھا ہے کہ نرد کھیلا کرتا تھا لوگوں نے اس سے کہا کہ آپ نرد کھیلتے ہیں شطرنج کیوں نہیں کھیلتے تو اس نے جواب دیا یہ اسلیے کہ اگر نرد میں ہار جاؤں تو میری اس میں سُبکی نہیں ہوتی اسلیے کہ میں یہ کہہ دیا کرتا ہوں کہ میں کیا کروں پانسے ٹھیک نہیں پڑے اس میں میری کوئی کوتاہی نہیں ہے اور اگر شطرنج میں ہار جاؤں تو بات بنائے نہ بنے اس لیے کہ اس میں میری ذکاوت اور عقل کو دخل ہے۔ گو کہ میں جانتا ہوں کہ بادشاہوں کے شایان شان شطرنج ہی ہے اور ان کی عقل اور دانش کا اقتضا بھی یہی ہے کہ بجائے نرد بازی کے شطرنج بازی میں اوقات فرصت گذارا کریں۔

کہتے ہیں کہ خسرو پرویز ہمیشہ شطرنج کھیلا کرتا اور نرد کے پاس بھی نہ پھٹکتا تھا لوگوں نے اُس سے وجہ پوچھی تو اُس نے جواب دیا کہ واقعہ یہ ہے کہ ساری دنیا والے تو اپنی حوائج اور ضروریات کو میرے پاس پیش کرتے ہیں پھر بھلا میں یہ کیسے کروں کہ میری ضرورتیں پانسوں کے ذریعہ سے جو مردہ ہڈیوں سے بنائے جاتے ہیں پوری ہوں۔ شطرنج میں ایک بادشاہی آن ہے اور ذہنی اور دماغی ارتقا۔ مثلاً

اگر دو حکومتیں آپس میں متصادم ہوں اور صلح و آشتی کے تدابیر بیکار ثابت ہوں اور انہیں میدان جنگ میں غالبیت
اور مغلوبیت کا فیصلہ کرنا ہو تو اس کی شکل یہ ہونا چاہیے اور نقشہ جنگ یوں بننا چاہیے کہ آگے آگے
پیادوں کی فوج ہو اور اُن سے ذرا ہٹ کر بادشاہ کو خود موجود رہنا چاہیے۔ فرزین بحیثیت وزیر بادشاہ
کے پہلو بہ پہلو رہے تاکہ مشوروں اور کارروائیوں میں آسانی سے اس کی مدد حاصل ہوتی رہے اسی کے
پہلو بہ پہلو فیلوں کا جھرمٹ ہو تاکہ وقت ضرورت ان سے بھی مدد ملے گھوڑوں کی جماعت ہاتھیوں
کے پاس کھڑی رہے تاکہ حاجت ہو تو ادھر اُدھر دوڑا دیا جائے اور پیادوں میں ضعف پیدا ہو تو
اُن سے مقاومت یا مدافعت کی جا سکے دونوں طرف رخ گویا رتھیں[۱] یا دو قلعے ہیں کہ جنگ کو اُن سے
بھی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ پیادہ کے سامنے گو میدان وسیع ہو لیکن حکم نہیں کہ ایک قدم سے زائد بڑھ کر
جا سکے اس میں مصلحت یہ ہے کہ گھوڑ سوار فوج جو پیچھے ہے اُس سے دوری نہ ہو اور اگر جوش و خروش میں
آگے نکل گیا تو اکثر تباہی ہی ہوتی ہے بادشاہ کو بھی اگر اپنا مقام چھوڑنا پڑے تو بس مصلحت اسی میں ہے
کہ ایک قدم دو قدم چلا جائے یعنے اتنا نہ بڑھ جانا چاہیے کہ خواہ مخواہ دشمن کی فوج سے مدبھیڑ ہو جائے
ہاں فیل ادھر اُدھر دور تک جدھر جدھر ضرورت پڑے چلے جا سکتے ہیں گویا ان پر اسلحہ حرب بھی
موجود رہتا ہے جدھر کمی دیکھی گئی وہاں پہنچا دیا گیا گھوڑے یا سوار پیادہ فوج سے ذرا لمبے بھی جا سکتے
ہیں اسلیے کہ مشکل آن پڑے تو اُن کو دوسری مقابلۃً آسان ہے۔ جب سوار فیل یا فرزین دست و پا شکستہ
ہو جائیں تو اب، اگر پیادہ فوج کے کسی فرد میں جرأت اور دلیری ہو تو اپنے قوت بازو سے وہی منزلت
حاصل کر سکتا ہے اس میں گویا پیادہ کی عقل و تمیز کا امتحان ہے کہ دشمن کی صفیں چیرتا ہوا اپنے ہاتھ پیر
بچاتا ہوا قلب لشکر میں گھس گیا یعنی اُس نے اپنے موجودہ مرتبے سے زائد کی اہلیت ثابت کر دی۔
کسی ہندی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

رحمن سیدھی چال سے فرزیں ہوت وزیر   فرزیں شاہ نہ ہو سکت ترچھے کی تاثیر

امتداد زمانہ اور مرور ایام کے ساتھ ساتھ جدت پسند طبائع نے اس میں کیا کچھ تغیر تبدل پیدا کیے چال
ڈھال کے طریقے بدلے اور مہروں کے نشست و برخاست کی وضعوں میں پہلوں سے اختلاف کیا
ان سب باتوں پر آگے چل کر ہم روشنی ڈالیں گے اس وقت ہمیں یہ لکھنا ہے کہ اس کھیل کے اختراع
اور ایجاد کا سہرا کس کے سر ہے اور اس کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔
رامائن اور مہابھارت میں چترنگھا کا لفظ تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور

[۱] مہابھارت اور رامائن کی لڑائیوں میں رتھوں کا ذکر اکثر مقامات پر آیا ہے۔

شطرنج کی اصل یہی چترنگھا ہے اور یہ دو لفظوں سے مرکب ہے چتر اور انگھا چتر کے معنی چار اور انگھا کے معنی
جز اور عضو کے ہیں گویا مفہوم یہ نکلا کہ کوئی چیز جو چار جزو والی ہو لیکن اس کی صفاتی حیثیت پر علمیت غالب
آگئی اور چار عضو یا جزو والی فوج کو چترنگھا کہنے لگے چنانچہ فیل اسپ پیادہ اور رخ یہ چار چیزیں چونکہ
شطرنج میں ہوتی ہیں لہذا نام کی مطابقت صحیح اور درست ہے ہندوستان کی ابتدائی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے
تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی لڑائیوں میں یہی چار چیزیں اجزائے لازمہ تھیں چنانچہ چوتھی صدی میں
جب سکندر رومی کا حملہ ہندوستان پر ہوا تھا تو پنجاب کے راجہ نے بمعیت منتری (وزیر) ۳۰ ہزار (پدّاتی)
پیادہ فوج چار ہزار (اشوا) سوار ۲۰۰ (ہستی) ہاتھیوں اور ۳۰۰ (رتھا) رتھوں کی مدد سے اس کے
مقابلہ میں مقاومت کی تھی۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی تاریخی شواہد اسی کے مؤید ہیں۔

غالبًا اسی چیز کو پیش نظر رکھ کر ہندوستان کے ایک ذہین اور طباع شخص صصّہ بن داہر نے شطرنج[1]
کو ایجاد کیا کہ جب دو مخالف فوجیں اس طرح سے باہم متصادم ہوں تو کسی ایک کے سردار یا بادشاہ کا قتل
یا محاصرہ دوسرے کی شکست متصور ہوگا۔ اس امر کی تائید کہ یہ چیز دراصل ہندوستان ہی کی ایجاد ہے
مورخ یعقوبی کے بیان سے بھی ہوتی ہے وہ لکھتا ہے کہ شطرنج کو ایک ہندوستانی شخص نے کسی
ہندوستانی بادشاہ کی تفریح طبع کے لیے ایجاد کیا تھا۔ یعقوبی کے علاوہ مسعودی نے بھی مروج الذہب
میں اس کو مفصل لکھا ہے لیکن اس کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا موجد تو کوئی ہندوستانی ہی
ہے مگر ہندوستان سے خسرو بادشاہ ایران کے لیے تحفہ بھیجی گئی تھی۔ گو اسے جب ہندوستانی راجہ
کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے اس ایجاد کو بہت پسند کیا اور نرد کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دیتا تھا۔
ابن خلکان لکھتا ہے کہ نرد کا موجد اگرچہ ایک فارسی شخص تھا لیکن شطرنج ہندوستان ہی میں ایجاد ہوئی اور
بادشاہ یا راجہ اس ایجاد پر اتنا خوش ہوا کہ اس نے فرمان جاری کر دیا کہ خزانہ شاہی سے جو چیز اس کا موجد
چاہے بطور انعام لے لے چنانچہ اس نے جو انعام اپنے لیے انتخاب کیا وہ یہ تھا کہ پہلے خانہ میں ایک دانہ
کسی غلہ کا رکھا جائے اور دوسرے میں دو اور تیسرے میں چار اسی طرح ہر خانہ میں پہلے سے دگنا کرتے
رہیں حتیٰ کہ چونسٹھ خانے اسی ترکیب سے پر کیے جائیں اور آخر میں جا کر جو ان سب کا مجموعہ ہو وہی اس کا
انعام ہے چنانچہ کہتے ہیں کہ جب اس حساب سے مجموعہ کیا گیا اور میزان لگالی گئی تو معلوم ہوا کہ اگر موجودہ
غلہ کی پیداوار کو جمع کیا جائے تب بھی اس کے حسب خواہش انعام دینے کی صورت نہیں بن سکتی۔

---

[1] عربی اور فارسی کتابوں میں اس لفظ کا تلفظ مختلف ہے صصّہ صِصّہ صوصہ، صیصہ صہصہہ صعصعہ وغیرہ وغیرہ راوندی نے راحۃ الصدور
میں باپ کا نام باہر لکھا ہے لیکن غیاث اللغات وغیرہ میں داہر بن نیلسوف ہے۔

بادشاہ نے اس نوعیت کے مطالبہ پر شطرنج کی ایجاد سے کہیں زائد داد دی۔

بہرحال یہ امر طے شدہ ہے کہ اس کا موجد کوئی ہندی ہی تھا اور عربی فارسی اور دوسری زبانوں کے مورخین اسی کے مؤید ہیں اب رہی یہ بات کہ عربوں کو یہ چیز براہ راست ہندوستان سے ملی ہے یا ایرانیوں کے واسطہ سے۔ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلوی زبان کے ایک رسالہ میں جس کا عہد تصنیف یعقوبی[1] سے مقدم ہے اور بقول یوروپین مستشرق نولڈک (Noldeke) یہ چھٹی صدی میں لکھا گیا تھا اس میں ہندوستان سے خسرو انوشیرواں کے پاس وفد[2] آنے اور شطرنج کا تحفہ لانے کا تذکرہ موجود تھا۔ اس میں یہ بھی درج ہے کہ اس شطرنج میں ۳۲ مہرے تھے ۱۶ زمرد کے اور ۱۶ یاقوت کے۔ شاہ فرزیں پیادوں اور گھوڑے کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے لیکن رُخ اور فیل کو اس مصنف نے نظر انداز کیا۔

اسی رسالہ کے آخر میں یہ بھی درج تھا کہ باہمی سمجھوتہ اور رہنماہٹ سے شکست اور فتح کا حاصل ہونا اس کا ایک خصوصی امتیاز تھا لیکن خسرو کے وزیر نے شکست و فتح کا مدار جنگ وجدل ضعف اور اضمحلال کو قرار دیا۔ چنانچہ جب شطرنج اس بادشاہ کو پہونچی تو اُس نے اس کے بدلہ میں ہندوستانی راجہ کو نرد[3] بھیجی۔ اس کی ایجاد میں یہ پہلو مدنظر تھا کہ انسانی زندگی کی اچھائی بُرائی کا مدار ستاروں کی گردش اور سیاروں کے دورہ پر ہے اور بساط نرد گویا سطح زمین ہے اور اس کے تیس مہرے مہینوں کے تیس روز ہیں۔ یہ مہرے سفید اور سیاہ تھے اس سے اس طرف اشارہ مقصود تھا کہ سفید مہرے دن ہیں اور سیاہ مہرے راتیں۔ اس رسالہ اور اس کے بیان کو اس قدر اہمیت حاصل ہوئی کہ فردوسی نے شاہنامہ میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے اور اس کو معلومات اسی رسالہ سے حاصل ہوئی تھیں۔

فردوسی نے اس قصہ کو مفصل لکھا ہے کہ کب اور کس طرح خسرو اول کے پاس قنوج سے ایک خاص وفد آیا تھا اور اس نے شطرنج کا تحفہ پیش کیا تھا۔ فردوسی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایجاد تو دراصل ہندوستان ہی کی ہے لیکن اسلیے ایجاد ہوئی تھی کہ کسی رانی کا لڑکا مر گیا تھا اُس کا غم اس کے ذریعہ سے بھلایا جائے۔

بہرحال سترنگ پہلوی لفظ یا شطرنج عربی لفظ دونوں تقریباً ہم شکل ہیں لیکن چونکہ سترنگ کو چترنگا سنسکرت لفظ سے زائد مشابہت ہے اس لیے یہ نتیجہ بآسانی نکل سکتا ہے کہ اس کو فارسی والوں نے براہ راست ہندوستان سے لیا اور عربوں نے بواسطہ ایران اس مشغلہ کو اپنے یہاں رواج دیا۔ اس کے

---

[1] یہ نسخہ کی تصنیف ہے ۵۳۱ء سے لیکر ۵۷۹ء عیسوی تک میں سے کسی سال یہ وفد بھیجا گیا تھا۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل۔

[2] مسعودی نرد کی ایجاد کو بھی ہندوستان کے راجہ کی طرف منسوب کرتا ہے اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ مورخین اسکی ایجاد کو اردشیر بابکان شاہ ایران کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ [3] رائل ایشیاٹک جرنل۔

علاوہ اور بھی قرائن اسی کے موید ہیں کہ عربوں نے اس کھیل کو فارسیوں سے لیا تھا اس لیے کہ شاہ راجہ کے معنی میں چونکہ فارسیوں میں مستعمل تھا لہٰذا یہی لفظ عربوں نے بھی اپنے یہاں قائم رکھا اگر براہ راست ہندوستان سے اُنھوں نے اس کھیل کو لیا ہوتا تو اس کی جگہ پر ملک سلطان خلیفہ یا امیر کا لفظ استعمال کرتے اور رتھ جو محض ہندی لفظ ہے اس کو فارس والوں نے رُخ کر دیا اور عرب نے اسی طرح برقرار رکھا ورنہ عرادہ یا اور کسی لفظ سے اس کو تعبیر کرتے۔

مسعودی کے بیان سے اتنا اور پتہ ملتا ہے کہ شطرنج کے ایران میں آنے اور کتاب کلیلہ[ا] دمنہ کا بحکم شاہ خسرو ایران کی مروجہ پہلوی زبان میں ترجمہ ہونے کا عہد تقریباً ایک ہی ہے اور عربوں کا فارس پر پوری طور پر تسلط ہونے کا سال چھ سو باسٹھ ہے۔ اگر شطرنج اس کے بعد آئی ہوتی تو عربوں کے یہاں قرین قیاس یہی ہے کہ شاہ اور رُخ کے الفاظ کا استعمال نہ ہوتا بلکہ بجائے شاہ کے امیر سلطان وغیرہ اور بجائے رُخ کے کوئی اور لفظ مستعمل ہوتا۔ یہ بات بھی یہاں لکھنا کچھ بے محل نہیں ہے کہ اہل یورپ نے یہ کھیل بواسطہ اسپین عربوں ہی سے لیا تھا اور اس کی سب سے قدیم سند ایک اسپینی زبان کے قلمی رسالہ سے ملتی ہے جو ۱۲۸۳ء میں لکھا گیا جس میں گھوڑے پیدل بادشاہ وغیرہ کے مرادف الفاظ اسپینی زبان میں لکھے گئے ہیں لیکن فرزیں فیل اور رُخ کو علیٰ حالہ قائم رکھا گیا۔ یورپ کی کسی مخصوص زبان کو اس باب میں تقدم کا شرف دینا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسی زمانہ کے لگ بھگ امریکہ جرمنی انگلینڈ فرانس وغیرہ میں اس کا رواج ہو گیا۔

اب رہی یہ بات کہ اس کے موجد کی وضع کی ہوئی چالوں اور طریق نشست میں کیا کیا تغیر ہوئے اور کون کون مہرے بدلے گئے اور کہاں کہاں کچھ مہروں کا اضافہ کیا گیا یہ بھی بہت کچھ تفصیل چاہتی ہے لیکن میں مختصر ہی لکھتا ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ آج جو مروجہ شکل ہندوستان میں پائی جاتی ہے کہ پہلی صف کے وسط میں بادشاہ ہو اس کے پہلو میں وزیر پھر فیل پھر اسپ اور سب سے آخر میں رخ اور دوسری صف میں پیادے رکھے جائیں یہی شکل بظاہر قدیمی ہے اور ہندوستان میں سب سے پہلے یہی رائج رہی لیکن فردوسی[۲] نے ایک اور ہی شکل

[ا] اس کتاب کو حکیم بید پا نے دابشلیم کے لیے سنسکرت میں لکھا تھا اس میں بارہ باب ہیں طیور اور بہائم کے ذریعہ سے وعظ و حکمت کی باتیں بیان کی ہیں اس کو ابن مقفع نے عربی میں ترجمہ کیا اور اس نے اپنی طرف سے ایک مقدمہ کا اور اضافہ کیا اس کے علاوہ کچھ بابوں کا بھی اس میں اضافہ کیا ہے۔ حسن زیات اپنی کتاب تاریخ الادب میں لکھتے ہیں کہ پہلوی سے عربی میں اسکا ترجمہ کیا گیا (تاریخ الادب الولی صفحہ ۲۴۱)

[۲] ترجمہ شاہنامہ انگریزی صفحہ ۳۱۱ جلد ۶۔

لکھی ہے احمد راوندی نے راحۃ الصدور میں مختلف ممالک، اور بلاد کے ساتھ مختلف شکلوں کو منسوب کر کے مفصل طور پر لکھا ہے۔ عام طور پر رائج شکل تو یہ ہے کہ بادشاہ وسط میں داہنی طرف رکھا جاتا ہے اور فرزیں بائیں طرف لیکن راوندی نے حکمائے ہند کی طرف جس شکل کو منسوب کیا ہے اس میں فرزیں داہنی طرف ہے اور شاہ بائیں طرف ہے۔

رخ	فرس	فیل	فرزیں	شاہ	فیل	فرس	رخ
پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ
پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ
رخ	فرس	فیل	شاہ	فرزیں	فیل	فرس	رخ

ان مُہروں کی چالوں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے عام طور پر گھوڑے کی چال کو ۲½ گھر سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن یہ مصنف لکھتا ہے کہ گھوڑے کی چال دو گھر ہے۔ رخ کے سامنے والے پیادوں کی جگہ بھی بیٹھ سکتا ہے۔ ہاتھی ٹیڑھی چال چلکر جہاں تک وسعت ہو عام طور پر جا سکتا ہے لیکن اُسکے بیان کے مطابق ایک خانہ سے اُٹھ کر دوسرے ملحق خانہ میں نہیں بیٹھ سکتا بلکہ اس کو ایک خانہ چھوڑ دینا چاہیے۔ اسی طرح فرزیں سیدھا اور ترچھا سب چالیں چلتا ہے لیکن اسکا بیان یہ ہے کہ اس کی چال وسطی خانوں میں نہ ہو بلکہ ادھر اُدھر رہے اور صرف ترچھی ہی ہو اور پیادہ کی چال اگرچہ سیدھی ہی ہے لیکن اس کی مار ایک خانہ چھوڑ کر ترچھی ہوگی۔ رُخ کے مقابلہ میں اگر بادشاہ آ جائے اور پاس کا کوئی خانہ مہرہ سے خالی نہ ہو تو بس صرف یہی صورت مات کی ہوگی۔ اگر پیادہ بڑھتے بڑھتے دشمن کے پہلے خانہ میں پہونچ جائے تو عموماً اسی خانہ کے مہرے سے بدل جاتا ہے لیکن یہ لکھتا ہے کہ خواہ کسی خانہ میں پہونچے فرزیں ہی بنے گا۔

سنہ یہ کتاب مخصوص طور پر سلجوقیوں کی تاریخ ہے اور اب گب میموریل کی طرف سے لیدن میں چھپ

دوسری شکل جو شاہ بزرجمہر کی طرف منسوب کر کے لکھی ہے وہ یہ ہے:-

رخ	فیل	پیادہ	پیادہ									پیادہ	پیادہ	اسپ	رخ
شاہ	فرس	پیادہ	پیادہ									پیادہ	پیادہ	اسپ	فرزین
فرزین	فرس	پیادہ	پیادہ									پیادہ	پیادہ	اسپ	شاہ
رخ	فیل	پیادہ	پیادہ									پیادہ	پیادہ	اسپ	رخ

اس میں مہروں کی تعداد وہی ۱۶ ہے خانے بھی ۶۴ اور رفتار میں بھی کوئی فرق نہیں لیکن ان کی نشست کا قاعدہ بدلا ہوا ہے اور اس کے کھیلنے کا طریقہ یہ ہے کہ پانسوں سے کھیلی جاتی ہے۔ دونوں مقابل پہلے پانسے پھینکیں جس کے پانسوں کا شمار زائد نکلے چال پہلے اس کی ہوگی۔ اب مثلاً ایک نے پانسہ پھینکا اور اسکا شمار ۶ نکلا تو اسے بادشاہ کو پہلے چلنا چاہیے اگر پانچ شمار نکلے تو فرزیں چار نکلے تو فیل تین نکلے تو گھوڑا دو نکلے تو رخ اور ایک آئے تو پیادہ پہلے چلنا ہوگا اب اگر آگے چل کر کوئی صورت ایسی نکل آئے کہ پانسہ میں ۶ شمار نکلا اور بادشاہ کو اپنی جگہ سے ہٹانا پڑا لیکن ہر طرف دیکھا تو کوئی خانہ خالی نہ تھا تب بھی مات نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ جس مہرے کے لیے کوئی گھر نہ ہو اُس کو نہیں چل سکتے دشمن اور مخالف کے مہرے اگرچہ زد پر ہوں لیکن جب تک پانسہ موافق نہ گرے مار نہیں سکتے۔

تیسری شکل یہ ہے جسے حکمائے روم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

اس میں بھی وہی ۶۴ خانے ہیں شاہ اور فرزیں کو کونے پر رکھا گیا ہے اور فیلوں کو آگے اور گھوڑوں کو

اُن کے پاس گھوڑوں کے پاس رُخ رکھے گئے یعنے بالکل قلعہ سے ملے ہوئے چار پیادے میمنہ پر یعنے داہنی طرف اور چار میسرہ پر یعنے بائیں طرف اس میں چالیں وہی ہیں جو مردج ہیں اس میں فیلوں فیلوں کا مقابلہ اور مار ہوتی ہے اور گھوڑوں گھوڑوں کی اگر کسی کا بادشاہ اپنی حفاظت کر کے قلعہ میں داخل ہو جائے تو جانب مخالف کی شکست سمجھی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور شکل بھی ہے جسے رومیوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے۔

سمہ											سمہ
	اسد	رخ	فرس	فیل	فرزیں	شاہ	فیل	فرس	رخ	اسد	
	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	
	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	پیادہ	
	اسد	رخ	فرس	فیل	شاہ	فرزیں	فیل	فرس	رخ	اسد	
قلعہ											قلعہ

اس شکل میں آٹھ مہرے زائد ہیں چار پیدل اور چار اسد (شیر) اس کے خانے بجائے ۶۴ کے ۱۰۰ ہوتے ہیں اسد کی جگہ بعض شتر کو رکھتے ہیں اور چاروں کونوں پر چار قلعے رکھے جاتے ہیں اسد کی مار فیل کی طرح گوشوں کی طرف ہے لیکن فرق اتنا ہے کہ فیل ایک خانہ چھوڑ کر چلتا اور مارتا ہے اور اسد دو خانے چھوڑتا ہے فیل فیل کی مڈبھیڑ نہیں ہوتی نہ آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے ہیں لیکن اسد اسد لڑ سکتے ہیں۔ قلعہ چاروں طرف اس مصلحت سے ہے کہ اگر بادشاہ مخالف فوج کو غالب آتا دیکھے تو فوراً قلعہ بند ہو جائے اور جب دیکھے کہ مقابلہ فریقین مقصد کے موافق ہے تو پھر باہر نکل آئے۔
فردوسی نے شاہنامہ میں اس چوتھی شکل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور بجائے اسد شتر لکھا ہے۔ ایک

فرق یہ بھی ہے کہ اس میں چاروں طرف قلعے نہیں ہیں دہ در دہ (۱۰×۱۰) خانے اور چالیس مہرے ہیں۔ شتر ہاتھی اور گھوڑے کے درمیان ہے اور دس پیادے اگلی صف میں ہیں۔

صفحات ماقبل میں لکھ چکا ہوں کہ شطرنج یورپ میں عربوں کے ذریعے آئی تھی۔ یورپ والوں نے چھ مہروں میں سے تین کے نام اپنے یہاں نمایاں طور پر بدل دیے۔ پیدل یعنے سنسکرت لفظ پڈاتی، اٹلی زبان میں پیڈوں (Pedone) اسپین میں پی ان (Peon) فرنچ میں پائی آن (Pion) اور انگریزوں کے یہاں پان (Pawn) کہا جانے لگا۔ اسی طرح گھوڑے کو فرنچ میں (Chevalier) انگریزی میں (Knight) اور جرمن میں (Springer) کہتے ہیں۔ بادشاہ کو (King) انگریزی میں کہتے ہیں اور فرنچ جرمنی وغیرہ میں مختلف نام ہیں باقی تین مہروں کے ناموں کا ترجمہ تو نہیں کیا لیکن ان میں اور تغیرات کر دیے مثلاً فرزیں اگر اس کا ترجمہ انگریزی میں وزیر کیا جاتا تو اس کا مفہوم عام طبائع کے لیے مشکل ہو جاتا اس لیے کہ سیاسی حیثیت سے کوئی رتبہ انگریزوں کے یہاں نہ تھا۔ لہٰذا اس مہرے کی جگہ پر انھوں نے (Queen) کو رکھ دیا کیونکہ وہ بھی بادشاہ کے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ ہاتھی کی بھی کوئی عظمت ان کے یہاں نہ تھی لہٰذا اس کی شکل بدل کر اس کی جگہ پر بشپ انگریزوں نے رکھا اور (Fool) یا احمق کو فرانسیسیوں نے اور (Runner) قاصد کو جرمنوں نے قائم مقام کر دیا۔ رہ گیا رُخ یہ انگریزوں کے یہاں (Castle) سے بدل دیا گیا لیکن اور ممالک میں اس کے مفہوم کو متعین کرنے میں جدتیں پیدا ہوئیں۔ صاحب نفائس الفنون لکھتا ہے :-

> کہ رُخ جانورے است مانند شتر و آں را دو کوہان باشد و دندانہائے بیشین او تیز و ہیچ حیوانے از و خلاص نہ یابد۔

لیکن بعض جگہ اس کو اس طرح بناتے ہیں کہ اوپر دو گھوڑوں کے ایسے سر یا دو سانپوں کے پھن نکال دیتے ہیں۔ مکڈانلڈ لکھتا ہے کہ رُخ کا مفہوم صحیح طور پر عربوں نے بھی نہیں سمجھا اور مختلف ممالک میں اس پر مختلف طبع آزمائیاں ہوتی رہی ہیں۔ اٹلی میں اس کا یہ مفہوم سمجھا گیا کہ جیسے ہاتھی پر کوئی ستون رکھا ہو جس میں مختلف اسلحہ لٹک رہے ہیں۔ کسی نے کوئی پرند فرض کیا ہے۔

رہ گئیں شطرنج کی مختلف چالیں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کوئی نمایاں تغیر نہیں کیا گیا۔ بیرونی لکھتا ہے کہ پیدل ہمیشہ ایک ہی گھر چلتا رہا۔ رُخ کی چال کے متعلق فردوسی اور بیرونی وغیرہ کے بیانات میں فی الجملہ اتحاد ہے۔ فرزیں یا (Queen) اور فیل یا (Bishop) کی چالیں بدلتی رہتی ہیں، بیرونی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فرزیں عربوں کی شطرنج میں بیک وقت صرف ایک ہی

گھر چل سکتا ہے ۔ فیل کی چال کے متعلق بیرونی کا بیان بھی واضح نہیں ہے وہ لکھتا ہے کہ فیل ہندوستانی شطرنج میں پیدل اور فرزیں دونوں کی چالیں چلتا ہے ۔ حالانکہ مروجہ ہندوستان کا طریقہ اس کے مغائر ہے یہاں پیدل کی چال سیدھی ہوتی ہے ۔

کلام واثق

(جناب شیخ ارشاد حسین صاحب واثق وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد دکن)

زمانے رُخ سے کی تعمیر تو نے پیر میخانہ
کہ چاروں رُخ سے سجدے ہیں سوئے تعمیر میخانہ

تہجد پڑھ کے کھولی کس نے یہ زنجیر میخانہ
حرم کی چار دیواری بنی تعمیر میخانہ

بنے رندوں کا مصحف یہ نئی تحریر میخانہ
خط ساغر میں لکھ دے گر کوئی تفسیر میخانہ

بچا کر سر کہ واعظ دیکھتا ہے غرق حیرت ہے
ہر آئینہ ہے میخانہ کا اک تصویر میخانہ

الٰہی ہر ارادے محتسب کے دل کے کٹ جائیں
اُٹھے جو موج ساغر سے بنے شمشیر میخانہ

مجھے اس طرح کرنا دفن رندو یہ وصیت ہے
سرہانے خشت خم ہو سامنے تصویر میخانہ

کوئی مسند نشیں آتا ہے ساقی اس طرح شب کو
صدا کیسی کہ ہلتی تک نہیں زنجیر میخانہ

بھٹکتا تھا جہاں تو مجھ کو دونا کیف ہوتا تھا
مجھے واعظ پسند آئی تری تقریر میخانہ

مرے گھر میں تہجد شیخ نے آخر قضا کر دی
کہیں تصویر بت پائی کہیں تصویر میخانہ

لب کوثر پہ [illegible] ہوئی فردوس میں دیکھی
مری آنکھوں میں ساقی پھر گئی تصویر میخانہ

حرم کی راہ میں دونوں طرف دلکش مناظر ہیں
ادھر تعمیر بتخانہ اُدھر تعمیر میخانہ

کہ [illegible] پل صراط اور پاؤں مستانہ پڑے میرا
خدارا دستگیری کر مری اے پیر میخانہ

کچھ اس انداز سے برسی گھٹا خود شیخ بول اُٹھا
فلک سے آج اُتری آیۂ تطہیر میخانہ

پئے آرائش بیت الحرم کچھ تو اضافہ ہو
مرا جی چاہتا ہے بھیج دوں تصویر میخانہ

قیامت تک اُسے جو چھوڑے اُس کو نفیس ساقی ہو
ہماری قبر پر لٹکی رہے زنجیر میخانہ

کیا ساقی نے وقف عام شاید میکدہ واعظ
کھلی دیکھی ہے میں نے خواب میں زنجیر میخانہ

وہاں تک پی کے پہونچا ہوں اگر ساقی اجازت دے
ملا دوں عرش کی زنجیر سے زنجیر میخانہ

غضب ہے تم نے واثق بیعت دست سبو اب کی
تمہیں مرد خدا سمجھے تھے ہم تو پیر میخانہ

(جناب الحاج منشی امیر احمد علوی صاحب بی اے پنشنر ڈپٹی کلکٹر)

(نمبر ۲)

تعلیم دینیات شادی سے پہلے تمام ہو چکی تھی۔ کتب عربی کا مطالعہ مولوی حسن بخش کی وفات کے بعد ختم ہوا۔ سارا وقت انگریزی پڑھنے اور فارسی انشا پردازی میں صرف ہونے لگا۔ سرکاری مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر بابو چوڑامن بڑی شفقت و محبت سے پڑھاتے تھے۔ شاگردوں میں بھی جوہر قابلیت موجود تھا۔ سالانہ امتحانات میں کامیاب ہوکر اپریل ۱۸۸۴ء میں دونوں بھائی مڈل پاس ہو گئے۔

اسی زمانہ میں ایک بیاض فارسی اشعار کی مرتب کی جس میں صائب۔ کلیم۔ ظہوری و بیدل کے کلام کا انتخاب تھا۔ فارسی صنائع و بدائع کی مثالیں تھیں اور ابتدائی اوراق پر یہ رباعی درج تھی۔

زاہد بہ مے دو سالہ ربطے دارد — عابد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد
معلوم نہ شد کہ یار سر در بہ کیست — ہر کس بخیال خویش خبطے دارد

مولوی محمد محسن کے پھوپھی زاد بھائی حکیم محب علی کے بڑے صاحبزادے منشی مقبول علی انگریزی پڑھتے اور مولوی نور الحسن کی صحبت میں دن کا بیشتر حصہ صرف کرتے تھے اُن سے فارسی میں گفتگو ہوا کرتی تھی۔ شیخ اکرام علی کی فارسی استعداد ان سب سے بہتر تھی۔ وہ بھی اسی زبان میں کلام کرتے تھے۔ اساتذۂ ایران کا کلام مطالعہ میں رہتا تھا۔ اور فارسی انشا پردازی سے ان سب کو دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ مگر مشکل یہ آ پڑی کہ مین پوری میں انٹرنس کی تعلیم کے لیے سرکاری مدرسہ نہ تھا۔ مشن ہائی اسکول موجود تھا۔ مگر وہاں قدم رکھنے میں بتیسمہ کا خطرہ تھا۔ لہذا مولوی نور الحسن۔ انوار الحسن اور اکرام علی مزید تعلیم کے لیے بارہ بنکی روانہ کیے گئے۔ جہاں مولوی محمد محسن کے چھوٹے بھائی مولوی محمد احسن اُس وقت سب جج تھے۔ وہ مرنجان مرنج۔ دیانتدار اور پرہیزگار تھے۔ علاوہ علوم رسمی کے نجوم و رمل میں دستگاہ۔ طب میں دخل رکھتے تھے۔ شعر گوئی سے ذوق تھا اور برادر بزرگ سے اصلاح لیتے تھے۔ کلام کا نمونہ دیکھیے:۔

جاتی رہی رسم دل لگی کی — رو دیے وہ جو بات کی ہنسی کی
تجھ سے دشمن کو دوست سمجھا — دل نے مرے ساتھ دشمنی کی
ہم نے وہ کیا جو اُس نے چاہا — اُس کے جو جی میں تھی وہی کی

احسن کیوں چپ ہو کس کی ہے یاد کچھ ہم سے کہو تو اپنے جی کی

ایضاً

رونے پہ مرے کہتے ہیں کیا اب نہ ملیں گے اقرار بھی کرتے ہیں تو انکار کی صورت

اُن کو تحقیق زبان کا شوق تھا۔ اور صحت الفاظ کا گفتگو میں بہت لحاظ رکھتے تھے۔ اگر کوئی لڑکا اُن کے سامنے لفظ "اکی" بیاے معروف بولتا تو فوراً ٹوکتے کہ صحیح لفظ "اکیے" بیاے مجہول ہے۔

بڑے بھائی کے عاشق و فرمانبردار تھے۔ بھتیجوں کو بہت چاہتے تھے۔ مولوی نور الحسن اُن کے داماد بھی ہوگئے تھے۔ انگریزی مدرسہ میں پڑھتے اور مکان پر اوقات فرصت میں چچا کی وسعت نظر اور تحقیق الفاظ و محاورات سے استفادہ کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔ مولوی نور الحسن کو یکایک تخمہ ہوگیا۔ چچا بدحواس ہوئے۔ ماں کاکوری سے دوڑکر پہونچیں۔ والد ماجد مین پوری سے تشریف لائے کئی روز تکلیف رہی۔ اور ہفتوں تک ضعف و نقاہت کا اثر رہا۔

صحت یاب ہوکر کاکوری آئے۔ ماں نے جشن کیا۔ عزیزوں نے تیل ماش خیرات کے لیے بھیجے مساکین کو صدقہ دیا گیا۔ اور مبارک سلامت کی رسمیں ادا ہوئیں۔ اسی کے ساتھ یہ طے کرلیا گیا کہ بارہ بنکی کی آب و ہوا موافق مزاج نہیں ہے۔ لڑکوں کو اٹاوہ میں پڑھنا چاہیے "وہاں کا پانی چورن کی خاصیت رکھتا ہے"۔

اٹاوہ میں ریلوے اسٹیشن تھا۔ مین پوری سے شِکرَم اور چھ پہیے روزانہ آتے جاتے تھے۔ والد ماجد کو ہرج مرج کی فوراً اطلاع پہونچ سکتی تھی "کٹرہ شہاب خاں" میں ایک خاندان شیوخ کا آباد تھا۔ جن سے مولوی محمد محسن کے موروثی تعلقات تھے۔ عہد طفلی کے کئی سال یہاں اپنے جدامجد مولوی حسین بخش شہید کے سایہ عاطفت میں بسر کیے تھے۔ اور وہ اسی محلہ میں اقامت گزیں رہے تھے۔ مولوی محمد محسن وطن آتے جاتے ہمیشہ دو چار روز یہاں قیام کرتے اور انھیں شیوخ کے مہمان ہوتے تھے۔ بزرگ خاندان شیخ محبوب بخش اُن کے رفیق تھے۔ اور شیخ جی کے صاحبزادے چودھری فضل الٰہی اور شیخ عنایت حسین مولوی نور الحسن اور انوار الحسن سے برادرانہ تعلقات رکھتے تھے۔ ان خصوصیات کی بنا پر کٹرہ شہاب خاں میں اقامت کی تجویز ہوئی۔

مولوی حسین بخش مغفور کے ایک دوست حاجی ممتاز علی خاں ہنوز زندہ تھے۔ سن شریف سو برس سے متجاوز ہوچکا تھا۔ لیکن اعضا میں قوت تھی اور تندرستی میں فرق نہ آیا تھا۔ ایک ہفتہ وار پرچہ "نجم الاخبار" اپنی نگرانی میں شائع کراتے تھے۔ بااثر اور حکام رس تھے۔ اُن کی سعی و کوشش سے "ہیوم ہائی اسکول" میں داخلہ ہوا۔ اسکول کے قریب ہی حکیم حبیب علی وکیل کا مکان تھا۔ جو مولوی محمد محسن کے پھوپھی زاد بھائی معقول و منقول کے جید فاضل تھے۔ شعر گوئی سے ذوق تھا۔ اور طب میں دستگاہ۔ وکالت کرتے تھے۔ مطب جاری تھا۔

مسلمانان شہر کے مقتدا رتھے۔ یہ نو وارد بھتیجے اکثر خدمت میں حاضر ہوتے اور اُن کے علم و فضل سے مستفید ہوتے تھے۔

نجم الاخبار کے اڈیٹر ماسٹر بشیر الدین اُردو نثر نویسی کا شوق رکھتے اور انگریزی جانتے تھے۔ مسلمانوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ تھی اور ایک مدرسہ قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے جس میں اسلامی تاریخ پڑھائی جائے اور "غزوۂ بدر" وغیرہ مہتم بالشان واقعات کے دن مدرسہ میں تعطیل ہوا کرے۔

مولوی نور الحسن سے ملاقات ہوئی۔ تعلیمی مسائل۔ انگریزی علوم کی ضرورت۔ زبان و محاورات کے مباحث پر گفتگو کا موقع ملا۔ بشیر الدین مدرستہ العلوم علیگڈھ کے ثنا خواں اور "انجمن جہل مرکب" کے سرگرم ممبر تھے۔ مولوی نور الحسن سر سید احمد خاں کو نیچریوں کا پیشوا کہتے اور اُنکے اسلام میں شک کرتے تھے۔ تبادلہ خیالات ہوا اور دونوں نے ایک دوسرے کی قدر کی۔

نجم الاخبار چند سال کے بعد بند ہو گیا۔ ماسٹر بشیر الدین نے اڈیٹر "البشیر" کے لقب سے شمالی ہند میں شہرت پائی۔ عالی شان اسلامیہ ہائی اسکول اُن کی جد و جہد سے اٹاوہ میں قائم ہوا۔ جوانی کا خواب بڑھاپے میں راست آیا لیکن مولوی نور الحسن سے جو دوستی شباب کے وقت پیدا ہوئی تھی زندگی بھر برقرار رہی اور دونوں خدمت گذاران قوم ہمیشہ ایک دوسرے کا ادب و احترام کرتے رہے۔

غرض اٹاوے میں صحبت پرلطف تھی۔ لیکن ہیوم ہائی اسکول میں دل نہ لگا۔ پدر بزرگوار کو لڑکوں کی جدائی ناگوار تھی۔ ادھر سے مدرسین کی بے توجہی کی شکایت ہوئی اُدھر سے حکم آیا کہ نام کٹوا کر چلے آؤ۔ چند مہینے اٹاوے میں قیام کر کے مین پوری واپس گئے اور مشن اسکول میں داخلہ کے لیے نیا تعلیمی سال شروع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

اس زمانہ میں منشی امیر احمد امیر مینائی عارضی طور پر لکھنؤ میں مسکن گزیں تھے۔ اور ایک گلدستہ "دامن گلچیں" نام اُن کی نگرانی میں نکلتا تھا۔ ابتدائی پرچوں میں ہندوستان کے بہترین شعرا نے طبع آزمائی کی۔ افضل۔ امیر داغ۔ جلال۔ ریاض۔ شوق۔ ممتاز وغیرہ سب کی غزلیں ہوتی تھیں۔ منشی امیر احمد کے اصرار سے مولوی محمد محسن نے بھی دو تین غزلیں بھیجیں۔ ایک کا مقطع تھا۔

اس غزل کہنے میں ہے تعمیل ارشاد امیر　　بعد مدت آج محسن خامہ فرسائی ہوئی

مولوی نور الحسن اس گلدستہ کو بہت دلچسپی سے پڑھتے اور اس کے بہترین اشعار کا انتخاب کیا کرتے تھے۔ چند ماہ کے بعد امیر مینائی رامپور واپس گئے اور دامن گلچیں کی کلیاں[1] مرجھا گئیں۔ لیکن مولوی نور الحسن کو اس گلدستہ سے

---

[1] شعر گلدستے میں بھیجا افسردہ دل کے کیا امیر ؛ دامن گلچیں میں کچھ کلیاں ہیں مرجھائی ہوئی۔

شغف باقی رہا۔ اور جب تک وہ بند نہیں ہوا برابر پڑھتے رہے۔ مولوی محمد محسن کے بھانجے اور شاگرد منشی عبدالحمید نیرنگ (جواب ریاست جھالراپاٹن کے ملک الشعرا اور فرمانروا کے استاد ہیں) فارسی انشا پردازی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اردو شاعری سے ذوق تھا اور نثر سلیس لکھتے تھے اودھ پنچ کے نامہ نگار تھے۔ اور مین پوری اکثر آیا کرتے تھے۔ اُن کا ظریفانہ رنگ دیکھ کر مولوی نور الحسن کو بھی ادب لطیف کا شوق ہوا۔ "تفتہ جگر" کے نام سے متعدد مضامین اودھ پنچ کے لیے لکھے۔ جولائی ۱۸۸۵ء میں رمضان تھا۔ ۹ جولائی کے پرچہ میں "روزہ داروں کی پسند" یوں بیان فرمائی :-

ظروف میں	ناند (نان)
پیشوں میں	نانبائی (نان)
اقربا میں	نانی (نان)
شہروں میں	نانپارہ (نان)
خدا کے ناموں میں	حنان ومنان (نان)
آلات حرب میں	سنان (نان)
بندوں کے ناموں میں	عدنان (نان)

اس رنگ میں بہترین مضمون "عشق جورو" تھا۔ جس کی سرخی تھی :-

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے — خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

اس پر منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ نے تقریظ کی تھی کہ "حضرت یہ شرعی عشق ہے۔ جیسے شرعی پاجامہ۔ یہاں مولوی لوگ بگڑ ہی جائیں گے۔"

المختصر بارہ بنکی اور اٹاوے کی سرگردانی میں ایک سال گنوا کر مشن اسکول میں نام لکھایا۔ بیشتر وقت کتب درسی کے مطالعہ میں صرف کرتے لیکن ذوق ادب بدستور تھا۔ فطری متانت وسنجیدگی نے ظرافت کی طرف مائل نہ رہنے دیا۔ اور چند ماہ کے بعد اودھ پنچ کی نامہ نگاری ترک کردی۔

وہ مولوی محمد حسین آزاد کے طرز تحریر کے مداح تھے۔ تذکرۂ آب حیات کے چست فقروں کی داد دیتے نیرنگ خیال کا "قبولیت عام کا دربار" بڑے جوش وخروش سے پڑھتے اور حاشیہ نشینوں کو سنایا کرتے تھے۔

مارچ ۱۸۸۶ء میں خدا نے فرزند عنایت کیا۔ احمد حسن نام رکھا گیا۔ "برخوردار من" تاریخ ولادت ہوئی اعزہ واقربا مسرور ہوئے۔ مولوی انوار الحسن بندوقیں چھڑانے کاکوری گئے۔ خوشیاں منائی گئیں۔ لیکن وسیع پیمانہ پر جشن کی نوبت نہ آئی تھی کہ ایک عزیز قریب کا انتقال ہوگیا۔

منشی نعیم الدین کا تذکرہ ان اوراق میں پہلے آچکا ہے۔ انھوں نے کم سنی سے مولوی نور الحسن کو شعر و سخن کا شوق دلایا تھا۔ وہ ۲۴ مارچ ۱۸۹۶ء کو دنیا سے رخصت ہوئے اور اس دلخراش سانحہ کی وجہ سے ولادت فرزند کی تقریب میں مجلس عیش و نشاط منعقد نہیں کی گئی۔

حضرت امیر مینائی نواب صاحب رامپور کے حکم سے اُردو کا ایک جامع لغت تیار کرنے کا ارادہ کر رہے تھے۔ اُس کا ایک نمونہ شائع ہوا۔ جس میں صرف "آنکھ" کا لفظ اور اُس کے مرکبات تھے۔ اساتذہ کے کلام سے پہلوئے استعمال دکھانے کے لیے سندیں تھیں۔ مولوی نور الحسن نے یہ نمونہ غور و خوض سے پڑھا اور دوستوں کی صحبت میں اس پر نکتہ چینی کی۔ منشی امیر احمد کے دو صاحبزادے لطیف احمد و خورشید احمد انگریزی پڑھنے مین پوری آئے تھے اور مولوی محمد محسن کے مہمان تھے۔ اُن سے اس نمونہ کی بابت لطیف بحثیں رہیں۔ شعر و سخن سے ذوق بڑھا۔ اُردو شعرا کے دواوین مطالعہ میں رہنے لگے۔ حسب ذیل شعر اس زمانہ میں اکثر اُن کی زبان سے سُنا جاتا تھا:۔

رات ابھی دوڑتی آئے جو کرو وعدۂ وصل　　　کھیے تو چار گھڑی دن سے اندھیرا ہو جائے

چند ماہ کے بعد ملکہ وکٹوریہ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا جشن ہوا۔ مین پوری کے کوردہ میں نزاہد فریب جلسے دلکش تماشے ہوئے۔ چراغاں ہوا۔ آتشبازی چھٹی۔ سب سے لطف اندوز ہوئے۔ مگر جب سالانہ امتحان کا وقت آیا تو اتفاقاً قضا و قدر سے بیمار ہو گئے۔ امتحان کا مرکز آگرہ تھا۔ سامان سفر درست ہو چکا تھا۔ والد کے ایک دوست کا مکان قیام کے لیے تجویز ہوا تھا۔ فرودگاہ سے مقام امتحان تک آمد و رفت کے لیے فٹن مین پوری سے روانہ کی جا چکی تھی۔ سویرے کوچ ہونے والا تھا کہ شام کو مولوی نور الحسن کے سر میں درد اُٹھا۔ رات کرب و بے چینی سے گذری اور صبح کو نقل و حرکت کے قابل نہ رہے۔ دو دن کے بعد آرام ہوا۔ مگر اضمحلال ہفتوں تک رہا۔ مولوی انوار الحسن اور شیخ اکرام علی[1] آگرے چلے گئے تھے۔ یہ مین پوری میں تنہا تھے۔ امتحان میں عدم شرکت کا قلق تھا۔ طبیعت ہر وقت افسردہ رہتی تھی۔ والد ماجد نے حکم دیا کہ تبدیلِ آب و ہوا کے لیے یہ بھی اکبر آباد جائیں۔ اور سیر و تفریح سے دل بہلائیں۔ چنانچہ یہ مع منشی مقبول علی کے آگرے گئے۔ تاج گنج اور اعتماد الدولہ کی سیر کی۔ جمنا جی کے درشن کیے۔ چند اعزہ[2] آگرے میں ملازم تھے۔ اُن کے یہاں دعوتیں کھائیں۔ اور ہفتہ عشرہ کے بعد واپس آئے۔

---

[1] ان میں سے ایک شیخ غلام باقی علوی تھے جو اُس وقت سررشتہ دار کمشنری تھے۔ اور بعد کو تحصیلدار ہو گئے۔ پنشن کے بعد فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے مکہ معظمہ گئے اور وہیں ۲۳ ستمبر ۱۹۱۹ء کو حج کے بعد داخل خلد بریں ہوئے۔

[2] دوسرے حاجی اکرام حسین علوی حافظ مولف سیف المقلدین وغیرہ کتب کلامیہ تھے۔ ۱۳۴۲ھ میں انتقال کیا۔ بڑے دیندار اور پابند وضع تھے۔ مولوی نور الحسن و انوار الحسن سے بہت محبت رکھتے تھے۔ مولوی نور الحسن فرماتے تھے کہ انھوں نے آگرہ میں دعوت کی تو برف کے پانی سے ہاتھ دُھلوائے تھے۔ حالانکہ اُس زمانہ تک شمالی ہند میں برف کی دستیابی اطلاعاً نہ تھی جواب ہے۔

آگرے میں امتحان کے پرچے دیکھ کر اور وہاں کے طلبا کی انگریزی لیاقت کا اندازہ کرکے یہ راے قائم ہوئی کہ مشن اسکول کی تعلیم ناقص ہے۔ اور یہاں انگریزی میں کافی قابلیت پیدا کرنے کی صورت نہیں۔ علیگڈھ کالج میں ایمان کا خطرہ تھا۔ الہ آباد دور تھا۔ آگرے کی گرمی ناقابل برداشت تھی۔ لکھنؤ وطن سے قریب تھا۔ اہل دعیال کی زنجیر پانوں میں پڑ چکی تھی۔ رغبت قلب اُسی طرف ہوتی تھی۔ مگر قصبات کے بزرگ نوعمر لڑکوں کا لکھنؤ کے غدار شہر میں آزاد و خودمختار ہو کر رہنا معیوب سمجھتے اور مثالیں پیش کرتے تھے کہ فلاں صاحبزادے لکھنؤ پڑھنے گئے تھے۔ چند روز کے بعد گومتی کے کنارے ایک میم کے ساتھ ہوا کھاتے دیکھے گئے۔ اور فلاں لڑکا تعلیم کے لیے شہر میں تھا۔ ہر اتوار کو گرجا جانے لگا۔ اب عیسائیوں کے بورڈنگ میں رہتا ہے معلوم نہیں کہ بتسمہ لے لیا یا نہیں۔

اس غور و فکر میں دو مہینے گذرے۔ امتحان کا نتیجہ آیا۔ معلوم ہوا کہ مولوی انوار الحسن بھی فیل ہو گئے۔ البتہ شیخ اکرام علی پاس ہوئے۔

کالج کھلنے کا زمانہ آگیا تھا۔ مولوی محمد محسن نے طے کیا کہ دونوں صاحبزادے لکھنؤ میں پڑھیں اور شیخ اکرام علی سلسلۂ تعلیم قطع کرکے تلاش ملازمت میں سرگرم ہوں۔ منشی مقبول علی ۱۸۹۶ء میں مڈل پاس کر چکے تھے۔ اُن کے والد نے تجویز کی کہ وہ بھی انھیں بھائیوں کے ساتھ لکھنؤ میں رہیں۔ اور وہیں سے انٹرنس کا امتحان دیں۔ مولوی محمد احسن سب جج بارہ بنکی نے اپنے ضلع کے ایک رئیس راجہ ہڑاہا کا عالی شان مکان قیصر باغ میں ان لڑکوں کے قیام کے لیے دلا دیا۔ اور جولائی ۱۸۹۳ء سے یہ مین پوری کا قافلہ قیصر باغ میں مقیم کیننگ کالج کے انٹرنس کلاس میں داخل ہو گیا۔

لکھنؤ میں طالب علمی | وضع قطع سب کی یکساں تھی۔ خشخاشی ڈاڑھی۔ خمدار پٹے۔ مندیل نما ٹوپی۔ نیچے دامن کی اچکن۔ غرارے دار پاجامہ۔ اس قدامت پرستی پر لسان ثانی عربی اور پابندی صوم و صلوٰۃ کی مہر!! کالج کے طلبا خندہ زنی کرتے اور اس کاروان حجازی کے قافلہ سالار کو "مولوی بدر الدجے" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ شرارت کے اندیشہ سے چھوٹی مُہری کا پاجامہ بہت جلد شروع کیا گیا۔ چند روز کے بعد اچکن کی جگہ جبت شیروانی نے لی۔ لیکن بالوں کے پٹے برسوں بحال رہے اور ترکی ٹوپی مدت طالب علمی میں استعمال نہیں کی۔ ۱۸۹۵ء میں جب راقم الحروف اُن کی نگاہ سے دور ہو کر لکھنؤ آیا اور کیننگ کالج کے ایف۔ اے کلاس میں داخل ہوا تو اُستاد نے ایک ہدایت نامہ حوالہ کیا تھا جس میں علاوہ دیگر بیش بہا نصیحتوں کے یہ حکم بھی تھا کہ "ترکی ٹوپی انگشت نما ہے۔ اس کو استعمال نہ کرنا"۔

باز آمدم بر سر داستاں۔ منشی امتیاز علی کاکوروی لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے۔ معاملہ فہمی اور طلاقت لسانی کی

دھوم تھی۔ تعلقداران اودھ موکل تھے اور رؤسائے شہر نیازمند۔ اُن کی پُر فضا کوٹھی قیصر باغ کے قریب اور راجہ ہرڑالی والے مکان کے بالکل سامنے تھی۔ اُن کے بھانجے منشی واحد علی بسمل[1] مولوی نور الحسن کے ہم سن اور مخلص دوست تھے۔ وہ بہت تیز طبع ذہین اور نازک خیال تھے۔ امیر مینائی کے شاگرد تھے۔ اور اُن کے حکم سے سال ڈیڑھ سال تک "دامن گلچیں" کی ادارت بھی کی تھی۔ کلام کا نمونہ دیکھیے:۔

تیری الفت میں یہ حالت ہو گئی — دیدہ و دل میں عداوت ہو گئی
بے بُلائے آپ آئے میرے گھر — آج مجھ پر کیا عنایت ہو گئی
زندگی بسمل مصیبت سے کٹی — مر گئے جس روز راحت ہو گئی

آخری وقت تو وعدوں پہ نہ ٹالا ہوتا — مرتے مرتے کوئی ارمان نکالا ہوتا
مر گیا میں تو وہ بولے ابھی جلدی کیا تھی — اور دو دن ملک الموت کو ٹالا ہوتا
ہم نہ کہتے تھے کہ ہو جاؤ گے بسمل بدنام — رنگ لائے گا نظارہ یہ پری خانوں کا

لڑکپن کے دوست مولوی نور الحسن جب کاکوری آتے تو اُن سے لطیف علمی مباحثے ہوا کرتے تھے۔ ایک عربی میں افضل تھے اور دوسرے کی استعداد فارسی بڑھی ہوئی تھی۔ دامن گلچیں بند ہو چکا تھا۔ لیکن شعر و سخن میں انہماک بدستور تھا۔ شاعری کرتے اور شطرنج و گنجیفہ کھیلتے تھے۔ مولوی نور الحسن کا لکھنؤ میں قیام اُن کے محبت بھرے دل کے لیے صبح عید سے کم نہ تھا۔ روزانہ سہ پہر کو قیصر باغ آتے اور گھنٹوں اپنے دوست سے ہنسی مذاق کرتے رہتے۔ یہ بھی بازدید کے لیے اُن کی کوٹھی جاتے اور تفریحی مشاغل میں شرکت کرتے تھے۔

ضلع رسلے بریلی کے ایک کہنہ مشق شاعر میر ولایت علی فردوس اکثر منشی واحد علی کے ساتھ رہتے تھے۔ فسانۂ عجائب کا دلچسپ قصہ نظم کر رہے تھے۔ جس کا ایک حصہ "باغ فردوس" کے نام سے مدت کے بعد الناظر پریس نے شائع کیا۔ چند ڈرامے بھی تصنیف کیے تھے۔ منیزہ و بیژن کا ڈرامہ مولوی نور الحسن کو سنایا اور جنبش لب و ابرو سے "موشن" دکھائے۔ ایک ڈرامے میں "دنیا" کی دو رنگی کا بیان تھا جس کی پیدائش کے وقت نجومیوں نے پیشینگوئی کی تھی کہ ؎

گلے سے لگائے گی لاکھوں گلوں کو — ہزاروں گلوں کا یہ خود جامہ ہو گی

مرثیے اور سلام بھی لکھتے تھے۔ حضرت علی اکبر کی شان میں ایک شعر تھا:۔

---

[1] تاریخ ولادت ۹ رجب ۱۲۸۱ھ تاریخ وفات ۱۰ جمادی الثانیہ ۱۳۳۵ھ افسوس ہے کہ مجموعہ غزلیات کسی نے مرتب نہیں کیا۔ مندرجہ بالا اشعار "دامن گلچیں" کے پرچوں سے نقل کیے گئے۔ ان کے قابل بھائی منشی احمد علی بی اے مصنف "شباب لکھنؤ" پہلے ہی انتقال کر گئے تھے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو آج بسمل کا کلام بھی زندہ ہوتا۔

خورشید ہلال سے عیاں تھا سنّت کا چاند چودھواں تھا

اُستاد مرحوم نے اعتراض کیا کہ پہلا مصرعہ سست ہے ان کی مثنوی کے بعض اشعار میں بھی یہی عیب تھا مثلاً

گوئندۂ فرخی و شومی سمجھی میں تھیں سے وہ نجومی

دوسرا مصرعہ بے ساختہ ہے اور پہلا بیکار۔

با ایں ہمہ فردوس کی ذہانت و طباعی۔ حاضر جوابی اور علم موسیقی سے واقفیت کے قائل تھے۔ اور اُن کی دلربایانہ شعرخوانی دلفریب نقالی سے لطف اُٹھاتے تھے۔ منشی احمد علی شوق قدوائی جگوری لکھنؤ سے اخبار آزاد نکالتے تھے۔ مولوی نورالحسن سے دور کی رشتہ داری تھی۔ اکثر ملنے آتے تھے۔ اس زمانہ میں مثنوی "ترانۂ شوق" تصنیف ہو رہی تھی۔ محاورات خوب باندھتے تھے۔

مٹی نہ کرا آبرو کو جانی اندھا ہے کنواں جو ہو نہ پانی

چار اپنے پرائے کیا کہیں گے تھو کیں گے بُرا بھلا کہیں گے

صحت زبان کا بہت شوق تھا۔ محاورات سیکھنے کے لیے بعض بیگمات شہر کی خدمت میں رسائی حاصل کی تھی۔ میلوں ٹھیلوں کی سیر کرتے بلکہ شہدوں کی محفلوں میں اُن کی اصطلاحیں یاد کرنے جاتے تھے۔ ؎

اُس نقش پا کے سودے نے کیا کیا کیا ذلیل میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

اسیر لکھنوی کے شاگرد تھے اور امیر مینائی سے اصلاح لی تھی۔ اخبار کی بدولت چھاپہ خانہ ذاتی تھا۔ مثنوی کی طباعت شروع ہو چکی تھی۔ ایک دن شام کے وقت پروف کا ایک ورق مولوی نورالحسن کے کمرے میں بھول گئے۔ اُس ورق پر یہ دو شعر لاجواب تھے۔

میری مہندی کی لاگ دیکھو ہاتھوں میں لیے ہوں آگ دیکھو

اختر مرتے ہو سچ بتاؤ کیونکر مرتے ہو مر تو جاؤ

مولوی نورالحسن "ترانۂ شوق" کے مداح تھے۔ ایک فاضلانہ ریویو مثنوی پر لکھا جس میں طلسم الفت۔ بہار عشق۔ گلزار نسیم وغیرہ سے ترانۂ شوق کی فوقیت ظاہر کی تھی۔ مگر ان کو اعتراض تھا کہ ہیرو اور ہیروئن کے نام مثنوی کی شان سے گرے ہوئے ہیں۔ "ماہ عالم" میں دلکشی نہیں اور "یاسمن" لونڈی باندی کا نام معلوم ہوتا ہے۔ شوق قدوائی نے اعتراض تسلیم کیا مگر مثنوی قریب ختم پہونچ چکی تھی۔ اس لیے یہ نقص دور نہ کیا جا سکا۔ اُستاد کو یہ بھی اعتراض تھا کہ بعض اشعار میں سخت آورد ہے اور ضلع جگت کی نوبت پہونچ گئی ہے۔ مثلاً :-

پاجی ہیں یہ سب شریفے سڑ جائیں بیری ہوئے بیر کیڑے پڑ جائیں

شوق نے اعتراف کیا اور طبع ثانی کے وقت اس شعر کو یوں درست بنایا :-

آئے نہ شریفے میرے کچھ کام ہے ان کا شریف نام ہی نام
آگاہ جو بیر سے میں ہوتی کیوں بیر لگا کے کانٹے بوتی

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اشعار میں ان کی فرمائش سے ترمیم کی گئی۔ اور بہت مدت کے بعد ۱۹۱۲ء میں جب نیر پریس لکھنؤ میں قائم ہوا تو اضافہ اور تصحیح کے بعد یہ رنگین مثنوی دوبارہ انھیں کے اہتمام سے شائع ہوئی۔ اگرچہ کارپردازان مطبع کی غفلت سے اس ایڈیشن میں اغلاط کتابت کا انبار ہوگیا۔ منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ سے بھی دیرینہ مراسم کی بنا پر ملاقات ہوتی تھی۔ مگر وہ اب نیشنل کانگریس کا جامہ پہنے تھے اور یہ کانگریسیوں کے خلاف تھے۔ اُنکے اخبار پر بھی پالٹیکس کا بہت اثر تھا۔ اور مطبع قیصر باغ سے دور تھا۔ اس لیے زیادہ میل جول نہیں بڑھا۔ شہر کی بعض مجالس عزا میں حاضری دی۔ حیدر کا سوز سنا۔ میر نفیس کے تحت اللفظ سے فیضیاب ہوئے۔ لیکن یہ افسوس رہا کہ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں شریک نہ ہوسکے۔ جو قیصر باغ کی سفید بارہ دری میں اُسی سال ہوا تھا۔ منشی امتیاز علی میزبان اور صدر جلسہ تھے۔ سرسید احمد خاں لکھنؤ تشریف لائے تھے اور مسلمانوں کی تعلیمی اور مالی پستی پر لاجواب خطبہ دیا تھا کیونکہ اُسی زمانہ میں ایک عزیز[۱] کی شادی تھی اور اُس تقریب میں شرکت کے لیے کاکوری جانا لازم تھا۔ اُسی زمانہ سے اُنھوں نے اپنے ایک ہشت سالہ بھانجے[۲] کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری لی۔ وہ لڑکا انوار سہیلی تک فارسی اور شرح مائۃ عامل تک عربی پڑھ چکا تھا۔ ابتدائی تعلیم بے قاعدہ ہوئی تھی مبتدا و خبر۔ فعل و فاعل۔ مضاف مضاف الیہ کی شناخت نہ تھی۔ عربی عبارت نہیں پڑھ سکتا تھا اور یہ ہدایت علی خاں بریلوی کے شاگرد لڑکے ہی سے عبارت پڑھوانا اور معنی کہلانا چاہتے تھے۔ لڑکا بدشوق بھی تھا۔ مطالعہ کے وقت سوتا اور موقع پاتے ہی کتاب بند کر دیتا تھا۔ ان کی زجر و توبیخ سے لرزتا مگر استاد کی نگاہ ہٹی اور کھیل کود میں مشغول۔

مولوی نورالحسن روزانہ کئی گھنٹے اُس کی تعلیم و تنبیہ میں صرف کرتے مگر لڑکا کا دل نہیں لگتا تھا اور کوئی ترقی ظاہرا معلوم نہ ہوتی تھی۔ اُن کی ہمت و استقلال کے قربان جائیے کہ لڑکے کی بدشوقی سے مایوس نہ ہوئے اپنا عزیز وقت ضائع کرکے بھانجے کو پڑھایا اور ایک سال میں ہدایۃ النحو سے قدوری تک پہونچا کر چند ورق

---

[۱] یہ شادی منشی عبدالقادر علوی خلف ڈپٹی امجد علی کی تھی۔ اور ۲۲ دسمبر ۱۸۸۷ء تاریخ عقد تھی۔ منشی عبدالقادر کیننگ کالج میں پڑھتے تھے اور مولوی نورالحسن کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ نائب تحصیلدار ہوئے۔ ڈپٹی کلکٹری سے پنشن لی۔ "خانصاحب" کا خطاب پایا۔ فی الحال بریلی میں سکونت پذیر ہیں۔

[۲] یہ مولوی نورالحسن کی بڑی ہمشیرہ کا لڑکا تھا۔ ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۴ جون ۱۸۷۹ء کو بمقام مین پوری پیدا ہوا۔ "چراغ محمد" تاریخی نام تھا۔

مشکوٰۃ کے بھی پڑھا دیے۔ علم مجلس سکھایا۔ فارسی انشا پردازی کی مشق کرائی۔ معمے اور پہیلیاں کا شوق دلایا۔ اُردو میں مضامین لکھوائے۔ املے کی غلطیوں پر تہدید محاورات کے بیجا استعمال پر تنبیہ کی۔ اور اُس نالائق لڑکے کو اس لائق بنایا کہ آج اپنے فاضل و قابل استاد کی سوانح عمری لکھتا ہے اور اُن کی شفقت و محبت کی یاد میں سونے کے ورق پر خون کے حرفوں سے میناکاری کرتا ہے۔

جان دی۔ دی اُسی کی تھی ‏ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہ سب کچھ تھا مگر اپنے کورس کی کتابوں پر کافی توجہ نہ کر سکے۔ سال کے نچوڑ کا وقت آیا تو منشی مقبول علی کو شرکت امتحان کی اجازت نہ ملی یہ شریک ہو کر فیل ہو گئے۔ البتہ مولوی انوار الحسن نے اسی سال انٹرنس پاس کر کے اپنے قافلے کی آبرو رکھی۔ گرمیوں کی تعطیل کچھ وطن میں گذاری اور کچھ مین پوری میں۔ مولوی حسن بخش کی وفات کے بعد عیدگاہ کی امامت ان کے سپرد تھی۔ وسط شوال تک مین پوری میں رہ کر اور عید کی نماز پڑھا کر لکھنؤ آئے۔ جولائی سنہ ۱۸۸۳ء سے وہ اور منشی مقبول علی انٹرنس کلاس میں اور مولوی انوار الحسن ایف اے کے پہلے سال میں داخل ہوئے۔ شیخ اکرام علی بجنوری کے چھوٹے بھائی منشی ناصر علی مین پوری سے اول درجہ میں مڈل پاس کر کے لکھنؤ آئے۔ ریاضی میں بہت تیز تھے۔ سرکاری وظیفہ ملا تھا۔ وہ بھی کیننگ کالج میں انٹرنس کے پہلے سال میں بھرتی ہوئے۔ اور مین پوری والے قافلہ میں ایک ممبر کا اور اضافہ ہو گیا۔

کیننگ کالج میں تقسیم انعام کا جلسہ ہوا۔ مولوی نور الحسن نے ایک عزیز[1] سے قصیدہ لکھوا کر جلسہ میں پڑھا۔ مجمع عام میں نعت خوانی کی عادت تھی۔ دل بڑھا ہوا تھا۔ مرعوب نہیں ہوئے۔ قصیدہ خوانی کی تعریف ہوئی اور ایک کتاب انعام میں ملی۔

دسمبر سنہ ۱۸۸۵ء میں منشی امتیاز علی بھوپال کے وزیر مقرر ہو کر لکھنؤ سے رخصت ہوئے۔ ریلوے اسٹیشن پر ہجوم تھا تعلقدار، رئیس، وکلا، اہل علم، اطبا اور ڈاکٹر مشایعت کے لیے آئے تھے۔ ہندو مسلمان، شیعہ سنی سب منشی جی کی مفارقت سے بےچین تھے۔ منشی واحد علی بھی ماموں کے ساتھ بھوپال جا رہے تھے۔ اس لیے مولوی نور الحسن افسردہ و مغموم تھے۔ مخلص دوست کو وداع کر کے واپس آئے تو طبیعت پریشان۔ دل لکھنؤ سے اچاٹ تھا۔ کوٹھی کی آمد و رفت کا سلسلہ چھٹا۔ شعر و شاعری سے دلچسپی گھٹی۔ انگریزی کی طرف ہمہ تن

---

[1] اس عزیز کا نام منشی عبد المجید تھا۔ وہ غلام مینا ساحر کاکوروی کے فرزند اور مولوی نور الحسن کے پھوپھا تھے۔ سحر تخلص تھا۔ مولوی محمد محسن سے اصلاح لیتے تھے۔ ڈپٹی کمشنر لکھنؤ کی کچہری میں محرر تھے۔ اکثر قیصر باغ آتے تھے۔ انھوں نے مدح خیر المرسلین کا مخمس کیا تھا۔ ۲۳ مئی ۱۹ء کو انتقال کیا۔ اُن کا ایک شعر سُنیے ؎ سفید ہو کے نہ پیری میں بےخبر ہوتے ‏ کہاں کی نیند مجھے پھٹ پڑی سحر ہوتے

ایک اور سُنیے ؎ روز و شب صحبت اغیار مبارک صاحب ‏ دن کو بھی آپ ہیں جائیں جہاں رات رہے

متوجہ ہو گئے۔ اُن کے ایک ہم وطن پڑوسی شیخ رفیع الدین سعدی نے حیدرآباد کے رسالہ "حسن" میں "قرآن شریف کی نئی ترتیب" پر ایک مضمون لکھا جس میں تجویز تھی کہ کلام مجید از سر نو مرتب کیا جائے تاکہ انبیائے سابق کے احوال بائبل کی طرح ایک جگہ ہو جائیں۔ اور احکام و نصائح الگ جمع کیے جائیں۔ رسالہ حسن کے اڈیٹر شیعہ تھے مگر اُنھوں نے بھی اس مضمون کے اکثر فقروں سے اختلاف کیا۔ مسلمان اخباروں نے چیخ پکار مچائی۔ مولویوں کے یہاں تو کافر سازی کی ٹکسال کھلی رہتی ہے۔ فوراً تکفیر کے فتوے صادر ہونے لگے۔ رفیع الدین کے باپ زندہ تھے۔ وہ بیٹے کی صورت سے بیزار ہوئے۔ عاق کرنے کی دھمکی دی۔ اب ہوش وحواس درست ہوئے اصلاح کرنے آئے۔ کہ عذر گناہ کن الفاظ میں شائع کیا جائے۔ مولوی نورالحسن نے وقت صرف کر کے تاویلیں تلاش کیں شان نزول اور ناسخ و منسوخ وغیرہ کے حیلے بتا کر باپ سے قصور معاف کرایا۔ اسی زمانہ میں سالانہ امتحان ہوا۔ اور پاس ہو گئے۔ اگرچہ منشی مقبول علی اس سال بھی فیل ہوئے۔ جولائی ۱۹۰۵ء سے مولوی نورالحسن ایف اے کے پہلے سال میں داخل ہوئے۔ منشی مقبول علی اور ناصر علی انٹرنس میں ہم جماعت تھے۔ منشی شیدا علی عباسی کاکوروی جو بستی میں اپنے بھائی کے ساتھ رہتے تھے۔ اور وہیں پڑھتے تھے تعلیم کے لیے لکھنؤ آئے۔ وہ بھی اسی تالاب کے ساتھ قیصر باغ میں رہنے لگے اگرچہ اُن کا کمرہ رہائش الگ تھا اور انتظام خورد و نوش بھی جدا تھا۔

حاجی ممتاز علی خاں رئیس اٹاوہ جن کا نام ان اوراق میں پہلے آچکا ہے لکھنؤ تشریف لائے۔ اور مولوی نورالحسن کے مہمان ہوئے۔ منشی بشیر الدین بھی ہمراہ تھے۔ منشی سجاد حسین وغیرہ شہر کے ادیبوں اور اخبار نویسوں سے ملاقاتیں رہیں۔ اور چند روز تک لیے ادب اُردو کا ذوق تازہ ہو گیا۔ مگر مہمانوں کے رخصت کرنے کے بعد پھر ان خیالات سے دل ہٹایا۔ ایک دن منشی مقبول علی کے ساتھ روشن الدولہ کی مسجد میں جو ان کے مکان کے متصل تھی نماز پڑھنے گئے۔ وہاں لکھنؤ کے دو سن رسیدہ شوقین با آواز بلند باتیں کر رہے تھے۔ اور کسی نواب زادے کی مدح و صفت میں تر زبان تھے کہ "ایسے صف شکن بٹیر جمع کیے کہ باپ دادا کا نام روشن کر دیا۔" منشی مقبول علی ضبط نہ کر سکے اور ان شوقینوں سے مخاطب ہو کر بولے کہ "حضرت باپ دادا کا نام بٹیروں کی پالی سے روشن ہوتا ہے" وہ بگڑ گئے اور حجت کرنے لگے۔ مولوی نورالحسن نے اپنے ہمراہی کو بات بڑھانے سے منع کیا اور مسجد سے ہٹا لائے۔

مولوی محمد احسن سب جج۔ سرکاری ملازمت سے پنشن لے کر نائب وزیر دیوانی ریاست بھوپال کے مقرر ہوئے اور اپنے صاحبزادے مولوی نظیر الحسن کو تعلیم و تربیت کے لیے بھتیجوں کی نگرانی میں قیصر باغ چھوڑ گئے۔

وہ بڑے نیک طبع۔ صالح اور کم سخن تھے۔ زبان میں کسی قدر لکنت تھی۔ ذہن خراب تھا اور فہم ناقص۔

لہ بن شیخ امید علی از اولاد مخدوم شیخ سعدی کاکوروی۔ سنا ہے کہ یہ عیسائی بنکر امریکہ چلے گئے تھے۔ اور وہیں انتقال کیا۔ یہاں مکان کا کوئی وارث نہ رہا۔ اینٹیں کھُد کر زمین برابر ہو گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

گلستاں تک فارسی پڑھی تھی۔ انگریزی کی کوئی ریڈر پڑھتے تھے۔ لیکن حافظہ کی کمزوری سے کچھ یاد نہ تھا۔ اُن کو فارسی پڑھانے کے لیے خواجہ عزیزالدین لکھنوی کے ایک شاگرد مولوی امیر علی نام جن کو غالب کے کلام فارسی سے بہت دلچسپی تھی۔ اور دستنبو کے عاشق تھے مقرر کیے گئے۔ راقم الحروف اُس وقت منیۃ المصلی پڑھتا اور انشا پردازی کی مشق کرتا تھا۔ وہ بھی انھیں مولوی صاحب کے حلقۂ درس میں شریک کیا گیا۔ اگرچہ مولوی نورالحسن کی نگرانی تھی۔ نظیر الحسن کو انگریزی پڑھانے کے لیے ماسٹر مقرر کیے گئے۔ اور راقم الحروف کو مولوی نورالحسن نے خود پرائمر شروع کرائی۔ یہ اُنکے طرز تعلیم کا کمال تھا کہ ایک سال میں انگریزی کی دو تین ریڈریں پڑھائیں۔ گرامر حفظ کرائی۔ اور جولائی ۱۸۹۰ء سے جوبلی ہائی اسکول کے درجہ پنجم میں (جو زمانہ حال کے درجہ ہفتم کے برابر تھا) داخل کرا دیا۔ خود مدرسہ تشریف لے گئے۔ ہیڈ ماسٹر سے گفتگو کی۔ اور کہا کہ میں اس لڑکے کو درجہ چہارم میں داخل کرانا چاہتا ہوں۔ ماسٹر صاحب نے امتحان لے کر صلاح دی کہ اس کو ایک درجہ نیچے بھرتی کرائیے تاکہ اپنی جماعت میں تیز رہے۔ جغرافیہ اور حساب کی کمزوری دور ہو جائے مولوی نورالحسن نے بخوشی خاطر منظور کیا۔ فرماتے تھے کہ اس وقت ایک سال ضائع کرانے سے یہ نفع ہوا کہ لڑکا ہر امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتا رہا اور بی اے تک کبھی فیل نہیں ہوا۔

اپریل ۱۸۹۰ء میں مولوی انوارالحسن ایف اے کے امتحان میں اور منشی مقبول علی و ناصر علی انٹرنس میں شریک ہوئے۔ موخرالذکر پاس ہوئے اور سب فیل ہو گئے۔ منشی مقبول علی نے دل برداشتہ ہو کر پڑھنا چھوڑ دیا۔ اور مولوی انوارالحسن جولائی ۱۸۹۰ء سے ایف اے کے دوسرے سال میں بڑے بھائی کے ہم جماعت ہو گئے۔ امیر احمد اور نظیر الحسن کو مدرسہ میں داخل کرا کے اُن کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ کی ضرورت باقی نہ تھی۔ ادب اُردو سے دلچسپی کا ذریعہ صرف منشی احمد علی شوق کی ملاقات تھی۔ وہ بھی کم آتے جاتے تھے۔ سارا وقت ایف اے کورس کی تیاری میں صرف ہوتا تھا۔ نماز پنجگانہ اور تلاوت کلام مجید طبیعت ثانیہ ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی شاہ مینا کے مزار پر حاضری دیتے یا حضرت گنج کی طرف سیر و تفریح کو جاتے تھے۔ ورنہ صبح سے دس بجے رات تک سوائے انگریزی کتابوں یا عربی ایف اے کورس کے کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ نتیجہ وہ ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ دونوں بھائی اُسی سال (یعنے اپریل ۱۸۹۱ء میں) ایف اے کے امتحان میں کامیاب ہو گئے۔

امتحان سے فارغ ہو چکے تھے مگر نتیجہ نہیں آیا تھا۔ کہ امیر اللغات کا پہلا حصہ جس کا برسوں سے انتظار تھا شائع ہوا۔ اردو زبان میں اس وقت تک کوئی مستند اور جامع لغت موجود نہ تھا۔ میر علی اوسط رشک شاگرد ناسخ نے چالیس برس پہلے ایک لغت کی ترتیب کی تھی۔ مگر اُس کی طباعت کی نوبت نہ آئی۔ اُس میں الفاظ کا ذخیرہ بہت تھوڑا تھا۔ محاورات میں فصیح و غیر فصیح کا امتیاز نہ تھا۔ لفظوں کے معانی فارسی میں لکھے تھے

جس کا رواج اب باقی نہ تھا۔ اُردو زبان اسقدر وسیع ہو چکی تھی۔ اور جدید محاورات اسقدر رائج ہو چکے تھے کہ رشک کا لغت تقویم پارینہ سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا۔ اُردو لغت کی ضرورت مدت سے محسوس کی جاتی تھی۔ جب سے کہ ۱۸۸۸ء میں "آنکھ" اور اُس کے مرکبات کے معانی مع اسناد کے بطور نمونہ "امیر اللغات شائع ہوئے تھے۔ ملک کو اس لغت کی اشاعت کا بے چینی سے انتظار تھا۔ سب سے پہلے منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ نے ۲۴ر اپریل ۱۸۹۱ء کے پرچہ میں اس پر ریویو کیا اور لکھا کہ "جو لوگ اُردو صحیح بولنا اور لکھنا چاہتے ہیں اُن کو یہ کتاب حرز جاں بنانا چاہیے"۔

مولوی نور الحسن اس لغت کے عرصے سے مشتاق تھے۔ قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور ادب سے پڑھا۔ معانی پر غور۔ اسناد پر لحاظ کیا۔ فروگذاشتوں کی یادداشت لکھی۔ بعض الفاظ کے املے اور معنی میں شک کیا اور اشتقاق الفاظ قواعد نحو کی بابت فاضل مولف کی موشگافیوں کی داد دی۔

اس لغت میں لفظ "آری" بمعنے "عاجز" الف ممدودہ سے لکھا تھا۔ یہ اُس کو "عین" سے لکھتے اور "عار" سے مشتق سمجھتے تھے۔ امیر مینائی کی خدمت میں ایک عریضہ بھیجا اور اپنا شبہ ظاہر کیا۔ اُس زمانہ میں یہ بحث بھی چھڑی ہوئی تھی۔ کہ مسالے کا صحیح املا کیا ہے۔ بعض حضرات اُس کو "مصالح" لکھتے تھے اور بعض "مصالحہ" بتاتے تھے۔ اور کمتر "مسالہ" کہتے تھے۔ اسی عریضہ میں اس کی بابت بھی استفسار کیا۔

منشی صاحب کے جوابات اُن کے والانامہ مورخہ ۸ر اگست ۱۸۹۱ء میں درج ہیں جو آئندہ صفحات پر نقل کیا جائے گا۔

جولائی ۱۸۹۱ء میں کیننگ کالج کے بی اے کلاس میں داخل ہونے کے بعد امیر اللغات پر ایک فاضلانہ ریویو لکھا جس کی تمہید میں "لغت" کی قدیم تاریخ تھی۔ انگریزی۔ عربی۔ فارسی کے لغات اور سنسکرت کے "امرکوس" کا تذکرہ تھا۔ اس کے بعد تحریر فرمایا تھا:-

"زبان اُردو جو ترقی کے کئی درجے طے کر چکی ہے اگرچہ لغت سے محروم نہ تھی مگر ایسے لغت کی محتاج تھی جس کی بنا منشی امیر احمد امیر مینائی نے ڈالی اور جس کا پہلا حصہ ہمارے سامنے ہے۔ اس حصہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طرز تحریر انگریزی لغت سے اخذ کیا گیا۔ اور اصول لغت عربی لغات سے۔ ہندی الفاظ کا اشتقاق سنسکرت کا محتاج تھا جس کا انتظام اس حصہ میں خوب کیا گیا ہے۔ اشعار مثالیہ کا التزام اور کئی کئی اشعار کا پہلو سے استعمال دکھانے کے لیے لکھنا باعث طوالت کتاب ضرور ہے لیکن اس سے اُن بحثوں کا فیصلہ بہ آسانی ہو جائے گا جو معمولی شاعروں اور نثاروں میں کسی محاورے یا پہلوئے استعمال پر ہوا کرتے ہیں۔ امیر اللغات میں فصیح و غیر فصیح۔ مستعمل و متروک۔ اضداد وغیرہ کے علاوہ تذکیر و تانیث اور اس پر کہیں کہیں مولف کی رائے

دو لفظ ہم معنی کا باریک فرق استعمال جیسے آزاد۔آزادہ۔آراستہ۔پیراستہ کا فرق۔حرف زائد کی تفصیل۔ رسم الخط واملا۔سنسکرت دری وغیرہ زبانوں سے اشتقاق۔محاورات کا پہلوے استعمال۔نظم میں ناسخ۔ آتش۔غالب۔ذوق۔اسیر۔داغ وغیرہ مشہور شعرا کے کلام سے نثر میں آب حیات۔عود ہندی۔توبۃ النصوح سے مشہور لوگوں کے حالات۔اُردو صرف ونحو کے قواعد۔مردوں اور عورتوں کی بول چال کا فرق۔ علاوہ ہندی امثال کے فارسی وعربی کی مستعمل امثال ومقولے ان سب امور کا نہایت خوبی سے التزام کیا گیا ہے۔اس کی اصلی خوبی دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہے۔ہم چند مقامات لکھتے ہیں۔تاکہ ہمارے ناظرین دیکھیں کہ امیر کا پایۂ تحقیقات کتنا بلند ہے ....
اس حصہ میں صفات وتشبیہات کی زیادتی اور فحش الفاظ کی کمی ضرور کھٹکتی ہے۔صفات وتشبیہات کا تعلق لغت سے ضرور ہے۔لیکن وہ صرف شعرا کے واسطے بکار آمد ہیں۔اس لیے اُن کو ضمیمہ میں داخل کرنا بہتر ہوگا "

امیر مینائی نے اس ریویو کی جو قدر کی وہ اُنھیں کی زبان سے سُنیے :-

"دفتر امیر اللغات - ریاست رام پور ۸ راگست ۱۸۹۱ء

سراپا رشد وسعادت مجسم علم ولیاقت عزیز از جان مولوی نور الحسن کو امیر فقیر کے جی سے بے اختیار نکلتی ہوئی دعائیں۔آج آزاد آیا۔آشوب چشم کے سبب سے میں دیکھ تو نہ سکا مگر تمھارا ریویو امیر اللغات پر پڑھوا کر سُنا۔اس حیثیت سے کہ تم نے اپنی رائے ظاہر کی تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔اور اس نظر سے کہ تم نے بہت ہی نازک خیالی کے ساتھ ریویو لکھا آفریں ومرحبا کہتا ہوں۔

چشم بد دور تم نے تو امیر اللغات کے بعض بعض وہ حُسن ملک کو دکھا دیے جن کی نسبت میرا خیال یہ تھا کہ جو اس کام میں مصروف ہیں صرف اُنھیں کی نگاہ میں ہیں۔خدا تمھیں بہت بڑی عمر دے۔تمھاری علم ولیاقت کا ملک میں ڈنکا بجے اور بہت بڑا صاحب اقبال کرے۔آمین۔

تمھارے سوالوں کا جواب حسب ذیل ہے :-

آری میرے نزدیک ہندی ہے۔اسلیے کہ "عاری" زبع وتنگ وعاجز کے معنوں میں فارسی عربی میں کہیں نظر سے نہیں گذرا۔ہندی میں تو عین سے لکھنا خلاف اصول ہے۔ہندی میں عین کہاں۔

"مسالا" معلوم ہوتا ہے کہ "مصالح" کا مُهَنّد ہے۔جو عربی میں مصلحت کی جمع ہے۔اور فارسی والے ہر چیز کی تیاری کے لوازم اور ضروریات کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔اور یہی محل استعمال ہندیوں کے یہاں بھی ہے۔جیسے عمارت کے لیے چونا۔سُرخی وغیرہ۔تالیف کے لیے وہ کتابیں وغیرہ جن سے اُس تالیف میں مدد مل سکے۔کپڑوں کی رونق اور چمک کے لیے۔گوٹا۔پٹھا۔بنت۔کناری۔کھانے کے لیے

لونگ۔ الائچی۔ دھنیا۔ مرچ۔ بال دھونے کا مسالا۔ محرم کا مسالا۔ مسالے کا تیل۔

دلّی والے اصل کی طرف جاتے ہیں۔ مگر چونکہ زبانوں پر مصالح نہیں ہے۔ یعنے یہ کوئی نہیں بولتا کہ گوشت کا مصالح پیس لیا۔ گرم مصالہ ہوگیا۔ کرتی میں مصالح کم پڑا۔ اب کے محرم کا مصالح ہم کو نہیں دیا۔ اس لیے میری رائے ہے کہ اُردو میں جو بولیں وہی لکھیں۔ جس طرح مسالا بولا جاتا ہے اُسی طرح لکھا بھی جائے۔ جیسا رشک نے اپنے لغت میں لکھا ہے "مسالا میم مفتوح سین مہملہ لام بالف کشیدہ ضروریات ہر چیز کہ باشد کہ بداں رونق ولذت آن چیز شود۔ ظاہرا این لغت از مصالح باشد" اور اسی کی تقلید جلال نے بھی اپنے لغت گلشن فیض میں کی ہے۔ منیر مرحوم نے بھی یہی مشرب اختیار کیا ہے ؎

نمک چھڑکنے کو مانگے جراحت دل پر جو دیکھے آپ کی مو بات کا مسالا سانپ

"کالا سانپ" اور "بالا سانپ" زمین ہے۔

اور جان صاحب کے ایک شعر سے پتہ چلتا ہے کہ محلات لکھنؤ میں بھی یہی بول چال تھی ؎

لے جان ایسا چھاتی سے لپٹا یا بھیچ کر کرتی کا میرے سارا مسالا مسل گیا"

اُس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ اس صحیفہ گرامی کا کاتب تکمیل امیر اللغات کا ارمان دل میں لے کر دنیا سے رخصت ہوگا۔ اُس کے قابل فرزند۔ لائق شاگرد۔ فاضل خواجہ تاش اس بار امانت کے متحمل نہ ہو سکیں گے اور اُردو کے لیے جامع لغت مرتب کرنے کا قرعۂ فال مکتوب الیہ کے نام نکلے گا۔ منشی امیر احمد کی دعا قبول ہوگی۔ اور مولف نور اللغات کی "علم ولیاقت کا ملک میں ڈنکا بجے گا" مگر ازل کے رجسٹروں میں اندراج ہو چکا تھا۔ قضا کے دفتر سے احکام صادر ہو چکے تھے۔ تقدیر کے پروانوں پر دستخط کیے جا چکے تھے۔ فرمان کا اجرا تیس سال کے بعد ہوا اور اُسی پر نفتا تاریخی باغ سے نوشتۂ ازل کا ظہور شروع ہوا جہاں یہ گرامی نامہ موصول ہوا تھا۔ ع دیر آمدہ زراہ دور آمدہ

غزل مائل انصاری

منتیں کرتے ہیں ہم تو رحم پر مائل نہیں ایک پتھر ہے ترے سینے میں ظالم دل نہیں

موتیوں کے واسطے دریا کی گہرائی میں جا ایسی چیزیں، ہیں سہی لیکن لب ساحل نہیں

طائر ہمت! رہائی کو عمل درکار ہے اب قفس میں نالۂ و شیون سے کچھ حاصل نہیں

شوق کہتا ہے ابھی کچھ دور آگے اور چل میں جہاں ٹھہرا ہوں شاید یہ مری منزل نہیں

درد اور احساس کی جس دل میں گنجائش نہ ہو
مائل! اہل دل کی نظروں میں وہ ہرگز دل نہیں

شیر شاہ سوری کے چند آئینی نقوش

(جناب منشی انوار احمد علوی صاحب بی، اے)

(بسلسلہ ماہ گذشتہ)

فوج

سلطنت دہلی کے ابتدائی دور میں شاہی اقتدار کا نشان بادشاہ کی فوج ہوتی تھی۔ لیکن اُس زمانے کی فوج ایک متحدہ فوج نہ تھی کیونکہ وہ صرف مختلف امیروں کے جمع کردہ سپاہیوں کا مجموعہ ہوا کرتی تھی۔ ہر سپاہی کی بادشاہ وقت کی اطاعت اپنے امیروں کی اطاعت پر مبنی ہوا کرتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کوئی سپاہی بھی قاعدہ کی پابندی کے لیے جواب دہ نہ ہوتا تھا اور فوج کے افسر بہت زیادہ خودمختار رہتے تھے اور ایسی نازیبا حرکتیں بعض اوقات اُن سے سرزد ہوتی تھیں جو کسی طرح بھی ایک فوجی کے شایان شان نہ تھیں۔ وقت ضرورت بادشاہ مختلف صوبوں کے گورنروں کی افواج کو شاہی فوج بنانے کے لیے طلب کر لیا کرتا تھا۔ فوج کو ایک نئے طریقے سے ترتیب دینے کا سہرا سلطان علاء الدین خلجی کے سر ہے۔ اُس نے ایک ایسی فوج تیار کی جو براہ راست مرکزی حکومت نے بھرتی کی تھی۔ (بذریعہ عرض ممالک) جس کی تنخواہ براہ راست شاہی خزانہ سے دی جاتی تھی اور جس کے افسر بادشاہ کی حسب مرضی مقرر کیے جاتے تھے۔ طریقہ "داغ" کی ایجاد سے اس نے بہت سی بدنظمی کو دور کر دیا۔ اس کی موت کے بعد اس طریقے میں خرابیاں پیدا ہونا شروع ہوگئیں۔ لیکن کسی نہ کسی طرح سلطان فیروز تغلق کی موت تک یہ انتظام قائم رہا[۵] اور اس کے بعد مٹ گیا۔

لودی سلاطین کی افواج جاگیردارانہ افواج تھیں اور مختلف فرقوں کے سرداروں کے متناسب حصوں سے (جنھیں جاگیریں عطا ہوئی تھیں) تیار ہوتی تھیں۔

شیر شاہ نے علاء الدین خلجی کے طریقے کو پھر رواج دیا۔ اور فوج کو حقیقی معنوں میں بادشاہت کا جزو بنا دیا۔ چونکہ اس کے کل انتظامی امور اور مالگذاری کی اصلاحات کا واحد مقصد بادشاہ اور رعیت میں بلاواسطہ تعلق پیدا کرنا تھا اس وجہ سے اُس کی فوجی اصلاحات میں بھی اسی مقصد واحد کی مسلسل کوشش کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ ہر سپاہی کو اپنی ذات سے وابستہ کرنا چاہتا تھا اور اسی لیے اُس نے اپنی ذات میں سپہ سالار اعظم اور فوج کو تنخواہ دینے والے کے عہدے کو مدغم کر لیا تھا۔ ان اصلاحات کی وجہ سے ایک معمولی سپاہی

---

[۵] ملاحظہ ہو تاریخ فیروز شاہی در الیٹ جلد سوم صفحہ ۱۹۔۴۸

اور اعیان حکومت کے تعلقات میں بہت فرق پڑ گیا۔ اب بجائے اس کے کہ سپاہی اپنے آپ کو اُن سے متعلق سمجھتا (جیسا کہ اس سے قبل ہوتا تھا) وہ انھیں صرف افسر کی حیثیت سے دیکھنے لگا۔ اور ہر سپاہی اپنے سے بالا افسر کو اپنا مالک نہ سمجھتا بلکہ بادشاہ کا نوکر سمجھ کر اُس کے احکام کی بجا آوری کرتا۔ ہر سپاہی کی نوکری اور ترقی بھی ہر اُس سردار کی مرضی پر منحصر نہ رہی جس کا وہ ماتحت ہوتا۔ بادشاہ ہر سپاہی کے معاملات کی طرف پوری توجہ کرتا اور سلطنت کے بڑے بڑے امرا کے خلاف بھی ایک ادنیٰ پیادہ کی دادرسی کرنے میں دریغ نہ کرتا۔[51] اُس کا مقصد واحد فوجی بغاوت کو روکنا تھا۔ جس کی جڑ سپاہیوں کی افسران بالا سے براہ راست قربت تھی۔

علاء الدین کے انتظام کو شیرشاہ نے جزئیات میں بہت درست کیا۔ گھوڑے کے "داغ" کے علاوہ اس نے حاضری کے طریقے کو رائج کیا (چہرہ)۔ وہ خود ہر سپاہی کو براہ راست ملازم رکھتا۔ اور ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں جہاں اُس نے صوبہ داروں کو فوج بھرتی کرنے کی اجازت دی ہو۔[52] وہ خود ہر سپاہی کو دیکھ کر اُس کی ماہوار تنخواہ مقرر کرتا اور اپنی موجودگی ہی میں چہرہ لکھواتا اور گھوڑے کو داغ لگواتا۔[53] (بہ حضور خود داغ و چہرہ می نمود[54]) جس طور سے کہ وہ ہر ایک کی تنخواہ مقرر کرتا اُسی طریقے سے وہ ہر ایک کو الگ الگ تنخواہ بھی دیتا تھا۔[55]

---

[51] عباس نے اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جس سے شیرشاہ کے انتظام پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔ وہ لکھتا ہے "صوبۂ مالوہ میں جہاں کا حاکم شجاعت خاں تھا۔ شیرشاہ نے حکم دیا کہ کچھ حصہ زمین کی آمدنی سپاہیوں میں تقسیم کر دی جائے۔ اپنے بعض ناعاقبت اندیش مصاحبین کے ورغلانے سے شجاعت خاں نے کچھ حصہ اپنے لیے رکھ لیا۔ اس پر دو ہزار سپاہی بگڑ گئے اور انھوں نے کل واقعہ شیرشاہ کے گوش گذار کرنے کی نیت سے شجاعت خاں کی فوج سے علیحدگی اختیار کر کے ایک منزل کی دوری پر قیام کیا۔ اور آپس میں مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ اس طرح جماعت کی شکل میں جانا ٹھیک نہیں کیونکہ بادشاہ نے شجاعت خاں کی ماتحتی میں انھیں دکن کے ملک میں متعین کیا ہے۔ اس لیے بلا بادشاہ کی اجازت کے چلا جانا مناسب نہیں بلکہ اپنا ایک وکیل یا نائب بادشاہ کے حضور میں بھیجنا چاہیے جو کل واقعے سے بادشاہ کو مطلع کرے اور جیسا وہ حکم دیں ویسا کیا جائے اور اگر اس درمیان میں کوئی ضرورت پیش آ جائے تو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ تندہی و جانفشانی سے کام کریں لیکن قبل اس کے کہ وکیل شیرشاہ تک پہونچے اُسے اپنے وقائع نویسوں کے ذریعہ کل واقعہ کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ شجاعت خاں کو حکم پہونچا کہ سپاہیوں کی شکایات دور کی جائیں۔ ورنہ در صورت عدول حکمی منصب و جائداد ضبط ہو گی۔ شجاعت خاں کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ خود ان سپاہیوں کے خیمے میں گیا اور بہت خوشامد درآمد سے انھیں راضی کیا۔ بادشاہ کے غصے سے بچ جانے کی خوشی میں اس نے درگاہوں پر شکرانہ کے طور پر مٹھائی و حلوائی اور خیرات تقسیم کی۔ (عباس ص ۲۶۶ ، الیٹ جلد چہارم ص ۳۲۵-۲۶)

[52] Irvine's Army of the Indian Moghals PP 46-56

[53] عباس ص ۲۳۵ - [54] عباس در الیٹ جلد چہارم ص ۴۱۳

یہ وہ اس لیے کرتا کہ سردار سپاہیوں کی تنخواہ میں کوئی بے عنوانی نہ کر سکیں (حق سپاہی دخل نہ کنند[1])۔ کوئی ثبوت اس امر کا نہیں ہے کہ شیر شاہ کے فوجی افسر کس طرح سے متعین ہوا کرتے تھے۔ اکبر کے "منصب" کی طرح یقیناً کوئی درجہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ افغان بہت زیادہ مساوات پر جان دیتے تھے اور منصبوں کی تخلیق یقیناً [illegible] و انشراق کا سبب ہوتی۔ ایک امتیازانہ حیثیت پیدا کرنے کے لیے "منصب اعلیٰ" کا لقب [illegible] مثل ہیبت خاں نیازی وغیرہ کو عطا ہوا تھا۔ لیکن یہ صرف ذاتی امتیاز ہوا کرتا تھا رتبہ اور [illegible] کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا۔

فوج کی تقسیم | سلطنت کے مختلف نازک مقامات پر شاہی فوج کے حصے منقسم تھے۔ ایک حصہ کو فوج کہتے تھے۔ جو ایک فوجدار کے ماتحت ہوا کرتا تھا جس کے خدمات خالص فوجی ہوتے تھے اسے ملکی انتظام سے کوئی سروکار [illegible] ہوتا تھا۔ جس طرح کہ آج کل کے چھاؤنی کے فوجی افسر ہوا کرتے ہیں۔ جنھیں شہر کے انتظام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ بعض تجربہ کار اور قابل اعتماد افسر جو نازک اور اہم فوجی مقامات پر تعینات ہوتے وہ ان قیود سے بری ہوتے۔ ایسے مقامات پر سردار فوج صدر شقدار کے فرائض انجام دیتا تھا اور اپنا کام بھی کرتا تھا۔ ایسے افسر چند ہی تھے۔ ان میں سے ایک ہیبت خاں نیازی تھا جو تیس ہزار فوج کے ساتھ گکھر میں حاکم تھا۔ اور کابل کے راستہ کی نگرانی کرتا تھا۔ دوسرا فتح جنگ خاں تھا جو دیپال پور اور ملتان میں تھا۔ [illegible] سندھ کی حفاظت اور قندھار کے راستہ کی نگرانی اس کے ذمہ تھی۔ تیسرا افسر حمید خاں گکھر تھا جو ملتان کے قلعہ کی حفاظت پر معمور تھا۔ اس کے ذمہ نگرکوٹ۔ جوالامکھی۔ دھدادل اور جمو کی پہاڑیوں کی حکومت تھی۔ خواص خاں اور عیسےٰ خاں نیازی جودھپور۔ اجمیر اور ناگور میں حاکم تھے۔ اور راجپوتانہ کی نگرانی ان کے ذمہ تھی۔ شجاعت خاں ہندیہ اور سواس میں بارہ ہزار فوج کے ساتھ دکن کے راستہ کی نگرانی پر تعین تھا۔ مندرجہ ذیل خاص خاص چھاؤنیاں تھیں جو فوجداروں کے تحت میں تھیں:۔

(۱) گوالیار	میں	سواروں کی فوج	اور	(۱۰۰۰)	بندوقچی	تھے
(۲) بیانہ	″	″ ″	″	(۵۰۰)	″	″
(۳) مانڈو	″	× ×	×	(۷۰۰)	″	″
(۴) رنتھمبور	″	فوج •	اور	(۱۶۰۰)	″	″
(۵) چتوڑ		× ×	×	(۳۰۰۰)	″	″
(۶) رائسین	″	″ فوج	اور	(۱۰۰)	توپچی	″

[1] عباسی صفحہ ۲۲۰

(۷) چنار میں سواروں کی فوج اور (۱۰۰۰) بندوقچی تھے

(۸) رہتاس (بہار) ″ × × × (۱۰۰۰۰) ″ ″

(۹) بنگال ″ × × × × × ×

(۱۰) کالپی ″ فوج اور (۱۲۰۰۰) ″ ″

(۱۱) لکھنؤ ″ ″ ″ × × × ×

(۱۲) دھندیرا ″ ″ ″ × × × ×

(۱۳) بجورا (ضلع جالندھر) ″ ″ ″ × × × ×

یہ فہرست مندرجہ ذیل کتب سے بنائی گئی ہے :-

واقعات مشتاقی - تاریخ داؤدی - الیٹ جلد چہارم ص ۴۱۶-۴۱۷ - عباس ص ۲۵۰-۵

سب اعیان دولت کے ہمراہ خبر دار (جاسوس) ہوا کرتے تھے جو فوج کی ہر بات سے بادشاہ کو مطلع کیا کرتے تھے۔ صاحب واقعات مشتاقیہ لکھتے ہیں "کہ سرحد پر منصف مقرر ہوتے تھے جو فوج کے "داغوں" کا معائنہ کرتے تھے۔"

اس تمام فوجی تقسیم کے بعد توازن قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ بادشاہ کے زیر کمان کوئی بڑی فوج ہو۔ اس لیے ایک لاکھ پچیس ہزار سوار اور پچیس ہزار پیادے۔ ایک منتخب تعداد بندوقچیوں اور تیر اندازوں کی ہمیشہ شیر شاہ کے تابع حکم رہا کرتی تھی۔ (ہمیشہ در رکاب حاضر می بود) پانچ ہزار جنگی ہاتھی اور توپخانہ کی ایک بڑی تعداد نے مل کر اس کی طاقت کو ناقابل تسخیر بنا دیا تھا۔ جیسا کہ [illegible] مشرق میں ہوا کرتا ہے کہ فوج قواعد داں نہیں ہوتی اسی طرح شیر شاہ کی فوج میں بھی قواعد نہ تھی۔ مگر [illegible] سے اس کی قابلیت میں کوئی کمی نہ واقع ہوتی تھی۔ اس کا قاعدہ تھا کہ ایک لڑائی کے بعد اس فوج کو جس [illegible] میں حصہ لیا تھا آرام کرنے کے لیے دوسرے فوجی محاذوں پر بھیج دیا کرتا تھا اور وہاں سے تازہ دم فوج بلا لیا کرتا۔ اس طرح سے کسی قسم کا نقص فوج کی عمدگی میں نہ آتا۔ شیر شاہ کے فوجی قوانین کی سختی ایک حملہ کے بعد ایک ناتجربہ کار سپاہی کو دوسری بار کے لیے بالکل پختہ کار بنا دیتی۔ پیادہ سوار اور بندوقچی قریب قریب ہندو ہوا کرتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر بکسر کے اطراف کے رہنے والے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جو شیر شاہ کے ساتھ اس کے ابتدائی زمانہ سے تھے اور شیر شاہ کو ان پر بہ مقابلہ شمالی صوبوں کے لوگوں کے [illegible] تھا۔

ہندو فوج میں اچھے عہدوں پر مقرر ہوا کرتے تھے۔ یہ طریق کار اس نے ابتدائی دور ہی سے [illegible] کر لیا تھا۔ اس کے بہترین جنرلوں میں ایک برہمیت گور بھی تھا۔ (عباس اور جوہر دونوں نے اس کا ذکر کیا ہے)

جسے اس نے چوسا اور بلگرام کی لڑائی کے بعد ہمایوں کے تعاقب میں روانہ کیا تھا[51] اور جسے اس نے ایک مرتبہ غیر ضروری سختی کے لیے فہمائش بھی کی تھی۔ گوالیار کا راجہ رام شاہ بھی شیر شاہی فوج میں تھا[52]۔ نظام الدین اور فرشتہ دونوں اس کی اس موقع کی بہادری کی تعریف کرتے ہیں جب اس نے نیل گڑھ کی لڑائی میں شجاعت خاں کی مدد کرکے اسے بچایا تھا۔ تاریخ داؤدی میں راجپوتوں کے ایک رجمنٹ کا شیر شاہ کے ملاحظہ سے گذرنے کا ذکر موجود ہے۔ (جماعت راجپوتاں بہ نظر می گذشتند)۔

ہندوؤں کا اس طرح فوج میں موجود ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ محمود غزنوی کے زمانہ سے ہندو جابجا مسلمان افواج میں نظر آتے ہیں۔ مگر اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے کہ شیر شاہ ایک قومیت کی تعمیر میں مصروف تھا اور یہ اُس کا ایک جزو تھا۔ تب اس کی اہمیت اور قدر و قیمت اور بڑھ جاتی ہے۔

[51] الیٹ جلد چہارم صفحہ ۳۰۳ [52] عباس۔ الیٹ جلد چہارم صفحہ ۴۹۲

نوائے ظہور

(جناب مولانا حکیم ظہور احمد صاحب ظہور (حیدرآبادی) مولوی اعلیٰ مدرسہ مفید الانام)

کب ادا حسن کی پابندِ وفا ہوتی ہے
سچ تو یہ ہے کہ جوانی بھی بلا ہوتی ہے

تو ہی اک مضطر و بیتاب نہیں اے بلبل
موسم گل کی جنوں خیز ہوا ہوتی ہے

موج دریا ہے گرہ گشتۂ امید مری
تا بساحل نہیں جاتی کہ فنا ہوتی ہے

عین حکمت تھی جو دیوانہ بنایا مجھ کو
مجھ سے ہر وقت نئی کوئی خطا ہوتی ہے

گھر اندھیرا ہو تو سارق کی بر آتی ہے مراد
طاقت نفس جہالت میں سوا ہوتی ہے

کون جاسوس ہے الفت کا تری اے بلبل
نکہت گل کی تو غماز صبا ہوتی ہے

رشتۂ طول امل دل کو تپاں رکھتا ہے
عالم یاس میں تسکین ذرا ہوتی ہے

آہ و حسرت کے یہاں اشک خجالت کے وہاں
دیدۂ و دل کی عجب آب و ہوا ہوتی ہے

خلش خار بیاباں تو ہے تا دورِ جنوں
پر خلش خار محبت کی بلا ہوتی ہے

رہنما کی نہیں پروا جو طلب صادق ہو
الفت قبلہ ہی خود قبلہ نما ہوتی ہے

کہہ کے اُٹھے یہ مسیحا مری بالیں سے ظہور
کہیں بیمار محبت کو شفا ہوتی ہے

نیاز کی جُرأتِ بے جا

(جناب منشی نانک چند صاحب عشرت ایم۔ اے، منشی فاضل)

بسلسلہ ماہ ستمبر ۳۶ء

یہاں تک جناب نیاز نے اصغر صاحب کے اشعار نظم پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اب اس کے آگے وہ اصغر صاحب کے اشعار غزل پر اپنی لیاقت دکھاتے ہیں۔

شعر اصغر | ترک مدعا کر دے عین مدعا ہو جا شانِ عبد پیدا کر مظہر خدا ہو جا

اعتراض نیاز | یہ شعر خالص فلسفۂ تصوف کی پیداوار ہے اور سوائے لفظوں کی اُلٹ پھیر کے اس میں قطعاً کوئی مفہوم نہیں ہے۔ اصغر صاحب ابھی بالکل ابتدائی منزل پر ہیں۔ انھوں نے صرف ترک مدعا پر قناعت کی۔ ورنہ صوفیہ کے یہاں تو یہ چار منزلیں ہیں۔ ترک دنیا۔ ترک عقبےٰ۔ ترک مولےٰ۔ ترک ترک۔ ۔ ۔ ۔ اصغر صاحب تو ترک مدعا کے بعد مظہر خدا ہو جانا ہی بڑی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ تیسری منزل ترک خدا کی ہے۔ ۔ ۔ ۔ [illegible] تو مظہر خدا ہر چیز ہے یہاں تک کہ ایک کافر و زندیق بھی مظہر خدا ہے۔ اس لیے ترک مدعا کے بعد [illegible] ہوتا جب بجائے مظہر خدا اسکے عین خدا کہا جاتا۔"

عرض عشرت | نیاز صاحب آپ کی منافقت یہ ہے کہ پہلے آپ لکھتے ہیں کہ اس میں قطعاً کوئی مفہوم نہیں ہے اور پھر ایک مفہوم سمجھتے ہیں اور اسکو پست بتا کر ایک بلند مفہوم کی طرف جو نظم کیا جانا چاہیے اشارہ کرتے ہیں۔ خیر مگر یہ تو بتائیے کہ آپ سے کس نے کہا کہ اصغر صاحب کا ہر شعر فلسفۂ تصوف کی پیداوار ہے۔ اصغر صاحب کے یہاں تصوف کے علاوہ بھی نہایت اعلےٰ خیالات ملتے ہیں اور ہر شعر کو تصوف کے اندر گھسیٹنا حماقت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مگر یہ آپ کی عادت معلوم ہوتی ہے کہ چند سُنی سُنائی باتوں کو اصغر صاحب کے اشعار میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں چاہے وہ "مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ" ہی کا مصداق کیوں نہ ہوں۔ اصغر صاحب کے شعر میں آپ نے الفاظ "ترک مدعا" دیکھے کہ آپ جھٹ لال بجھکڑ بنکر کہنے لگے۔ ہو نہ ہو یہ شعر انھیں چار ترکوں پر مبنی ہے جنھیں آپ نے کہیں سُن لیا ہوگا۔ یہ بعینہ وہی قصہ ہے جس میں ایک شاگرد حکیم نے اپنے اُستاد کی زبان سے ایک مریض کے لیے سخت ڈانٹ پھٹکار سُنی تھی کہ جب منع کیا گیا تھا تو تم نے چنے کیوں کھالیے؟ کیونکہ مریض کی چارپائی کے گرد چند دانے بھُنے چنے کے پڑے تھے۔ شاگرد نے ایک دوسرے مریض کو جس کی چارپائی کے پاس چند نمدے کے ٹکڑے پڑے تھے بُری طرح آڑے ہاتھوں لیا کہ تم نے آج نمدے کھائے ہیں۔ مریض لاکھ

لاکھ کہتا رہا کہ میں نے ندرے نہیں کمائے ہیں۔ ندرے کمانے کی چیز ہی نہیں۔ مگر سُنتا کون تھا۔ اسی قیاس پر آپ کہہ رہے ہیں کہ "اصغر صاحب تو ترک مدعا کے بعد مظہرِ خدا ہو جانا ہی بڑی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ تیسری منزل ترک خدا کی ہے۔" ترک مدعا سے خدا جانے آپ کا خیال چہار ترک تصوف کی طرف کیوں گیا کیونکہ اس میں نہ ترک دنیا ہے نہ ترک عقبےٰ اور نہ ترک مولےٰ ہے نہ ترک ترک۔ مگر آپ نے تو کمال یہ کیا کہ "ترک مولیٰ" کا ترجمہ "ترک خدا" کر ڈالا۔ سمجھ ہو تو آپ کی سی۔ بھلے مانس خدا ہی کے لیے تو صوفیہ سب کچھ کرتے ہیں۔ اسی کو وہ ترک کر دیں گے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اسے آپ نے اپنے خبط کے مطابق لکھ مارا ہے کیونکہ ہر کس بخیال خویش خبطے دارد۔ بھائی صاحب آدمی پہلے ترک دنیا کر لیتا ہے تو ترک عقبےٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور جب اسکو بھی ترک کر دیتا ہے تب مرشد کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ اس وقت اُسے دنیا یا عقبےٰ کا کوئی خیال نہیں رہتا۔ صرف مرشد کا ارشاد اُس کے لیے سب کچھ ہوتا ہے۔ جب مرشد اُسے راہِ عرفان پر لگا دیتا ہے اور وہ جلوۂ حق سے ہمکنار ہو جاتا ہے تب وہ مرشد کو بھی ترک کر دیتا ہے اسکو کہتے ہیں ترک مولیٰ۔ "ترک مولیٰ" کے معنی ہرگز ترک خدا کے نہیں۔ اسکے بعد ترک ترک کا مرتبہ ہے مگر یہ باتیں تو ضمناً آگئیں۔ شعر کو ان چار ترکوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے کیونکہ یہ سلوک کا شعر ہے جس میں مظہرِ خدا ہو جانا ہی کافی ہے۔ خدا ہو جانا یعنے خدا کی ہستی میں اپنے کو محو کر دینا جذب کی بات ہے، مگر آپ کو ان کے امتیاز کی کیا خبر؟ خیر۔ مگر آپ یہ کیا کہنے لگے کہ مظہرِ خدا تو ہر چیز ہے یہاں تک کہ ایک کا فر و زندیق بھی مظہرِ خدا ہے۔ تو مظہرِ خدا ہونے سے کیا مراد؟ کیونکہ آپ کی رائے میں یہ سعی حاصل یا سعی لاحاصل ہے۔

نیاز صاحب بُرا نہ مانیے۔ سچ کہتا ہوں کہ میں نے اپنی عمر میں سیکڑوں ناسمجھوں کو پڑھایا ہے مگر آپ ایسے سے پالا نہیں پڑا۔ کیا آپ کوئی ایسی چیز نہیں جانتے جس کا مُحل استعمال آپ کو معلوم ہو؟ کس معنی میں ہر شے مظہرِ خدا ہے اور کس معنی میں مظہرِ خدا ہونے کی تمنا کی جاتی ہے یہ بھی آپ کو نہیں معلوم؟ سُنیے۔ ہر شے جاندار و بے جان مظہرِ خدا اس معنے میں ہے کہ اس میں جلوۂ خدا نہاں ہے مگر مظہرِ خدا ہونے کی تمنا اس معنے میں کی جاتی ہے کہ عملاً صفاتِ صمدی یہاں تک حاصل کیے جائیں کہ جلوۂ خدا جو ہر شے میں پنہاں رہتا ہے وہ نمایاں ہو جائے۔ اسی لیے اوتاروں پیغمبروں کو مظہرِ خدا کہا جاتا ہے۔ اب شاید آپ کی سمجھ میں کچھ آیا ہو مگر آپ کو تو کوئی نہ کوئی شگوفہ چھوڑ کے نگار کی اشاعت میں ترقی مقصود ہے۔ بات چاہے صحیح ہو یا غلط۔ اُس سے جہالت ٹپکے یا ذکاوت۔

شعرِ اصغر	قطرۂ تنک مایہ بحرِ بیکراں تو ہے اپنی ابتدا ہو کر اپنی انتہا ہو جا
اعتراضِ نیاز	"میں نے بہت کوشش کی کہ اسکا کوئی مفہوم پیدا کر سکوں لیکن کامیاب نہ ہوا..... قطرہ کو شاعر

خود تنگ مایہ سمجھتا ہے درانحالیکہ فوراً اسکے بعد ہی بحر بیکراں ہونے کی خبر دیتا ہے ۔۔۔۔ کسی چیز کا اپنی ابتدا ہونا اور پھر اپنی انتہا ہو جانا عجیب و غریب معمہ ہے اگر اسکا یہ مفہوم قرار دیا جائے کہ جو تیری ابتدا ہے وہی تیری انتہا ہے تو الفاظ سے ظاہر نہیں ۔ "اپنی" اور "ہو کر" دونوں لفظ بالکل بیکار اور لایعنی طور پر نظم کیے گئے ہیں"

عرض عشرت | نیاز صاحب آپ نے شعر کے مفہوم کو سمجھنے کی کوشش کی اور ناکام رہے اس کے بعد شعر میں مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس میں بھی ناکامیاب رہے ۔ مجھے بھی اس امر کا تاسف ہے مگر میرا اور آپ کا دونوں کا تاسف بیکار ہے ۔ جس میں جس چیز کی اہلیت نہ ہوگی وہ چیز اُس کی عقل میں کیونکر آسکتی ہے ۔ بہتر یہی ہے کہ آئندہ آپ کسی بڑے شاعر کے اشعار پڑھنے سے توبہ کر لیں ۔ ع چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی ۔ خیر شعر کے معنی سُنیے ۔ یہ شعر روح انسانی پر مبنی ہے ۔ روح جزو ہے اور خدا کل ۔ ہندی کے مشہور شاعر تلسی داس نے بھی یہی کہا ہے ईश्वर अंश जीव अविनाशी یعنے روح لایزال ہے اور رب لایزال کا جزو ہے ۔ جزو کو کل کے مقابلے میں ہر شخص تنک مایہ کہے گا ۔ یعنی قطرہ کو دریا کے مقابلے میں کون تنک مایہ نہ کہے گا ؟ مگر نظر تعمق سے دیکھیے تو قطرہ میں وہ تمام اجزا مل جائیں گے جو دریا کے پانی میں موجود ہیں ۔ یعنے اصلیت کے لحاظ سے قطرہ بھی دریا ہے ۔ دریا سے الگ ہونے کی وجہ سے قطرہ قطرہ ہو جاتا ہے ورنہ وہ دریا ہی ہے ۔ غالب نے اسی مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

(دیگر) قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

روح انسانی پہلے ذات احدیت میں ملی ہوئی تھی ۔ تخلیق کے باعث قطرۂ روح دریائے صمدیت سے الگ ہوا تب ہی قطرہ قطرہ ہو گیا ورنہ دریا ہی ہوتا ۔

بھائی نیاز آپ جدت بیان کے بڑے متمنی رہتے ہیں مگر جہاں بیان میں ذرا سی جدت ہوئی تو بات آپ کی فہم سے بالاتر ہو جاتی ہے ۔ آپ کو قطرہ و بحر بیکراں میں جو روح انسانی کے دو رُخ ہیں تناقض معلوم ہوتا ہے ۔ آپ اردو و فارسی دونوں زبانوں کی شاعری سے واقف ہونے کے دعویدار ہیں مگر تعجب ہے کہ روح انسانی کے لیے قطرہ و دریا ہونا جو فارسی اور اردو دونوں میں ہزار بار لکھا گیا ہے آپ کی نگاہ سے نہیں گذرا ۔ نگار ہی میں غالب پر متعدد مضمون نکل چکے ہیں اور آپ نے غالب کا یہ شعر جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے نہیں پڑھا ؎ قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ۔۔۔۔۔ الخ اگر آپ نے اسے پڑھا ہوگا تو اس شعر میں بھی آپ کو قابل فہم تضاد اور تناقض نظر آیا ہوگا ۔ خیر ۔ شعر کے معنی رہ گئے ۔ سُنیے ۔ یہ ۔ اے روح انسانی میں نے مانا کہ بحالت موجودہ محض ایک قطرہ ہے مگر اصلیت میں تو دریا ہی ہے جس میں سے تو جدا ہو کر قطرہ بن گیا ہے ۔ اس لیے

تیری انتہا یہی ہوسکتی ہے کہ تو اپنے جزو کو کل میں محو کر دے یعنے دریا ہوجا جو تو ابتدا میں تھا۔ یعنی اپنی ابتدا ہوکر اپنی انتہا ہو جا۔ اس میں نہ لفظ "اپنی" بیکار ہے اور نہ "ہوکر"۔ بات محض اتنی ہی ہے کہ عمدہ شعر سمجھنے میں آپ کی عقل بیکار ہوجاتی ہے۔

شعر اصغر | شعاعِ مہر کی جولانیاں ہیں ذرّوں میں حجابِ حسن ہے آئینہ دارِ حسن نمود

اعتراض نیاز | "پہلا مصرعہ دوسرے سے بے تعلق ہے..... دوسرے مصرعے میں ذرّوں کو حجابِ حسن کہنا بالکل خلافِ واقعہ ہے کیونکہ وہ شعاعِ آفتاب کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوسکتے۔"

عرض عشرت | جہاں بیان میں ذرا سی جدت ہوئی کہ آپ کی عقل کوتاہ اُلجھ جاتی ہے۔ بھائی صاحب آپ کی سمجھ میں آخر کوئی شے ہے جو شعاعِ آفتاب کی راہ میں حائل ہوسکتی ہے اور اُسکے لیے حجاب کا کام دے سکتی ہے؟ ا[illegible] چیزوں کا نام لینے لگیں گے۔ پھر اگر میں آپ سے کہوں کہ ان چیزوں کا تجزیہ کرتے جائیے تو آخیر میں ذرّوں کے سوا کیا رہ جائے گا جن کو سائنس کی زبان میں (Atoms) کہیں گے۔ اب آپ ہی اپنی عقل پر زور دالکر انصاف سے کہیے کہ ذرے حجاب نور بھی ہوسکتے ہیں اور چمکنے کے وقت آئینہ دار حسن بھی یا نہیں۔ اب اس شعر کا مفہوم حقیقی سمجھیے۔ کونین کی ہر چیز جلوۂ خدا کے لیے پردہ ہے مگر اسی پردہ میں اُسکی جھلک بھی دکھائی پڑتی ہے۔ گل و ریحاں میں جلوۂ حسنِ لایزال بھی صاحبانِ بصیرت دیکھتے ہیں۔ یہاں بھی جو حجاب ہے، وہ آئینہ دارِ حسن ہے۔ اب آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ ذرے کس طرح شعاعِ آفتاب کی راہ میں حائل ہوسکتے ہیں۔

شعر اصغر | دکھائی صورتِ گل پہ بہار شوخیِ پنہاں چھپایا معنیِ گل میں کبھی حسن نمایاں کو

اعتراض نیاز | "پہلے مصرعہ میں (پہ) کا لفظ غلط ہے (سے) ہونا چاہیے یا (میں)۔ اور دوسرا مصرعہ بالکل بے معنی ہے کیونکہ معنیِ گل کوئی علیحدہ چیز (گل) سے نہیں ہے۔ اگر نکہت گل کہتے تو بے شک صورت سے تفریق ہوسکتی تھی۔"

عرض عشرت | پہلے مصرعہ میں (پہ) (میں) (سے) تینوں ٹھیک ہوسکتے ہیں مگر استعارہ میں فرق آجائے گا۔ اگر ظرف کا استعارہ لینا ہے تو (میں) لکھنا چاہیے اور اگر [illegible] کا استعارہ لینا ہے تو (سے)۔ یہی دو استعارے ہیں جو اُردو شعرا نے ایسے موقع پر استعمال کیے ہیں اور بس یہیں تک بھائی نیاز آپ کا دماغ بھی محدود ہے۔ اصغر صاحب کی طبیعت جدت پسند ہے اور انھوں نے ایک نیا اور نہایت خوبصورت استعارہ ڈھونڈھ نکالا مگر میں کئی بار لکھ چکا ہوں کہ جہاں ذرا سی جدت ہوتی ہے آپ کی عقل کوتاہ پر ڈال دیتی ہے۔ سُنیے۔ اصغر صاحب نے 'پردہ' کا استعارہ لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ پردے پر نقش و نگار رنگ گل بوٹے۔ باغ و بہار وغیرہ سب کچھ دکھائے جاتے ہیں۔ اسلیے (پہ) کا استعمال غلط نہیں ہے جیسا کہ آپ کی عقل غلط کوش میں آیا ہے۔ اب آپ کا دوسرا

اعتراض بھی کہ "معنیٔ گل" میں اور "گل" میں کوئی فرق نہیں ہے سرتاسر غلط ہے۔ بھلے مانس ذرا غور کیا ہوتا کہ "معنیٔ گل" دو لفظوں سے مرکب ہے، اس کے معنی یک لفظی "گل" کے مترادف کیونکر ہو سکتے ہیں۔ "معنیٔ گل" میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جو گل سے متعلق ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اس کا رنگ، اس کا روپ۔ اس کی نکہت۔ اس کی نرمی و نزاکت وغیرہ۔ اب شعر کے معنی سنیے۔ شاہد حقیقی نے جو نظروں سے چھپا ہوا ہے کبھی اپنی شوخیٔ مستور کی بہار پردۂ گل پر دکھائی اور کبھی اپنے جلوۂ نمایاں کو جو ہر چہار طرف ہر شے میں پھیلا ہوا ہے "معنیٔ گل" میں چھپا دیا یعنے صاحبِ بصیرت کو پردۂ گل پر اس کی شوخی نظر آئی مگر کم نظر جب اسکا رنگ رخسار دیکھتا ہے تو اس کو محض گل سمجھ کر ٹال دیتا ہے اور حسنِ لایزال کا جلوۂ عام بھی اس کی نظروں سے پوشیدہ رہ جاتا ہے۔ ایک بات اور رہ گئی وہ یہ کہ آپ نے شعر پر اصلاح بھی دی ہے۔ پہلے مصرعہ میں (پر) کو (سے) یا (میں) بنایا جس کی وجہ سے تمام جدت [illegible] و استعارہ کا خاتمہ ہو گیا۔ دوسرے مصرعہ میں آپ نے "معنیٔ گل" کے بجائے "نکہتِ گل" پسند فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ نکہتِ گل ہی تک حسنِ گل محدود نہیں ہے۔ اس کے رنگ، اسکی صورت۔ اسکی نرمی و نزاکت وغیرہ میں بھی حسن موجود ہے۔ غضب ہے کہ تمام محاسن میں سے آپ صرف ایک چیز یعنے نکہت لیتے ہیں اور باقی چھوڑ دیتے ہیں اور شاعر نے ایک جامع لفظ "معنی" لکھ کر سب کچھ کہہ دیا ہے۔ آپ کی اصلاح اور اصلی شعر میں جزو و کل کا فرق ہے ؎

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے　　ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

شعر حضرت　یہ راز ہے میری زندگی کا　　پہنے ہوئے ہوں کفن خودی کا

اعتراض نیاز　دوسرے مصرعہ کا مفہوم یہ ہے کہ میں خودی میں مبتلا ہوں۔ لیکن یہ زندگی کا راز کب ہوا۔ بجائے (راز) کے "حال" یا (رنگ) کہنا چاہیے تھا۔ صرف ایک لفظ (راز) نے شعر کو بے معنی کر دیا۔"

عرض عشرت　نیاز صاحب آپ کا علم اور آپ کی عقل دونوں بالکل محدود ہیں آپ معمولی معمولی الفاظ کے معنے نہیں جانتے۔ اصغر صاحب نے لفظ خودی کو جس معنے میں استعمال کیا ہے کاش اسے آپ سمجھ سکتے! مگر اس طرح کی امید آپ سے رکھنا ہی گویا لاحاصل ہے۔ سنیے خودی کے دو معنی ہیں۔ ایک معنی وہی غرور کے جسے آپ نے سمجھا ہے۔ دوسرے معنی اصطلاح صوفیہ و ویدانت۔ فلسفۂ قدیم و جدید سب میں اس لفظ کا لفظی مفہوم لیا گیا ہے "خود" کے معنی اپنے کے ہوتے ہیں اسلیے خودی کے معنے "اپنے پن" یعنے "میں ہوں" کے ہوئے۔ ہندی میں بھی اسکے مقابلے کا لفظ اہنکار ہے جو بجنسہ دو معنی رکھتا ہے ایک غرور کے دوسرے ([illegible]) کے یعنے "اپنے پن" کے۔ ظاہر ہے کہ جب تک انسان کو "میں" اور "میرا" کا خیال نہ رہے گا انسانی زندگی محال ہے۔ اس معنی میں اقبال نے پوری کتاب "اسرار خودی" لکھی ہے اور اس میں یہی نصیحت کی ہے کہ اگر زندگی چاہتے ہو تو خودی

پیدا کرو۔ اب آپ کی فہم مبارک میں شاید آیا ہو کہ خودی ہی انسانی زندگی کا راز ہے۔ لفظ راز ہی شعر کی جان ہے اور آپ فرماتے ہیں کہ ایک لفظ راز نے شعر کو بے معنی کر دیا۔ آپ راز کے بجائے 'درنگ' اصلاح دے رہے ہیں جس سے شعر چوپٹ ہو کے بے رنگ ہو جائے گا۔ اور آپ نے 'حال' کی اصلاح بھی نہ جانے کس حال میں دی ہے۔ مگر ابھی شعر کے معنی آدھے سمجھائے گئے ہیں بقیہ آدھے بھی سن لیجئے ورنہ ممکن ہے کہ جواب الجواب میں آپ شاید لفظ 'کفن' پر الجھنے لگیں اور اسے بے معنی بتائیں۔ سنیئے جہاں خودی حیات انسانی کیلیے ناگزیر ہے وہاں یہ حیات روحانی کی موت ہے کیونکہ روحانی زندگی میں درویش کو اپنا پن اور برایا پن مٹانا پڑتا ہے جب جاکے وہ کامل ہوتا ہے شاعر چونکہ روحانی زندگی کا طالب ہے اسلیے وہ کہتا ہے کہ اگرچہ خودی میری انسانی زندگی کا راز ہے لیکن یہی میری روحانی زندگی کے لیے کفن ہے۔

شعر اصغر | عالم پہ ہے یہ سکون بیتاب یا عکس ہے میری خامشی کا

اعتراض نیاز | "پہلے مصرعہ میں ادعائے بے دلیل کا نقص موجود ہے کیونکہ عالم پر سکون بیتاب ہونے کا ثبوت موجود نہیں ہے اور نہ حقیقتاً عالم پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اگر بجائے عالم کے کسی ایسی چیز کا ذکر کیا جاتا جس میں واقعی کوئی سکون پایا جاتا تو بے شک کسی دلیل لانے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا ع ہے بحر پہ اک سکون بیتاب" تو یہ اعتراض وارد نہ ہوتا کیونکہ بحر میں ایک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جس میں سکون و بیتابی دونوں شامل ہیں۔

عرض عشرت | سکون و بیتابی دو نوں متضاد و متناقض چیزیں ہیں جنکا بیک وقت ایک چیز میں اطلاق قریب قریب ناممکن ہے مگر یہ دونوں باتیں اس خاموشی میں یقیناً ہوتی ہیں جب دل میں شورش کا ایک طوفان برپا ہوتا ہے ایسی خاموشی کی مثال ایک محال کام ہے جس سے اصغر صاحب ہی کا ذہن رسا عہدہ برآ ہو سکا۔ انھوں نے عالم کی مثال ڈھونڈھ نکالی مگر آپ اسے ادعائے بے دلیل سمجھتے ہیں یہ آپ کی سمجھ کی خوبی ہے۔ حالانکہ موجودہ سائنس و فلسفہ کا معمولی واقف کار بھی اسے مسلمات میں سے سمجھتا ہے جس کے لیے کسی دلیل کی حاجت نہیں مگر شاید آپ اتنا بھی نہیں جانتے۔ سنیئے۔ آج کل کی تحقیق ہے کہ یہ عالم ہی نہیں بلکہ فلک کا ہر جرم گردش کر رہا ہے یا تو کسی ستارے کے گرد یا اپنے ہی محور پر۔ یہاں تک کہ آفتاب جس کے گرد متعدد سیارے گھوم رہے ہیں اپنے محور پر گردش کر رہا ہے۔ مگر تمام دنیا کی آنکھوں میں بہت سے اجرام ساکن نظر آتے ہیں غضب تو یہ ہے کہ ہماری دنیا جس پر ہم رہتے اور بستے ہیں بالکل ساکن نظر آتی ہے۔ اب آپ شاید سمجھے ہوں کہ عالم کو ساکن و بیتاب کہنے میں کوئی ادعائے بے دلیل نہیں ہے۔ مگر آپ کی اصلاح جس میں آپ نے 'عالم' کو 'بحر' بنا دیا بحر جہالت کا نقشہ ہے۔ آپ نے شاید سمندر دیکھا ہی نہیں یا جب آپ سمندر کے کنارے پہونچے تھے

تو آپ کی آنکھوں میں کوئی فتور تھا کیونکہ سمندر کی معمولی لہریں بھی کئی گز اونچی ہوتی ہیں اور برابر مد و جزر میں رہتی ہیں۔ طوفانی موجوں کا کیا ذکر جو چھوٹے موٹے پہاڑوں کے برابر ہوتی ہیں۔ اس حالت میں بحر کے لیے لفظ سکون کا استعمال آپ ہی ایسے سمجھدار کر سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے سمندر نہیں دیکھا۔ آپ نے محض لکھنؤ کے گنگجی شکل کے تالاب کو دیکھا ہے اور وہ بھی کافی دور سے جس کی وجہ سے تالاب کے چھوٹے چھوٹے ہلکورے آپ کو نظر نہیں آئے مگر آپ نے قیاس ضرور کر لیا ہوگا کہ اس میں ہلکورے ہوں گے اور اس طرح سکون بیتاب کا اطلاق آپ نے تالاب سے اٹھا کر بحر کے متھے مڑھ دیا کیونکہ یہ آپ کی عادت ہے جیسا کہ میں کئی بار دہرا چکا ہوں کہ آپ سنی سنائی باتوں کو بے محل استعمال کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔

شعر اصغر | یاس ایک جنون ہوشیاری　　　امید فریب زندگی کا

اعتراض نیاز | امید کو فریب زندگی کہنا غلط نہیں لیکن یاس کا (جنون ہوشیاری) ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یاس اور جنون دونوں بالکل متضاد ہیں۔ اس سے پہلا مصرعہ یوں ہونا چاہیے تھا۔ ع "یاس ایک سکون ہوشیاری"

عرض عشرت | اعتراض سے ظاہر ہے کہ آپ شعر بالکل نہیں سمجھے۔ عام لوگ جو زیادہ سمجھدار نہیں ہیں اور جن کے عقلی تصورات بہت تیز نہیں ہوتے ان کو یاس سے کم پالا پڑتا ہے۔ اگر ان کا کوئی لڑکا مر جائے یا نوکری چھوٹ جائے یا اور کوئی حادثہ سخت پیش آئے تو وہ ناامید نہیں ہوتے۔ کچھ عرصہ تک وہ مغموم ضرور رہتے ہیں مگر امید پھر ان کو ڈھارس دلاتی ہے کہ آئندہ سب باتیں سدھر جائیں گی۔ ناامیدی اکثر انھیں کو ہوتی ہے جن کے عقلی تصورات بہت تیز ہوتے ہیں وہ سوچنے لگتے ہیں کہ اگر ایسا ہونے والا ہوگا تو یہ رکاوٹیں سد راہ ہو جائیں گی اور مجھے کامیابی ہرگز نہ ہوگی وغیرہ وغیرہ ایسے لوگ اپنی افراط ہوشیاری یا عقل سے "لا تقنطوا من رحمۃ اللہ" کے جادہ سے ہٹ جاتے ہیں اور ناامیدی ان پر مسلط ہو جاتی ہے۔ شاعر نے اسی لیے کہا ہے "یاس ایک جنون ہوشیاری"۔ مگر یہاں اسکا سمجھنا آپ کے مان کا نہ تھا۔ اور آپ کا یہ لکھنا کہ یاس اور جنون دونوں متضاد کیفیتیں ہیں بالکل عجیب بات ہے۔ کیونکہ یاس و امید متضاد ہیں نہ کہ یاس و جنون۔ دوسری بات یہ بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ شاعر نے جنون ہوشیاری کو استعارۃً افراط ہوشیاری کے معنی میں کہا ہے۔ مگر سب سے بڑی قیامت آپ نے اپنی اصلاح میں ڈھائی ہے۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ یاس بڑی ہلچل مچانے والی پرشورش چیز ہے اسلیے یاس کے لیے سکون لکھ دینا آپ ہی کا کام ہے۔ شاید اصغر صاحب کے شعر میں جنون ہوشیاری کے الفاظ پر نظر پڑتے ہی آپ پر بھی یہی کیفیت طاری ہو گئی۔

شعر اصغر | اس کے سوا تو معنیٔ مجنوں بھی کچھ نہیں　　　ایسا بھی ربط صورت لیلےٰ نہ چاہیے

اعتراض نیاز | "یعنی صورت لیلےٰ کے ساتھ اتنا ربط کہ مجنوں کا مفہوم سوائے اس ربط کے اور کچھ نہ رہ جائے

مناسب نہیں حالانکہ عشق کی کامیابی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ حسن کے نام سے پکارا جانے لگے پہلے مصرعہ میں لفظ (بھی) بالکل غلط استعمال ہوا ہے ۔۔۔۔۔"

عرض عشرت | شکر ہے خدا کا کہ آپ اس کا کچھ مفہوم سمجھے مگر اپنے اعتراض میں "حالانکہ" کے بعد والی سطور لکھ کر اپنی فہم کا پھر ثبوت دینے لگے۔ آپ کو پہلے مصرعہ میں لفظ (بھی) بیکار معلوم ہوتا ہے۔ سبحان اللہ۔ خیر۔ پہلے اصغر صاحب کی ایک خصوصیت سمجھ لیجئے۔ اصغر صاحب اُس عاشقی کے قائل نہیں ہیں جس میں حسن ہی سب کچھ ہو اور عشق کچھ نہ ہو۔ اصغر صاحب کو اپنی عزت نفس اور انفرادیت کا خیال ہمیشہ رہتا ہے۔ وہ پُرانے عاشقوں کی طرح معشوق کے سامنے "جی حضور" (؟) کہنے والے نہیں ہیں۔ اُنھوں نے اکثر اپنے شعروں میں اس کا اعادہ فرمایا ہے۔ سع "وہ اُس رُخ پہ دیکھتا ہوں اب اپنی نظر کو میں" سے

وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنا سے

وغیرہ وغیرہ اس کے بین ثبوت ہیں اگر اس سے آپ کی تشفی نہ ہوئی ہو تو اصغر صاحب کے اور شعر ملاحظہ کیجئے

(۱) ستم جو چاہے کرے مجھ پہ ذوقِ عکس نظر بساطِ آئینۂ حسن خود نما معلوم

(۲) تھیں نگاہیں شوق کی رنگینیاں چھائی ہوئی پردۂ محمل اُٹھا تو صاحبِ محمل نہ تھا

(۳) جبینِ شوق کی شوریدگی کو کیا کہیے وگرنہ عشوۂ طرازیٔ نقشِ پا معلوم

(۴) میرے مذاقِ شوق کا اس میں بھرا ہے رنگ میں خود کو دیکھتا ہوں کہ تصویرِ یار کو

بہرحال یہ اصغر صاحب کی انفرادیت ہے کہ اس معاملہ میں وہ تمام فارسی اور اردو شعرا سے ممتاز ہیں۔ اب شعر کے معنی سُنئیے۔ مجنوں کا اصلی نام قیس تھا۔ لیلےٰ کے عشق میں پاگل ہو جانے کی وجہ سے لوگ مجنوں کہنے لگے تھے۔ شاعر کہتا ہے کہ قیس کو صورت لیلےٰ کے ساتھ ایسا ربط ہوا کہ قیس کی انفرادیت ہی کچھ نہ رہ گئی مگر اس سے زیادہ قابل افسوس بات یہ ہوئی کہ مجنوں کی بھی انفرادیت غائب ہو گئی اور معنیٔ لفظ مجنوں کچھ نہ رہ گئے۔ مجنوں کے معنی پاگل کے یعنے اپنے دماغ میں ایک خلل رکھنے والے کے ہیں لوگ چاہے کچھ کہیں پاگل اپنی رائے نہیں بدلتا اور اپنے خیال میں مست رہتا ہے یعنے وہ اپنی انفرادیت ہرگز نہیں کھو سکتا۔ اگر قیس کو لوگ "مجنوں" یعنے اپنے دماغ میں ایک خاص ذاتی خلل رکھنے والا نہ کہتے اور وہ ربطِ صورت لیلےٰ میں اپنی انفرادیت کھو دیتا تو چنداں حرج نہ تھا مگر کوئی مجنوں ہو کے بھی اپنی انفرادیت محو کر دے تو یہ نہایت قابل افسوس بات ہے اب شاید آپ کی سمجھ میں آیا ہو کہ لفظ (بھی) پہلے مصرعہ میں بیکار نہیں ہے۔

شعر اصغر | دوزخ بھی ایک جلوۂ فردوسِ حُسن ہے جو اس سے بے خبر ہے وہی ہے عذاب میں

اعتراض نیاز | اگر دوزخ کو فردوسِ حسن کا جلوہ کہنا درست ہو سکتا ہے تو فردوس کو نمونۂ جہنم بھی کہہ سکتے ہیں

پھر کیوں نہ شعر اس طرح پڑھا جائے ؂

جنت بھی ایک شعلۂ نار جحیم ہے　　جو اس سے بے خبر نہیں وہ ہے عذاب میں

عرض عشرت | اگر آپ اس شعر کو سمجھ پاتے تو آپ کا یہ لایعنی اعتراض نہ ہوتا۔ مگر آپ اس نعمت سے محروم ہیں اور شاید زندگی بھر یونہی رہیں گے۔ خیر۔ شعر کے معنے سنیئے۔ عارف رضا و تسلیم کی زندگی بسر کرتا ہے اس لیے وہ مصیبت کو حکم خدا سمجھ کے سر اور آنکھوں پر لیتا ہے اور اس میں خوش و شاکر رہتا ہے۔ حضرات صوفیائے کرام نے اکثر اس مضمون کو کہا ہے۔ اصغر صاحب کے بہت سے شعر اس مضمون کے ہیں میں صرف ایک شعر لکھتا ہوں ؂

آلام روزگار کو آساں بنا دیا　　جو غم ہوا اُسے غم جاناں بنا دیا

اب اگر دوزخ کو مصائب کے معنے میں استعارہ سمجھئے یا دوزخ کو اصلی معنے میں لیجئے دونوں صورتوں میں چونکہ حکم خدا (حسن حقیقی) درمیان میں ہے اسلیے دوزخ کو "جلوۂ فردوس حسن" کہنا بجا و درست ہے۔ عارف چونکہ عذاب کو اشارۂ معشوق حقیقی سمجھتا ہے اسلیے وہ عذاب میں بھی شاد رہتا ہے۔ مگر جو عارف نہیں ہے اور اس رمز کو نہیں سمجھتا کہ عذاب بھی اشارۂ حسن حقیقی ہے وہ عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ اب شاید فہم شریف میں آیا ہوگا کہ دوزخ کس طرح "جلوۂ فردوس حسن" ہے۔ رہ گئی آپ کی اصلاح۔ وہ آپ کی فہم کا نتیجہ ہے اور آپ کے مرتبہ کے عین مطابق۔ اصغر صاحب کا شعر اپنے مرتبہ پر ہے۔ دونوں کا فرق صاحبان فہم سے پوشیدہ نہیں۔ آپ کی اصلاح اور اصغر صاحب کے شعر میں واقعی دوزخ و جنت کا فرق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ایسے سمجھدار اصغر صاحب پر اعتراض کرتے ہی رہے اور "نشاط روح" علی گڑھ اور پٹنہ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہوگئی۔

شعر اصغر | میری ندائے درد پہ کوئی صدا نہیں　　بکھرا دیے ہیں کچھ مہ و انجم جواب میں

اعتراض نیاز | "دوسرا مصرعہ پہلے سے کوئی معنوی تعلق نہیں رکھتا۔ آسمان پر اگر تارے بکھرا دیے ہیں تو ندائے درد سے اسکو کیا واسطہ۔ اگر یہ مراد ہے کہ تارے گنا کرو تو لفظ "کچھ" بیکار ہے کیونکہ قلت کو ظاہر کرتا ہے علاوہ اس کے لفظ "مہ" کے ساتھ یوں بھی "کچھ" کا استعمال صحیح نہیں کیونکہ کرۂ ارض کا چاند تو ایک ہی ہے۔"

عرض عشرت | جب آپ کو معلوم تھا کہ کلام اصغر بی۔ اے سے کم درجہ والوں کے لیے نہیں ہے تو آپ کو "ایاز قدر خود بشناس" کے مطابق اس کے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کرنا تھی۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ڈگری یافتہ لوگوں میں دو چار گدھے نہیں ہوتے یا آپ ایسے نیم تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک دو ذہین نہیں ہوتے۔ مگر ہاں کلیہ یہی ہے کہ تعلیم یافتہ کے دماغ میں ایک روشنی ہوتی ہے جس سے نیم تعلیم یافتہ کو کوئی تعلق نہیں۔ اگر آپ کو فلکیات اور نجوم کی کچھ موٹی موٹی باتیں معلوم ہوتیں جن کی ایک پڑھے لکھے آدمی سے امید کی جاتی ہے تو آپ کا یہ اعتراض ہی نہ ہوتا کہ لفظ مہ کے ساتھ کچھ کا لفظ استعمال نہیں ہو سکتا۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارے کرۂ ارض کا چاند ایک ہی ہے۔ مگر

آسمان پر ہزاروں چاند ہیں جو اسی کرۂ ارض پر سے دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے نظام شمسی ہی میں کئی ستارے ہیں جن کے ایک سے زائد چاند ہیں۔ اب رہ گیا کچھ کا اطلاق انجم کے لیے۔ اسکے بارے میں اتنا ہی عرض ہے کہ ستارے گو کہ بیشمار ہیں مگر پھر بھی فضائے کو زمین دیکھتے ہوئے ان کی قلت ظاہر ہے۔ اچھا اس بات کو بھی جانے دیجئے۔ جتنے ستارے ہیں وہ سب کے سب ایک مقام سے دیکھے نہیں جا سکتے۔ یوں بھی لفظ (کچھ) کی (جو قلت ظاہر کرتا ہے) صحت استعمال پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ اب رہ گیا ندرا ے درد سے مہ و انجم کا تعلق۔ اُسے بھی سمجھ لیجئے۔ عاشق نے جو جلوۂ یار کا متلاشی ہے درد ہجر سے بیقرار ہو کر حضرت موسیٰؑ کی طرح ایک درد بھری آواز لگائی "رب ارنی" جناب موسیٰؑ کی خاص بات تھی اسلئے شعلۂ طور برآمد ہو گیا تھا مگر عام جلوۂ دید کے بیقراروں کے لیے خدا نے کچھ مہ و انجم بکھرا دیے ہیں جن سے اسکا جلوہ اور اُسکی قدرت ظاہر ہے اس کو تارے گننے سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ آپ کے دماغ شریف میں گھُس گیا ہے۔

شعر اصغر | اب کون تشنگان حقیقت سے یہ کہے ہے زندگی کا راز تلاش سراب میں

اعتراض نیاز | "اگر زندگی کا راز واقعی تلاش سراب میں ہے تو موت کا راز جستجوئے حقیقت میں ہونا چاہیے حقیقت یہ ہے کہ تصوف کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے کہ اس کا سب سے زائد مہمل نظریہ سب سے زیادہ مستحق ستائش سمجھا جاتا ہے۔"

عرض عشرت | ہر جاہل یہ ماتم کرتا ہے کہ جس کو ہم مہمل سمجھتے ہیں دنیا اُس کی ستائش کرتی ہے۔ مثال کے لیے زمین کی گردش ہی کو لے لیجئے۔ پُرانے خیال کے مولوی اور پنڈت اس کو اب بھی کتنا مہمل سمجھتے ہیں مگر تمام دنیا گلیلیو کی تعریف کرتی ہے کہ اُس نے کتنی صحیح بات دریافت کری۔ تصوف سے آپ قطعی ناواقف ہیں اسلیے کوئی تعجب نہیں کہ تصوف کی جن جن باتوں کو آپ مہمل سمجھتے ہوں دنیا اُن پر مفتون ہو اور شاید قیامت تک رہے۔

پہلے اصغر صاحب کے نظریہ زندگی کے متعلق کچھ سُن لیجئے۔

جستجو ہے زندگی۔ ذوق طلب ہے زندگی زندگی کا راز لیکن دوری منزل میں ہے

یہ مجھ سے سُن لے تو راز پنہاں۔ سلامتی خود ہی دشمن جاں کہاں سے رہرو میں زندگی ہو کہ راہ ہی پرخطر نہیں ہے

یک جہد و کشاکش ہے ہستی جسے کہتے ہیں کفار کا مرجانا خود مرگ مسلماں ہے

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ اصغر صاحب زندگی کو جوش و ولولہ و شورش و کشاکش و مقابلۂ خطرات وغیرہ سمجھتے ہیں۔ اُن کے لیے آرام طلبی۔ جمود۔ امن و سکون وغیرہ موت کے مترادف ہیں اور سمجھداروں کے لیے ہے بھی یہی بات۔ اسلیے اگر رہرو کو منزل مل جائے اور متلاشی حقیقت کو حقیقت۔ تو

ظاہر ہے کہ آسودگی و اطمینان آجائے جسے اصغر صاحب زندگی نہیں سمجھتے۔ جب تک حقیقت سراب کی طرح آگے بڑھتی جاتی ہے تبھی تک تحقیق جاری ہے۔ ورنہ حقیقت کے ملتے ہی تحقیق و تدقیق۔ سائنس و فلسفہ سب ختم ہوجائیں۔ ریگستان میں سراب اکثر پانی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے مگر جب وہاں تک پانی کا متلاشی پہونچتا ہے تو وہ ہٹ کے اور آگے دکھائی پڑنے لگتا ہے اور اسی طرح آگے بڑھتا رہتا ہے۔ بعینہٖ حقیقت بھی متلاشی حقیقت سے سراب کی طرح ہٹتی رہتی ہے اور اسی میں زندگی کا رازِ نہاں ہے جو شاید اب آپ پر عیاں ہوگیا ہوگا۔

بھائی صاحب کیا کیا جائے۔ جہاں خیال میں بلندی ہوتی ہے یا جدت بیان کا معاملہ ہوتا ہے وہاں آپ کی نگاہیں خیرہ ہو کے رہ جاتی ہیں۔ آپ کی عقل کی پرواز بالاخانوں تک ہے جہاں "گوشت پوست والی" معشوقہ مل سکتی ہے اس سے آگے آپ کی نگاہ جا ہی نہیں سکتی اور یہ آپ کی خام کاری ہے کہ جسے آپ دیکھ نہیں پاتے اُس کے وجود سے آپ انکار کرنے لگتے ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ خفاش کے انکار آفتاب سے آفتاب کے وجود کو کون کہے اس کی تابش یا انوار میں بھی فرق نہیں آتا۔

شعر اصغر| کچھ شورشوں کی نذر ہوا خونِ عاشقاں　　جو جم کے رہ گیا اُسے حرماں بنا دیا

اعتراض نیاز| "یہ بالکل جدید انکشاف ہے کہ جس چیز کو یاس و حرماں کہتے ہیں وہ عاشقوں کا منجمد خون ہے اگر یہ شعر یوں ہوتا ؎

جو خون بہ گیا اُسے اُمید کر دیا　　جو جم کے رہ گیا اُسے حرماں بنا دیا

تو حرماں کے مقابلے میں امید کے اجزائے ترکیبی کی بھی تحلیل ہوسکتی"۔

عرض عشرت| نیاز صاحب اگر آپ کچھ علم معنی و بیان باقاعدہ پڑھے ہوئے ہوتے تو منجمد خون کے استعارہ کو بالکل لفظی معنی میں لے کر جدید انکشاف کا رونا نہ روتے۔ شعر کے معنی تو یہ ہیں کہ عاشق کے اندر ایک شورش بے حد پایاں ہے جس نے قریب قریب تمام خون کو سکھا دیا۔ مگر ہاں جو تھوڑا سا رہ گیا ہے وہ سیال صورت میں نہیں رہ گیا ہے بلکہ جم گیا ہے۔ اُسے خون کیوں کہیے وہ گویا حرماں ہے۔ مگر آپ کی سمجھ نرالی ہے۔ پھر جس بات پر اعتراض تھا اُس کو آپ نے اپنے اعتراض میں دُہرا دیا ہے گو کہ آپ کو تقابل پیدا کرنے والے سبق کے (جس کو آپ کانی مار کھا کے اپنے استاد سے سیکھا تھا) استعمال کرنے کا موقع مل گیا۔ آپ کے اصلاحی پہلے مصرعہ کے معنی استعارۃً بھی کچھ نہیں نکلتے۔ کیونکہ جو خون بہ جائے اُسے اُمید ہرگز نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ حالت امید میں تو خون بڑھ جاتا ہے۔ گھٹنے کی اسمیں کوئی گنجائش نہیں۔ اب آپ ہی کا اعتراض آپ کی اصلاح کے پہلے مصرعہ پر ہوتا ہے کہ یہ جدید انکشاف ہے کہ جو خون بہ جائے اُس کا نام امید ہے۔ چلئے تھے آپ اصغر صاحب کے

شعر پر اصلاح دینے مگر بجائے اصلاح کے اصغر صاحب کے رنگ شعر میں اتنا رنگ گئے کہ اُسی طرح کا مصرعہ گو کہ غلط اور سرتا پا غلط ہے کہنے لگے ۔ع ۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔

شعر اصغر | اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی — کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

اعتراض نیاز | "یہ شعر بھی بے معنی ہے کیونکہ ایمان کی حقیقت یہ بتانا کہ وہ فی الاصل کفر ہے پابند رسوم۔ حد درجہ لغو توجیہ ہے۔ اصغر صاحب مصرعہ پورا کرنے کے لیے (کچھ) اکثر استعمال کرتے ہیں اور ہمیشہ بلا ضرورت چنانچہ یہاں بھی موجود ہے اور بالکل بے محل "

عرض عشرت | نیاز صاحب آپ کی سمجھداری کا پورا ثبوت مل چکا ہے اس لیے ہم آپ کی بکواس کا بُرا نہیں مانتے۔ آپ چاہے جس شعر کو بے معنی اور صد درجہ لغو کہیں۔ اصغر صاحب کے چاہے جس لفظ کے استعمال کو بلا ضرورت اور بالکل بے محل قرار دیں۔ خیر۔ پہلے شعر کے معنی سمجھئے۔ یہ شیخ پر پھبتی ہے۔ دنیا میں جب دین محمدی کی بنیاد پڑی تو اس سے پہلے بہت سے مذاہب موجود تھے جن کو کٹر شیخ سوائے کفر اور کسی نام سے یاد نہیں کرتا دراں حالیکہ کفر کے معنی انکار خدا کے ہیں جو شاید ہی کسی مذہب میں روا ہو۔ اسی کفر میں شارع نے کچھ قیود جیسے نماز۔ روزہ وغیرہ اور کچھ رسوم جیسے عید الفطر و عید الضحیٰ وغیرہ لگا دیے۔ بس کفر ایمان ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ یہاں کفر کل اور ایمان اسکا ایک جزو ٹھہرا۔ اب آپ کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ شعر نہیں بلکہ آپ کا پہلا اعتراض بالکل بے معنی اور حد درجہ لغو ہے۔ اور "کچھ" کا استعمال نہیں بلکہ آپ کا دوسرا اعتراض ہمیشہ کی طرح بالکل بے محل۔

شعر اصغر | مجبوریٔ حیات میں راز حیات ہے — زنداں کو میں نے روزنِ زنداں بنا دیا

اعتراض نیاز | "اصغر صاحب راز کی جب کوئی بات ظاہر کرتے ہیں تو وہ ہمیشہ ایسی ہی عجیب و غریب ہوتی ہے پہلے انھوں نے راز زندگی "خودی کا کفن" بتایا۔ اس کے بعد "تلاش سراب" ظاہر کیا اور اب "مجبوری" میں پنہاں بتاتے ہیں جس کا دوسرا نام ان کے یہاں "روزنِ زنداں" ہے۔ دوسرے مصرعے کی بے تعلقی پہلے سے ظاہر کرتے ہوئے ڈرتا ہوں مبادا اس میں بھی کوئی راز پنہاں ہو"

عرض عشرت | یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ آپ اصغر صاحب کا معمولی شعر بھی سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے کیونکہ اصغر صاحب کے خیالات پایاں میں جدت ضرور رہتی ہے اور اُس کے سمجھنے کے لیے ذرا عقل کی ضرورت ہے۔ "راز زندگی" کس طرح "خودی کا کفن" اور "تلاش سراب" ہے وہ بالتفصیل سمجھایا جا چکا ہے۔ اب "روزنِ زنداں" کے استعارے کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

اصغر صاحب زندگی کو ایک جہد و کشاکش اور خطرات کا مقابلہ کرنا سمجھتے ہیں۔ اُن کے ان اشعار کا پھر اعادہ کرتا ہوں ؎

ایک جہد و کشاکش ہے ہستی جسے کہتے ہیں — کفار کا مرجانا خود مرگ مسلماں ہے

یہ مجھ سے سُن لے تو راز پنہاں۔ سلامتی خود ہی دشمن جاں — کہاں سے رہرو میں زندگی ہو کہ راہ ہی پر خطر نہیں ہے

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جد و کشا کش اور مقابلہ خطرات آدمی خوشی سے قبول نہیں کرتا مجبوری سے کرتا ہے۔ کیونکہ انسان فطرتاً آرام و اطمینان کا جویا ہے۔ اب چاہے یہ مجبوری خارجی ہو یعنے بیرونی مشکلات و مصائب سے ہو یا داخلی یعنے ذاتی طبیعت یا شوق سے۔ مجبوری بہرحال مجبوری ہے۔ اب شاید آپ کی سمجھ میں آیا ہو کہ راز حیات کیوں مجبوری حیات میں ہے۔ خیر آگے چلیے آپ کو "روزن زنداں" کا تماشہ بھی دکھا دیں۔ سنیے۔ جو آدمی مجبوری کو مجبوری سمجھتا ہے اس کی پریشانی و تکلیف ظاہر ہے۔ مگر جو مجبوری کو وجہ فائدہ سمجھتا ہے اُسے اک گونہ اطمینان رہے گا۔ مان لیجیے کہ ابھی آپ طفل مکتب ہیں کیونکہ آپ کے اعتراضات سب اُسی طرح کے ہیں اور اُسی طرح آپ کو سمجھانا پڑتا ہے اور فرض کیجیے کہ استاد نے آپ پر تادیباً دو درجن بید جھاڑے۔ اب اگر آپ اس مجبوری سزا کو محض مجبوری سمجھتے ہیں تو آپ کو انتہائی تکلیف ہوگی لیکن اگر آپ کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہے کہ اُستاد آپ کی بھلائی کے لیے آپ کو سزا دے رہا ہے تو آپ کی تکلیف میں اس خیال سے کچھ نہ کچھ تخفیف ہو جائیگی اسی بات کو استعارۃً اصغر صاحب نے کہا ہے "چونکہ میں نے مجبوری حیات کی حقیقت کو سمجھ لیا ہے کہ اسی پر زندگی کا انحصار ہے اسلیے مجبوری حیات کی تکلیف میں جو ایک زنداں کی طرح ہے کچھ کمی محسوس ہونے لگی میں زندان مجبوری میں تو ہوں مگر گویا زنداں میں میں نے ایک روزن بنا دیا ہے جس سے باہر کا منظر دکھائی پڑتا ہے اور ایک گونہ فرحت ملتی ہے۔ ابھی تک تو زنداں ہر طرف سے بند تھا یعنے میں اپنے کو ہر چہار طرف مجبوری سے گھرا پاتا تھا اور اس میں کہیں خوشی کی جھلک دکھائی نہیں پڑتی تھی مگر اب روزن کی وجہ سے کلفت زنداں میں ذرا کمی ہوئی"۔ یعنے نالائق لڑکے لاکھ سمجھانے پر بھی سمجھ نہیں پاتے مگر استاد اپنا فرض ادا کرتا ہے میں بھی اپنا فرض ادا کر رہا ہوں چاہے کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔ مگر ہاں اب کی آپ نے اپنے اعتراض میں کچھ سمجھداری برتی ہے۔ پہلے مصرعہ سے دوسرے مصرعہ کی بے تعلقی ظاہر کرتے ہوئے آپ ڈر رہے ہیں کہ مبادا اس میں کوئی راز نہاں ہو بے شک آپ کا ڈر درست تھا۔ راز شعر آپ کی فہم میں نہ سہی مگر ناظرین کرام کی فہم میں ضرور آگیا ہوگا۔

شعر اصغر | عالم سے بے خبر بھی ہوں عالم میں بھی ہوں میں — ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا

اعتراض نیاز | "معلوم نہیں کہ وہ کونسا مقام ہے جس کو ساقی نے آساں بنا دیا اگر یہ کوئی مقام تصوف نہیں ہے تو اس کے مخصوص کرنے میں کیا حرج تھا جبکہ (اس) کے اشارہ نے یوں بھی ایک حد تک ابہام کو دور کر ہی دیا ہے"۔

عرض حسرت | نیاز صاحب۔ آپ ایسی موٹی عقل کا آدمی مجھے اپنی عمر میں نہیں ملا۔ بھائی صاحب جو بات سامنے کی ہوتی ہے اور بہت واضح طور سے لکھی ہوتی ہے وہ بھی آپ کو دکھائی نہیں دیتی۔ جس مقام کی آپ کو تلاش ہے اور جس کی طرف لفظ (اس) اشارہ کر رہا ہے وہ شعر کا پہلا مصرعہ ہی ہے یعنے عالم میں ہونا اور عالم سے بے خبر ہونا۔ ظاہر ہے کہ یہ مقام بلا امداد ساقی (چاہے وہ دنیاوی شراب دینے والا ہو چاہے روحانی)

ممکن نہیں۔

شعر اصغر | محو ہے ذوق دید بھی جلوۂ حسن یار میں ایک شعاع نور ہے اب یہ نظر نظر نہیں

اعتراض نیاز | "پہلے مصرع میں لفظ (بھی) بیکار ہے۔ جلوۂ حسن میں ذوق دید محو نہیں ہوتا تو کیا لامسہ اور سامعہ محو ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے مصرع میں لفظ (اب) یکسر بے محل استعمال ہوا ہے کیونکہ نظر نام ہی ہے اک شعاع نور کا۔ اس میں اب اور جب کیا؟"

عرض عشرت | عاشق جلوۂ یار کے سامنے آنے سے پہلے ہی اپنی ہستی محو کرکے محض ذوق دید بنکر رہ گیا ہے۔ مگر جلوۂ یار کے سامنے آتے ہی ذوق دید بھی محو ہو گیا۔ یعنے عاشق یہ بھی بھول گیا کہ اسی جلوہ کے ذوق دید میں اب تک بیتاب تھا۔ اب جی بھر کے دیکھ لینا چاہیے۔ مگر اب نگاہیں خیرہ ہیں کرے تو کیا کرے۔ اب شاید آپ کی فہم میں گھسا ہو کہ لفظ (بھی) کا استعمال بیکار نہیں ہے بلکہ اسکا محل استعمال سمجھنے میں آپ کی عقل بیکار ہو کر رہ گئی ہے۔ اب آپ کا یہ جملہ کہ "جلوۂ حسن میں ذوق دید محو نہیں ہوتا تو کیا لامسہ اور سامعہ محو ہوتے ہیں" قریب قریب صحیح ہے مگر افسوس آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ہر حسن میں ذوق دید محو نہیں ہوتا۔ سیکڑوں حسن ہم روز دیکھتے ہیں اور ذوق دید کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔ ایسا حسن تو زندگی میں خوش قسمتی سے کبھی ملتا ہے کہ جسے دیکھ کر ذوق دید رخصت ہو جائے۔ پھر آپ فرماتے ہیں کہ "نظر نام ہی ہے ایک شعاع نور کا۔ اس میں اب اور جب کیا؟" اجی حضرت سنیے۔ نظر محض ایک شعاع نور نہیں ہے۔ شعاع نور حساس نہیں ہوتی مگر نظر بہت کچھ سمجھتی بوجھتی ہے۔ اگر موجودہ تحقیق کے رو سے آپ سمجھنا چاہتے ہیں تو نظر کم از کم جو چیز دیکھتی ہے اس کی خبر دماغ کو پہونچاتی ہے۔ وہ محض ایک شعاع نور نہیں ہے جو ایک تاریک کمرے کو روشن کر دے۔ شاعر کہتا ہے کہ جلوۂ یار کے سامنے آنے سے نگاہ خیرہ ہو گئی ہے اور نظر اب محض ایک شعاع نور ہے جس نے اپنا سمجھنے کا کام چھوڑ دیا ہے۔ اس لیے اب میں اپنی نظر کو نظر نہیں کہہ سکتا۔ سمجھ پائیے تو سمجھیے۔ آگے چلتا ہوں۔

شعر اصغر | چاہیے داغ معصیت اسکے حریم ناز میں پھول یہ ایک بھی نہیں دامن پاکباز میں

اعتراض نیاز | "محبوب کے دامن عفت کو داغ معصیت سے آلودہ دیکھنے کی تمنا اگر کوئی مقام تصوف ہے تو اس میں شک نہیں کہ نہایت دلچسپ ہے اگر اس کا تعلق اپنے سے ہو۔ اور حد درجہ رشک انگیز اگر یہ خدمت کسی اور کے سپرد کی جائے۔"

عرض عشرت | محبوب کے دامن عفت کو معصیت سے آلودہ دیکھنے کی تمنا کوئی مقام تصوف نہیں۔ یہ تو بالکل کسی بالاخانے کی بات ہے جہاں کوئی "گوشت پوست والی معشوقہ" ہو جس کے بغیر آپ کے دماغ میں تغزل ناممکن ہے اور اس طرح کا کام آپ کے لیے بے شک "دلچسپ ہے اگر اس کا تعلق اپنے سے ہو اور حد درجہ رشک انگیز اگر یہ خدمت

کسی اور کے سپرد کی جائے"۔ آپ کی نظر چونکہ ایسے بالاخانے سے بالا تر کبھی گئی اور نہ جا سکتی ہے لہٰذا اس کے سوا آپ کو کسی شعر میں اور سوجھے گا کیا؟ خیر، شعر کے معنے سنئیے۔ یہ شعر زاہدوں پر پھبتی ہے جن کو اپنی پاکدامنی پر اتنا ناز ہوتا ہے کہ وہ حد غرور سے بھی تجاوز ہو جاتا ہے مگر معشوق حقیقی کے حریم ناز میں کرم و عفو کی اگر خواہش ہے تو داغ معصیت کا پھول دامن میں بھر لیجانا چاہیے۔ غرور پاکدامنی کی وہاں کوئی قیمت نہیں۔ اسکے علاوہ داغ کو پھول کہنا کتنا خوبصورت و رنگین استعارہ ہے مگر آپ کو علم معنی و بیان سے کیا تعلق؟۔

شعر اصغر| اب وہ عدم عدم نہیں پر توحسن یار سے　　　　باغ و بہار بن گیا آئینۂ دست ناز میں

اعتراض نیاز| "پہلے مصرعہ کا پہلا ٹکڑا بیکار ہے کیونکہ معنی صرف اتنا کہنے سے ہی پورے ہو جاتے ہیں" پر توحسن یار سے آئینہ باغ و بہار بن گیا۔ "اب وہ عدم نہیں" کا شعر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اول تو آئینہ کو عدم سے تعبیر کرنا درست نہیں اور اگر سادگی کے لحاظ سے اس کو عدم کہا جائے تو دوبار (عدم عدم) کہنے کی ضرورت نہیں۔ پہلا مصرعہ یوں ہو سکتا تھا۔ ع "اب وہ عدم نہیں رہا پر توحسن یار سے" علاوہ اس کے باغ و بہار کے مقابلہ میں بجائے عدم کے خزاں کہنا زیادہ موزوں تھا۔ یا عدم کے مقابلہ میں باغ و بہار کے بجائے نقش وجود، نقش حیات کہتے۔"

عرض عشرت| شکر ہے کہ آپ شعر میں اتنا تو سمجھے کہ سادگی کے لحاظ سے آئینہ کو عدم کہہ سکتے ہیں اور جب آپ خود ہی اسکا اقرار کرتے ہیں تو آپ کا وہ جملہ جو اس سے پہلے یعنے "آئینہ کو عدم سے تعبیر کرنا درست نہیں" از خود غلط ہو گیا۔ خیر میں اس طرح کے اعتراض کو محض آپ کی سادگی پر محمول کر کے آگے چلتا ہوں۔ سنئیے۔ چونکہ آئینہ کے اندر بلا کوئی چیز سامنے آئے کچھ نہیں ہوتا اس لیے شاعر نے اس کو عدم کہا جو ایک بدیہہ اور روشن استعارہ ہے اب اپنے اعتراض یعنے "دوبار (عدم عدم) لکھنے کی ضرورت نہیں" کی خیر و عافیت سنئیے۔ ایمفاسس۔ زور (Emphasis) دینے کے ہر زبان میں جہاں اور طریقے ہیں وہاں تکرار لفظ بھی ہے۔ غور کیجئے ایک جملہ ہے "جب سے اڈیٹر صاحب کے دماغ میں ہمچو من دیگرے نیست، کا خبط سوار ہوا وہ آدمی نہیں رہ گئے"۔ مگر اسی جملہ کو اگر زور دے کے کہنا ہو تو یوں کہیں گے "جب سے ہمچو من دیگرے نیست، کا خبط سوار ہوا تب سے وہ آدمی آدمی نہیں رہ گیا"۔ اب شاید آپ سمجھے ہوں کہ تکرار لفظ یہاں بیکار نہیں ہے بلکہ نہایت معنی دار ہے جس کی وجہ سے شعر کا پورا مصرعہ زوردار ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا اصلاحی مصرعہ اس کے سامنے نہایت پھسپھسا اور سست معلوم ہوتا ہے۔

آپ کو یہاں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ آئینہ کے بارے میں شاعر نے دو باتیں کہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ آئینہ جلوۂ یار سے باغ و بہار بن گیا اور دوسرے یہ کہ اب آئینہ عدم نہیں رہ گیا۔ مگر آپ کہتے ہیں کہ دوسری بات کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یوں ہی شاعر کا مفہوم پورا ہو جاتا ہے اور آپ نے [illegible]

جھک بھی ماری ہے۔ شاباش ایسے ہی لوگوں کے لیے کسی نے یہ شعر کہا تھا۔ ع۔ ہرکس کہ نداند و بداند کہ بداند۔ الخ
اس کے بعد آپ کو اپنے استاد کا بتایا ہوا شعر میں تقابل پیدا کرنے کا سبق یاد آ گیا۔ تقابل کے لیے آپ شاعر کے مفہوم کا خون کرنے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔ اسی لیے آپ فرماتے ہیں کہ باغ و بہار کے مقابلے کے لیے بجائے عدم کے "خزاں" لکھنا چاہیے۔ لیکن اگر آدمی میں تھوڑی بہت بھی عقل ہو تو وہ سمجھے کہ چونکہ آئینہ کے اندر کچھ نہیں ہوتا اس لیے اُس کو عدم کہنا درست ہے اور اُس کو "خزاں" ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ خزاں میں گو کہ سرسبزی و شادابی۔ پھول، کلیاں وغیرہ نہیں ہوتیں مگر سوکھی شاخیں۔ زرد گرے ہوئے پتے وغیرہ وغیرہ دوسری چیزیں ہوتی ہیں۔ بھائی صاحب۔ شعر میں مناسبت الفاظ دیکھنے کے لیے بڑی لیاقت چاہیے۔ محض اڈیٹر بن جانے سے یہ کام نہیں آجاتا۔ پھر آپ رقمطراز ہیں۔ بلغ و بہار کے بجائے نقش وجود و نقش حیات لکھنا چاہیے۔ بھلے آدمی یہ بھی نہ دیکھا کہ آئینہ دست ناز معشوق میں ہے اور جب اس کی خوبصورتی کا عکس پڑے گا تو آئینہ میں باغ و بہار کی کیفیت آجائے گی۔ اب اگر باغ و بہار کے بجائے نقش وجود۔ نقش حیات لکھا جاتا تو معشوق کی خوبصورتی پر حرف تو آتا ہی اور اس کے ساتھ ساتھ شعر کی بھی خوبصورتی رفوچکر ہو جاتی۔ ایک خوبصورت آدمی کے آئینہ دیکھنے سے آئینہ میں نہ نقش وجود بنتا ہے اور نہ نقش حیات۔ مگر آپ کو معنی سے تعلق ہمیشہ کم رہتا ہے۔ شعر کے معنی چاہے کم ہو جائیں چاہے یک لخت لٹ جائیں مگر شعر کی چول تقابل کے ذریعہ بیٹھ جائے۔ آپ ہی ایسے حضرات کے لیے ایک مرتبہ اصغر صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اُردو میں شعرا کے دو گروہ ہیں ایک وہ جو الفاظ و محاورہ کو سب کچھ جانتا ہے اور دوسرا وہ (اسی میں خود اصغر صاحب ہیں) جو معنی کو سب کچھ سمجھتا ہے اور الفاظ کو معنی کا پیرو بنانا چاہتا ہے کیونکہ الفاظ محض لباس ہیں اور معنی جسم۔ اصغر صاحب کہنے لگے کہ میں کہتا ہوں کہ اگر شیروانی فٹ نہیں آتی ہے تو اُسے یہاں وہاں سے کھول کر درست کر لو۔ مگر پہلے گروہ کے شعرا یہ کہتے ہیں کہ خبردار شیروانی کو ہاتھ نہ لگانا۔ شیروانی جیوں کی تیوں رہے گی۔ بس جسم کی ایک پسلی کو دبا دو تو شیروانی فٹ آجائے گی۔ نیاز صاحب آپ اسی گروہ میں ہیں اس لیے تقابل و توازن کے خاطر شعر کے مفہوم کو ہلکا کرنے کے لیے یا اس کو بالکل برباد کرنے کے لیے ہمہ تن تیار رہتے ہیں۔ جب تک اس طرح کے تمام بد مذاقوں کو بقول شخصے بوروں میں بند کر کے گنگا میں ڈبویا نہ جائے گا غریب اُردو کا بھلا نہیں ہو سکتا۔

شعر اصغر: مئے بے رنگ کا سو رنگ سے رسوا ہونا کبھی میکش کبھی ساقی کبھی مینا ہونا

اعتراض نیاز: "یہ شعر 'خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ' کی قسم کا ہے اور فلسفۂ وحدت الوجود سے تعلق رکھتا ہے یعنی وہی ایک مئے 'بے رنگ' ہے جو کبھی میکش نظر آتی ہے اور کبھی ساقی و مینا۔ یہ مئے بے رنگ

کیا چیز ہے۔ یہ شاعر کا کوئی ذہنی مفروضہ ہے یا علم نیرنجات کا کوئی تماشہ کہ ایک ہی چیز مختلف شکلوں میں نظر آتی ہے۔ پہلے مصرع میں لفظ (کا) غلط ہے اس کے بجائے (کو) ہونا چاہیے۔"

عرض عشرت | حضرت، پہلے آپ لکھتے ہیں کہ یہ شعر فلسفۂ وحدت الوجود سے تعلق رکھتا ہے اور اسکی ایک مثال مشہور فارسی مصرعہ یعنے "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ" سے دیتے ہیں اور پھر اس کو یوں لکھ کے ادھفا کرتے ہیں" وہی ایک مئے بے رنگ ہے جو کبھی سیکش نظر آتی ہے اور کبھی ساقی و مینا" مگر فوراً ہی آپ سب کچھ بھول کے تجاہل سے پوچھتے ہیں کہ یہ مئے بے رنگ کیا چیز ہے؟ اسی کو کہتے ہیں"..... حافظہ نباشد" آپ لکھتے ہیں کہ یہ شاعر کا کوئی ذہنی مفروضہ ہے یا نیرنجات کا تماشہ۔ وحدت الوجود اگر اصغر صاحب کا ذہنی مفروضہ ہوتا تو اس مسئلہ پر عربی۔ فارسی۔ سنسکرت۔ اردو ہندی والوں نے اس سے پیشتر ہزاروں کتابیں نہ لکھی ہوتیں۔ مگر ہاں وحدت الوجود کا مسئلہ آپ ایسے دماغ والوں کے لیے نہیں ہے۔ آپ کو بیشک نیرنجات کا تماشہ معلوم ہوگا۔ آپ کیوں نہ پوچھیں یہ مئے بے رنگ کیا چیز ہے۔ بھائی صاحب۔ یہ بات یہاں تک مشہور ہے کہ ایک جاہل بھی جانتا ہوگا کہ "وحدت الوجود" میں ہر شے خدا ہوتی ہے۔ سوا آپ کی ذات گرامی کے کسی کو اس طرح کا سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب رہ گئی آپ کی اصلاح کہ مصرعہ اولیٰ میں جو (کا) ہے اسے (کو) ہونا چاہیے۔ یہ آپ کی لیاقت ادبی پر دال ہے۔ بھائی صاحب، 'کو' جبھی ٹھیک ہو سکتا ہے کہ جب ردیف بجائے 'ہونا' کے 'کرنا' ہوتی۔

شعر اصغر | از ازل تا بہ ابد محو تماشا ہونا ہیں وہ ہوں جسکو نہ مرنا ہے نہ پیدا ہونا

اعتراض نیاز | "یہ شعر تو اصغر صاحب نے غالباً پیدا ہونے کے بعد ہی کہا ہوگا اس لیے اب نہ پیدا ہونا کیسا؟ اصل میں کہنا چاہیے تھا" نہ زندہ رہنا" حالانکہ اس صورت میں بھی معما لاینحل رہ جاتا ہے کہ وجود کی یہ صورت کہ انسان نہ زندہ رہے نہ مرے کیونکر متعین ہو سکتی ہے۔ اور اس کا تعلق تماشہ سے کیا ہے۔ محاورہ کے لحاظ سے پہلے مصرع کی ردیف بالکل غلط قرار پاتی ہے 'محو تماشہ رہنا' کے بجائے 'محو تماشہ ہونا' لکھا گیا ہے۔"

عرض عشرت | آپ شعر کو قطعی نہیں سمجھے۔ آپ کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ انسان نہ پیدا ہوتا ہے نہ مرتا ہے۔ جہاں بات ذرا گہری ہوئی آپ کی فہم سے بالاتر ہو جاتی ہے آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ نوع انسانی ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی یہ نہ پیدا ہوتی ہے نہ مرتی ہے۔ منفرد انسان پیدا بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں مگر انسان باقی رہتا ہے اور مظاہر عالم کے تماشہ میں محو رہتا ہے۔ اب شاید آپ سمجھے ہوں کہ شعر میں 'میں' کا اطلاق اصغر صاحب پر نہیں ہے بلکہ 'انسان' پر یعنے 'بنی نوع انسانی' پر ہے۔ اب آپ جو یہ فرماتے ہیں کہ محاورہ کے لحاظ سے "محو تماشہ ہونا" کے بجائے "محو تماشہ رہنا" چاہیے۔ اس کے بارے میں عرض ہے کہ دونوں محاورے کے

اندر ہیں اور زبان زد عوام و خواص ہیں ساں دونوں جملوں پر غور کیجئے۔ (۱) میں سات بجے تک محو خواب تھا (۲) میں سات بجے تک محو خواب رہا۔ ہاں ایک اور نکتہ ہے "محو ہونا" میں جس حد تک خود فراموشی ہے وہ "محو رہنا" میں بہت کم ہے۔ اسی کا لحاظ کرتے ہوئے شاعر نے 'محو ہونا' لکھا ہے۔

شعر صغر | سارے عالم میں ہے بیتابی و شورش برپا ہائے اُس شوخ کا ہمرنگ تمنا ہونا

اعتراض نیاز | "شوخ کا ہمشکل تمنا ہونا عجیب بات ہے، اور اگر اس 'ان ہونی' کو ہونی فرض کرلیں تو معنًا یہ نقص پیدا ہوتا ہے یعنے جب ہمشکل تمنا ہو گیا یعنے خود آرزومند ہو گیا تو پھر عالم میں بیتابی و شورش کیونکر پیدا ہو سکتی ہے"

عرض عشرت | اس شعر کا لطف ایک ہندو زیادہ اُٹھا سکتا ہے کیونکہ بالکل اسی سے ملتی جلتی تلسی داس کی ایک مشہور چوپائی ہے جو زبان زد خلائق ہے "जाकी रही भावना जैसी । हरि मूरती देखी तिन तैसी"

یعنے جس کا جیسا خیال تھا اُس نے مالک حقیقی کو اُسی شکل میں دیکھا۔ مگر آپ کا نیم تعلیم یافتہ دماغ ان بڑی بڑی باتوں تک کیونکر پہونچ سکتا ہے۔ اگر میں آپ سے فلسفۂ جمالیات کا ایک معمہ اور بیان کروں تو آپ اپنی نافہمی کی چیخ مار کے اور اُچھلیں کودیں گے۔ مگر ہرچہ بادا باد میں بیان ضرور کروں گا۔ سُنیے "آدمی اپنے ہی پر عاشق ہو سکتا ہے دوسرے پر نہیں" آپ گھبرائیں نہیں میں اس کے معنے آپ کو سمجھائے دیتا ہوں۔ غور کیجئے۔ جو خوبی انسان کے دل و دماغ میں ہوتی ہے یعنے جس خوبی کو انسان کا دل پسند کرتا ہے وہی جب کسی چیز میں مل جاتی ہے تب انسان اُس چیز پر عاشق ہو جاتا ہے اور عاشق ہونا بیتابی و شورش کا مترادف ہے۔ اب شعر کو سمجھیے۔ شاعر کہتا ہے کہ معشوق میں قیامت کی بات یہ ہے کہ جس کے دماغ میں جو خوبی ہوتی ہے اُسی خوبی میں وہ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ جس ادا کی تمنا ہوتی ہے وہی ادا سامنے آجاتی ہے اسی وجہ سے تمام عالم اس پر عاشق ہو کر بیتابی و شورش میں مبتلا ہے۔ اب شاید آپ سمجھ سکے ہوں کہ اس میں نہ کوئی 'ان ہونی' بات ہے اور نہ اس میں بیتابی و شورش پیدا ہونا ناممکن۔

شعر اصغر | فصل گل کیا ہے۔ یہ معراج ہے آب و گل کی میری رگ رگ کو مبارک رگ سودا ہونا

اعتراض نیاز | "پہلے مصرعہ میں لفظ (یہ) بالکل بیکار ہے اور صرف وزن پورا کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں 'رگ سودا' کا استعمال درست نہیں"

عرض عشرت | آپ کو لفظ (یہ) جو زائد معلوم ہوتا ہے وہ زور یعنے (Emphasis) دینے کے لیے ہے۔ جب سوال ہو کہ فصل گل کیا ہے؟ تو اس کے جواب دو ہو سکتے ہیں (۱) آب و گل کی معراج ہے (۲) یہ آب و گل کی معراج ہے۔ صاحبان ذوق پر روشن ہے کہ پہلا جواب سادہ ہے مگر دوسرے جواب میں زور ہے اور محض لفظ (یہ) کی وجہ سے۔ انگریزی میں تعریف کرنے کے موقع پر (جیساکہ اس شعر میں ہے)

لفظ (this) کا استعمال ناگزیر ہے (this) کے معنے 'یہ' یا 'وہ'، دونوں ہوتے ہیں۔ اگر انگریزی میں پوچھا جائے کہ وھیل کیا ہے! (What is a whale) تو اس کا جواب یقیناً یہی ہوگا کہ یہ ایک مچھلی ہے۔ (Whale a is this) انگریزی میں تو لفظ 'یہ' ناگزیر ہے مگر اُردو میں دونوں جائز ہیں چاہے آپ یہ کا استعمال کریں یا نہ کریں مگر ہاں جب آپ کو کسی بات پر زور دینا ہے تو آپ لفظ (یہ) ضرور استعمال کریں گے۔
آپ کا دوسرا اعتراض کہ دوسرے مصرعہ میں "رگ سودا" کا استعمال درست نہیں۔ لایعنی ہے کیونکہ آپ نے کوئی ثبوت اپنے دعوے کے لیے پیش نہیں کیا ہے جس پر غور کیا جائے۔ میرے خیال میں 'رگ سودا' کا استعمال بالکل صحیح ہے۔ فصل گل کے ساتھ جنون کا تعلق فارسی اور اُردو شاعری میں مسلم ہے۔ پھر نہ جانے آپ کی سمجھ میں 'رگ سودا' کا استعمال کیوں غلط ہے۔ مگر آپ کو تمام مسلمہ باتوں سے انکار کرنے کی ضد رہتی ہے چاہے وہ مذہب سے متعلق ہوں چاہے کسی اور موضوع سے۔ اسلیے شاید اس مسلمہ سے بھی انکار ہے۔

شعر صغرا | حسن کے ساتھ ہے بیگانہ نگاہی کا مزہ　　　قہر ہے قہر مگر عرض تمنا کرنا ؛

اعتراض نیاز | " (ساتھ) بالکل غلط استعمال ہوا ہے۔ بیگانہ نگاہی کسی چیز سے ہوتی ہے نہ کہ اسکے ساتھ "

عرض عشرت | اگر آپ کی سمجھ کوئی مادی چیز ہوتی تو میں آپ سے ضرور کہتا کہ لکھنؤ میں جو ایک بہت بڑی نمائش کا اہتمام ہو رہا ہے اس میں اسے ضرور بھیج دیجئے کیونکہ یقیناً اسپر آپ کو انعام اول ملے گا۔ مگر چونکہ یہ ممکن نہیں میں اُسے ناظرین کرام کے سامنے بے نقاب کیے دیتا ہوں۔ یہ بھی نمائش سے کم مزیدار بات نہیں ہے۔ بھلے مانس۔ اگر معشوق میں حسن بے پناہ ہو اور اسکے ساتھ اپنے عاشقوں سے بیگانہ نگاہی بھی۔ تو اس میں کیا قباحت ہے۔ آپ کیوں لکھ رہے ہیں کہ بیگانہ نگاہی کسی چیز کے ساتھ نہیں ہوتی۔ کیا جس میں بیگانہ نگاہی ہوتی ہے اُس میں کوئی چیز رہ ہی نہیں جاتی۔ سبحان اللہ۔ یہ جدید اکتشاف ہے۔ اب ذرا شعر کا لطف اُٹھانے کی کوشش کیجئے۔ ایک معشوق میں حسن عالم سوز کے ساتھ بھولا پن ہے یعنے نہ وہ اپنے کو حسین سمجھتا ہے اور نہ دوسروں کو اپنے حسن کا دیوانہ بلکہ سب کو بیگانہ سمجھ کر بے جھجک آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گفتگو کرتا ہے یہ کتنے مزے کی بات ہے مگر یہ جبھی تک ممکن ہے کہ کوئی عاشق بیتاب ہو کر اظہار تمنا نہ کر بیٹھے۔ عرض تمنا کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ حسن اپنے حربہ سے آگاہ ہو جاتا ہے اور وہ خود بیں ہو کر عاشق سے حیا اور کج ادائی کرنے لگتا ہے اسی لیے شاعر نے عرض تمنا کو 'قہر' کہا ہے۔

متذکرہ بالا تینوں شعروں کو آپ نے مفہوم کے لحاظ سے ادنیٰ درجہ کے اور فن کے لحاظ سے اسقام سے پاک نہیں لکھا ہے۔ سمجھداروں پر روشن ہو چکا کہ مفہوم کے لحاظ سے شعر اتنے بلند ہیں کہ اُردو ادب میں صف اولیں میں رکھنے کے قابل ہیں اور فن کے لحاظ سے جو غلطیاں آپ نے نکالیں اُن کی حقیقت کے ساتھ ہی آپ کا بھی بھرم کھل گیا۔

اشعار صغرا (۱) معنیٔ آدم کجا و صورت آدم کجا　　　یہ نہاں خانے میں تھا اب تک نہاں خانے میں ہے

(۲) خرمن بلبل تو پھونکا عشق آتش رنگ نے — رنگ کو شعلہ بنا کر کون پروانے میں ہے
(۳) میں یہ کہتا ہوں فنا کو بھی عطا کر زندگی — تو کمال زندگی کہتا ہے مرجانے میں ہے

اعتراض نیاز " یہ تینوں شعر مفہوم سے معرا ہیں۔۔۔۔۔"

عرض عشرت پہلے شعر کے معنی سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ معنیٔ آدم وہ صفات اعلےٰ ہیں جن کی وجہ سے فرشتوں کو سجدہ کرنا پڑا تھا۔ مگر دنیا میں آ کے صورت آدم نے جو شورشیں پیدا کیں وہ ظاہر ہیں۔ اب معنیٔ آدم وصورت آدم میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ شاعر نے اسی لیے کہا "معنیٔ آدم کجا وصورت آدم کجا"۔ ازل میں اپنی پیدائش سے پہلے آدم مصلحت ایزدی کے نہاں خانے میں تھا۔ شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ آدم کو ہزاروں برس صفحہ ارض پر رہتے ہو گیا مگر معنیٔ آدم کے لحاظ سے آدمی اب بھی نہاں خانے میں ہے۔ صاف لفظوں میں مفہوم یہ ہوئے کہ اصلی ارصاف آدم اب تک دنیا میں ظاہر نہ ہو سکے۔

اب دوسرا شعر سمجھنے کے لیے دماغ پر زور ڈالیے۔ شاعر کہتا ہے کہ عشق نے گل آتش رنگ بنکر خرمن بلبل کو پھونک دیا اور اُسے آہ وزاری کرنے پر مجبور کر دیا۔ اگر معاملہ یہیں ختم ہو جاتا تو غنیمت تھا مگر عشق اور آگے بڑھا اور اس رنگ کو جو آتش سے مشابہ تھا بالکل آگ ہی کر دیا جو مشتعل ہو کر شعلہ ہو گیا۔ اس شعلہ کو عشق نے پھر سینۂ پروانہ میں رکھ دیا جس سے بیتاب ہو کر پروانے نے شعلۂ شمع پر اپنی جان دیدی۔ اقرار کو زوردار بنانے کے لیے استفہام بنا دیا جاتا ہے انگریزی میں یہ ایک صنعت ہے جسے انگریزی علم دبیان میں (Interrogation) کہتے ہیں۔ اسی کے ماتحت اصغر صاحب نے 'کون' لکھا ہے جس سے اشارہ 'عشق' کی طرف ہے۔

اب تیسرے شعر کے لیے دماغ صاف کیجیے۔ شاعر دہریہ سے مخاطب ہے۔ جو زندگی کا منتہا موت سمجھتا ہے یا یوں کہیے کہ آپ ہی سے مخاطب ہے۔ کیونکہ آپ بھی "زندگیٔ بعد الموت" کو نہیں مانتے۔ شاعر کا روئے سخن اُن بزدلوں کی طرف بھی ہے جو مصائب سے گھبرا کر کمال زندگی مرجانے میں سمجھ کر خودکشی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ شاعر ان سب سے کہتا ہے کہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ مردانہ وار اس طرح کشاکش حیات میں حصہ لو اور جنگ جہد للبقا میں وہ بہادری دکھاؤ کہ تمھارا نام تمھاری فانی زندگی کے بعد بھی رہ جائے اور اس طرح سے زندگیٔ فانی کو زندگیٔ دوام سے بدل لو۔ دوسرے لفظوں میں فنا کو بھی زندگی عطا کر و۔

اب آپ ہی ازراہ انصاف بتائیے کہ آیا یہ اشعار مفہوم سے معرا ہیں یا آپ کا دماغ ہی بلند پروازی سے معرا ہے جو اصغر صاحب کے اعلےٰ مضامین تک پہونچ نہیں سکتا۔

(باقی آیندہ)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

(جناب مرزا ندا علی صاحب خنجرؔ لکھنوی)

الناظر ستمبر ۱۹۳۶ء میں منشی مشیر احمد صاحب علوی ناظرؔ کاکوروی کا بسیط مضمون "لکھنوی شاعری" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اُس مضمون میں شاعری کے ارتقائی مدارج پر محققانہ نظر ڈالتے ہوئے اُن رموز و نکات کو اُبھارنے کی سعی کی گئی ہے جن کے ذریعہ سے ہر عہد کی ادبی تبدیلیاں دریافت کی جا سکتی ہیں۔ مجھے اس مقالہ پر نقد و تبصرہ کرنا مقصود نہیں البتہ بعض غلط فہمیوں کا ازالہ اور چند ضروری مشورے عرض کرنا منظور ہیں۔

زیر نظر مضمون میں، لائق مقالہ نگار نے پانچویں صفحہ پر میر حسنؔ، صاحب "سحر البیان" کا تذکرہ قلم بند کیا ہے اور ساتھ ساتھ چھ شعروں میں کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اُن اشعار میں حسب ذیل یہ دو شعر بھی شامل ہیں۔

تمہارے محبت میں بازی سدا　　وہ جیتا کیا اور میں ہارا کیا
کیا قتل اور جان بخشی بھی کی　　حسنؔ اس نے احساں دوبارا کیا

مذکورہ اشعار میر حسنؔ "سحر البیان" کے مصنف کے نہیں ہیں، بلکہ اُن کے ہم تخلص خواجہ حسنؔ کی تصنیف ہیں۔ یہ وہی خواجہ حسنؔ ہیں جنھیں صاحب مضمون نے آگے چل کر اسی صفحہ میں، مرزا جعفر علی حسرتؔ کے ذکر کے ساتھ یاد کیا ہے اور جراُتؔ کا استاد بھائی اور حسرتؔ کا تلمیذ رشید بتایا ہے لیکن اُن کے کلام کا نمونہ پیش نہیں کیا ہے۔

خواجہ حسنؔ کا زمانہ میر حسنؔ کے قریب بلکہ ملتا ہوا ہے اور تخلص بھی ایک ہی ہے اس لیے بعض تذکرہ نویسوں نے دھوکا کھایا ہے۔ چنانچہ شمس العلما، مولانا محمد حسین آزادؔ مرحوم نے اپنی زندۂ جاوید تالیف "آب حیات" میں جہاں میر حسنؔ کی سوانح عمری بیان کی ہے وہاں کلام کے نمونہ میں خواجہ حسنؔ کی ہی پوری غزل لکھ دی ہے اور جن تذکرہ لکھنے والوں نے "آب حیات" کو سامنے رکھ کر کوئی مضمون یا تذکرہ حوالہ قلم کیا ہے وہ بھی اس غلطی میں آلودہ ہو گئے ہیں۔

"آب حیات" میں صرف یہی ایک غلطی نہیں بلکہ دقیق نظر سے دیکھا جائے تو اس قماش کی بہت سی لغزشیں ملتی ہیں۔ چونکہ اُس مشہور تذکرہ پر تنقید لکھنا منظور نہیں اس واسطے یہ بحث چھوڑ کر اصل مطلب پر آتا ہوں۔

"گلشن بے خار" کے مولف خواجہ حسن کے ذکر میں بیان کرتے ہیں کہ وہ آزاد مزاج آدمی تھے، جوانی کی پُرجوش اُمنگوں نے بخشی نامی ایک طوائف کا شیفتہ بنا دیا تھا، وارفتگی کے عالم میں گریباں پھاڑے گلی کوچوں کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ عاشق ہونے کے بعد سے اُنھوں نے یہ شیوہ اختیار کر لیا تھا کہ ہر غزل کے مقطع میں کسی نہ کسی طرح بخشی کا نام ضرور نظم کر دیتے تھے۔ اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے بھی مذکورۂ بالا دونوں شعر نقل کیے ہیں۔

لائق مضمون نگار نے چھٹے صفحہ پر شیخ مصحفی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ "لکھنؤ کی شاعری ہمیشہ اُن کی زیربار احسان رہے گی، کیونکہ جس قدر شاعران نامور گزرے ہیں، وہ سب تقریباً مصحفی کے شاگرد یا شاگردوں کے شاگرد تھے۔ ناسخ اسی دبستان کے پروردہ یافتہ تھے۔ آتش نے وہیں فیض پایا، متاخرین میں امیر، انیس، دبیر، سب اسی میخانہ سے سیراب ہو چکے تھے۔"

شیخ ناسخ کا اس دبستان کا تربیت یافتہ ہونا سراسر واقعہ کے خلاف ہے۔ جہاں تک تذکروں کی چھان بین سے پتہ چلتا ہے، وہ یہ ہے کہ ناسخ نے کسی در پر جبیں سائی کی نہ کسی اُستاد فن کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کیا، اس معاملہ میں وہ صرف اپنی طبع سخن گو کے منت پذیر رہے۔ ہاں ایک دفعہ خدائے سخن میر تقی میر کی خدمت میں حاضر ہونے کا قصہ سُنا جاتا ہے، وہ بھی یوں کہ میر صاحب کی نازک دماغی نے اصلاح کی درخواست قبول نہ کی اور انھیں بے نیل مرام واپس آنا پڑا۔

ازل سے غیور طبیعت لائے تھے۔ اس واقعہ کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ اُس دن سے پھر کسی اُستاد وقت کی شاگردی کا خیال تک نہیں کیا، ذہن رسا کی مدد سے جو کچھ کہا اُس پر خود ہی اصلاح دیتے رہے یہاں تک کہ امام فن کا مرتبہ حاصل کر لیا، لیکن آج اُن کی شاعری پر چاندماری کی جا رہی ہے۔ اہل و نااہل، دونوں، جب قلم اُٹھاتے ہیں اُن پر ایک آدھ باڑھ مار دینا فرض تصور کرتے ہیں، حالانکہ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اُس ماحول، اُس عہد اور اُس وقت کی ضرورت کیا تھی، زمانہ کس قدر آگے بڑھ آیا، رسم و رواج میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں، تخیلات نے کیسے کیسے پلٹے کھائے اور اردو شاعری کن کن ادوار سے گذرتی ہوئی موجودہ معیار تک پہونچی ہے؟ گذشتہ تہذیب و معاشرت سے آج کی تہذیب و معاشرت بالکل مختلف ہے ایک صدی پہلے جو اُمور عیب متصور ہوتے تھے اب ہنر کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ مثلاً اگلے شرفا مونچھیں مُنڈوانا، ٹوپی یا پگڑی بغیر گھر سے نکلنا۔ کرتہ اور جانگیہ پہن کر راستوں پر گذرنا۔ موسیقی کے لَے میں کلام سُنانا معیوب سمجھتے تھے، اُس کے برخلاف آج صرف امین آباد سے چوک اور چوک سے امین آباد تک چکر لگایا جائے تو متعدد کرزن فیشن، متعدد ذنگ سکر، متعدد فیئر فی اور نیکر پوش، نئی تہذیب کی علم داری کرتے دکھائی دیں گے

اور مشاعرے تو ہو بہو رقص و غنا کا اکھاڑا معلوم ہوتے ہیں جن میں پہلوانانِ سخن محض گلے بازی اور موسیقی دانی کے بل بوتے پر کلام کی داد حاصل کرتے ہیں۔ بعض صوبوں میں تھیٹر اور سینما گھروں کی طرح ٹکٹ لگانے کا نفع بخش اصول رواج پا چکا ہے اور کچھ شاعروں نے پیشہ وروں کی تقلید میں اجرت بھی مقرر کر دی ہے۔

جس طرح تغیرات کے طاقتور پنجہ نے ہماری تہذیب، تمدن اور طبیعتوں کی کایا پلٹ دی ہے ویسے ہی تخیلہ اور وجدان پر بھی اثر اندازی کی ہے۔ اس لیے یہ نہایت ہی بے منصفی ہے کہ اگلے اساتذہ کا کلام موجودہ کسوٹی پر کسنے کی لاحاصل کوشش کی جاتی ہے اور زمانے کے بُعد کو یکسر فراموش کر دیا جاتا ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ اُن کا کمال پرکھا نہ جائے ــ پرکھا جائے اور ضرور پرکھا جائے مگر مشرقی بادہ کو مغربی صہبا کے ساتھ ملانا درست نہیں۔ رہی جذباتی و غیر جذباتی یا داخلی و خارجی شاعری کی بحث تو کہا جا سکتا ہے کہ ناسخ کے کلام میں تاثیر کا عنصر کم ہے اور کم ہونا بھی چاہیے کیونکہ اُنھوں نے وقت کا اقتضا ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا راستہ پیدا کیا جس کی شدید ضرورت تھی۔ شاعری سے اُنھوں نے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی خدمت نہیں لی بلکہ محض الفاظ کی تصحیح اور استعمال کا محل بتانے کا کام لیا، ثقیل و نامناسب الفاظ ترک کر دیے تقلید کی مضبوط زنجیریں توڑ پھینکیں اور ایک آزاد اسکول کی بنیاد قائم کرتے ہوئے ایسے مبسوط لغت کی تدوین میں زندگی گزار دی جس نے اُردو سیکھنے، بولنے اور سمجھنے والوں کو ہمیشہ کے لیے دربدر بھٹکتے پھرنے کی زحمت سے بے نیاز کر دیا۔ اگر اُن کی کامیاب جد و جہد سہارا نہ دیتی تو آج کی اُردو فلمی ہندوستانی سے بھی کئی درجے نیچے ہوتی۔ معترضین حضرات ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو محسوس ہوگا کہ جو الفاظ اعتراض کی مد میں صرف کیے جا رہے ہیں وہ بھی حقیقۃً اُسی فخرِ روزگار شخصیت کے مرہون ہیں جسے اُسی کے تیروں سے مجروح کیا جا رہا ہے!

اس جگہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ناسخ کے دور کا ہر خاص و عام، شاہ و وزیر، امیر و فقیر، برنا و پیر نظم کا فریفتہ تھا، نثر کی جانب یا تو سرے سے میلان نہ تھا اور اگر کچھ تھا بھی تو وہ اعتنا کے قابل نہیں ہو سکتا لہٰذا اُس وقت خالص علمی تصنیف سے اصلاحِ زبان کا کام لینا مصلحت سے دور اور بے معنی تھا۔

ناسخ کی نکتہ رس طبیعت نے ان دقتوں اور دشواریوں کا اندازہ کرتے ہوئے بالکل اچھوتا نیز دل پذیر طریقہ اختیار کیا اور بقول صاحب مضمون "تصنع، ضلع، جگت" یا بہ الفاظ دیگر شاعرانہ صنائع و بدائع کی دقتوں، وزن و قوافی کی دشواریوں اور نظم کی بندشوں کے ساتھ اپنا اہم ترین کام جاری کیا۔ انھوں نے علو ہمتی و بلند حوصلگی، غیرت و خودداری شجاعت و مردانگی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ محض اخلاقی اسباق ہی نہیں دیے بلکہ اُردو کو جملہ غلطیوں کی نقالت سے پاک کر کے صاف و شیریں بنا دیا اور اُس مہتم بالشان کام کی تکمیل کر دی جس کا بیڑا اُٹھایا تھا، یہ اُنھیں کا

فیض ہے کہ موجودہ مخالف ہواؤں میں بھی ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُسی اُردو کا دور دورہ ہے جو اُن کے دل کے لہو سے پلا پا کے مُنہ لگنے اور سر چڑھنے کے قابل ہوئی ہے۔

اب قابلیت کے فریب میں مبتلا ہو جانے والوں کو اختیار ہے کہ "ہر کس بہ خیال خویش......" کے ماتحت صرف "گیارہ اشعار" اُن کی ساری زندگی کا سرمایہ بتائیں یا نام کے آگے صفر دیدیں، اُنھیں تعریف کے بے مصرف سکوں کی ضرورت نہیں، وہ اپنا فرض ادا کر چکے، جب تک اُردو زندہ ہے اُن کی جانکاہی اور عرق ریزی کا بول بالا رہے گا۔

صفحہ ۱۷ پر لائق مقالہ نگار نے دور حاضر کو دو درجوں میں قائم کر کے اُن شاعروں کے نام دیے ہیں جو اب شاعری کی بساط پر موجود نہیں ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ اس فہرست میں بعض مشاہیر شعرا کا نام نہیں ہے مثلاً جاوید مرحوم جو رشید، عارف اور ذاکر کی طرح مرثیہ نگاری اور غزل گوئی میں یکساں طور پر داد سخن دیتے تھے۔ شہرت و ناموری کے اعتبار سے بھی کم نہ تھے۔ اس سلسلے کی اور کڑیاں تلاش کی جائیں تو اُنس، مونس، نفیس، عشق، تعشق، اوج، جلیس، [illegible]، حمید، عروج وغیرہم کے نام نامی پائے جاتے ہیں۔

غزل گوئی کے میدان میں مرزا بہادر، مرزا محمد عباس علی خاں بیگر، مسٹر حامد علی خاں حامد بیرسٹر ایٹ لا، نواب میر مہدی حسین ناہر، نواب میر اصغر حسین فاخر، نواب باقر علی خاں عروج، نواب جعفر علی خاں سالم، نواب قمرالدین حیدر مجنوں، علی میاں کامل، نواب عسکری مرزا بلیغ، سید عباس حسن فصاحت، منشی نوبت رائے نظر، مولوی عبدالرحیم کلیم، ناصری وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا درجہ یعنے زندہ شاعروں میں، مودب، فائق، فائز، رفیع، شدید، تسیم، ذکی، عالم، فاضل، آفتاب، عشرت، نقل، اشہر، ہرف، شعلہ، بہزاد اور ان کے علاوہ اکثر نام لیے جا سکتے ہیں۔ نہ معلوم کیوں؟ صاحب مضمون نے ان شعرا کو نظر انداز کر دیا حالانکہ ان میں وہ شخصیتیں بھی موجود ہیں جو اساتذہ کا درجہ پا چکی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ جناب ناظر اس مشورہ کو معاندانہ حیثیت سے دور رکھتے ہوئے، دوستانہ صلاح پر محمول کریں گے اور بغیر کسی طرح کی برہمی پیدا کیے ہوئے اپنے تذکرے کے مقدمہ پر نظر ثانی فرمانے کی تکلیف گوارا کریں گے۔

سرزمین وطن

(جناب مولوی حاجی محمود حسن خاں صاحب محمودؔ اسرائیلی)

اے نہالِ آرزو، اے غنچۂ بستانِ شوق — کھینچتے ہیں تیرے کانٹے بھی مرا دامانِ شوق
تیرے کوچوں میں بہاریں عید کی پاتا ہوں میں — تیرے ذرّوں میں کشش خورشید کی پاتا ہوں میں
گوشہ گوشہ تیرے صحرا کا ہے مردم آفریں — قطرہ قطرہ تیرے دریا کا ہے قلزم آفریں
تیرے گلشن پر خزاں بھی پھول برساتی رہی — برقِ خرمن سوز آئینے ہی چمکاتی رہی

مضطرب پروانہ جس سے شمع کی محفل میں ہے — وہ شرارِ عشق مضمر تیری آب و گل میں ہے
تیرے دریا میں نہیں ہے یہ روانی کی جھلک — ہے عیاں اس آئینہ میں زندگانی کی جھلک
کھلکھلا اٹھتا ہے مجھ کو دیکھ کر تیرا چمن — تیرا سبزہ تک نہیں بیگانہ مجھ سے اے وطن
گو نہیں منت کشِ دوشِ صبا تیری شمیم — غنچۂ دل کی تو ہے عقدہ کشا تیری شمیم

کچھ سکونِ دل تری آغوش میں پاتا ہوں میں — کچھ سخن تیرے لبِ خاموش میں پاتا ہوں میں
تیری ان خاموشیوں سے دلکشی کا راز ہے — جو ادائے دل نشیں ہے اس میں اک اعجاز ہے

یوں تو اپنی نوعیت میں ہر جگہ کیا خوب ہے
میرے سادہ دل کو تیری سادگی مرغوب ہے

قند پارسی

در ازل بر رخِ جاناں چو نگاہے کردم — او بسویم نظرے کرد و من آہے کردم
او ہماں داد سزائے کہ سزاوارم بود — مجرمِ عشق شدم سخت گناہے کردم
چوں مرا بخت رسانید بدرگاہِ جمال — سجدۂ شکر بہ سنگِ درِ شاہے کردم
ناوکِ غمزہ زدی بر دلِ مجروح کسے — اے نگاہ غلط انداز نگاہے کردم
او چو پرسید زمن صدمۂ غمہائے فراق — مختصر قصۂ خود را بیک آہے کردم
دم نظارہ چگویم بدل و جاں چہ گذشت — بر جمالش نظرے کردم و آہے کردم
اے جگر گرچہ گدا بودم و مسکیں بودم — شکر صد شکر کہ من خدمتِ شاہے کردم

جگر صدیقی بسوانی

عید کے روز![۱]

(جناب جلیل احمد قدوائی صاحب جلیل ایم۔اے)

عید کے روز گلے کس کو لگائے کوئی
وہ نہ ہوں پاس تو کیا عید منائے کوئی

دل کے دم سے ہے خوشی اور دل اُن کے دم سے
دل ہے ویران تو کیا دھوم مچائے کوئی

لذتِ وصل میسر جو نہیں آج کے دن
ہے غم ہجر کو سینہ سے لگائے کوئی

عید کا روز بھی سب دن کے برابر ہے مجھے
عید کے روز بھی گر منھ نہ دکھائے کوئی

آج وہ روز مسرت ہے کہ شاید میری
دل کی اُجڑی ہوئی بستی کو بسائے کوئی

کاش اک بار وہ اس شان سے آجائیں جلیل
غور کرنے پہ بھی پہچان نہ پائے کوئی

۱؎ "یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا!" ع

فغان عظیم

(جناب منشی علی عظیم صاحب عظیم تینوی عظیم آبادی)

کہوں میں باعثِ دردِ نہاں کیا
عیاں جو ہو وہ محتاج بیاں کیا

رہا ناسور بنکر اب تو دل میں
علاجِ زخمِ شمشیر زباں کیا

چمن میں جتنے گل ہیں سب گراں گوش
عنا دل کی سنیں آہ و فغاں کیا

نہ ہو کچھ جس میں لطفِ زندگانی
تو پھر ایسی حیاتِ جاوداں کیا

جگر دل لے چکے اس کو بھی لے لو
کروں گا رکھ کے جانِ ناتواں کیا

نفس کے ٹوٹ جانے کے یہ ہیں نام
فنا کیا اور مرگ ناگہاں کیا

ہے گرم سیر کیوں دوشِ صبا پر
نہ ٹھہرے گی کہیں عمر رواں کیا

جہاں دیکھو وہی ہے جلوہ افگن
سراپا نور کو قید مکاں کیا

عظیم اب آن واحد کے ہیں مہماں
یہ دنیا کیا طلسمات جہاں کیا

نظرے خوش گذرے

گذشتہ پرچہ کی اشاعت کے بعد ہی انجمن ترقی اُردو کے دفتر سے اُردو کانفرنس کی مطبوعہ روئداد وصول ہوئی جس میں جلسہ کی مفصل کارروائی کے علاوہ خطبہ استقبالیہ، خطبہ صدارت، سکریٹری صاحب کا بیان اور نواب مہدی یار جنگ کی آخری صدارتی تقریر وغیرہ بھی درج ہیں۔

کانفرنس کے انعقاد سے قبل آس بندھی تھی کہ حامیان ہندی کی تازہ سرگرمیوں سے متاثر ہوکر دکن اور پنجاب کے ہواخواہان اُردو نے اپنی زبان کو بچانے کے لیے کوئی موثر کارروائی کرنے کا تہیہ کیا ہے مگر کانفرنس میں شریک ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ جہاں تھے وہیں ہیں اور فی الحال وہیں رہیں گے۔

کانفرنس نے جو چند تجاویز منظور کی ہیں اُن میں سے کوئی تجویز ایسی نہیں جو اتنے دور دراز مقامات کے لوگوں کے جمع ہوئے بغیر مولوی عبدالحق صاحب تنہا اپنی رائے سے یا اپنے چند مقامی رفقا کے مشورہ سے نہ نافذ کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ بعد میں مخصوص ارکان شوریٰ سے تحریری رائے یا منظوری حاصل کرلی جاتی۔

کانفرنس کا انعقاد اس موقع پر اگر کیا گیا تھا تو اس کے لیے وجہ جواز یہی ہوسکتی تھی کہ

(۱) شرکائے کانفرنس اس بات پر آمادہ کیے جاتے کہ اپنے اپنے حلقوں میں اُردو کی حفاظت و اشاعت کیلیے عملی جدوجہد شروع کردیں۔

(۲) زبان کے تحفظ و اشاعت کے لیے سب سے زیادہ دو چیزوں کی ضرورت ہے سرمایہ اور کارکن۔ اُن کی فراہمی کے لیے مناسب تدابیر تجویز کی جاتیں اور اُن کو کامیاب بنانے میں جمع شدہ ہمدردان اُردو کا اشتراک عمل حاصل کیا جاتا۔ لیکن ان دونوں امور کے متعلق کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حامیان ہندی کی جدوجہد سے کوئی سبق حاصل کرنے کے لیے خادمان اُردو ہنوز آمادہ نہیں۔

مولوی عبدالحق صاحب نے کانفرنس کے روبرو بیان فرمایا تھا کہ:—

"اب حالات اس کے مقتضی ہیں کہ ہم کامل ارادے اور قوت کے ساتھ اپنی زبان کی طرف توجہ کرکے اور علم و فن اور ادبیات کی ہر شاخ کے متعلق کتابیں لکھوائیں، دنیا کی بہترین تصانیف کے ترجمے کرائے جائیں اور عام معلومات وغیرہ پر کتابیں تالیف کراکر کم سے کم قیمت پر کثرت سے شائع کی جائیں تاکہ ہر معمولی پڑھے لکھے اور کم استطاعت شخص کی بھی رسائی ان تک ہوسکے۔ دوسری طرف ہمیں زبان کی اشاعت کا بھی کام کرنا ہوگا۔ جو ان پڑھ ہیں اُنھیں پڑھائیں اور جو زبان سیکھنے کے آرزومند ہیں، اُن کے لیے مناسب سامان مہیا کریں...."

اس کے لیے ضرورت ہے کہ معقول اور کافی سرمایہ ہمارے ہاتھ میں ہو اور اس سے بڑھ کر سرگرم اور مخلص کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔" (مطبوعہ روداد صفحہ ۳۰)

براہیم کانفرنس کے موقع پر نہ سرمایہ مہیا کرنے کی تدابیر کا ذکر آنے پایا اور نہ سرگرم اور مخلص کارکنوں کے فراہم کرنے کے بارہ میں کوئی مشورہ ہو سکا۔

میزبانوں کی عنایت سے کانفرنس کی ابتدا لنچ کی دعوت سے ہوئی تو اختتام ڈنر کی دعوت پر ہوا۔ دو دن کے اندر صرف چار گھنٹے کمیٹیوں کی تشکیل پر اور تقریباً اسی قدر کانفرنس کی رسمی نشستوں پر صرف ہوئے اور باقی سارا وقت دعوتوں اور تقریروں کے نذر ہو گیا۔ باہر سے آنے والے اصحاب کی تعداد کچھ ایسی زیادہ نہ تھی مگر اُن سب کا قیام بھی اتنے متفرق مقامات پر تھا کہ کوئی وقت اُن کو اطمینان سے باہم تبادلۂ خیال اور مشاورت کا بھی نہ مل سکا اور ایسا نظر آتا تھا کہ اس کانفرنس کا مقصد محض اسی قدر تھا کہ ایک معاشرتی اجتماع ہو جائے اور "من تراحاجی بگویم تو مراحاجی بگو" کے مشتق مظاہرے کے بعد میزبان و مہمان دونوں اپنی اپنی ذمہ داریوں سے فراغت پا جائیں۔

حامیانِ ہندی تقریباً تمامتر ہندو ہیں اور ہوا خواہانِ اُردو میں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور دونوں قوموں کی ذہنیت، تنظیم اور صلاحیت عمل میں جو فرق ہے وہی اُن کی کانفرنسوں اور انجمنوں کی کارروائیوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک جماعت نے اپنی بیداری، حوصلہ اور تنظیم کی بدولت ہندی کے بولوں کو نصف صدی کے اندر اس درجہ پر پہونچا دیا ہے کہ آج وہ ملک ہندوستان کی قومی زبان منوائی جا رہی ہے۔ دوسری جماعت اتنی پست ہمت اور بے پروا گذری کہ وہ اُردو جیسی قدرتی خوبیوں والی زبان کی حمایت میں کتب فروشی سے آگے کوئی اقدام کرتے ہوئے جھجکتی ہے۔

کانفرنس کی تجاویز میں سب سے زیادہ اہم مولوی عبدالحق صاحب کی یہ رائے ہے کہ انجمن ترقی اردو کا دفتر اب دہلی میں منتقل کیا جائے۔ ۱۹۳۸ء میں "انجمن ترقی اُردو کے نظام" پر جو مضامین الناظر میں لکھے گئے تھے اُن میں اسی بات پر خاص طور سے زور دیا گیا تھا کہ انجمن کے لیے ایک مستقل مرکز کی ضرورت ہے۔ اُس وقت تو اس پر کوئی توجہ نہیں ہوئی۔ باقی صبح کا بھولا شام کو بھی گھر آ جائے تو غنیمت ہے۔ اگر آئندہ سال یہ تجویز زیرِ عمل ہو گئی تو امید ہے کہ انجمن کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا اور اس تبدیلی کی بدولت اُس کے تمام کاموں میں ترقی اور وسعت کے امکانات بہت بڑھ جائیں گے۔

انجمن ترقی اُردو کی تنظیم میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ معدودے چند کے سوا ملک بھر کے خدمت گذارانِ اُردو کو اُس سے کوئی خاص لگاؤ نہیں جس کا باعث کچھ تو یہ ہے کہ انجمن کا دفتر اُردو کے اصلی مرکز (شمالی ہند) سے بہت دور پڑ گیا اور دوسرا بڑا اور اصلی سبب یہ کہ انجمن کے نظم و نسق کی ساری ذمہ داری ایک شخص واحد پر

ہے کہ شاید ہندوستان میں یہی ایک انجمن ایسی ہے جس کی کوئی مجلس منتظمہ نہیں۔
اورنگ آباد کے گوشہ میں بیٹھ کر، مولوی عبدالحق صاحب مجبور تھے کہ کام کو آسانی اور خوبی سے انجام دینے کے لیے ساری ذمہ داری اپنے سر رکھیں۔ دہلی میں دفتر آجائے گا تو اس کی ضرورت باقی نہ رہے گی اور یقین کرنا چاہیے کہ مستعد اور سرگرم اشخاص کے اشتراک عمل سے انجمن کا کام بہت کچھ آگے بڑھ سکے گا۔
جنگ عظیم کے بعد یورپ میں جمہوریت کے بجائے انفرادیت کی طرف رجحان بڑھتا گیا اور مسولینی، مصطفیٰ کمال پاشا اور ہٹلر کی غیر معمولی شخصیتوں نے لوگوں کی ذہنیت میں ایک خاص قسم کی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ ہندوستان میں بھی اس کا اثر ہوا ہے اور جمہوری نظام سے وہ حسن ظن باقی نہیں رہا جو اس سے پہلے پایا جاتا تھا اور بہت سے لوگ اسے پسند کرنے لگے ہیں کہ قومی اداروں کو ایک شخص کے سر ڈال کر "سپردم بتو مایۂ خویش را" کہہ دیں۔ مگر یورپ کی موجودہ انفرادیت صدیوں کی جمہوری کشمکش کی ارتقائی صورت ہے۔ ہندوستان میں اور خصوصاً مسلمانوں میں ابھی تک جمہوری اداروں کا پورا نشوونما ہی نہیں ہوا ہے۔ یہاں انفرادیت پسندی کے یہ معنی ہیں کہ لوگ اُس ذمہ داری کا بار اُٹھانے سے گھبراتے ہیں جو کسی ادارے کو جمہوری اصولوں پر چلانے کی صورت میں اُن پر پڑے گا اور اس کا لازمی نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ قومی اداروں کو وہ امداد نہ مل سکے جو عام طور پر قوم کے ذی احساس اور فہمیدہ طبقہ سے ملنا چاہیے۔
ہندوستان میں کانگریس کے سب سے بڑے سیاسی نظام کے علاوہ اقوام ہند کی مختلف اقتصادی، معاشرتی، علمی و لسانی تنظیمیں موجود ہیں اور اُن کے حالات کو دیکھ کر کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ جمہوری طریقہ پر کام کرنے ہی کی وجہ سے اُن کی قوت اور مقبولیت میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہوتی رہی ہے۔
مسلمانوں کے پاس بھی مسلم یونیورسٹی اور انجمن حمایت اسلام کے تعلیمی ادارے موجود ہیں اور اُن کے بے پناہ ذوق استبداد کے باوجود ان کا نشوونما بہت کچھ اسی کا رہین منت ہے کہ قوم کے بہت بڑے طبقے نے اُن کی ترقی میں حصہ لیا۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ مولوی عبدالحق جیسے مخلص اور خدمت اُردو کی سچی لگن رکھنے والے بزرگ کی رہنمائی میں انجمن ترقی اُردو کے کاموں کو بھی وہی وسعت حاصل نہ ہو جائے جو ان اداروں کے نصیب میں آئی اگر سارے ملک کے ہوا خواہان اُردو انجمن کے معاملات میں دلی دلچسپی لینے لگیں اور ہر طریقہ پر مولوی صاحب کا ہاتھ بٹائیں۔
تحفظ اُردو کا کام خالص ادبی ذوق والوں کے کرنے کا نہیں ہے بلکہ یہ سیاسی کام ہے اور اُن لوگوں کو کرنا چاہیے جو سیاسیات سے دلچسپی رکھتے اور سیاسی اداروں کی تنظیم میں آزادی سے حصہ لے سکتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب اور انجمن ترقی اُردو سے جو خدمت ممکن ہے وہ ہو رہی ہے۔ جو کام اُن سے

نہیں انجام پاسکتا اُس کے لیے دوسرے لوگوں کو میدان عمل میں آنا چاہیے۔

میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر ہمایوں کو خدا نے اردو کی محبت بھی دی ہے اور جوش عمل بھی۔ اگر وہ اس طرف متوجہ ہوجائیں تو امید ہے کہ بہت جلد ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالی جاسکے گی جو انجمن ترقی اردو کے دوش بدوش صرف تحفظ اُردو کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر مناسب عملی جدوجہد کرسکے گا اور یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ وہ تمام پرجوش حضرات خصوصًا نوجوان طبقہ کے وہ اصحاب جو اپنی زبان سے محبت رکھتے اور اُس کی بقا کے لیے جدوجہد کرسکتے ہیں اُن کے ساتھ اشتراک عمل کے لیے تیار ہوجائیں گے۔

سرسید، مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق اور اُن کے رفقا نے اردو کے لیے جو کچھ کیا وہ ہمارے سامنے موجود ہے اب نوجوانوں کو انھیں بزرگوں کے نقش قدم پر چلکر اُردو کو ترقی کے اعلےٰ مدارج پر پہونچانے کے لیے مقتضیات وقت کے لحاظ سے نئی راہیں پیدا کرنا اور اس میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ممکنہ جدوجہد کرنا چاہیے۔

میراث پدر خواہی علم پدر آموز

۷۔۸ فروری کو صوبۂ متحدہ میں اسمبلی کے انتخابات ہونے والے ہیں۔ مسٹر جناح نے جو مسلم لیگ پارلمنٹری بورڈ بنایا، ہندوستان کے دیگر حصص کے مقابلہ میں صوبہ ہذا میں شاید اُسکی سب سے زیادہ آؤ بھگت ہوئی مگر جس بے اصولی کے ساتھ اُس کا افتتاح ہوا تھا اُس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ہر جگہ اُس کی شدید مخالفت کی گئی۔

پنجاب میں مجلس اتحاد ملت اور مجلس احرار کی علیحدگی کے بعد بشکل ۲۔۷ امیدوار مسلم لیگ بورڈ کو ملے۔ ان میں سے بھی ایک صاحب مایوس ہوکر انتخابی جدوجہد سے دستکش ہوچکے ہیں دوسرے صاحب اتحادی پارٹی میں جا ملے اور تیسرے صاحب جو پنجاب مسلم لیگ بورڈ کے سکریٹری بھی ہیں اتحاد ملت کے دامن میں پناہ گزین ہوگئے ہیں۔ باقی جو تین چار صاحب رہے ہیں اُن کا بھی اللہ بیلی ہے۔

بنگال، صوبہ سرحد، سندھ، بہار، صوبہ متوسط، مدراس وغیرہ کہیں بھی مسلم پارلیمنٹری بورڈ کی تحریک کامیاب نہیں ہوئی۔ صوبہ بمبئی میں بھی جہاں مسٹر جناح کو ذاتی اثر کی وجہ سے زیادہ کامیاب ہونا چاہیے تھا علاً بہت کم کامیابی کی امید ہے۔

ہمارے صوبہ میں ۶۴ مسلمان اراکین ہوں گے۔ اُن میں سے ۸ اصحاب بلامقابلہ ہے۔ جن میں صرف ایک حافظ محمد ابراہیم صاحب وکیل نگینہ جو پرانی کونسل میں بہترین مقرر سمجھے جاتے تھے، مسلم لیگ کے نمائندے ہیں اور باقی، حضرات اُس سے الگ رہنے والوں یعنے نواب چھتاری اور نواب یوسف کی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔

اگر انتخابات کے نتائج بھی اسی تناسب سے ہوے اور بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا ہے تو مسلم لیگ بورڈ کے ۸۰۔۱۰ نمائندے اسمبلی میں پہونچ سکیں گے حالانکہ یہاں مولانا شوکت علی ایسے جلیل القدر زعیم الملت، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی جیسے برگزیدہ عالم، اور مولانا احمد سعید دہلوی جیسے خوش بیان مقرر اُس کی تائید و پشت پناہی کے لیے موجود ہیں۔ افسوس ہے کہ مسٹر جناح نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ جب تک مسلمانوں کی سیاست غرضمند لوگوں کے ہاتھ میں رہے گی اور اُن کی تنظیم کسی محکم اور پائدار اصول پر نہ ہوگی کوئی مفید نتیجہ نہیں پیدا ہو سکتا۔

لکھنؤ شہر سے یارش بخیر ہمارے دیرینہ دوست چودھری خلیق الزماں صاحب کھڑے ہوے ہیں جن کے متعلق دسمبر ۱۹۳۵ء کے الناظر میں یہ لکھا گیا تھا:۔

"۱۹۳۶ء میں جنگ کا دغدغہ باقی نہیں، لکھنؤ میونسپلٹی میں مسلمان صدر کے منتخب ہونے کی باری ہے اور آئندہ انتخابات کے موقع پر اگر کونسل کی رکنیت پر فائز ہوگئے تو وزیر تک بننے کی گنجائش۔ ان حالات میں چودھری صاحب سے زیادہ بڑا کانگریسی کون ہو سکتا ہے"

حیدر آباد سے واپسی پر معلوم ہوا کہ نہ صرف عجیب عجیب گنوں سے چودھری صاحب میونسپلٹی کے صدر بن چکے ہیں بلکہ کانگریسی کارکنوں میں جھگڑے پیدا کر رہنمایان کانگریس کے استقبال کی مجلس کے بھی صدر بنا دیے گئے۔ کانگریس کے نظام میں جگہ نہ پانے کی وجہ سے کانگریس پارلیمنٹری بورڈ میں اگرچہ نہیں شریک ہو سکے لیکن لیلائے اسمبلی کے عشق نے خاموش نہ بیٹھنے دیا اور موقع پاتے ہی مسلم پارلیمنٹری بورڈ میں شامل ہوگئے اور اب اسمبلی میں پہونچنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ اُن کی یہ تمنا پوری بھی ہو جائے۔ کیونکہ میونسپلٹی کی صدارت کے فائدہ کے علاوہ حضرات علمائے کرام کی تائید اُن کو حاصل ہے اور اتفاق سے مقابلہ جس شخص سے ہے وہ بالکل نوجوان، ناتجربہ کار اور سیاسی چالبازیوں سے ناواقف ہے۔

ہمارے دیرینہ کرمفرما مسٹر محمد یعقوب نے ایک موقع پر اسمبلی کی رکنیت کو اپنی "سیاسی سربلندی" کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ چودھری صاحب کو جب یہ معلوم ہوا کہ راقم الحروف اُن کے مخالف کی تائید کرے گا تو اُنھوں نے بھی نہایت تبختر سے فرمایا کہ:۔

"خدا مجھے بڑھا رہا ہے تم مجھے (بڑھنے سے) روکنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکتے"

چودھری صاحب نہ کہتے تب بھی ہمیں کامل یقین تھا کہ اسمبلی کی رکنیت اور اپنی سیاسی و قومی سرگرمیوں کو وہ ذاتی ترقی کا وسیلہ جانتے ہیں۔ باقی ہماری موافقت و مخالفت کامیابی اور ناکامیابی کے امکانات کی بنا پر نہیں ہوتی۔

سر وزیر حسن کے خلاف ۱۹۱۸ء میں جب ہم نے پہلی بار آواز بلند کی ہے تو دوسروں کا کیا ذکر ہے خود

چودھری صاحب نے مسلم لیگ کی کونسل کے بھرے جلسہ میں ہماری مخالفت میں تقریر کی اور ہمارے عائد کردہ الزامات کا مضحکہ اُڑایا۔ مگر خدا کا کرنا دیکھیے کہ جب سر وزیر حسن نے چودھری صاحب کے بہنوئی مسٹر وسیم کو ذلیل کیا اور نقصان پہنچایا تو ۱۹۳۶ء کے انتخابات کے موقع پر چودھری صاحب اور اُن کے خاندان سے زیادہ سر وزیر حسن کا کوئی مخالف نہ تھا اور بالآخر سر وزیر حسن کی سیاسی زندگی ایسی برباد ہوئی کہ مسٹر جناح اُن کو مسلم لیگ کا صدر بنا کر بھی قوم میں سرخرو نہ کر سکے۔

چودھری صاحب اپنے رویہ پر قائم رہے تو خدا نے چاہا ایک دن اُن کو بھی اپنی غداریوں اور غرض پرستیوں کا انعام مل جائے گا۔

خدا کے یہاں دیر ہے۔ اندھیر نہیں۔

"کائنات" کے نام سے برادر عزیز منشی عبدالرؤف عباسی مالک و ایڈیٹر روزنامہ حق نے ایک رسالہ حال ہی میں جاری کیا ہے جس کے دو پرچے اکتوبر اور نومبر کے ہیں پہونچے ہیں۔ اس کے اجرا کی غرض عزیز موصوف نے پہلے ہی پرچہ میں جو ظاہر کی ہے وہ اُنھیں کے الفاظ میں درج ذیل ہے :-

"کائنات" کے اجرا کی واحد غایت اُس دہریت اور مادیت کے سیلاب کا مقابلہ کرنا اور اپنے بھولے ہوئے بھائیوں بھٹکے ہوئے ساتھیوں اور گم کردہ دوستوں کو مذہب کی صراط مستقیم دکھانا اور انھیں اُن کے مذاق طبعی کی مناسبت سے اس طرف متوجہ کرنا ہے"

ایک دوسری جگہ کی عبارت ذیل

"نیاز" کے پردہ پر "بے نیازیوں" کا بھیانک مرقع میری نظروں کے سامنے ہے اور وہ بیباکیاں وعبارتیں نہیں نہیں گستاخیاں و بدتمیزیاں میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ جو جلب منفعت اور کسب زر کی غرض سے مذہب، تعلیمات مذہب اور شعائر مذہب کے ساتھ بعض ناعاقبت اندیش ہستیاں نہایت تمسخر و مباحات کے ساتھ کر رہی تھیں"

بتا رہی ہے کہ نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار نے مذہب اور اسلام کے خلاف جو زہر پھیلایا ہے اُس کے لیے "تریاق" مہیا کرنے کی کوشش ہے اور کون مسلمان ایسا ہے جو اس کوشش کا دل سے خیر مقدم نہ کریگا۔

مگر دونوں نمبروں میں صرف ایک مضمون "تجزیۂ نیاز فتحپوری" کے عنوان سے مقصد رسالہ سے بظاہر متعلق نظر آیا۔ بظاہر اس لیے کہ اس مضمون میں بھی نیاز کی کسی مذہبی تحریر کی تردید نہیں بلکہ محض اُن کی ادبی شخصیت سے بحث کی گئی ہے۔

کائنات کی طباعت متوسط درجہ کی ہے البتہ سرورق بھڑکیلا اور جاذب نظر۔ چندہ سالانہ للعہ ر

میں نے عرض کیا کہ میں خاص جالون میں تحصیلدار تھا یہ سنتے ہی میرے گلے لپٹ گئے اور میم صاحبہ کو آواز دے کر دوسرے کمرہ سے بلایا اور فرمایا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے ہم دونوں کی جان غدر میں بچائی تھی۔ میم صاحبہ نے بھی پہچان کر بڑی محبت کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور دیر تک وہ دونوں بیٹھ کر میرے حالات جو بعد کو گذرے تھے دریافت فرماتے رہے اور اپنی بھی کیفیت مع کپتان براون صاحب کے بیان کی اور پھر دونوں بغرض محبت میرے مکان تحصیل پر جہاں میں رہتا تھا گئے اور رات کا کھانا ہم سب نے ملکر ایک ساتھ کھایا صبح کو اپنی رجمنٹ کے ساتھ مقام نوگانوں کو کوچ کر گئے۔ اور دوسرے روز ایک رپورٹ موسومہ گورنمنٹ بہ اندراج حالات غدر میرے لکھ کر میرے پاس بھیجدی اور مجھ کو لکھا کہ اس کو اپنے کلکٹر کے پاس خود لے جا کر دو وہ گورنمنٹ میں بھیج دیویں گے۔ میں نے ہمیرپور جا کر وہ رپورٹ ویسا ہی کلکٹر صاحب کو دیدی انھوں نے لے کر کہا کہ تم جاؤ ہم بھیجدیں گے میں واپس چلا آیا۔ اور الگزنڈر صاحب کو اطلاع اسکی بذریعہ چٹھی کے دیکر منتظر نتیجہ رپورٹ مذکورہ کا تھا۔ بالآخر گورنمنٹ نے بذریعہ رزولیوشن مورخہ ۲۹ جون ۱۸۶۶ء نمبری A-۱۳۶- ایک پختہ بنگلہ واقع شہر باندہ جس میں کالکٹر صاحب بمقام مذکور بکرایہ سو روپیہ ماہوار رہتے تھے اور علاوہ بریں عہدہ ڈپٹی کلکٹری بھی بجلدوی خیر خواہی مندرجہ رپورٹ کے عطا فرمایا اس پر الگزنڈر صاحب نے دوبارہ رپورٹ کی کہ یہ انعام بمقابلہ اتنی بڑی خیر خواہی کے بہت کم ہے بجواب اسکے گورنمنٹ نے یہ لکھ کر کہ فی الحال سوائے اسکے اور کوئی جائداد گورنمنٹ کے قبضہ میں نہیں ہے اور معاملہ عرصہ دراز کا ہوگیا ہے مزید کارروائی نہیں کی۔ بہر حال میں نے اس پر قناعت کی۔ علاوہ اس کے میں نے یہ سب کچھ کسی انعام کی طمع پر نہیں کیا تھا بلکہ فرض منصبی اور مذہبی اپنا سمجھ کر تعمیل حکم خدا اور رسول کی کی تھی جیسا کہ حدیث شریف میں ہے السلطان ظل اللہ فمن اکرمہ اکرمہ اللہ ومن اھانہ اھانہ اللہ۔ ترجمہ۔ یعنی سلطان وقت سایۂ خدا ہے پس جس نے ادب و منزلت اسکی کی گویا خدا کی ادب و منزلت کی اور جس نے توہین و بےعزتی اسکی کی اُس نے خدا کی توہین اور بےعزتی کی ۔ مجھ کو افسوس ہے کہ اپنے حالات لکھنے میں ناظرین کی بہت سمع خراشی کی۔ میں اپنی سرگذشت ایام غدر کو اب ختم کرتا ہوں مگر اس امر کے لکھنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ میرے والد جن کا اوپر ذکر آچکا ہے نہایت خوش نصیب تھے۔ میں اُن کو الہ آباد میں گورنمنٹ ہاؤس کو جاتے ہوئے چھوڑ آیا تھا اُس کے بعد مجھ کو کچھ تفصیلی حالات اُن کے معلوم نہ ہوئے مگر اسقدر کہونگا کہ مالی اعتبار سے وہ مجھ سے بدرجہا بہتر تھے۔ آخر وقت جبکہ عمر اُنکی قریب اسی برس کے ہوگی ریاست حیدرآباد میں بہ سفارش کرنیل میڈوز ٹیلر صاحب

بہادر رزیڈنٹ کے تعلقہ دار ضلع دگلور میں مقرر ہو کر تین چار برس بعد نہایت نیک نامی کے ساتھ ایسے معزز عہدہ پر جس کی تنخواہ غالباً ایک ہزار ہوگی انتقال فرمایا۔

اب میں اُن نوجوانان ہم وطن اپنے کو جن کا ذکر شروع میں تمہیداً آچکا ہے چند نصائح بزرگانہ برحسب تفصیل ذیل اس غرض سے توجہ دلاتا ہوں کہ وہ اپنی کجروی اور کوتاہ اندیشی سے باز آکر صلاحیت اختیار کریں اور اُن آفات سے بچیں جو نتیجہ لازمی اُن حرکات کا ہے جو اُن سے سرزد ہوئی ہیں اور خوب یاد رکھنا چاہیے کہ ایک کرتا ہے اور کل قوم پر اثر اُسکا پڑتا ہے بمصداق اس شعر کے ؎

چو از قومے یکے بیدانشی کرد نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

غدر میں جانتے ہو کہ میں نے کیسی کیسی عظیم خیر خواہیاں کیں اور سرٹیفکٹ حاصل کیے مگر سب جیب میں دھرے رہ گئے اُس زمانہ میں اس قدر بے اعتباری بڑھی ہوئی تھی کہ جب میں اولاً اپنی جگہ پر حاضر ہوا تو تادریافت حال فوراً حوالات میں بھیجدیا گیا جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے اگر میرے ہم وطن سب نیک روش ہوتے تو ہرگز ایسا نہ ہوتا۔ تو پھر تم کیوں لے نوجوان سمجھ اپنی خام خیالی اور ناعاقبت اندیشیوں سے اپنی قوم اور اپنی ذات خاص کو (ایسی ذات خاص جو ہونہار ہے اور جس سے بہت سی امیدیں نیکی اور منیفر ساتی خلائق کی وابستہ ہیں) تباہ اور برباد کر رہے ہو۔ دوسرے یہ کہ گوا بتداءً کسی قومی یا مذہبی بنیاد پر اشتعال کیسا ہو مگر اخیر میں یہی دیکھا گیا ہے کہ لوٹ مار کے سبب سے طمع روپیہ کی اسقدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ تمام تحریکیں جو اولاً بظاہر اچھے پیرایہ پر تھیں مبدل بہ طمع ذاتی ہو جاتی ہیں اور پھر اپنی ہی قوم اور مذہب کے ساتھ نہایت سفاکی اور بے رحمی اور بزدلی کے ساتھ پیش آتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ باغیوں نے ایام غدر میں ڈاکہ زنی کے وقت بجائے اسکے کہ ہزاروں عورتوں کے لوٹ مار کے وقت سہولیت سے زیور اُتاریں ناک کان اُن کے جڑ سے جو طلائی نتھوں اور بالیوں سے بھرے ہوئے تھے کاٹ لیے کہ وہ بیچاریاں بوچی و نکٹی ہو کر ہمیشہ کے لیے نفرت انگیز خلائق ہو کر زندگی اُن کی بدتر از موت ہوگئی۔ ایسے ظالموں کو میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ تھوڑے ہی دن بعد عذاب سخت میں مبتلا ہو کر سب کے سب تباہ اور ہلاک ہوگئے اور جو بعض بچ رہے اُن کو بھی ہمیشہ اس بات کا شاکی پایا کہ تمام شب اُن کی وحشت و بیداری میں گذرا کی اور جب کبھی ذرا آنکھ لگتی تو بھیانک صورتیں اُن عورتوں کی اُن کو ڈراتی ہوئی نظر آتیں جن کے ساتھ حسب مذکورہ بالا وحشیانہ برتاؤ اُنھوں نے کیا تھا۔ اُس ہولناک شکل سے خوف اُن پر ایسا غالب آتا تھا کہ تمام جسم تھرا جاتا تھا اور ایسا کیوں نہو بمصداق اس شعر کے ؎

اے یار جو کسی کو کلپا ئیگا تو جان کہ وہ بھی نہ کل پائیگا

اس دیر مکافات میں سن لے غافل جو آج کرے گا وہ کل پائے گا
اور عاقبت کے عذاب کی تو کچھ انتہا نہیں جہاں موت نہیں ہے اور آتش دوزخ کی بہ نسبت یہاں کی آگ کے ستر ہزار درجہ بڑھی ہوئی ہے۔ تیسرے یہ بھی ظاہر ہے کہ غدر میں لکھوکھا فوج قواعدداں باغی ہوگئی تھی اور کل سامان حرب اُنکے قبضہ میں تھا پس جبکہ ایسے انقلاب عظیم میں اُن سے (جس کی نسبت بڑے بڑے عقلا کی اُس وقت یہ رائے تھی کہ آئندہ اب بحالی سلطنت کی غیر ممکن ہے) کچھ نہ ہوسکا تو پھر تم لوگ کہ اُس کے مقابلہ میں ایک پشہ برابر بھی نہیں ہو ایسی عظیم الشان سلطنت کو جو قریب قریب نصف دنیا میں نہایت استحکام کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے بجز اپنی و اپنی قوم کی خرابی کے کیا نقصان برٹش گورنمنٹ کو پہونچا سکتے ہو۔ چوتھے یہ کہ ہر قوم و مذہب میں بادشاہ کی اطاعت و فرمانبرداری فرض گردانی گئی ہے عاقبت میں بھی سوائے روسیاہی اور عذاب الیم کے کیا توقع ہوسکتی ہے۔ قرآن شریف کے سیپارۂ پانچ رکوع چار کے اخیر میں اللہ تعالےٰ جلشانہ نے خود فرمایا ہے۔ یَاۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ کل رعایا برٹش گورنمنٹ کو اس سے اتفاق ہوگا کہ شروع عملداری سے اب تک ہر کس وناکس کو اپنے مذہبی ارکان اور ملکی رواج کی ادائی میں ہر طرح کی آزادی ہے اور انصاف کا پلہ اسقدر بھاری رہا کہ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیا کیے اور رعایا کے آرام و آسائش کے لیے لکھوکھا وسائل کڑوڑوں روپیہ کے خرچ سے مہیا کیے جو کسی وقت ہندوستان میں کسی فریق کی سلطنت میں رعایا کو نصیب نہیں ہوئے جو خوش قسمتی سے ہم لوگوں کو حاصل ہیں۔ پس ایسے شہنشاہ وقت پر تہ دل سے جان و مال نثار کرنا چاہیے اور اُسکے استحکام سلطنت کے لیے دست بدعا اور دشمن کے مقابلہ میں شمشیر بکف رہنا چاہیے۔ اب میں اس دعا کے ساتھ اپنی تحریر کو ختم کرتا ہوں اور غالبًا تم لوگ بھی اس دعا میں میرے شریک ہوگے کہ خداوند کریم ہمارے قیصر اور قیصرہ ہند جارج پنجم اور ملکہ میری کو بعمر طبعی پہونچا دے اور اس سلطنت کو تا بقیامت قائم رکھے اور اُن کے قائم مقام لارڈ ہارڈنگ وسیرائے ہند و لیڈی ہارڈنگ و سرجان ہیوٹ لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ و اودھ و لیڈی ہیوٹ جن کی محبت پدرانہ ہر کس وناکس کے دل پر نقش کالحجر ہے اور سب اپنی جانیں اُن کے انصاف اور قیصر ثانی پر نثار کرنے کو ہر وقت موجود ہیں خداوند کریم ایک مدت مدید تک اُن کو قائم اور سلامت رکھے۔ آمین

<table>
<tr><td colspan="2">اب اخیر میں واسطے سہولیت ناظرین کے لب لباب اس تمام سرگذشت کا بطور فہرست کے درج ذیل کرتا ہوں۔</td></tr>
<tr><td>(۱) اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر یوروپین افسران برٹش گورنمنٹ کی جانیں بچائیں۔</td><td>نمبر۱۔ دیکھو اخیر عبارت ہسٹری آف گزیٹڈ افسران ۱۸۹۴ء
نمبر۲۔ رزولیوشن گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی نمبری ۱۳۶-A (136-A) مورخہ ۲۹ر جون ۱۸۶۶ء۔</td></tr>
<tr><td>(۲) مقام کانپور کشتی پر مثل یوروپین کے بٹھلایا گیا جو باغیان کی توپوں کی ضربات سے تہ و بالا ہوکر غرقاب ہوگئیں۔ اور اس مہلک مقام سے تختوں پر بہ کر اُس پار خشک گھانس کی گنجی میں چھپ کر جاں بر ہوا۔</td><td>ظاہر ہے کہ اس مہلک مقام سے کوئی افسر شاسا میرا جاں بر نہیں ہوا البتہ تصدیق اس کی کرنیل الگزنڈر صاحب کی رپورٹ کے اخیر حصہ سے ہوتی ہے جہاں اُنھوں نے یہ لکھا ہے۔
"They were taken to Cawnpore where the work of butchery was going on, and escaped from thence by miracle."
علاوہ اس کے اخبار پانیر مورخہ ۲۴ر اگست ۱۹۱۱ء ملاحظہ طلب ہے کہ اس میں بھی ذکر اس کا درج ہے جسکی نقل شامل سرگذشت مذکور ہے</td></tr>
<tr><td>(۳) برٹش گورنمنٹ کا خزانہ جو کہ لکھوکھا روپیہ کا تھا دست برد باغیان سے بچانا۔</td><td>افسوس ہے کہ حسب تحریر کرنیل الگزنڈر صاحب جو رپورٹ کپتان براؤن صاحب ڈپٹی کمشنر نے میری نسبت گورنمنٹ میں کی تھی وہ بوجہ غدر کے تلف ہوگئی اور گورنمنٹ تک نہیں پہونچی اور نہ اُسوقت جب بعد غدر حسب طلب صاحب موصوف بمقام ساگر جارہا تھا بوجہ وفات صاحب مذکور کے اُن سے مل سکا ورنہ وہ ضرور عندالملاقات میری نسبت جو رپورٹ گورنمنٹ میں کرتے اُس میں یہ سب حالات بھی درج کرتے جنکا ذکر اوپر آچکا ہے تاہم اگر ہسٹری مذکورہ بالا کو بغور دیکھا جاوے گا تو اُس کی اس عبارت سے
"And he kept his Tahsil in order."
محفوظی خزانہ کی مفہوم ہوگی۔</td></tr>
</table>

(۴) باغیان نے کل مال و اسباب میرا بیش قیمت اور میری بیوی کا زیور طلائی و نقرئی اور مرصع بجواہرات جو ہزارہا روپیہ کی قیمت کا تھا تمام کمال قبل گرفتاری کے لوٹ لیا۔	اس موقع پر کرنیل انگزنڈر صاحب کی رپورٹ کا اخیر حصہ و نیز سرٹیفکیٹ انگریزی مسٹر گریفتھ صاحب ملاحظہ طلب ہے جس سے تصدیق اس کی قرار واقعی ہوتی ہے۔
(۵) راجہ گورسرائے کا برٹش گورنمنٹ سے منحرف ہو جانا جو کہ بعد غدر کے خیر خواہانہ جامہ میں پیش پیش حکام ہو کے بچ گیا۔	دیکھو سرٹیفکیٹ گریفتھ صاحب ڈپٹی کلکٹر جالون جو بعد غدر کانپور میں بعہدہ مذکورہ مقرر ہوئے تھے۔

تمت

واقع ۲ر مئی سنہ ۱۹۱۱ء کو بمقام الہ آباد ختم ہوا۔ میں نے یہ کل سرگذشت اپنی بابت ایام غدر ۱۸۵۷ء کے اپنی بھتیجی زوجہ برخوردار ڈاکٹر لطافت حسین خاں آئی۔ ام۔ اُس [درج صفحہ ۱۱] پسر اپنے کے لکھایا ہے اور اُس کی نظر ثانی میں نے اچھی طرح کر لی ہے۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ جو کچھ اُس میں درج ہے وہ حرف بحرف وہی ہے جو میں اپنی زبان سے بولتا گیا ہوں اور یہ سب میں نے اپنے علم و یقین اور یادداشت ذہنی کے رو سے لکھوایا ہے اسکی صحت میں مجھے کچھ شک نہیں ہے۔ باقی الانسان مرکب من الخطاء والنسیان اگر کچھ سہو واقع ہو تو لائق درگذر کے ہے۔ فقط

خان بہادر محمد عنایت حسین خاں
ڈپٹی کلکٹر پنشنر ساکن الہ آباد
محلہ دوندی پور۔ بقلم خود

یعنی

خان بہادر منشی محمد عنایت حسین خاں مرحوم و مغفور

پنشنر ڈپٹی کلکٹر و سابق نائب وزیر ریاست بھوپال

کی

خود نوشت آپ بیتی

یہ رسالہ بالاقساط رسالۂ النّاظر میں جولائی ۱۹۳۶ء سے دسمبر ۱۹۳۶ء تک شائع ہونے کے بعد اب کتابی صورت میں پیش کیا جاتا ہے

باہتمام اسحٰق علی علوی پرنٹر

درالنّاظر پریس واقع بلدہ لکھنؤ طبع یافت

باراوّل

قیمت [illegible]

خطبات و مقالات

طوفان تبسم
موج تبسم
آخری مضامین سرسید
افادات مہدی
انتخاب اودھ پنچ
انتخاب لقیب
انتخاب مخزن ۳ حصے
بہترین انشا پرداز
پطرس کے مضامین
تخیلات
بنکھڑیاں
پھلیاں اور گدگدیاں
خیالستان
حکایات و احساسات
خطبات مدراس
رسائل شبلی
در گل
سیپارۂ دل
گلدستۂ عید
فسانۂ جوش
قطرات اشک
قلب حزیں
راہ در پردیں
بحر تبسم
سیلاب تبسم
نکات رموزی
مترجمات
مضامین سرسید
مضامین محسن الملک
مضامین چراغ علی
مضامین وقار الملک
مضامین چکبست
مقالات
مقالات سرسید
مقالات شبلی
مذہبی مضامین شبلی
ادبی مضامین شبلی
تعلیمی مضامین شبلی
تنقیدی مضامین شبلی
سوانحی مضامین شبلی
مولانا شبلی
مقالات حالی
منثورات
مجموعہ لکچر سرسید
مجموعہ لکچر محسن الملک
لکچروں کا مجموعہ نذیر احمد
تقاریر ظفر علی خاں
خطبات عالیہ ۳ حصے

قواعد و اصول

اصلاح زبان اردو
اصول اردو
جان اردو
زباندانی
قواعد میر
بحر الفصاحت
معیار البلاغہ
رکن عروض
زر کامل العیار
سنکو ملیغ
قواعد المنتخب
معاون الشعرا
دستور الشعرا
رسالہ تذکیر و تانیث
نظام اردو
سرور کیفی
شاعری کی ۴ کتابیں
نکات سخن ۴ حصے
قواعد اردو
قواعد عربی
عربی بول چال
فارسی بول چال
ترکی بول چال
سرگذشت الفاظ

لغات

امیر اللغات نامکمل
فرہنگ آصفیہ جلد اول
نور اللغات کامل
سرمایۂ زبان اردو
زبدۃ اللغات
فرہنگ امثال
لغات اردو ۴ جلد
لغات سعیدی
لغات فارسی
لغات کشوری
منیر اللغات اردو
منیر اللغات فارسی
سعیدی ڈکشنری
لغات النسا
لغات الخواتین
محاورات نسواں
محاورات ہندستان
بازاری زبان
غلط العوام
گنج رواں
نجم الامثال
جواہر اللغات فارسی
لغات جدیدہ عربی

مثنویاں

مثنویات میر
خواب و خیال (اثر)
مثنوی میر حسن
بحر المحبت (مصحفی)
گلزار نسیم
زہر عشق
طلسم الفت
حزن اختر
ترانۂ شوق
قاسم و زہرہ
فریاد داغ
دفتر سحر
باغ فردوس
قومی مثنوی
راہ حق

مرثیے

کلیات مراثی میر ضمیر
کلیات مراثی دبیر
کلیات مراثی انیس
واقعات کربلا
کلیات مراثی مونس
کلیات مراثی عشق

کلیات و دواوین	نظمیں	علوم و فنون	افسانے	جوہر قدامت عہ
کلیات ولی للعہ	مجموعہ نظم آزاد ۸ر	فلسفہ تعلیم سے	ابن الوقت عہ	عروس کربلا ۶ہر
کلیات میر عہ	مجموعہ نظم حالی عہ	فلسفہ جذبات ۶ار	ایامیٰ ۶ہر	یاسمین شام ۶ہر
کلیات سودا ۲ جلد سے	نظم بے نظیر ۶ہر	برکلے عہ	فسانہ مبتلا ۶ہر	تیغ کمال عہ
دیوان اثر عہ	مجموعہ کلام شبلی ۱۰ر	مبادی علم انسانی عہ	رویائے صادقہ ۶ہر	ماہ عجم عہ
دیوان تاباں عہ	جذبات نادر ۱۲ر	مکالمات برکلے عہ	فسانہ آزاد ۴ جلد ہے	طوفان حیات عہ
دیوان درد ۱۲ر	ہفت گلبن (شرر) ۸ر	نفسیات ترغیب ۶ار	خدائی فوجدار ۶ار	شہید مغرب عہ
دیوان یقین ۶ار	خیاباں (") ۴ر	ارتقا عہ	جام سرشار عہ	حیات صالحہ عہ
کلیات آتش ۶ہر	کلام نیرنگ ۱۰ر	تاریخ تمدن ۲ جلد ہے	عیب دان وطن عہ	حجاج بن یوسف ۶ہر
دواوین ناسخ ۶ہر	بانگ درا (اقبال) ہے	روح الاجتماع ۶ار	مفتوح فاتح ۶ہر	عروس مصر ۶ار
کلیات مومن عہ	بال جبریل (") سے	انقلاب الامم ۶ار	فلپانا عہ	عبدالرحمن الناصر ۶ار
دیوان ذوق ۶ار	رود قفس ۱۲ر	ریاست للعہ	زوال بغداد ۶ہر	شریف زادہ عہ
دیوان غالب ۸ر	گنجینۂ معانی ہے	اساس التعلیم ۶ار	عزیزۂ مصر ۶ہر	نیلی چھتری ۶ہر
کلیات نظیر اکبر آبادی عہ	نغمہ زار (حفیظ) ۶ہر	جاپان کا تعلیمی نظم و نسق ہے	بابک خرمی عہ	بہرام کی گرفتاری عہ
کلیات ظفر سے	سبد گل عہ	نظریۂ اضافیت للعہ	لعبت چین عہ	لال کھٹور عہ
دواوین داغ ۴ جلد عہ	پیام روح (افسر) سے	وضع اصطلاحات سے ۱۲ر	طاہرہ ۶ہر	خواب ہستی ۱۲ر
دواوین امیر ۳ جلد ہے	مطلع انوار عہ	علم المعیشت عہ	نیکی کا پھل عہ	یاسمین عہ
دیوان حالی عہ	لمعات اختر ۸ر	امداد باہمی عہ	فلورا فلورنڈا عہ	مجبور وفا ۶ہر
کلیات اکبر ۳ حصے للعہ	نقش و نگار (جلیل) عہ	المسمر ۱۰ر	حرم سرا کامل سے	لیلے ۶ار
کلیات نعت محسن ۶ہر	مسدس حالی ۸ر	ریڈیو ۱۲ر	تارا کامل ۶ار	عذرا ۱۲ر
تاج سخن (جلیل) ۶ار	عالم خیال (شوق قدوائی) ۸ر	بجلی کے کرشمے ۶ہر	صبح زندگی عہ	عذرا کی واپسی ۶ار
دیوان شوق قدوائی ۶ار	نیرنگ جمال (") ۴ر	رموز حکمت سے	شام زندگی ۶ہر	آستانہ کی حور ۶ار
کمل دیوان حسرت سے	صبح وطن (چکبست) ۶ار	رسس ۸ر	شب زندگی ۲ حصے ۶ار	سعید و فلپانا ۶ار
دیوان آرزو عہ	دنیائے راز ۱۰ر	معلم السیاست ۶ہر	نوحۂ زندگی ۱۲ر	سرگذشت کامل ہے
کلیات فانی عہ	شاعر کی راتیں (جوش) ۱ر	سرگذشت حیات ۶ہر	منازل السائرہ ۲ حصے ۶ار	شوکت آرا بیگم ہے

الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

الناظر پریس لکھنؤ میں باہتمام ... طبع ہوا

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ